زبان اور قواعد

رشید حسن خان

زبان اور قواعد

زبان اور قواعد

رشید حسن خان

بک ٹاک
میاں چیمبرز، 3 ٹمپل روڈ، لاہور

فہرست

حرفِ آغاز	9
صحتِ الفاظ	11
مشترک الفاظ	156
لغت اور استعمالِ عام	188
ملائی — بالائی	226
ترکیبِ تہنید	241
سقوطِ حروفِ علت	271
اعلانِ نون	288
مختاراتِ امیر مینائی	305
بحر البیان	427

زبان اور قواعد

رشید حسن خان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ناشر ——— بک ٹاک، لاہور
اشاعت ——— 2018ء
طابع ——— بھٹو پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت ——— -/995 روپے

بک ٹاک ——— میاں چیمبرز، 3- ٹمپل روڈ لاہور
فون ——— 042-36374044-36370656-36303321
Email:book_talk@hotmail.com
www.booktalk.pk
www.facebook.com/booktalk.pk

برادرِ مکرم

جناب سید ابراہیم حسن رسا بریلوی

کے نام

maablib.org

حرفِ آغاز

اِس مجموعے میں شامل مضامین، مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے؛ اب اِن پر نظرِ ثانی کی گئی ہے اور بعض کو از سرِ نو لکھا گیا ہے۔

تلفظ کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ عربی و فارسی کے بہت سے لفظوں کے تلفظ میں تغیرات رونما ہوئے ہیں، اور اکثر تبدیلیاں، یہاں کے لہجے کے تقاضوں کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ اِن تبدیلیوں سے اِس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ دُنیا کی دوسری خود مختار زبانوں کی طرح، اُردو نے بھی لفظوں کو اپنے سانچے میں ڈھالا ہے؛ تلفظ کے لحاظ سے بھی اور بناوٹ کے اعتبار سے بھی۔

اِس سلسلے میں یہ بات ضرور پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ تلفظ کی تبدیلیاں پہلے بول چال کی نچلی سطح پر اپنے آپ کو نمایاں کیا کرتی ہیں اور یہ قدرتی عمل ہے۔ یہ تغیرات جب ایک خاص مدت تک کار فرما رہتے ہیں اور زبان کی دوسری سطح پر بھی اپنے اثرات کو ثبت کر لیا کرتے ہیں، تب وہ لُغت کے لیے قابلِ قبول ہو پاتے ہیں۔ یعنی جو تغیرات اِس درمیانی وقفے میں اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں، وہی استعمالِ عام کے دائرے میں شامل کیے جانے کے حق دار ہوا کرتے ہیں، اور اسی نسبت کے ساتھ وہ

صحّتِ الفاظ

اردو میں چھوٹی بڑی کئی کتابیں صحتِ الفاظ کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے مولفین نے عموماً ایسے لفظوں کی فہرستیں مرتب کی ہیں جو حرکات یا بناوٹ کے لحاظ سے اصل سے مختلف ہیں اور اُن کے خیال کے مطابق "غلط العوام" کے ذیل میں آتے ہیں۔ مولفین نے عام طور پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ عربی و فارسی الفاظ کو، جہاں تک ہو سکے، اُسی طرح استعمال کرنا چاہیے جس طرح وہ اُن زبانوں کے لغات میں محفوظ ہیں۔

فارسی اور عربی کے جن لفظوں میں حرکات کی تبدیلی ہوئی ہے یا اُن کی صورت بدل گئی ہے یا قیاس کے واسطے سے کچھ نئی صورتیں معرضِ وجود میں آئی ہیں، تو یہ ساری تبدیلیاں، اردو کے مزاج اور ہندستانی لہجے کے اقتضا سے، خود بہ خود عمل میں آئی ہیں۔ یہ عمل، زبان کی حقیقی صلاحیت کا مظہر ہوتا ہے اور اس کا ثبوت کہ وہ زبان زندہ ہے اور متحرک ہے۔ جس زبان میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی، وہ ترقی کے امکانات سے محروم ہو جاتی ہے، بل کہ یوں کہیے کہ وہ زبان اس طرح جامد ہو جاتی ہے کہ مرحوم زبانوں کے دائرے میں شامل کیے جانے کی حق دار بن جاتی ہے۔ کسی زبان کی وسعت، صلاحیت اور طاقت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دوسری زبانوں سے وارد ہونے والے لفظوں کو وہ کس طرح اور کس حد تک اپنے سانچوں میں ڈھال سکتی ہے۔ بہ قولِ پنڈت دتاتریہ کیفی

لغت میں شامل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ عربی و فارسی الفاظ کا تلفظ بس اُسی طرح صحیح ہے جس طرح اُن زبانوں کے لُغات میں محفوظ ہے؛ تو یہ سمجھا جائے گا یا سمجھا جانا چاہیے کہ یہ شخص اردو کو کوئی مستقل زبان نہیں سمجھتا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تلفظ کے وہ سارے تغیرات لازماً قابلِ قبول ہیں جو کسی بھی شخص کی گفتگو میں نمایاں ہوئے ہیں؛ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس شخص کو زبان کے اعتبار اور لُغت کے استناد کے مسائل سے دل چسپی نہیں۔

تلفظ کی طرح، لفظوں کی بناوٹ میں بھی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ عربی و فارسی الفاظ کے انداز پر بہت سے نئے لفظ بن گئے ہیں اور بہت سے لفظوں کو معمولی یا غیر معمولی تبدیلیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ یہ اُردو کا قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ ایسے مستعمل الفاظ کو غیر معتبر سمجھنا، غیر صحت مند طرزِ عمل کے مرادف ہوگا۔

اسی طرح زبان اور قواعد کے اور بہت سے اہم موضوعات کی بحثیں بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اُن سے متعلق اکثر مباحث، مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اساتذہ کے مکاتیب میں اور فنِ اصلاح پر لکھی گئی کتابوں میں بھی بہت کچھ محفوظ ہے۔ اور ایسے موضوعات پر لکھے گئے رسائل بھی بہت سے اہم مباحث کا گنجینہ ہیں۔ زبان و ادب کے اچھے طالب علموں کے لیے اِس لیے ضروری ہے کہ اُن کو ایسی تفصیلات کا علم ہو۔ اِس علم کے بغیر، بہت سے اہم مسائل کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔

اِس کے علاوہ، اب اگر اُردو کا کوئی بڑا لُغت مرتب کیا جائے، اُس وقت اِن سارے مسائل کی اہمیت کا اور زیادہ احساس ہوگا ——— اِس مجموعے میں شامل مضامین، ایسے چند اہم مباحث پر روشنی ڈالتے ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ اِن سے بعض مسائل کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

رشید حسن خاں

صحتِ الفاظ

اردو میں چھوٹی بڑی کئی کتابیں صحتِ الفاظ کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ اِن کتابوں کے مولفین نے عموماً ایسے لفظوں کی فہرستیں مرتب کی ہیں جو حرکات یا بناوٹ کے لحاظ سے اصل سے مختلف ہیں اور اُن کے خیال کے مطابق "غلط العوام" کے ذیل میں آتے ہیں۔ مولفین نے عام طور پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ عربی و فارسی الفاظ کو، جہاں تک ہو سکے، اُسی طرح استعمال کرنا چاہیے جس طرح وہ اُن زبانوں کے لغات میں محفوظ ہیں۔

فارسی اور عربی کے جن لفظوں میں حرکات کی تبدیلی ہوئی ہے یا اُن کی صورت بدل گئی ہے یا قیاس کے واسطے سے کچھ نئی صورتیں معرضِ وجود میں آئی ہیں، تو یہ ساری تبدیلیاں، اردو کے مزاج اور ہندستانی لہجے کے اقتضا سے، خود بہ خود عمل میں آئی ہیں۔ یہ عمل، زبان کی حقیقی صلاحیت کا مظہر ہوتا ہے اور اس کا ثبوت کہ وہ زبان زندہ ہے اور متحرک ہے۔ جس زبان میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی، وہ ترقی کے امکانات سے محروم ہو جاتی ہے، بل کہ یوں کہیے کہ وہ زبان اِس طرح جامد ہو جاتی ہے کہ مرحوم زبانوں کے دائرے میں شامل کیے جانے کی حق دار بن جاتی ہے۔ کسی زبان کی وسعت، صلاحیت اور طاقت کا اندازہ اِس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دوسری زبانوں سے وارد ہونے والے لفظوں کو وہ کس طرح اور کس حد تک اپنے سانچوں میں ڈھال سکتی ہے۔ بہ قولِ پنڈت تاتریہ کیفی

لغت میں شامل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ عربی و فارسی الفاظ کا تلفظ بس اُسی طرح صحیح ہے جس طرح اُن زبانوں کے لغات میں محفوظ ہے؛ تو یہ سمجھا جائے گا یا سمجھا جانا چاہیے کہ یہ شخص اُردو کو کوئی مستقل زبان نہیں سمجھتا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تلفظ کے وہ سارے تغیرات لازماً قابلِ قبول ہیں جو کسی بھی شخص کی گفتگو میں نمایاں ہوئے ہیں؛ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس شخص کو زبان کے اعتبار اور لغت کے استناد کے مسائل سے دل چسپی نہیں۔

تلفظ کی طرح، لفظوں کی بناوٹ میں بھی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ عربی و فارسی الفاظ کے انداز پر بہت سے نئے لفظ بن گئے ہیں اور بہت سے لفظوں کو معمولی یا غیر معمولی تبدیلیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ یہ اُردو کا قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ ایسے مستعمل الفاظ کو غیر معتبر سمجھنا، غیر صحت مند طرزِ عمل کے مرادف ہوگا۔

اسی طرح زبان اور قواعد کے اور بہت سے اہم موضوعات کی بحثیں بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اُن سے متعلق اکثر مباحث، مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اساتذہ کے مکاتیب میں اور فنِ اصلاح پر لکھی گئی کتابوں میں بھی بہت کچھ محفوظ ہے۔ اور ایسے موضوعات پر لکھے گئے رسائل بھی بہت سے اہم مباحث کا گنجینہ ہیں۔ زبان و ادب کے اچھے طالب علموں کے لیے از بس ضروری ہے کہ اُن کو ایسی تفصیلات کا علم ہو۔ اِس علم کے بغیر، بہت سے اہم مسائل کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔

اِس کے علاوہ، اب اگر اُردو کا کوئی بڑا لُغت مرتّب کیا جائے، اُس وقت اِن سارے مسائل کی اہمیت کا اور زیادہ احساس ہوگا ـــــــ اِس مجموعے میں شامل مضامین، ایسے چند اہم مباحث پر روشنی ڈالتے ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ اِن سے بعض مسائل کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

رشید حسن خاں

"جب کسی زبان کو دوسری زبانوں سے الفاظ یا مرکبات لینے کا لپکا پڑ جاتا ہے اور وہ انھیں بلا چون و چرا، یعنی اپنے طور پر تصرف کے بغیر، استعمال کی عادی ہو جاتی ہے، تو اُس کی تصریفی قوت، اختراعی قابلیت اور اشتقاقی اہلیت زائل ہو جاتی ہے۔" (منشورات ص ۴)

عربی و فارسی کے جن لفظوں میں حرکات کی تبدیلی ہوئی ہے، وہ یہاں کے لہجے کے تقاضوں کی آئینہ داری کرتی ہے، جیسے: سیّد، جیّد، میّت، طیّب؛ کہ عربی میں یہ سب لفظ بکسرِ یائے مشدّد ہیں، مگر اردو میں اِن کو عام طور پر بہ فتح یائے مشدّد بولا جاتا ہے؛ یا جیسے: فرشتہ، فریب، بہشت؛ کہ فارسی میں یہ لفظ بکسرِ حرفِ اوّل ہیں، مگر اردو بول چال میں بہ فتح حرفِ اوّل ہیں۔ اردو والوں کے لہجے کے اعتبار سے یہ تلفظ بالکل صحیح ہے، بل کہ اب فصاحت کی سند بھی اِسی تلفظ کو حاصل ہے ــــــــ اسی طرح لئیق، ممرض، مشکریہ، تخراج، مُلتبب، مغلوب، فوق البھڑک جیسے بہت سے لفظ، عربی الفاظ کے انداز پر بن گئے ہیں اور عام طور پر مستعمل ہیں؛ اب اگر ایسے الفاظ کو غلط سمجھا جائے تو یہ اندازِ فکر، اردو زبان کی خصوصیات کو، اور زبانوں میں لفظوں کے بننے بگڑنے کے مسلّم اصولوں کو نظر انداز کرنے کے مرادف ہوگا۔ دنیا کی زندہ زبانوں میں ایسا نہیں ہوتا، اور ہو بھی نہیں سکتا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ متعدد صاحبِ نظر حضرات ہر زمانے میں استعمالِ عام کو سند مانتے رہے ہیں اور اردو الفاظ کے لیے صراح و قاموس سے سند لینے کو غلط طرزِ عمل سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔ مثلاً مولانا سیّد سلیمان ندوی (مرحوم) نے لکھا ہے:

> "لفظ خواہ کسی قوم و ملک کے ہوں، مگر جب وہ دوسری قوم اور ملک کی زبان میں چلے جاتے ہیں، تو اُن کی مثال اُن لوگوں کی سی ہے جو پیدا کہیں ہوئے ہوں، لیکن جب کسی دوسرے ملک کی رعایا بن جاتے ہیں، تو اُس دوسرے ملک کے قاعدے اور قانون اُن پر چلا کرتے ہیں۔ اُس وقت یہ نہیں

دیکھا جاتا کہ ان کی پیدائش کہاں کی ہے، اور یہ پہلے کس کی رعایا تھے؟
(نقوشِ سلیمانی ص ۳۳۲)

لفظ "متشکر" کے ذیل میں لکھا ہے :
"عربی میں "مشکور" اُس کو کہتے ہیں جس کا شکریہ ادا کیا جائے، مگر ہماری زبان میں اُس کو کہتے ہیں جو کسی کا شکریہ ادا کرے۔ اِس لئے "مشکور" کی جگہ، بعض عربی کی قابلیت جتانے والے اِس کو غلط سمجھ کر، صحیح لفظ "شاکر" یا "متشکر" بولنا چاہتے ہیں، مگر اُن کی یہ اصلاح شکریے کے ساتھ واپس کرنا چاہیے۔" (ایضاً ص ۹۸)

مولانا حالی نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے :
"لکھنؤ میں ایک صاحب نے ۱۸۹۰ء میں ایک رسالہ شعر و سخن کے متعلق لکھا ہے، اُس میں کچھ اوپر پچاس لفظ ایسے لکھے ہیں جن کو خود صاحب رسالہ اور اہلِ لکھنؤ واجب الترک خیال کرتے ہیں ..... اِسی رسالے میں بعضے ایسے الفاظ کو واجب الترک قرار دیا ہے جو اصل زبان کی گریمر یا قیاسِ لغوی کے خلاف برتے اور بولے جاتے ہیں، جیسے : موسم بہ فتح سین، یا میّت بہ فتح یا، یا نشا بروزنِ وفا ؛ کہ عربی گریمر یا لُغت کے موافق موسم بروزنِ مسجد، اور میّت بہ کسرۂ یا، اور نشأۃ بروزنِ وحدت ہے۔
لیکن فی الحقیقت یہ ایک غلطی ہے جو اکثر ہمارے عربی دانوں کو علمِ لسان کی ناواقفیت سے پیش آتی ہے۔ اُن کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل ہو کر، کبھی اپنی اصلی صورت پر قائم نہیں رہ سکتے، اِلّا ماشاءاللہ۔ ہماری اردو ہی میں ہزاروں لفظ سنسکرت، پراکرت اور بھاشا کے داخل ہیں ؛ باوجود اِس کے، شاذ و نادر ہی ایسے لفظ

ملیں گے جو اپنی اصلی صورت پر قائم ہوں . . . . مگر چوں کہ اُن کی اصلیت سے واقف نہیں ہیں، اس لیے اُن کو صحیح سمجھ کر، بے تکلف بولتے اور برتتے ہیں۔ لیکن عربی یا فارسی، جس سے کہ اُن کو فی الجملہ واقفیت ہے، جہاں اُس کا کوئی لفظ اصل زبان کے خلاف کسی اردو نظم یا نثر میں دیکھا اور فوراً ناک چڑھائی، حالاں کہ خود عربی کے بہت سے الفاظ اصل وضع کے خلاف استعمال کرتے ہیں. . . . . فارسی کے الفاظ بھی اکثر اردو میں غلط بولے جاتے ہیں۔ اہلِ ایران، عربی کے صدہا لفظ، غلط تلفظ کے ساتھ یا غلط معنوں میں استعمال کرتے ہیں. . . . . اسی طرح جہاں تک استقرا کیا جاتا ہے، کسی زبان کے الفاظ، دوسری زبان میں جا کر اپنی اصل وضع پر قائم نہیں رہتے ——— بات یہ ہے کہ ایسے لفظوں کو جو عربی یا فارسی یا انگریزی سے اردو میں لیے گئے ہیں اور اصل وضع کے خلاف عموماً مستعمل ہوتے ہیں، یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کہ وہ موجودہ صورت میں عربی یا فارسی یا انگریزی کے الفاظ ہیں، نہیں، بل کہ اُن کو اردو کے الفاظ سمجھنا چاہیے، جو اصل کے لحاظ سے عربی یا فارسی یا انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ ایسے لفظوں کو غلط سمجھ کر ترک کرنا اور اُن کو اصل کے موافق استعمال کرنے پر مجبور کرنا، بعینہٖ ایسی بات ہے کہ "لال ٹین" کے بولنے سے لوگوں کو منع کیا جائے اور "لینٹرن" بولنے پر مجبور کیا جائے، یا "گمرا" بولنے سے روکا جائے اور "گمٹ" بولنے کی تاکید کی جائے۔

جو صاحب ایسے الفاظ کو ترک کرنے کی عام ہدایت کرتے ہیں، اُن کی مثال اُن لوگوں کی سی ہے جو آپ تو ملتان میں مقیم ہیں اور کشمیر جانے والوں کو اجازت نہیں دیتے کہ جڑاول کا بوجھ اپنے ساتھ باندھ کر لے جائیں۔"

(مقدمہ شعر و شاعری، طبع اول، ص ۱۰۱-۱۱۲)

سید انشا نے بہت پہلے یہ بات کہی تھی:

"جاننا چاہیے کہ جو لفظ اردو میں آیا، وہ اردو ہو گیا، خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، اصل کی رُو سے غلط ہو یا صحیح؛ وہ لفظ، اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح۔ اُس کی صحت اور غلطی، اس کے اردو میں رواج پکڑنے پر منحصر ہے۔ کیوں کہ جو چیز اردو کے خلاف ہے، وہ غلط ہے، گو اصل میں صحیح ہو۔ اور جو اردو کے موافق ہے، وہی صحیح ہے، خواہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو۔" (ترجمۂ دریائے لطافت ص ۲۵۲)

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے، انشا کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

"۔ ۔ ۔ یا وہ "غدر" کو بہ فتحِ دال، اردو کا صحیح لفظ خیال کرتے ہیں، اگر چہ اصل میں بسکونِ دال ہے۔ یہ سن کر، بعض اصحاب جنھیں صحتِ لغات کا اسی قدر خیال رہتا ہے جیسے ایک مومنِ متقی کو ادائے ارکانِ صلات کا، اور خصوصاً ثقاتِ لکھنؤ، بہت جز بز ہوں گے؛ لیکن جو لوگ اصولِ لسان سے واقف ہیں، وہ سید انشا کی وسعتِ نظر اور اصابتِ رائے کی داد دیں گے۔ فرق یہ ہے کہ سید انشا، اردو کو ایک جدا زبان خیال کرتے ہیں اور غیر زبان کے جن الفاظ نے منجھ منجھا کر یا گھس پس کر یا اختلافِ لہجہ یا دوسرے اسباب سے ایک خاص صورت اختیار کر لی ہے، وہ اب اردو کے لفظ ہو گئے ہیں، انھیں اصل زبان سے کچھ تعلق نہیں رہا۔ مگر جو حضرات ابھی تک ان عربی و فارسی الفاظ کو، جو اُردو میں مستعمل ہیں اصلی صورت میں لکھنا اور بولنا صحیح اور فصیح سمجھتے ہیں، اور اُس کے خلاف غلط اور غیر فصیح؛ تو گویا وہ ابھی اردو زبان کو زبان ہی نہیں سمجھتے۔

اسی اصول کو اگر مدِ نظر رکھا جائے اور ہر اردو لفظ کو اُس کی اصلی صورت میں (یعنی جس زبان سے وہ آیا ہے) لکھنا اور بولنا شروع کریں تو اردو زبان کوئی زبان ہی نہ رہے گی، اور موجودہ تحریر و تقریر کے سارے الفاظ، بہ استثنائے چند، غلط ٹھہریں گے، کیوں کہ اس میں جس قدر الفاظ ہیں، وہ یا تو سنسکرت اور ہندی زبانوں کے ہیں یا عربی فارسی ترکی یا بعض یورپی السنہ کے۔ اردو زبان مستقل زبان اُسی وقت ہوگی جب وہ اِن زبانوں کے لفظ لے کر انھیں اپنا کر لے۔ اور جہاں وہ اپنے ہوئے، اُن کی شکل و صورت، وضع قطع، رنگ ڈھنگ میں ضرور فرق آئے گا۔ مگر ہم میں سے بعض نازک دماغ، دقیق نظر حضرات کو اُن غیر ملکیوں کی یہ بے تکلفی ہرگز نہیں بھاتی، وہ انھیں اپنا بنانا نہیں چاہتے، بل کہ انھیں ڈھکیل ڈھکیل کر اپنے حدود سے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔"

(مقدمہ ترجمۂ دریائے لطافت، ص ز۔ ط)

دس بارہ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب نے لفظ "عادی" کو غلط بتایا تھا اور اس کے استعمال کرنے والے پر نکتہ چینی کی تھی؛ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

"عربی میں جو لفظ فارسی سے یا سریانی سے، عبرانی سے، ہندی سے آئے ہیں؛ اُن کے تلفظ اور معنی، دونوں کے تعین کا حق اب اہلِ عرب کو حاصل ہو گیا ہے، یا وہ الفاظ بہ دستور انھی دوسری زبانوں کے قاعدوں کے اسیر رہے ہیں؟ . . . انگریزی میں سیکڑوں ہزاروں لفظ لاطینی سے یونانی سے، سنسکرت سے، عربی سے آئے ہیں؛ سب لفظوں کے تلفظ و معنی میں تصرف کا پورا حق انگریزوں کو حاصل ہو گیا ہے یا نہیں؟

یہ ظلم آخر اردو پر کب تک جاری رہے گا کہ جس لفظ کو وہ چاہے جتنا اپنالے، لیکن اُسے بولتے ہوئے، وہ پابند دوسری زبانوں کی رہے گی، اور اُس کی تذکیر و تانیث میں، اُس کے اعراب میں، اُس کی جمع بنانے میں، اُسے حالتِ ترکیب میں لانے میں؛ اردو والے بے بسی سے منہ دوسروں ہی کا دیکھتے رہیں گے! ذرا کسی دوسری زبان والے کے سامنے یہ اصول بیان کر کے تو دیکھیے کہ لفظ آپ کا؛ لیکن اُس کا املا، اُس کا تلفظ، اُس کی گرامر، سب دوسروں کی!" (ماہنامہ تحریک (دہلی) جولائی ۱۹۶۳ء)

جس طرح اربابِ نظر ایسے الفاظ کے متعلق صحیح طرزِ عمل کی طرف توجہ دلاتے رہے ہیں، اُسی طرح یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہر زمانے میں ایسے الفاظ مستعمل رہے ہیں اور یہ استعمال کرنے والے بھی اہلِ زبان تھے اور اُن میں سے اکثر کو اُستادی کا منصب بھی حاصل تھا۔ یہ صورت اکثر و بیش تر الفاظ کی ہے۔ اساتذہ کے کلامِ نظم و نثر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسے بیش تر لفظوں کو بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ بس بات یہ ہے کہ اِس طرح کی تفصیلات یک جا نہیں ہو سکیں، اِس لیے کبھی کبھی ذہن بھٹکتا ہے۔

جن لفظوں کو بعض صحت پسند حضرات اور بعض اربابِ لغت نے غلط قرار دیا ہے، اُن کی صورت یہ ہے کہ عربی کے بہت سے لفظ تو خود فارسی میں تغیر سے دوچار ہو چکے تھے، اور وہیں سے صورت بدل کر یہاں آئے ہیں، اور کچھ لفظوں میں یہاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اور چوں کہ الفاظ کا اِس نقطۂ نظر سے مفصل جائزہ نہیں لیا گیا ہے؛ اِس لیے ایسی تفصیلات بہت سی نگاہوں سے اوجھل ہیں اور یوں غلط فہمی کے لیے گنجایش نکل آتی ہے۔

اِس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن میں سب سے مشہور کتاب قاموس الاغلاط ہے جس کو دو فاضل حضرات: مولانا سید مختار احمد صاحب اور مولانا ذہین صاحب نے مرتب کیا ہے۔ یہ ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی۔ اِس کتاب کو بعض وجوہ سے

زیادہ شہرت ملی۔ اچھے اچھے لوگ اِس کے مندرجات کو صحیح سمجھ کر، اِس کے حوالے دیتے رہے ہیں یا حوالے کے بغیر اس کے مندرجات کی روشنی میں فیصلے کرتے رہے ہیں۔
اِس کتاب کی دو خامیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: ایک تو یہ کہ عربی کے جن الفاظ میں فارسی میں تصرف ہو چکا ہے؛ اُن کو بھی غلط الفاظ کی فہرست میں شامل کر لیا گیا؛ حالاں کہ اساتذۂ اردو کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ جو لفظ مفرّس ہو کر ہم تک پہنچا ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔ یہ دراصل نگاہِ تحقیق کا قصور ہے کہ تصرفات تک نہیں پہنچ سکی۔ اور جیسا کہ لکھا جا چکا ہے؛ ایسے بیش تر تصرفات کسی ایک جگہ مرتب صورت میں ملتے بھی نہیں۔ اِسی طرح جو لفظ فارسی و عربی الفاظ، یا اِن زبانوں کے قواعد کے قیاس پر بن گئے ہیں اور مستعمل ہیں؛ وہ اب بالکل صحیح ہیں، اور یہ علمِ لسان کے مسلّمات میں سے ہے، مگر مؤلفینِ قاموس نے (بعض اور حضرات کی طرح) ایسے بیش تر الفاظ سے زبان و قلم کو آلودہ نہ کرنے کی ہدایت کی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عربی و فارسی کے جو لفظ اب اردو میں اختلافِ حرکات کے ساتھ مستعمل ہیں؛ مؤلفین نے ایسے بیش تر الفاظ کو اصل حرکات کے موافق بولنے کی تاکید کی ہے۔ حالاں کہ یہ ایسے لفظ ہیں کہ اگر ان کو اصل زبانوں کے مطابق استعمال کیا جائے تو اجنبیت کا شدید احساس ہوگا، بل کہ یہ محسوس ہوگا کہ بولنے والا تازہ وارد ہے۔

اِس کا اظہار ضروری ہے کہ یہ عیب قاموس الاغلاط یا ایسی ہی اور تالیفات تک محدود نہیں، لغات میں بھی یہ خامی پائی جاتی ہے۔ اِس مشکل میں مزید اضافہ یوں ہوتا ہے کہ لُغت کی کتابوں میں باہم اختلاف بھی ملتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک مؤلف نے بعض الفاظ میں اختلافِ حرکت کو صحیح مان لیا، بعض میں نہیں۔ یا یہ کہ ایک لُغت نویس نے ایک لفظ میں بول چال کے تصرف کو مان لیا، اور دوسرا فرہنگ نگار اُس سے منکر ہے، یا وہ سرے سے اُس کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ یہ بہت پریشان کُن صورت ہے۔ یہ پریشان کُن صورتِ حال اِس کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے اہم لُغات میں ناتمامیوں کا اور انتشار و اختلاف

کا کیا عالم ہے۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ لُغات میں خامیاں کس انداز کی ہیں؛ مگر سب سے اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ اب ایک مکمل لُغت کو کس انداز سے مرتّب ہونا چاہیے اور اُس میں کن کن باتوں کو نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فصاحت اور معیار کے غیر منطقی تصوّرات نے کس قدر انتشار پھیلایا ہے اور اب ایسے اندراجات کے متعلق ہمارا رویّہ کیا ہونا چاہیے۔ اِس ضرورت کا سبھی کو احساس ہے کہ اُردو میں ایک اچھے لُغت کی کمی ہے، اور اُس کی تدوین ضروری ہے؛ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ ہمارے موجودہ لُغات میں کیا کمیاں ہیں اور کیا خامیاں ہیں۔ اِس علم کے بغیر، اُن خامیوں کو دور نہیں کیا جاسکتا۔ اِس مضمون کے سلسلے میں، یہ پہلو خاص طور پر پیشِ نظر رہا ہے اور اسی لیے نور اللغات اور فرہنگِ آصفیہ کے اندراجات کو قریب قریب ہر لفظ کے ذیل میں بہ طورِ خاص پیشِ نظر رکھا گیا ہے، اور اُن کے حوالے دیے گئے ہیں۔ اگر اس مضمون سے اِس معلومات کے حصول میں مدد ملے گی تو میں سمجھوں گا اصل مقصد پورا ہوگیا۔ قاموس الاغلاط کی خامیاں گنانا اصل مقصد نہیں؛ اصل مقصود یہ ہے کہ اُس کو موضوع بنا کر، اُردو میں لُغت نگاری کے احوال و انداز کا اور غلطی و صحت اور فصیح و غیر فصیح کے ٹھپا لگے ہوئے تصوّرات کا کچھ بیان کیا جائے۔

اِس مضمون میں قاموس الاغلاط کے کچھ مندرجات پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کوشش کی گئی ہے کہ جن لفظوں کو مولفینِ قاموس الاغلاط نے غلط بتایا ہے، یا جن کی مستعمل حرکات کو غلط لکھا ہے؛ ایسے الفاظ کے متعلق فارسی تصرّفات کو یا اساتذۂ اردو کے مختارات کو پیش کیا جائے، تاکہ اندازہ ہوسکے کہ ایسی تالیفات کے اکثر مندرجات، مفروضات پر مبنی ہیں اور ایسی کتابوں کے مولفین نے زبان کے اصولِ ارتقا اور اُس کے ناگزیر تقاضوں سے کم سے کم سروکار رکھا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اُن الفاظ پر بحث کرتے ہوئے اُردو کے اہم لُغات، خاص طور پر فرہنگِ آصفیہ و نور اللغات کے متعلقہ اندراجات

کا بھی جائزہ لیا جائے، جس سے یہ معلوم ہو کہ اُردو کے اہم لغات کی کیا صورت ہے۔

قاموس الاغلاط میں ایسے بہت لفظ ہیں جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے، میں نے کچھ الفاظ پر بحث کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ سب لفظوں پر بحث کرنا کسی ایک مضمون میں ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ اصل مقصد یہ ہے کہ ایک غلط اندازِ نظر کی نشان دہی کی جائے، ایسی تالیفات کی عدمِ افادیت کو نمایاں کیا جائے اور اس بات کو واضح کیا جائے کہ ہمارے لغت کس قدر ناتمامی کے امین ہیں؛ اور اس کے لیے بہ طورِ مثال کچھ الفاظ پر بحث کرنا کافی ہے۔

اِس تحریر سے اِس کا بھی بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اب ایک مفصل اور مکمل لغت کو مرتب کرنے کے لیے نظم و نثر کی کتابوں کو، اساتذہ کے مکاتیب کو اور مختلف رسائل کو کھنگالنا کس قدر ضروری ہے۔ اور یہ کہ بناوٹ اور تلفظ کے سلسلے میں غلط و صحیح کے اُس غیر علمی انداز کو بدلنا لازم ہے۔ یہی اِس مضمون کا مقصد ہے اور اِس مقصد کے حصول کے لیے قاموس الاغلاط کو مثال کے طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔ قاموس الاغلاط کے لیے عموماً لفظ "قاموس" استعمال کیا گیا ہے۔ اِسی طرح فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات کے لیے "آصفیہ" اور "نور" کے مخففات استعمال کیے گئے ہیں اور جلال کے لغت سرمایۂ زبانِ اردو کے لیے "سرمایہ" بھی لکھا گیا ہے۔ بعض مستشرقین جیسے فیلن، پلیٹس، فوربس، اسٹنگاس، شکسپیر وغیرہ کے لغات کے حوالے بھی جا بہ جا حسبِ ضرورت آ گئے ہیں۔

مندرجۂ ذیل الفاظ اس تحریر میں زیرِ بحث آئے ہیں:

لفظ	صفحہ	لفظ	صفحہ	لفظ	صفحہ	لفظ	صفحہ
آب ودلنے	۳۵	آزادگی	۹۱	ادانگی	۹۰	اشرفی	۲۷
آدمیت	۸۹	آزردگی	۸۶	ارنی	۱۰۰	اصطبل	۹۷

اعجوبہ	۲۵	جراحت	۱۱۷	خلجان	۱۲۹	زرہ	۱۳۸
اعراف	۹۹	بریان	۱۰۹	خوردرفتہ	۲۲	زمرد	۴۴
						زیبائش	۱۳۷
اگری	۲۹	جمعہ	۱۳۰	درستگی	۹۲	سرایت	۱۱۶
الائچی	۹۹	جمہور	۱۲۰	درود	۱۱۹	سرشت	۱۱۶
اندازہ	۸۵	جواہرات	۶۴	دروغ	۱۱۹	سفلی	۱۶۶
انسانیت	۸۸	جہالت	۱۰۷	دریغ	۱۱۹	سنسنی خیز	۱۵۳
انکساری	۸۴	جنید	۴۳	دمشق	۱۴۶	سوال	۱۵۴
ایزد	۲۷	چغد	۱۲۳	دن بہ دن	۱۵۴	سیّد	۱۲۱
بابر	۱۰۱	چنگیز	۱۱۸	ذومعنی	۱۴۴	شبیہ	۱۵۳
بادشاہت	۶۹	حبشی	۱۲۷	ذومعنیین	۱۴۴	شجاعت	۹۳
بہشت	۱۱۷	حسین	۱۴۵	ذہانت	۶۹	شکریہ	۱۴۱
بے وقوف	۱۰۲	حقارت	۱۰۷	راشی	۶۶	شکیل	۱۳۹
پابوسی	۸۰	حماقت	۱۰۷	ردّی	۶۷	صفر	۵۸
پیدائش	۱۳۸						
تابعداری	۶۰	خاصیت	۸۷	رعایا	۱۰۹	طرفین	۱۴۴
تاہم	۱۰۲	خراج	۹۵	رعونت	۱۲	طمانیت	۱۵۴
تبدیلی	۷۷						
ترجمہ	۱۰۳	خرچ	۹۵	رفاقت	۱۰۷	طبیب	۱۵۲
تعینات	۷۵	خزاں	۱۰۹	رقابت	۱۰۷	عادی	۴۴
تعیناتی	۷۵	خزانہ	۱۱۸	رقعہ	۷۴	عصمت	۵۰
تنازع	۱۰۵	خسرو	۱۴۶	رواج	۱۰۸	عفو	۱۱۵
تنقید	۹۲	خفگی	۱۲۹	رہا	۱۰۹	عمامہ	۱۳۷
تواں	۱۰۵	خلاصی	۷۹	رہائش	۱۳۵	عنقا	۱۱۵

عیادت	۱۱۵	قدیمی	۸۳	مرغن	۱۴۲	ناراضگی	۹۱
عیال	۱۱۴	قرآن	۱۳۲	مروّت / مسرّت	۱۲۱ / ۱۴۱	ناواقفی	۹۶
عیاں	۱۱۴	قلعہ	۷۳	مشکور	۵۴	نشتر	۱۱۰
غبن	۱۲۸	قلعی	۷۴	مصافحہ	۷۲	نفل	۱۴۴
غلطی	۱۲۶	کرختگی	۹۲	مطالعہ	۷۲	نفی	۱۲۵
غمی	۱۵۲	کلید	۱۱۱	معتوب	۵۷	نقاب	۱۱۰
فرار	۱۱۲	کلیسا	۱۱۱	"مُفاعَلَۃ"		نقص	۱۴۳
فرستادہ	۱۱۳	کنیت / گرمایش	۱۴۸ / ۱۳۸	کے ہم وزن الفاظ		نمکین	۱۴۷
فرشتہ	۱۱۲	گروہ / گرہ	۱۵۱ / ۱۴۹	(۸۵ لفظ)	۷۰	نمود	۱۴۲
فروخت	۱۱۳	گوارا	۱۵۱	مغرور	۱۴۲	نمونتاً	۸۵
فریب	۱۱۲	گواہ	۱۵۱	مقصد	۳۹	نمونہ	۱۴۲
فریفتہ	۱۱۳	گھائل	۱۴۹	ملبّب	۱۴۲	نیتر	۴۲
فضا	۱۵۲	لئیق	۱۴۸	ملزم	۳۶	ہچک	۱۴۱
فوق البھڑک	۱۳۱	مانند	۹۷	ملکیت	۹۰	یک سانیت	۱۵۴
فہمایش	۱۳۶	متلاشی	۴۷	منصب	۴۰	یگانگت	۱۵۴
فی زمانہ	۱۳۲	متوفّی	۴۶	مہوّس	۱۴۳		
قدم بوسی	۸۱	محبت / محویت	۸۹	میّت	۴۱		

"ازخود رفتہ - ف۔ بے خود۔ اس کی جگہ "خود رفتہ" کہنا غلط ہے۔" (قاموس)
مولفِ نور بھی مولفینِ قاموس کے ہم نوا ہیں! انھوں نے "از خود رفتہ" کے ذیل
میں لکھا ہے: "اس جگہ خود رفتہ بولنا غلط ہے۔" آصفیہ میں بھی یہ صراحت کی گئی ہے کہ

صحیح الفاظ "ازخود رفتہ" اور "ازخود رفتگی" ہیں۔ (جلد دوم) ۔ یہی رائے اثر لکھنوی (مرحوم) کی تھی؛ انھوں نے ایک مضمون میں لکھا تھا : "ازخود رفتہ، اس کی جگہ "خود رفتہ" بولنا غلط اور قابلِ ترک ہے" "وارفتہ" کہہ سکتے ہیں" (رسالہ الحمرا (لاہور) شمارۂ جنوری ۱۹۵۴ء)۔

شوق نیموی نے رسالہ اصلاح میں لکھا ہے: "چوں کہ یہ فارسی محاورہ ہے اور فارسی میں "از" کے ساتھ مستعمل ہے؛ اکثر فصحائے حال بے "از" کے استعمال نہیں کرتے" (ص ۱۴) اور اِس کے حاشیے میں لکھا ہے: "اور مؤلف کو اردو میں "ازخود رفتہ" اچھا نہیں معلوم ہوتا اور بر وجہ ترک کرنے محققین کے صرف "خود رفتہ" کے استعمال سے احتیاط رکھتا ہے؛ لہٰذا اِس لفظ ہی کو ترک کرکے اِس کے عوض "وارفتہ" استعمال کیا کرتا ہے"۔

یہ خیال کہ "خود رفتہ" غلط ہے، قطعاً صحیح نہیں۔ نہ یہ خیال درست ہے کہ سارے اساتذہ اِس کو متروک قرار دے چکے ہیں۔ اِس کے برعکس، بہت سے اساتذہ کے یہاں "خود رفتہ" اور "خود رفتگی" موجود ہیں۔ درج ذیل مثالوں سے اس کے صحیح اور مستعمل ہونے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

ہوں وہ خود رفتہ کہ جوں عمرِ تلف کردہ مجھے
حشر تک ڈھونڈھیں تو ممکن نہیں ہاتھ آئے نشاں

ذوق (قصائدِ ذوق، مرتبہ سر شاہ سلیمان، ص ۸۰)

یادِ کاکل میں بھی خود رفتگی اپنی نہ گئی — جوشِ وحشت سے میں پابندِ سلاسل نہ ہوا

موتمن (دیوانِ مومن، مرتبہ مولانا ضیا احمد بدایونی (مرحوم) طبع دوم، ص ۲۹)

یہ ضعف ہے تو دم سے بھی کب تک چلا گیا — خود رفتگی کے صدمے سے مجھ کو غش آگیا

(ایضاً ص ۴۸)

گھر میں خود رفتگی سے دھوم مچی — کیوں کے ہو اس گلک مرا جانا

(ایضاً ص ۴۸)

خیالِ زلف میں خودرفتگی نے قہر کیا — امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

(ایضاً ص ۲۹)

فغاں ہے وجہِ پروازِ حواس اے رشکؔ دنیا میں — بنا ہوں قمریِ خودرفتہ اک شمشاد قامت کا

رشکؔ لکھنوی (مجموعۂ دواوین ص ۵۰۸)

جو کام عشق میں ترے خودرفتہ کر گئے — وہ مست سے ہوا، نہ وہ ہشیار سے ہوا

(ایضاً ص ۸۰۹)

خودرفتگی ہے چشمِ حقیقت جو وا ہوئی — دروازہ کھل گیا تو میں گھر سے نکل گیا

صباؔ لکھنوی (غنچۂ آرزو ص ۱۵)

کوچہ گردی سے کیا بدچلنوں نے آگاہ — رفتہ رفتہ ہوا خودرفتہ مرا غیرتِ ماہ

امانتؔ لکھنوی (واسوخت بند ۳۵)

خیالِ یار کا، خودرفتگی نتیجہ ہے — جو یاد آگئی اس کی، تو خود کو بھول چلے

رندؔ لکھنوی (کلیاتِ رند جلد دوم ص ۱۴۲)

ہو گئے خودرفتہ ایسے حد سے زیاد — دو ہی دن میں بھلا دی میری یاد

نواب مرزا شوقؔ لکھنوی (مثنوی زہرِ عشق، مرتبہ مجنوں گورکھپوری ص ۱۴۲)

اے وہ خودرفتگی، الجھے ہوئے سب سر کے بال
وہ کسی میں اب کہاں، جو تیرے دیوانے میں تھا

شادؔ عظیم آبادی (مے خانۂ الہام ص ۸۰)

غمِ خودرفتگی نے جب ستایا — اسی کوچے میں شبلی ہوش آیا

امیر اللہ تسلیمؔ (رسالۂ اصلاح)

مدت ہوئی ہے یار کا دیکھے ہوئے جمال — لیکن گئی نہیں مری خودرفتگی ہنوز

بیخودؔ دہلوی (گفتارِ بیخود ص ۹۰)

مولانا نظم طباطبائی نے ایک استفسار کے جواب میں لکھا تھا: "صحیح لفظ "ز خود رفتگی" ہے، لیکن اساتذہ اگر "خود رفتگی" کو نظم کر چکے ہیں تو اُن کی سند کافی ہو جائے گی۔" (مکتوب بہ نام صفدر مرزا پوری، مرقعِ ادب، جلدِ دوم، ص ۳۰۲)۔ مندرجۂ بالا اسناد ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

یہی صورت لفظ "سرگذشت" کی ہے جو اصلاً "از سرگذشت" ہے لیکن "سرگذشت" مستعملِ عام و خاص ہے، اور اس پر کوئی شخص اعتراض نہیں کرتا۔ پنڈت دتاتریہ کیفی نے اپنے انداز میں لکھا ہے: "کہا جاتا ہے کہ اردو میں "خود رفتہ" نہیں، بل کہ "از خود رفتہ" استعمال کرنا لازم ہے۔ جواب دیا گیا کہ "سرگذشت" کی سرگذشت تو ذرا بیان فرمائیے۔"

(منشورات ص ۲۶)

اتمامِ سخن کے طور پر، دو مثالیں اِس زمانے کے دو شاعروں کے یہاں سے بھی پیش کی جاتی ہیں، اِن سے معلوم ہوگا کہ آج کل بھی یہ لفظ بہ دستور مستعمل ہے:

خود رفتہ و خود بین و خود افروز و خود آرا   ژولیدہ گماں، زود غضب، دیر پشیماں

جوش ملیح آبادی (نظم "جوانی و پیری" جوش نمبر ماہ نامہ افکار کراچی ص ۱۵۱

مگر برق و آتش کے سائے میں اے دل   یہ صدیوں کے خود رفتہ نا شاد طائر

جذبی (سخنِ مختصر ص ۲)

اعجوبہ کے ذیل میں لکھا گیا ہے: "عوام "عجوبہ" کہتے ہیں، جو غلطِ محض ہے۔" مولفین کا یہ خیال صحیح نہیں کہ "عجوبہ" عوام کا گڑھا ہوا ہے۔ یہ لفظ (بہ حذفِ الف) مفرس ہو کر ہم تک پہنچا ہے:

"عجوبہ: چیزیکہ مردم را بہ شگفت اندازد۔ و ایں مخففِ "اعجوبہ" است۔ محسن تاثیر:

اے شیخ شہر با کہ تواں ایں عجوبہ گفت: بے پردہ گشت شیدہ نہاں از ردای تو (بہارِ عجم)

...... یہ غلطی اصل میں مولفِ غیاث اللغات کی پھیلائی ہوئی ہے، اُنھوں نے لکھا ہے:

"اعجوبہ: بہ ضمِ ہمزہ، بہ معنی عجیب وآنچہ مردم را در تعجب اندازد، نہ بغیر ہمزہ. از زبل الالفاظ".
عربی کا اصل لفظ "اُعجُوبَۃ" تھا، فارسی میں یہ تصرف ہوا کہ بہ حذفِ الف "عجوبہ" بھی
استعمال کیا گیا۔ اردو میں بھی، فارسی کی طرح، اس لفظ کی دونوں صورتیں مستعمل ہیں۔ مولفِ
نور نے اِس سلسلے میں یہ غلطی کی ہے کہ "عجوبہ" کو عربی لکھا ہے، حالاں کہ یہ مفرس صورت
ہے۔ عبدالواسع ہانسوی نے رسالۂ عبدالواسع میں "اعجوبہ" کو "عجوبہ" کا مزید فیہ لکھا ہے۔ اُن کی
رائے میں عربی کے اصل لفظ "عجوبہ" میں فارسی والوں نے الف کا اضافہ کیا ہے۔ حالاں کہ
صورتِ حال برعکس ہے کہ عربی کا اصل لفظ "اعجوبہ" ہے اور اس کو بہ حذفِ الف استعمال
کیا گیا ہے۔

سلیمان حییم نے اپنے فارسی انگریزی لغت میں "عجوبہ" (بہ حذفِ الف) کو بہ فتحِ
اوّل اور بہ ضمِ اوّل، دونوں طرح لکھا ہے، یہی صورت اردو میں ہے کہ یہ لفظ سننے میں
دونوں طرح آتا ہے۔ "عجوبہ" کی طرح "اعجوبہ" بھی اردو میں بہ ضمِ اوّل اور بہ فتحِ اوّل،
دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ آصفیہ میں الف پر زبر لگا ہوا ہے: اَعجوبہ۔ اور نور میں
اس کو بہ ضمِ اوّل (اُعجوبہ) لکھا گیا ہے) اور اس لحاظ سے اب اِس لفظ کے بھی دونوں
تلفظ قابلِ تسلیم ہیں۔ یہ بیشتر فارسی ترکیب کے ساتھ آتا ہے، جیسے: اعجوبۂ روزگار،
اعجوبۂ عالم:

ہوں جو بے چین اُس اعجوبۂ عالم کے لیے
حال سُن سُن کے مرا، لوگ عجب کرتے ہیں

(میر دکلیات مرتبۂ آسی، ص ۴۲۲)

"آشنائی اور آشنا پرستی میں اعجوبۂ روزگار تھے۔"

(محمد حسین آزاد دربارِ اکبری، طبع لکھنؤ، ص ۱۵۷)

مفرد بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن نسبتاً کم۔ مثلاً:

کیسا اعجوبہ نیا پہنچا ہے یاں چونچ ہو، تو ہو شترمرغِ کلاں

میر (کلیات، مرتبہ آسی، ص ۸۲۱)

"میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اِس اعجوبے کا ردِ عمل کہاں کہاں کس طرح ہوتا ہے۔"

رشید احمد صدیقی (نقدِ غالب، ص ۳۱۴)

اصل معنی کے لحاظ سے "عجوبہ" بہ فتحِ اوّل اور بہ ضمِ اوّل دونوں طرح سے میں آتا ہے، البتہ بہ فتحِ اوّل (عَجوبہ) کا چلن زیادہ ہے۔ لیکن ایک خاص پودے کے لیے، جس کے پتّے دوا کے طور پر استعمال میں آتے ہیں، یہ صرف بہ فتحِ اوّل بولا جاتا ہے (عَجوبے کا پتّا)۔ اس معنی میں یہ اُردو نژاد ہے۔ فارسی یا عربی میں یہ معنی نہیں۔

معرّب الفاظ کے لیے اگرچہ اصولاً کسی سند کی ضرورت نہیں، مگر محض بطورِ احتیاط، ایک سند پیش کی جاتی ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی سمجھی گئی ہے کہ نور یا آصفیہ میں اس کی سند موجود نہیں۔ انشا کا شعر ہے (کلامِ انشا، ص ۲۲۳):

گر سنے کوئی عجوبہ ہے یہ حق حق سانپ کی اینچ نیچے کے، ترے ختّے پہ بولے ہیں یہی

فورلیس، رچرڈسن اور شکسپیئر نے "عجوبہ" کو عربی لکھا ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہ معرّب صورت ہے۔ عربی کا اصل لفظ "اعجوبہ" ہے۔ فورلیس نے اس کو بہ ضمِ اوّل لکھ کر مزید لکھا ہے کہ بہ فتحِ اوّل عامیانہ تلفظ ہے، مگر اب اس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

"اَشرفی: بہ فتحِ شین کہنا غلط ہے" (قاموس)

نور میں یہ تو نہیں لکھا ہے کہ بہ فتحِ شین غلط ہے، مگر اس میں صرف "بہ فتحِ اول و سکونِ دوم و فتحِ سوم" لکھا ہوا ہے؛ مطلب اس سے بھی یہی نکلتا ہے۔ آصفیہ میں بھی اصل کے مطابق "اَشرَفی" لکھا ہوا ہے۔ اور امیر اللغات میں حرکات کی صراحت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی میں "ش" ساکن ہے اور "ر" مفتوح ہے، مگر اردو میں یہ لفظ بہ فتحِ شین بھی استعمال

کیا گیا ہے، یعنی، اَشَرفی۔ یہ اردو کا تصرف ہے۔ بول چال میں تو اب یہ لفظ عام طور پر فتحِ شین ہی آتا ہے؛ نظم میں دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے،

دوں پیرِ مے فروش کو قیمت شراب کی ہاتھ آئے اَشرفی جو گلِ آفتاب کی

آسیر

مانی ہوں قسمیں بھی سو سو کروڑ ڈھب کی دھو دھو روپے اَشرفی نذرِ اثنا عشری کی

کلامِ انشا ؛ ص ۱۳۸

اس لفظ کے دونوں تلفظ صحیح مانے جائیں گے، البتہ اردو کی مثلوں میں جہاں بھی یہ لفظ آئے گا بہ طورِ واحد آئے یا بہ طورِ جمع، بہ فتحِ شین بولا جائے گا، جیسے، گھر میں کوڑی نہیں نام اَشَرفی لال۔ یا ایک اور مثل ہے، اَشَرفیاں لٹیں، کوئلوں پر مُہر۔

"اشرفی بوٹی" (وہ بوٹیاں جو زربفت اور کم خواب پر ہوتی ہیں) میں بھی شش مفتوح رہے گا، ورنہ لفظ ہی بگڑ جائے گا۔ "گلِ اشرفی" دونوں طرح مستعمل ہے، اور "اشرفی کا پھول" عموماً بہ فتحِ شین بولا جاتا ہے۔ اردو شعرا نے "گلِ اشرفی" اور "اشرفی کا پھول" دونوں مرکبات میں، فارسی تلفظ کی رعایت سے اِس کو بہ سکونِ شین نظم کیا ہے، مثلاً؛

ہوا سے اشرفی کے پھول سبزے پر گرے جس دم عروسِ باغ نے اوڑھا زری پٹا کا مسدانی کا

امانت لکھنوی (دیوانِ امانت ص ۲۹)

مَتّے کی زرد زرد پھلیاں ہیں یا گلِ اَشرفی کی کلیاں ہیں

انشا (کلامِ انشا ص ۳۴۶)

لیکن بول چال میں اس تلفظ نے بار نہیں پایا۔ بول چال میں بہ فتحِ شین ہی آتا ہے۔ فیلن نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے، اُس نے "اشرفی" کو بہ سکونِ شین اور بہ فتحِ شین دونوں طرح لکھا ہے۔ اور ایک مثل "گھر میں کوڑی نہیں، نام اشرفی لال" لکھ کر، اِس کے شش کو مفتوح لکھا

ہے ؛ اِس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ امثال میں شکش مفتوح رہے گا۔

اشرفی کی جمع اشرفیاں، بول چال میں عام طور پر بہ فتحِ شین مستعمل ہے۔ نظم میں اِس کو دونوں طرح لایا گیا ہے، مثلاً

کب مجھے رکھے گی مفلس ہمتِ شاہِ مجنوں
دولت اِن داغوں کی، اَشرفیاں، روپے ہو جائے گی

رشک (دیباچہ نفس اللّغۃ، ص ۱۳)

چوری کا ڈر نہیں ہے، دیے شوق سے لگا ڈھیروں روپے اَشرفیاں رکھی ہیں جا بہ جا

جانصاحب (مسدس تہنیتِ جشنِ بے نظیر ص ۱۰)

لیکن بہ سکونِ شین کو بول چال سے متعلق علاقہ نہیں، یہ نظم تک محدود ہے۔

اسٹنگاس نے "آشرفی" (بہ الفِ ممدودہ و رائے ساکن) بھی لکھا ہے یہ ٹھیک نہیں۔ الفِ ممدودہ نہ فارسی میں ہے نہ اردو میں۔

"اگری": ۱۔ بعض شعرا نے اگرئی" کہا ہے۔ رند :

اگری کا ہے گماں، شک ہے ملاگیری کا رنگ لایا ہے دوپٹا ترا میلا ہو کر

~~در اصل "اگر" سے "اگری" صحیح ہے۔ اگر "اگرہ" سے منسوب ہوتا تو "اگرئی"~~ ہوتا۔" (قاموس)

مولفینِ قاموس کے علاوہ اور لوگوں نے بھی رند کے اِس شعر کو "اگرئی" کی سند میں پیش کیا ہے، مثلاً مولفِ آصفیہ نے لکھا ہے :

"بعض حال کے صاحبانِ لکھنؤ اس لفظ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "اگرئی" اجنبی کے وزن پر غلط ہے..... مگر ہمیں اس اعتراض سے اتفاق نہیں ہے؛ کیوں کہ اوّل تو شعرا نے اِس کو برابر اجنبی کے وزن پر باندھا ہے، چناں چہ

رندؔ لکھنوی ہی کا شعر موجود ہے ؎ اگری کا ہے گماں، شک ہے۔۔۔۔"

وجاہت جھنجھانوی نے بھی اِسی شعر کو "اگرئی" کی سند میں لکھا ہے (اختلاف اللسان ص ۴۴)۔ جناب اثر لکھنوی نے لکھا ہے:

"یہ فرمانا کہ دہلی کا لفظ "اگرئی" لکھنؤ میں "اگری" بولا جاتا ہے؛ پاسا پھیری ہے۔ رندؔ لکھنوی کا مشہور شعر ہے:

اگرئی کا ہے گماں، شک ہے ملاگیری کا　　رنگ لایا ہے دوپٹا ترا میلا ہو کر"

(چھان بین ص ۲۰۵)

"اگرئی" کی سند میں عام طور پر رندؔ کے اسی ایک شعر کو پیش کیا گیا ہے، مگر حتمی طور پر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اس شعر میں "اگرئی" نظم ہوا ہے، بل کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس شعر میں دراصل "اگری" ہے، جس کو "اگرئی" فرض کر لیا گیا ہے، اور اِس بنا پر اِس شعر سے فائدۂ استناد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

رندؔ کی یہ غزل بحرِ رمل میں ہے۔ اس میں پہلا رکن سالم (فاعلاتن) بھی آ سکتا ہے، اور مخبون (فَعِلاتن) بھی۔ یعنی مصرعِ اوّل کا پہلا رکن "فَعِلاتن" بھی ہو سکتا ہے، اور اس صورت میں "اگری" پڑھا جائے گا۔ اور ایسا کوئی ثبوت یا قرینہ موجود نہیں جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس مصرعے کا پہلا رکن "اگرئی" بر وزنِ "فاعلاتن" ہے۔ ہاں اِس کا قرینہ موجود ہے کہ اس رکن کو "اگری" بر وزنِ "فعلاتن" پڑھنا چاہیے، اور وہ قرینہ یہ ہے کہ رندؔ کے کلام میں "اگرئی" کہیں نہیں آیا ہے، البتہ "اگری" آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس شعر کے علاوہ کسی اور مستند شاعر کے یہاں سے "اگرئی" کی کوئی اور مثال نہیں پیش کی جا سکی ہے، بل کہ رندؔ کے اسی ایک شعر پر سند کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ تیسرے یہ کہ جلالؔ نے سرمایۂ زبانِ اردو میں، امیرؔ مینائی نے امیر اللغات میں، اور مولّفِ نور اللغات نے رندؔ کے اِسی شعر کو "اگری" کی سند میں پیش کیا ہے۔

اور اس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ ان حضرات کی نظر اس عروضی نکتے پر تھی۔ یہ قرائن اِس تعیین کے لیے کافی ہیں کہ رند کے اس شعر میں "اگری" ہی نظم ہوا ہے۔ اور یہ کہ جن لوگوں نے اِس شعر میں "اگری" کو "اگرئی" پڑھا ہے، اُنھوں نے غلطی کی ہے۔ اِس مصرعے کی تقطیع اِس طرح ہوگی:

ری کا	ہ ملاگی	ہ گما شک	اگری کا
فعْلُن	فَعِلاتُن	فَعِلاتُن	فَعِلاتُن

رند کے دیوان میں ایک جگہ یہ لفظ اس طرح آیا ہے کہ اُس کو قطعیت کے ساتھ "اگری" کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے:

آپ ہیں اس کو اگر بے خبری رہنے دے　　رو بہ رو دل تری تصویر دھری رہنے دے
دست بیچے میں لباسِ اگری رہنے دے　　زعفرانی کوئی جوڑا پہن آیا ہے بسنت

اب جب تک کوئی مثال اِس کے خلاف نہ پیش کی جاسکے، اُس وقت تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ رند نے اُس شعر میں "اگرئی" نظم کیا ہے، بل کہ لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ اُس شعر میں "اگری" نظم ہوا ہے۔ اِس میں اِس کا اور اضافہ کرلیا جائے کہ کئی مستند لغت نویسوں نے "اگرئی" کو غلط بتایا ہے۔ جلال نے سرمایۂ زبانِ اردو میں لکھا ہے:

"جو لوگ "اگری" بر وزنِ سفری کو "اگرئی" بر وزنِ اجنبی بولتے ہیں غلط بولتے ہیں۔ کس واسطے کہ لفظ "اگر" ہے "اگرہ" نہیں۔ پھر ہمزہ قبل تحتانی کے کس حرف کے عوض میں آگیا جو "اگرئی" سرمئی اور نقرئی کے قیاس پر بولا جاتا ہے۔" (سرمایۂ زبانِ اردو)

امیر مینائی نے "اگر" کے ذیل میں لکھا ہے:

"بعض لوگ اِس کو غلطی سے "اگرئی" مچھیئی کے وزن پر بولتے ہیں۔"

(امیراللغات)

صاحبِ نور اللغات نے لکھا ہے:

" یہ لفظ " اگرئی " بروزنِ اجنبی نہیں ہے ، بروزنِ اجنبی بولنا غلط ہے کس واسطے کہ لفظ " اگر " بہ فتح اول و دوم تھا، اُس میں یائے نسبت اضافہ کی تو " اگری " ہوا۔ سرمئی اور نقرئی پر اس کا قیاس صحیح نہیں ہے ۔ "

فیلن اور پلیٹس کے لغات میں " اگرئی " موجود ہے ، اور خیال یہ ہے کہ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے فیلن کی تقلید میں " اگرئی " کو درج لغت کیا ہے اور اِس کو صحیح بتایا ہے اور سند میں رند کے زیرِ بحث شعر کو لکھا ہے ۔

حاصلِ بحث یہ نکلا کہ رند کے زیرِ بحث شعر کو " اگرئی " کی سند میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس شعر کے علاوہ اس لفظ کی کوئی اور سند پیش نہیں کی جا سکی ۔ نیز سارے قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ رند کے شعر میں " اگری " پڑھا جائے ۔

اِس بحث سے قطعِ نظر کرکے، یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اب اِس نئے لفظ " اگرئی " کو بھی صحیح مان لینا چاہیے ۔ ایک لفظ کا اضافہ سہی ۔ خلافِ قیاس یا خلافِ قاعدہ بنے ہوئے بہت سے لفظ اردو میں مستعمل ہیں ، اِس لفظ کا شمار بھی اُسی فہرست میں کیا جائے گا ۔

اثر لکھنوی مرحوم نے اسے نظم بھی کیا ہے :

کسے دے ترجیح کس پہ کوئی ، کھبی ہے آنکھوں میں جامہ زیبی
کسی کا ملبوس ہے شہابی ، کسی کی پوشاک اگرئی ہے

(عروسِ فطرت ۔ (مجموعۂ منظوماتِ اثر) ص ۹۳)

جوش ملیح آبادی نے بھی اِس کو نظم کیا ہے :

گردوں اِدھر طلائی تو اُس سمت نقرئی
اک گوشہ کاسنی ہے تو اک گوشہ پستئی
یہ پارہ سرمئی ہے تو وہ پارہ سُرمئی
مغرب جو اگرئی ہے تو مشرق ہے چمپئی

(طلوعِ فکر)

بول چال میں بھی یہ لفظ آتا ہے، یوں بھی اس کو صحیح ماننا چاہیے۔ وجاہت جھنجھانوی (تلمیذ داغ) نے "اگری" کی سند میں امانت کا ایک شعر لکھ کر، لکھا ہے:

"قطع نظر اس کے، امانت لکھنوی کے شعر میں یہ لفظ جن اعراب سے شروع ہوا ہے، وہ زبان سے جلد اور بہ آسانی ادا نہیں ہو سکتے۔ اس کے مقابلے میں "اگرئی" بہر حال صحیح و خفیف ہے۔" (اختلاف اللسان ص ۴۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ بول چال کے لحاظ سے "اگری" کے مقابلے میں "اگرئی" زیادہ آسانی اور روانی کے ساتھ استعمال میں آئے گا۔ اور یہ بات کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔

ہاں، مولّفِ آصفیہ نے "اگرئی" کے ایک اور معنی بھی لکھے ہیں، انھوں نے لکھا ہے، "شاہانِ دہلی کی ایک پلٹن کا نام، جس کی اگرئی وردی تھی۔" اس کی تصدیق تو میں نہیں کر سکا، لیکن یہ لفظ اگر اس معنی میں مستعمل تھا، تو پھر اس کو "اگری" کی طرح قدیم ماننا ہوگا۔ بہ ہر صورت، اِس لفظ کے یہ معنی تصدیق طلب ضرور ہیں۔

یہاں پر ضمنی طور پر یہ بھی لکھنا چاہتا ہوں کہ اثر صاحب نے جلال کی عبارت نقل کر کے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ "کتھا سے کتھئی، چمپا سے چمپئی بن سکتے ہیں تو اگر سے اگرئی کیوں نہ بنے۔" (فرہنگِ اثر، ص ۱۰)۔ اثر صاحب نے اگر اس لفظ "اگرئی" کو صحیح مان لیا تو کچھ غلط نہیں کیا، مگر اس کے لیے جو دلیل دی ہے وہ قاعدے کی رو سے ٹھیک نہیں۔ کیوں کہ "اگر" اور "کتھا" اور "چمپا" کی صورت بالکل مختلف ہے، اور یہ بات بالکل ظاہر ہے۔ جس طرح "پستہ" سے "پستئی" بنے گا، اسی طرح "چمپا" سے "چمپئی" بنے گا۔ جو فائدہ "پستہ" کے آخر کی ہائے مختفی دے رہی ہے، وہی فائدہ "چمپا" کے آخر کا الف دے گا۔ اور "اگر" کے آخر میں نہ ہ ہے اور نہ الف ——— جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے۔ اِس لفظ "اگرئی" کو خلافِ قاعدہ بنے ہوئے الفاظ میں جگہ دی جائے گی اور دوسرے لفظوں کی طرح اِس کو بھی بالکل صحیح مانا جائے گا، اور ضرورت

کے مطابق بے تکلف استعمال کیا جائے گا۔

میر حسن نے مثنوی سحر البیان میں ایک جگہ "اگری" کو بہ سکونِ گاف نظم کیا ہے،

وہ پشواز اگری، وہ نرگس کا ہار وہ کم خواب کے بند، رومی ازار

(سحر البیان، شائع کردہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ ص ۹۱)

امیر مینائی نے اس شعر کو امیر اللغات میں لکھ کر، اس کے متعلق لکھا ہے: "اب یہ زبان نہیں ہے" لیکن گفتگو میں یہ لفظ بہ سکونِ گاف بھی آئے گا، اور بہ فتحِ گاف بھی؛ مناسب یہ ہوگا کہ بہ سکونِ گاف کو بھی صحیح مان لیا جائے۔ یہ فیصلہ محلِ استعمال کے لحاظ سے کیا جائے گا کہ کہاں پر اس لفظ کی کون سی صورت اچھی معلوم ہوتی ہے۔

لفظ "اگر" کے ہندی یا فارسی ہونے کے متعلق لغت نویسوں میں اختلاف ہے۔ فرہنگِ جہانگیری و برہانِ قاطع میں اس کو فارسی لکھا گیا ہے۔ لیکن "اگری" کے متعلق اِن لغات میں کوئی صراحت نہیں ملتی۔ البتہ رشک نے نفس اللغۃ میں "اگری" کو فارسی لکھا ہے۔ اگر لفظ "اگر" فارسی ہے تو پھر "اگری" بہ لحاظِ قاعدہ بھی درست ہوگا۔ غالباً اسی لیے اردو میں اساتذہ نے اِس لفظ (اگری) کو بہ اضافتِ فارسی بھی نظم کیا ہے،

کیوں کر نہ مرے داغوں سے بو آئے اگر کی میں سوختہ ہوں اس کے لباسِ اگری کا

مصحفی (انتخابِ مصحفی مرتبہ حسرت موہانی ص ۲۱)

زعفرانی کوئی جوڑا پہن آیا ہے بسنت دست بیچے میں لباسِ اگری رہنے دے

رند (کلیاتِ رند ص ۹۲)

ہاں، امیر مینائی نے امیر اللغات میں "اگردان" کے ذیل میں لکھا ہے: "فصحا "اگرسوز" زیادہ بولتے ہیں" یہی جملہ نور اللغات میں بھی نقل کیا گیا ہے ــــ یہ احتیاط کہ "اگردان" کی جگہ "اگرسوز" بولنا انسب ہے، اگر اس خیال سے کی گئی کہ لفظ "اگر" فارسی نہیں؛ تو درست نہیں۔ اردو کے لحاظ سے "اگردان" زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

کیوں کہ اس وزن کے کئی مرکبات اُردو میں مستعمل ہیں۔ لیکن یہ احتیاط اگر معنوی مناسبت کی بنا پر کی گئی، یعنی "اگردان" کے مقابلے میں "اگرسوز" میں استعمال کے لحاظ سے زیادہ مناسبت پائی جاتی ہے؛ تب ٹھیک ہے، مگر جیسا کہ لکھا گیا ہے، اردو میں اس طرح کے مرکبات میں عموماً "دان" کا لاحقہ پایا جاتا ہے اور اس اعتبار سے "اگردان" انسب قرار پائے گا۔ صحت اور فصاحت کے لحاظ سے دونوں لفظ معیاری ہیں۔

آب و دانے کی فکر: "آب ودانہ کی ترکیب فارسی ہے..... عطفی ترکیب میں حروفِ عوامل کی وجہ جہاں ہائے مختفی، یائے تحتانی سے بدل جاتی ہے، وہاں واوِ عطف کو حذف کرنا مناسب ہے، ورنہ تہنید کی صورت میں فارسی ترکیب غلط ہو جاتی ہے۔" (قاموس)

میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے، شاد عظیم آبادی کی ایک کتاب سے ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جس میں اس خاص مرکب کا بھی ذکر آگیا ہے:

"کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی ہندی یا اور کسی زبان کا لفظ، کسی فارسی یا عربی کے لفظ سے بہ طورِ قواعدِ فارسی ہم بغل ہو تو غلط ہے۔ جب کہ فصحا برابر استعمال کرتے آئے ہیں اور کرتے رہے ہیں، تو سبب اُس خاص فارسی ترکیب کے غلط ہونے کا کیا ہے؟ تو بجز اس کے کوئی جواب نہیں ہے کہ ہماری تجویز۔ ملاحظہ ہو، چوکی دار، ریجی دار، سمجھ دار، سونٹے بردار، جھنڈی بردار، وغیرہ صفاتی اسما کیوں زبان سے مطرود کیے جاتے ہیں؟.... اسی طرح گاڑی بان، پان دان، سنگاردان وغیرہ وغیرہ غیر محدود مستعمل الفاظ ہیں جن کو غلط بتایا جاتا ہے ــــــ معلوم نہیں "کوچ بان" کو بھی نکال دیا گیا ہے یا انگریزی لفظ (کوچ) کے سبب سے ابھی تک بار پا جاتا ہے۔

ایک صاحب بڑے شد و مد سے تحریر فرماتے ہیں کہ لفظ "اٹھائی گیرا"

بھی غلط ہے، کیوں کہ "اٹھائی" ہندی ہے اور "گیرا" فارسی ہے ۔ کہیں بھی اس تنگ خیالی کا جواب ہے!

ایک دوسرے صاحب ڈانٹ بتاتے ہیں کہ "آب و دانہ" کا لفظ نہ باندھو، کیوں کہ بیچ میں واوِ عاطفہ فارسی ہے ۔ اور لفظ "دانہ" ہے نہ کہ "دانے" ۔ اگر ایسے زبان زد، مقبولِ فصحا الفاظ کی فہرست دی جائے، تو میرا قیاس یوں ہے کہ غالباً ہزاروں اچھے خاصے لفظوں کی گردن پر چھری چل جائے گی، جن کے قائم مقام الفاظ ڈھونڈے نہیں ملتے، مثلاً : چھری فروش، دودھ دان، چینی دان، مکھن دان، عرقِ کیوڑا، شربتِ کیوڑا، پاجی پرست ..... ۔

(نکبر بلیغ ص ۶۳)

مولفینِ قاموس نے "آب و دانے" کے غلط استعمال کی مثال میں میر انیس کی یہ رباعی لکھی ہے:

اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے ۔۔۔ ناداں! تجھے فکر آب و دانے کی ہے
ہستی کے لیے ضرور اک دن ہے فنا ۔۔۔ آنا تیرا، دلیل جانے کی ہے

حالاں کہ اس رباعی کو، اس مرکب کے مستعملِ فصحا ہونے کی سند کے طور پر پیش کرنا چاہیے تھا ۔ "آب و دانے کی فکر"، "آب و دانے کو" وغیرہ کی مثالیں مستندین کے یہاں بہ کثرت پائی جاتی ہیں ۔ میں صرف نور و آصفیہ سے چند اشعار نقل کیے دیتا ہوں:

کہاں ہم، کہاں تم، ہوا یہ جو ساتھ ۔۔۔ یہ تھی بات سب آب و دانے کے ہاتھ

میر حسن

ذرا تو اپنے اسیروں کی لے خبر صیاد ۔۔۔ قفس میں کیسے ترستے ہیں آب و دانے کو

جرأت

دکھایا کنجِ قفس مجھ کو آب و دانے نے ۔۔۔ وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد

اگر مولفینِ قاموس کی تجویز کے مطابق ایسے مرکبات میں واوِ عطف حذف کر دیا جائے، یعنی "آب ودانے" کو "آب دانے" لکھا جائے تو یہ صورت صریحًا استعمالِ فصحا کے خلاف ہوگی، یہی نہیں، اِس مرکب کی صورت بھی ایسی بگڑ جائے گی کہ پہچاننا مشکل ہوگا۔ "آب ودانے" بالکل صحیح اور فصیح مرکب ہے اور فصحا اس کو شروع سے آج تک مسلسل و متواتر استعمال کرتے رہے ہیں۔ قواعد کے پھیر میں آکر، ایک اچھے بھلے مرکب کی صورت بگاڑنا، کچھ معقول بات نہیں۔ اور پھر کچھ ایک ہی مرکب تو نہیں، ایسے بہت سے مرکبات ہیں، جیسے مقدمے بازی میں، لب ولہجے میں وغیرہ وغیرہ۔ مولانا احسن مارہروی نے اِس بات کو وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ سن ۱۹۰۵ء کے رسالہ فصیح الملک میں مولانا نے املا سے متعلق کچھ لکھا تھا؛ ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں نے ایک مضمون میں مولانا کی اُن اصلاحات اور تجاویز کو بیان کیا ہے۔ اِس طرح کے مرکبات سے متعلق مولانا احسن کی تجویز یہ تھی:

> "جس لفظ کے آخر میں ہ آئے تو فاعلیت، مفعولیت اور اضافت کی حالت میں اُسے یے سے لکھا جائے جیسے، کسی زمانے میں۔ اِسی طرح حالتِ ترکیبی یعنی اضافت و عطف میں بھی عربی فارسی الفاظ اُسی طرح لکھے جائیں جس طرح بولے جاتے ہیں، مثلاً: لب ولہجے میں، مقدمے بازی میں وغیرہ۔" (علمی نقوش، ص ۱۴۳)

ایزد: لفظ ایزد کو قاموس میں بہ کسرِ سوم "ایزِد" لکھا گیا ہے اور اُس کے ذیل میں مزید لکھا گیا ہے کہ: "تعجب ہے کہ انجمن آرائے ناصری میں "میر یزد" کے وزن پر لکھ دیا ہے"۔ (قاموس)۔

اگر مولفِ فرہنگِ انجمن آرائے ناصری نے "ایزد" کو بہ فتحِ سوم بھی لکھا ہے تو غلط نہیں لکھا۔ فارسی میں یہ بہ فتحِ سوم بھی آیا ہے۔ فرہنگِ انجمن آرائے ناصری کا مولف

خود بھی اہلِ زبان ہے، ہمارے لیے تو اُس کا لکھنا بھی کافی ہوتا۔ شوق نیموی نے ازاحۃ الاغلاط میں لکھا ہے:

"از اہلِ زبان بہ تحقیق پیوست کہ ایں لفظ در پارس بہ فتحِ ثالث و کسرِ آں بر ہر دو طور است۔ نظامی فرماید:

نہ ہر کہ ایزد پرست، ایزد پرستد
چو خود را قبلہ سازد، خود پرستد"

(میں اس وقت یہ نہیں کہہ سکتا کہ نظامی کا شعر کہاں سے ماخوذ ہے) مرزا غالب ایسے معاملات میں سختی کے ساتھ اہلِ زبان کی تقلید کے قائل تھے، انھوں نے بھی بہ فتحِ ذا نظم کیا ہے:

در احمد الف، نامِ ایزد بود
ز میم آشکارا محمد بود

(کلیاتِ غالب، نولکشور پریس، طبعِ دوم ص ۱۵۱)

محمد علی تبریزی نے فرہنگِ نو بہار میں اس کو دونوں طرح لکھا ہے، "ایزد (چو زیرک یا بیدل) نام نامی خدای تعالیٰ" ___ اردو میں یہ لفظ صرف بہ فتحِ سوم بولا جاتا ہے۔ بہ کسرِ سوم کو فارسی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ امیر اللغات و نور اللغات میں اِس کو صرف بہ کسرِ سوم لکھا گیا ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے ایک مضمون میں لکھا تھا، "ایزد، فارسی میں بہ کسرِ سوم ہے۔ اردو میں بہ فتحِ سوم بولتے ہیں" (رسالۂ آجکل جنوری ۱۹۵۴ء)

عربی کے ایسے متعدد لفظ ہیں جن کا دوسرا یا تیسرا حرف مکسور ہے، لیکن اردو میں یہ لفظ زبر کے ساتھ مستعمل ہیں۔ اُن میں سے اکثر لفظ فارسی میں بھی زبر کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں، اور اس طرح ایسے لفظ مفرس ہو کر اردو تک پہنچے ہیں اور اپنی طرح کے دوسرے لفظوں میں اس تصرف کی گنجائش کی گواہی دیتے ہیں۔ اور اردو میں حرکت کی یہ تبدیلی ہوئی ہے۔ اِس بنا پر کہ یہاں کے لہجے کے لحاظ سے یہ تبدیلی ضروری تھی اور قدرتی بھی۔ ایسے چند الفاظ کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

(۱) مقصد، عربی میں یہ بکسرِ صاد ہے (المنجد)۔ فارسی میں اِس کو بہ فتحِ صاد نظم کیا گیا ہے:

صفا از عقدۂ دلہاست آں زلفِ معقد را ۔۔۔ بحمداللہ کہ ربطے ہست با مطلق مقید را

بسکن بستر از پہلوی گرش سر زنا گشتہ ۔۔۔ کند طے بر براقِ معرفت اقصای مقصد را

(نظیری)

آصفیہ میں اِس کو صرف بہ کسرِ صاد لکھا گیا ہے۔ مولّف نے بہ فتحِ صاد کو غلط بتایا ہے، "اردو میں بہ فتحِ صادِ مہملہ غلط مستعمل ہے"۔ اس کے مقابلے میں صاحبِ نور اللغات نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: "یہ لفظ عربی میں بکسرِ صاد ہے، بہ معنی جائے مقصد۔ اردو میں بالفتح و فتحِ سوم زبانوں پر ہے"۔ سند میں امیر و محسن کا ایک ایک شعر بھی لکھا ہے۔

اردو کے اساتذہ نے اِس لفظ کو بہ فتحِ صاد عام طور پر نظم کیا ہے۔ مثلاً محسن کاکوروی کے معروف نعتیہ قصیدے میں، جس کے قوافی مسند، زبرجد وغیرہ ہیں، یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے:

ملاذِ جن و انساں مرجعِ قدوسیاں کہیے ۔۔۔ کہیں ہے قبلۂ حاجت کہیں ہے کعبہ مقصد کا

ہدف ہو ہو گیا زورِ کماں دارِ نبوت سے ۔۔۔ مقامِ قاب قوسین اکثر ادنیٰ تیرِ مقصد کا

لے انگوری الفقر فخری، کی حلال اُس نے ۔۔۔ لڑا ہے جام جم سے سنگِ مقصود اُس کے مقصد کا

(کلیاتِ نعتِ محسن کاکوروی)

اسی زمین میں امیر مینائی کا بھی ایک نعتیہ قصیدہ ہے، اُس میں بھی یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے:

سوا حیرت کے کیا ہے فکرتِ کنہِ حقیقت میں
یہ وہ گھر ہے کہ جس میں بند ہے دروازہ مقصد کا
حباب آسا ہیں آنکھیں بند تیری، ورنہ ظاہر ہے
کہ ہر موج ہے اِس دریا میں، جادہ راہِ مقصد کا

کہیں ایوب کے شافی، کہیں یعقوب کے حامی
بھرا دُرِ عنایت سے نہ دامن کس کے مقصد کا

(محامد خاتم النبیین)

میر علی اوسط رشک کا مطلع ہے:

آرزو مند ہوں خضرِ رہِ مقصد مل جائے
کہ پتا منزلِ مقصود کا شاید مل جائے

(مجموعۂ دو دواوینِ رشک ص ۳۲۵)

اُردو میں اب یہ لفظ صرف بہ فتحِ صاد مستعمل ہے۔ بکسرِ صاد کو عربی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔

(۲) منصب: یہ لفظ بھی عربی میں بکسرِ صاد ہے۔ فارسی میں اِس کو بہ فتحِ صاد استعمال کیا گیا ہے۔ صاحب بہارِ عجم نے لفظ "غلط" کے ذیل میں لکھا ہے:

"از افضل المتاخرین شیخ عبدالعزیز فطرت بروایتِ صحیح رسیدہ کہ غلط بر دوگونہ است: غلطِ عام و غلطِ عوام۔ اول، چناں کہ لفظِ منصب کہ بکسر می آید و بفتح شہرت دارد۔ و شعرا با لب و تب و غضب قافیہ کردہ اند"۔

"مقصد" کی طرح یہ لفظ بھی اردو بول چال میں صرف بہ فتحِ صاد آتا ہے۔ اِسی طرح نظم بھی کیا گیا ہے:

ساقیِ صاف بے حُبِّ علی مشرب ہے
مردِ مومن ہوں میں، اثنا عشری مذہب ہے
تو امیر اے بُتِ سرکش، تو یہ عاجز ہے فقیر
حُسن جاگیر تری، عشق مرا منصب ہے

آتش (کلیاتِ آتش، طبع دوم ص ۱۹۹)

آصفیہ میں منصب کے صاد پر زیر لگا ہوا ہے اور قوسین میں لکھا گیا ہے کہ "غلطِ عام بہ فتحِ صاد بولتے ہیں"۔ غنیمت ہے کہ مولف نے اس کو "غلطِ عوام" نہیں لکھا۔ نور میں

ذرا مختلف صورت ہے، مولّف نے لکھا ہے :

"منصب - ع - بالفتح وفتحِ سوم - مصدرِ میمی ہے ، بہ فتحِ سوم بمعنیِ مرتبہ ورفعت - بابِ ضَرَبَ یَضرِبُ سے مصدرِ میمی بہ فتحِ عین کلمہ بھی آتا ہے۔
فارسیوں نے لب، تب کے قافیے میں استعمال کیا ہے ...."

معلوم نہیں مولّف نے عربی کے کس لغت میں "منصب" کو بہ فتحِ سوم دیکھا - عربی میں یہ صرف بہ کسرِ سوم ہے (المنجد) - بہ فتحِ سوم فارسی والوں کا تصرّف ہے ، اور اردو میں یہ صرف بہ فتحِ سوم مستعمل ہے -

(۳) میّت : یہ لفظ بھی عربی میں بہ کسرِ یائے مشدّد ہے - فارسی لغات میں اس لفظ میں کسی طرح کے تصرّف کا ذکر نہیں کیا گیا ہے - مولانا نظم طباطبائی نے سیّد ، جیّد ، میّت کو بہ فتحِ یا بولنے سے منع کیا ہے اور عربی کے مطابق بہ کسرِ یا بولنے کی تاکید کی ہے ، "اس قسم کے الفاظ کا صحیح طور سے استعمال کرنا لازم ہے" (معائبِ سخن ص ۴۶) میر کے یہاں یہ لفظ بہ فتحِ دوم آیا ہے :

بے دل ہوئے ، بے دیں ہوئے ، بے وقر ہم ات گت ہوئے
بے کس ہوئے ، بے بس ہوئے ، بے کل ہوئے ، بے گت ہوئے
ہم عشق میں کیا کیا ہوئے ، اب آخر آخر ہو چکے
بے مت ہوئے ، بے ست ہوئے ، بے خود ہوئے ، میّت ہوئے

(کلیاتِ میر ص ۵۱۶)

مرتّبِ کلّیات مولانا عبدالباری آسی نے اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے :

" میّت ، بہ کسرِ دوم صحیح ہے ، اور اس کا قافیہ " ات گت " کے ساتھ اب ذکر نا چاہیے - میر کے زمانے میں اس طرح قافیہ کرنا جائز سمجھتے ہوں گے "

داغ بھی اس لفظ کو بہ فتحِ یاے مشدد غلط سمجھتے تھے۔ انھوں نے احسن مارہروی کو ایک خط میں لکھا تھا:

"ایک اشتہار اس گل دستے میں آپ چھاپ دیجیے، اکثر استاد کے شاگرد بجاے خود استاد بن کر، اپنی غزلیں بے اصلاح چھپوا دیتے ہیں، اُس میں غلطیاں رہ جاتی ہیں.... کسی صاحب نے لفظ "میت" جو بہ کسرِ یاے تحتانی ہے، اُس کو بہ فتحِ یا باندھا۔" (انشاے داغ ص ۱۳۲)

مولفِ نور اللغات نے "بالفتح و تشدید یاے مکسور" لکھ کر لکھا ہے:

"اردو میں زبانوں پر بہ فتحِ یاے مشدد ہے، لیکن فصحاے حال اس طرح کے استعمال سے احتیاط کرتے اور بہ کسرِ یاے مشدد استعمال کرتے ہیں۔"

یہی بات مولفِ رسالۂ اصلاح نے لکھی ہے:

"میت، بہ فتحِ یاے مشددہ استعمالاً صحیح ہے، نظمِ اردو میں کئی جگہ تربت وغیرہ کے قافیوں میں آگیا ہے۔ چوں کہ قاعدے کی رو سے کسرہ ہونا چاہیے، فصحاے حال احتیاط رکھتے ہیں۔" (ص ۱۷)

فصحاے مرحوم نے کچھ ہی کہا ہو، گفتگو میں یہ لفظ بہ فتحِ یاے مشدد آتا ہے اور اب یہی صحیح، بل کہ فصیح ہے۔ مولفِ آصفیہ نے، دوسرے لوگوں کے برخلاف یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اصل حرکات لکھ کر مزید لکھا ہے: "اردو والے بہ فتحِ یا بولتے ہیں اور یہی فصیح ہے۔" مولانا حالی کے یہاں سے بہ فتحِ یا کی مثال بھی پیش کی جاتی ہے:

ہو اس طرح ہاتھوں میں اُس کے رعیت
کہ قبضے میں غسّال کے جیسے میت
(مسدسِ حالی، تاج کمپنی لاہور ص ۱۱۵)

(۳) تیّر، عربی میں بہ کسرِ یاے مشدد ہے (المنجد) فارسی میں اِس کو بہ فتحِ دوم

بھی استعمال کیا گیا ہے۔ صرف غالبؔ کے یہاں سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں؛

داد کو، تا ستم بر اندازد — طرحِ نَو چرخِ دیگر اندازد
نگہِ خشمگینش از تیزی — نور از روی نیّر اندازد

(کلیاتِ غالب، نول کشور پریس، طبع دوم ص ۲۴۶)

باز بہ اطرافِ باغ آتشِ گل درگرفت — مرغ بر ہیمِ مغاں زمزمہ از سر گرفت
نامہ بنازد بخویش کز اثرِ فیضِ مدح — نقطہ ز بس روشنی تابشِ نیّر گرفت

(" " " ص ۴۶۸)

چو گوہرم کہ محیط از صفای گوہرِ من — بپای لغز نیارد گذشتن از سرِ من
صد آفتاب تواں ساختن بیاز یچہ — ز ذرہ ایکہ بود در ہوای نیّرِ من

(" " " ص ۴۴۴)

جم حشم شاہزادہ فتح الملک — مرحبا طالعِ مظفّرِ تو
آفتابی و شیر مرکبِ تست — آسمانی و جبہہ نیّرِ تو

(" " " ص ۳۳)

آصفیہ میں اِس لفظ کو عربی لغات کی تقلید میں، صرف بکسرِ یائے مشدّد لکھا گیا ہے، " نیّر "۔ نور میں اصل حرکات کے ساتھ ساتھ اِس کی بھی صراحت کی گئی ہے کہ اُردو میں بفتحِ دوم مستعمل ہے، اور یہی صحیح بات ہے۔ اردو میں اِس لفظ کا فصیح تلفظ بفتحِ دوم (نَیَّر) مانا جائے گا۔ اِسی طرح استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ اور " نیّر " کو عربی سے مخصوص سمجھا جائے گا۔

(۵) سیّد، جیّد، طیّب، عربی میں یہ تینوں لفظ بکسرِ یائے مشدّد ہیں۔ اردو میں یہ تینوں لفظ بھی بفتحِ یائے مشدّد استعمال کیے جاتے ہیں، یعنی، سیَّد، جیَّد، طیَّب۔ اور اب اردو میں یہ اِسی طرح فصیح مانے جائیں گے۔ مولفینِ قاموس اور مولانا نظم طباطبائی

نے اِن لفظوں کو بکسرِ یا بولنے کی تاکید کی ہے، لیکن اس حکم کو مانا نہیں جا سکتا۔ اِن بزرگوں میں سے کسی نے یہ نہیں بتایا کہ "سیّد" کی تانیث "سیّدانی" صحیح ہے یا یہ بھی غلط ہے، اور اِس کو بھی "سیِّدانی" کہنا چاہیے!

نور میں اِن تینوں لفظوں کو صرف بکسرِ یائے مشدّد لکھا گیا ہے۔ یہ نری عربی کی تقلید ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ مولف نے استعمالِ عام پر لُغت کو ترجیح دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کی صراحت کر دی جائے کہ "طیّب" کی جمع "طیّبات" بکسرِ یائے مشدّد رہے گی۔ اسی طرح "جیّد" کے ایک مرکب "جیّد الکیموس" میں بھی اصل حرکت باقی رہے گی، مگر مفرد الفاظ کو بفتحِ یائے مشدّد ہی مانا جائے گا۔

مندرجۂ بالا الفاظ سے اِس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لسانی رجحان ہے کہ اِس قبیل کے الفاظ اردو میں بفتحِ حرفِ ثانی یا بفتحِ حرفِ ثالث استعمال میں آئیں۔ لسانی رجحان کو لُغت کے اندراجات یا قواعدِ صرف و نحو سے روکا نہیں جا سکتا، نہ اس کو دبایا جا سکتا ہے۔ لسانی رجحان کو لغت اور قواعد، سب پر افضلیت حاصل ہوتی ہے۔ مختلف لفظوں میں اردو کے تلفظ نے اپنے انداز کو نمایاں کیا ہے۔ مثلاً ایک لفظ ہے "مروّت" لُغات میں اس کو بضمِ اول و دوم لکھا گیا ہے۔ مولفِ غیاث اللغات نے تو خاص طور پر صراحت کی ہے کہ اِس لفظ کو بفتحِ ثانی استعمال کرنا صحیح نہیں، "مروّت، بضمتین و تشدید واوِ مفتوح ... و بضمِ اول و فتحِ ثانی خطاست" آصفیہ و نور میں بھی اصل کی رعایت سے اس کو صرف بضمِ اول و ثانی لکھا گیا ہے۔ بول چال میں یہ لفظ بفتحِ حرفِ ثانی آتا ہے اور اردو کے لحاظ سے یہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔

زمرّد: اصلاً یہ لفظ بضمِ اول و ثانی و ثالث ہے، یعنی، زُمُرُّد (المنجد) فارسی میں اِس کو بد اور صد وغیرہ کے قافیے میں بھی لایا گیا ہے، لیکن فارسی میں

حرفِ اوّل وثانی مضموم ہی رہا ہے۔ اردو میں مزید تصرّف یہ ہوا ہے کہ پہلا اور تیسرا حرف، دونوں مفتوح ہیں۔ بول چال میں یہ اسی طرح آتا ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود ہے، مگر حرکات کی صراحت نہیں کی گئی ہے، البتہ نور میں یہ ضرور لکھا گیا ہے کہ، "اردو میں بفتحِ اوّل وضمّ دوم وتشدیدِ سوم مفتوح مستعمل ہے" اور یہی صحیح ہے۔ محسن کاکوروی اور امیر مینائی کے معروف نعتیہ قصائد میں یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے،

مٹا نا لوحِ دل سے نقشِ ناموسِ اب وجد کا
دبستانِ محبت میں سبق تھا مجھ کو ابجد کا

کہاں ہے آتشِ یاقوتِ لب میں وہ بھڑک باقی
کہ خطِ سبز نے چھینٹا دیا آبِ زمرّد کا

عجب کیا ہے کہ خوابِ ناز میں سوتی رہے ناگن
نہ کھولے آنکھ، اگر چھینٹا نہ دیں آبِ زمرّد کا

عیاں ہے کہکشاں، یا نقشِ محرابِ منقّش ہے
فلک ہے، یا کلس رکھا ہے چھوٹا سا زمرّد کا

محسن کاکوروی (کلیاتِ نعتِ محسن کاکوروی)

تفکّر امتیازِ جان وجاناں میں کیا حد کا
عروض اب تک نہ آیا ہاتھ اس بیتِ معقّد کا

نہ رکھ تاجِ تکبّر سر پہ، تیرے حق میں سم ہوگا
فرا حی ہے اسی میں، ہے جو آویزہ زمرّد کا

وہی تو چرخِ اخضر ہے، جو روزِ خلقتِ آدم
گرا تھا تاجِ نورانی سے آویزہ زمرّد کا

امیر مینائی (محامدِ خاتم النّبیین ص ۵، ۶)

ایک اور لفظ ہے: مُلزَم۔ اِس کے متعلق مولفینِ قاموس نے لکھا ہے:

"مُلزَم، الزام لگایا گیا، قصوروار۔ بجائے مُلزَم، مُلزِم کہنا غلطی ہے، کیوں کہ ملزِم، الزام کا اسمِ فاعل ہے، جس کے معنی ہیں، کسی کے ذمّے کوئی کام کر دینے والا۔ لازم و واجب کر دینے والا۔ الزام لگانے والا۔"

مقصد یہ ہے کہ عربی کے لحاظ سے صحیح لفظ "مُلزَم" ہے زَ کے زبر کے ساتھ اور اردو میں بھی اِسی طرح استعمال کرنا چاہیے۔ اردو میں عربی کے ایسے نہ معلوم کتنے لفظ ہیں جن کی حرکات بدل گئی ہیں۔ عربی میں یہ اسمِ فاعل تھے یا اسمِ مفعول، اب ہمیں اِس سے مطلق بحث نہیں۔ اُردو میں یہ مفرد الفاظ کی حیثیت سے دیکھے جاتے ہیں۔ اِس لحاظ سے اِن کی وہی حرکات صحیح ہیں جو عام زبانوں پر ہیں۔ کوئی صاحب لغت کے احترام کی خاطر یا اپنی واقفیت کے اعلان کے لیے کسی محفل میں "مُلزَم" (بہ فتحِ سوم) بولیں تو یہ سمجھا جائے گا کہ موصوف تازہ وارد ہیں ـــ اُردو میں یہ لفظ صرف بہ کسرِ سوم صحیح ہے اور بہ فتحِ سوم نا قابلِ قبول ہے۔

اردو لُغات میں سے نُور میں اِس کو بہ کسرِ سوم لکھا گیا ہے اور آصفیہ میں زَ پر زبر لگا ہوا ہے۔ نُور میں یہ صراحت نہیں کی گئی ہے کہ بہ کسرِ سوم اردو کا تصرّف ہے اور اس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ عربی میں بھی یہ لفظ اِس معنی میں بہ کسرِ سوم ہے۔ یہ صراحت ضروری تھی کہ زَ کا زیر، اردو کا تصرّف ہے۔ اس کے برخلاف آصفیہ میں سرے سے تصرّف کا ذکر ہی نہیں۔ مولّف نے عربی لُغات کی پیروی کی ہے اور اردو بول چال کو نظر انداز کر دیا ہے۔

اِسی قماش کا ایک لفظ ہے: متوفّی ـــ یہ بھی اُردو میں اصل کے خلاف مستعمل و مروّج ہے۔ عربی میں "متوفّی" بروزنِ متفعّل اسمِ فاعل ہوگا، جس کے معنی

ہوئے ، وفات دینے والا ، مارنے والا۔ اور "مرا ہوا" کے مفہوم میں اسم مفعول "متوفّیٰ" آئے گا۔ اردو میں "تلزّم" کی طرح اِس کو بھی "متوفّی" کہتے ہیں اور "وفات پایا ہوا" کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ مؤلفینِ قاموس نے اِس سے بھی زبان و قلم کو آلودہ نہ کرنے کی ہدایت فرمائی ہے ؛

"متوفّی" کی جگہ "متوفّی" کہنا سخت غلطی ہے کیوں کہ "متوفّی" کے معنی ہیں وفات دینے والا ، مارنے والا۔ فَاللّٰہُ مُتَوَفِّی وَالْعَبْدُ مُتَوَفّٰی " (قاموس)

ہم بھی جب عربی لکھیں گے یا بولیں گے تو مؤلفین کے اِس قول کا پوری طرح احترام کریں گے، لیکن اردو بولنے اور لکھنے میں، اردو میں چلن کا لحاظ کریں گے۔ جس طرح اردو والے "مرتشی" کے معنوں میں "راشی" اور "معتاد" کے معنی میں "عادی" استعمال کرتے ہیں اور ان لفظوں کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں؛ اُسی طرح "متوفّٰی" کی جگہ "متوفّی" کہتے ہیں اور اِس کو بھی صحیح سمجھتے ہیں۔ ہاں، یہ لکھ دیا جائے کہ آصفیہ اور نور دونوں میں اِس لفظ کو عربی کے مطابق "متوفّٰی" لکھا گیا ہے۔ دونوں لغات کے مؤلفین نے اردو کے تصرّف سے سروکار نہیں رکھا۔

متلاشی : اردو میں یہ لفظ بہ طورِ اسمِ فاعل، "تلاش کرنے والا" کے معنی میں مستعمل ہے۔ اصل کے لحاظ سے یا یوں کہیے کہ لغت کے لحاظ سے یہ بھی غلط ہے۔ مؤلفینِ قاموس نے اِس کے متعلق لکھا ہے ؛

"تلاش" ترکی لفظ ہے، جو فارسی و اردو میں مستعمل ہے، اس سے اہلِ اُردو نے بہ طورِ عربی "متلاشی" (بہ معنی تلاش کنندہ) اسمِ فاعل بنا لیا ہے، جو غلطِ محض ہے "

صاحبِ آصفیہ کی بھی یہی رائے ہے ، " یہ لفظ ، ترکی "تلاش" سے ، اُن لوگوں نے بنا لیا ہے جن کو

عربی و ترکی کی تمیز نہیں، بنا لیا ہے جو محض غلط ہے۔" مولانا عبدالباری آسی نے بھی ایک جگہ یہی رائے ظاہر کی ہے: "اور جو تلاش کے معنی پر متلاشی استعمال کرتے ہیں، وہ غلط ہے۔"
(حاشیہ کلیاتِ میر ص ۱۸۱)

فارسی میں "متلاشی" پریشان و خراب و معدوم کے معنی میں استعمال ہوا ہے (غیاث اللغات) سلیمان حییم نے اپنے لغت میں یہ مثالیہ فقرہ لکھا ہے: "جسد در چند روز متلاشی شد۔" اردو میں بھی یہ اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے، مثلاً:

ہوا میں جیسے دھواں دم میں ہوئے ہے ناچیز
ہوں اس طرح متلاشی سپہر کے اجرام — قائم چاند پوری
(دیوانِ قائم عکس مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ص ۱۳۰)

لیکن اب اس معنی میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ فارسی میں "متلاشی" "تلاش کرنے والے کے معنی میں نہیں آیا ہے۔ وہاں اس معنی میں "تلاشی" ہے (بہارِ عجم) مگر اردو میں متلاشی، تلاش کرنے والے کے معنی میں بالعموم استعمال کیا گیا ہے، اور اب بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور یہ معنی، اردو کا اضافہ ہیں۔ چند مثالیں بھی پیش کی جاتی ہیں،

نے فکر ہے دنیا کی، نہ دیں کا متلاشی — اس ہستیِ موہوم میں کس کام کا ہوں میں
سودا (کلیات نول کشور پریس ص ۱۱۰)

دل سے وہ آشنا ہیں کہاں نفتے کے — متلاشی ہیں آب و دانے کے
فغاں (دیوانِ فغاں مرتبہ صباح الدین عبدالرحمان ص ۱۶۳)

کوہ و صحرا و گلستاں میں پھرا کرتا ہے — متلاشی ترا وہ آبِ رواں ہے کہ جو تھا
آتش (کلیات نول کشور پریس ص ۱۱۰)

شب کو خیال رہتا ہے اک رشکِ حور کا — ظلمت میں دل مرا متلاشی ہے نور کا
(آتش کلیات، نول کشور پریس ص ۵)

متلاشی ترے افلاک کے سب تارے ہیں   جو ثوابت تھے، وہ اب چرخ پہ سیارے ہیں

(رند دیوانِ دوم، نول کشور پریس، ص ۲۴۳)

"متلاشی" کو تو کسی طرح غلط نہیں کہا جا سکتا۔ یہ لفظ بھی اردو والوں کا گڑھا ہوا نہیں۔ فارسی میں یہ لفظ موجود تھا، معدوم کے معنی میں؛ اردو میں اس کو اس معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے (اگرچہ اب متروک ہے) اور ایک نئے معنی کا اضافہ کر لیا گیا ہے؛ اس معنی میں یہ مہتم ہے اور بالکل صحیح ہے۔

"تلاش" کو ترکی زبان کا لفظ بتایا گیا ہے۔ اسی ترکی لفظ سے "تلاشی" بنا لیا گیا، اسم فاعل کے معنی میں اور یہ فارسی میں مستعمل ہے (بہارِ عجم)۔ اردو میں یہ لفظ فارسی کے مطابق بطورِ اسم فاعل (تلاش کرنے والا کے معنی میں) بھی استعمال کیا گیا اور "متلاشی" کی طرح اس میں بھی ایک نئے معنی کا اضافہ کیا گیا، یعنی اس کو حاصل مصدر کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا۔ دونوں کی مثالیں درج کی جاتی ہیں:

ساکنِ دیر و حرم دونوں تلاشی ہیں ترے   تو خدا جانے کہاں ہے، کیونکے تجھ کو پایئے

میر (کلیاتِ مرتبۂ آسی ص ۳۵۱)

جلوت میں یوں ہے وہ کہ تلاشی ہے چشمِ شوق   خلوت میں اس طرح ہے کہ خلوت گزیں نہیں

داغ (مہتابِ داغ ص ۱۳۰)

اعمالِ بد و نیک سے جا خالی ہاتھ   سامان اگر ہوا، تلاشی ہو گی

رشک لکھنوی (مجموعۂ دواوینِ رشک ص ۳۹۳)

مے کشو! حضرتِ زاہد کی تلاشی لینا   کہ چھپائے ہوئے وہ جام لیے جاتے ہیں

داغ (مہتابِ داغ، ص ۱۱۷)

نکلا ہے تلاشی سے فقط اک درمِ داغ   یاروں کو مرے دل پہ ہزاروں کا بھرم تھا

داغ (مہتابِ داغ ص ۵۷)

آتش نے "مضموں تلاشیاں" بھی نظم کیا ہے:

نہ فکرِ شعر ہے، نہ وہ مضموں تلاشیاں آتش سے تو نہیں کہیں خواجہ لڑے ہوئے

(کلیات ص ۴۰۰)

اِس طرح "متلاشی" اور "تلاشی" دونوں لفظ مستعمل رہے ہیں اور ہیں اور بالکل صحیح ہیں۔ شوق نیموی نے لکھا ہے:

"متلاشی بمعنیِ تلاش کنندہ، مرغن بمعنیِ روغن دار، یا اس قسم کے دوسرے الفاظ، جن کا مادّہ عربی نہیں مگر ان کا اشتقاق بطورِ عربی ہوا ہے اور عام طور پر بولے جاتے ہیں، ان کا استعمال میرے نزدیک کچھ مضائقہ نہیں۔"

(رسالۂ اصلاح ص ۳۰)

عادی: "متلاشی" کی طرح اِس لفظ کو بھی شک کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے:

"عادی، عربی میں نہیں آیا ہے۔ بعض لغات میں خوگر کے معنی میں پایا گیا ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ اس کی جگہ "معتاد" کہا جائے۔" (قاموس)

کلبِ حسین خاں نادر (تلمیذِ ناسخ) نے لکھا ہے:

"لفظ عادی کا، بمعنی خوگرفتہ، زباں زدِ عام ہے مگر لغت میں معنی اُس کے دشمن و بیداد کنندہ کے آئے ہیں۔ اور جس چیز کی عادت ہو جائے، اُس کو بھی کہتے ہیں۔ یہ جو عادت کنندہ اور خوگرفتہ کے محل پر بولتے ہیں، غلط ہے۔" (تلخیصِ معلّیٰ ص ۱۲۳)

کچھ لوگ اِس کو مستند مانتے ہیں اور خوگر کے معنی میں اِس کے استعمال کو غلط نہیں سمجھتے۔ مولفینِ آصفیہ و نوراسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شوق نیموی نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے:

"عادی، عادت گیرندہ کے معنی میں استعمالاً صحیح ہے .... مگر چوں کہ لغتاً اِس کے کچھ اور معنی ہیں، اس وجہ سے خواص احتیاط رکھتے ہیں۔" (اصلاح ص ۱۳)۔

پھر اِس پر یہ حاشیہ لکھا:

"مگر میرے نزدیک اردو میں جہاں ترکیبِ فارسی نہ ہو، عادی بہ معنی عادت گیرندہ، کچھ مضائقہ نہیں۔ کیوں کہ سیکڑوں الفاظِ عربیہ و فارسیہ کے معنوں میں اہلِ زبانِ ہند نے تصرف کیا ہے تو اِس میں بھی تصرف روا رکھا جائے تو کیا نقصان ہے۔"

غرض جن لوگوں نے اِس لفظ کے استعمال کو غلط نہیں کہا، وہ بھی اِس پر متفق ہیں کہ ہند ہونے کے سبب، اِس لفظ کو بہ ترکیبِ فارسی استعمال نہ کیا جائے۔ شوق قدوائی نے ایک خط میں لکھا ہے:

"اِس قسم کے بہت سے الفاظ ہیں جو اردو میں دوسرے معنی پر بولے جاتے ہیں مگر فارسی ہونے کا دھوکا دیتے ہیں۔ مثلاً عادی، یہ عام زبان پر عادت رکھنے والے کے معنی میں ہے، لیکن اس معنی میں ہندی ہے۔" (مرقعِ ادب ص ۹)

"عادی" عربی کا لفظ ہے۔ عربی میں اس کے وہ معنی ہیں جن کی نشان دہی صاحبِ تنقیحِ معنی نے کی ہے۔ فارسی میں یہ لفظ "وہ شے جس کی عادت ہو" کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، "ہر چیز کہ عادت شود" (غیاث اللغات) اور اب بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً:

"اینگونہ اختلاف وزن نزد شعرای عراق امری عادی بودہ، و خطا شمردہ نمیشد۔"

(تحقیق انتقادی در عروض پارسی ص ۳۱)

"و بعضی زحافات غیر عادی در آنہا یافتہ و شاعران گمل را بخطا منسوب داشتہ۔"

(ایضاً ص ۳۱)

عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ عادی بہ معنیِ خوگر، فارسی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے؛

لیکن اِس کی ایک مثال میرے سامنے موجود ہے۔ محمد علی جمال زادہ نے تنکابنی کی کتاب قصص العلماء کا انتخاب قصۂ قصہ ہا کے نام سے مرتب کیا تھا، اُس میں ایک جگہ یہ لفظ اسی معنی میں ملتا ہے:

"تنکابنی می نویسد کہ شیخ لحسائی عادی بخوردن کندر بود، لذا قوۂ حافظہ او بہ ترجہ ای بود کہ سر آمدِ اہلِ زماں بود" (قصۂ قصہ ہا ص ۲۸)۔

اِس کے علاوہ سلیمان حییم نے بھی اپنے لغت میں اس لفظ کو بہ معنی خوگر لکھا ہے۔

اب بھی بعض ضرورت سے زیادہ محتاط حضرات اس لفظ کو خوگر کے معنی میں غیر معتبر سمجھتے ہیں اور اُن کا خیال یہ ہے کہ فصحائے اُردو نے اِس لفظ کو اس معنی میں استعمال نہیں کیا ہے۔ اِس غلط فہمی کے ازالے کے لیے ذیل میں "فصحائے اُردو" کے یہاں سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ اِن مثالوں سے معلوم ہو گا کہ اِس لفظ کو زیر بحث معنی میں اساتذہ نے بے تکلف استعمال کیا ہے:

ہمیں مارِ سیاہ زلف کے کاٹے سے کیا ہووے
کہ ہم اِک عمر سے عادی ہیں خالِ لب کی افیوں کے
انعام اللہ خاں یقین (دیوانِ یقین ص ۵۳)

کیوں کہ عادی ہیں ترے دور میں سب اہلِ دول
کہ جسے دیکھیں فلاکت سے گرفتارِ محن
انشا (کلامِ انشا ص ۳۳۰)

تلخ کامی شہد ہے سودائے زلفِ یار میں
عشقِ افعی نے کیا ہے زہر سے عادی مجھے
آتش (کلیات نول کشور پریس ص ۲۷۶)

تیرا جی چاہے تو پلوا دے کوئی جامِ شراب
ہاتھ پھیلانے کا بندہ نہیں عادی ساقی
رند (دیوان نول کشور پریس ص ۲۰۱)

اب اُتر آئے ہیں وہ تعریف پر
ہم جو عادی ہو گئے دشنام کے
داغ (انتخاب داغ، ص ۱۵۴)

شکرِ نعمت نہ کریں آپ کے مہماں کیوں کر
دی وہی چیز کہ جس چیز کا جو عادی ہے
قمر عظیم آبادی (میخانۂ الہام ص ۳۲۱)

عادی ہیں صبر و شکر کی، اس گھر کی بیبیاں
دکھ درد ہو ہزار، پہ کرتی نہیں فغاں
(مراۃ شاد، اول ص ۵۱)

ذکرِ ابرو کی زباں عادی ہوئی
بات سیدھی بھی جو کی، ٹیڑھی ہوئی
خواجہ وزیر (دفترِ فصاحت ص ۲۳۹)

مجازی عشق بھی اک شے ہے، لیکن
ہم اس نعمت کے منکر ہیں نہ عادی
حسرت موہانی (کلیاتِ طبع لاہور ص ۱۷۷)

"یہ اس کی عادی ہوتی ہیں کہ لوگ جھوٹی خوشامد کریں" مرزا رسوا (امراؤ جان ادا، نیا ادارہ لاہور ص ۲۱۳)

فارسی میں لفظ "عادی" جس طرح "وہ شے جس کی عادت ہو" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اُسی طرح اُردو میں بھی کہیں کہیں اس کی مثال مل جاتی ہے جیسے:

"دیباچہ پورے ذوق سے مِن اوّلہٖ اِلیٰ آخرہٖ پڑھا۔ آپ کی عادی ہمہ گیری، بیان کی پاکیزگی لفظ لفظ سے عیاں ہے۔" حبیب الرحمان خاں شروانی (نقوش، مکاتیب نمبر، ص ۲۸۴)

یا معمولی اور مقررہ کے مفہوم میں، جیسے:

"میں چھٹے ہفتے کی عادی رخصت پر روانہ ہوں گا" (ایضاً ص ۲۶۷)

مگر ایسی مثالوں کو اب از قسم شواذ سمجھنا چاہیے۔ ہاں "عادی چور" اور "عادی مجرم" جیسے مرکبات ضرور مستعمل ہیں۔

"عادی" کی جگہ "معتاد" بھی استعمال کیا گیا ہے۔ از روئے قاعدہ یہ لفظ اس معنی میں بالکل صحیح ہے، جیسے:

"شاعری ہماری دو مصرعوں پر موقوف ہے۔ اگر ان میں مناسبات معمولی

ہوئے اور بعض وہ صنعتیں جو دائم الوقت ہیں، شعر یں پائی گئیں، تو گویا ہم نے شاعری کا حق ادا کر دیا۔ جس طرح ہمارے مضمون مصنوعی ہیں، اُسی طرح ہماری طبیعت بھی اس کی معتاد ہو گئی ہے۔"

مرزا رسوا (مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات ص۳۷)

یہ استعمال بہ لحاظِ قواعد اور بہ لحاظِ لغت بالکل صحیح ہونے کے باوصف قبولِ عام کا درجہ حاصل نہیں کر سکا اور "معتاد" کی جگہ، خوگر کے معنی میں "عادی" ہی نے قبولِ عام پایا۔

دوا کی مقررہ خوراک، مقررہ رقم، وظیفہ وغیرہ کے لیے (اور کبھی عادت کے مفہوم میں) بھی "معتاد" کا لفظ استعمال میں آتا رہا ہے۔ پرانے طبیبوں کی زبان سے اب بھی کبھی کبھار یہ لفظ سُننے میں آجاتا ہے۔ قدیم اساتذہ کے یہاں اس کی اچھی خاصی مثالیں ملیں گی۔ مثلاً:

میں نفر سے کہا، جو ہے معتاد
دے وہی چار پیسے، کم نہ زیاد
قائم چاندپوری (مثنوی در ہجوِ حجام)

ایسا وہ شوخ ہے کہ اُٹھتے صبح
جانا سو جائے، اُس کی ہے معتاد
میر (کلیاتِ مرتبہ آسی ص ۶۴)

"حکیم صاحب نے گھی معتاد سے زیادہ کھانے کو منع فرمایا ہے" حالی
(مکاتیبِ حالی، دوم، ص ۴)

مختصر یہ کہ "عادی" استعمالاً بالکل صحیح لفظ ہے اور اساتذہ نے اس کو بالعموم استعمال کیا ہے۔ لغت کے لحاظ سے صحیح لفظ "معتاد" ہے، اُس کو مختلف معانی میں استعمال بھی کیا گیا ہے؛ مگر اب اُس کا چلن اُٹھ گیا ہے۔

مشکور: جس طرح "عادت گیرندہ" کے معنی میں "عادی" کو غیر صحیح کہا گیا تھا،

اور اُس کی جگہ "معتاد" بولنے کی فرمایش کی گئی تھی؛ اُسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ "مشکور" صحیح لفظ نہیں؛ اِس کے بجائے "متشکر" یا "شاکر" کہنا چاہیے۔ مولفینِ قاموس نے لکھا ہے کہ مشکور بہ معنیِ ممنون صحیح نہیں۔ اور اِس پر اظہارِ تعجب کیا ہے کہ "ایک واقف کار شخص بھی لکھ گیا ہے"۔ واقف کار شخص سے مراد غالباً مولانا شبلی ہیں؛ اُن کا شعر ہے؛

آپ کے لُطف و کرم سے مجھے انکار نہیں

حلقہ در گوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں

مولفینِ آصفیہ و نور بھی اِس لفظ سے کچھ خوش نہیں؛

"اگر ممنون و مشکور کی بجائے، ممنوں و شاکر کہیں تو بجا ہے" (آصفیہ)

"اہلِ علم اس معنی میں استعمال نہیں کرتے۔ مشکور، صفت اُس شخص کی ہوگی جس نے احسان کیا ہے، نہ اُس شخص کی جس پر احسان کیا گیا ہے" (نور)

عربی قواعد کے لحاظ سے لُغت نویسوں کا فیصلہ بالکل صحیح ہے، لیکن ایک دوسری زبان اُن قواعد کی پابند کیوں ہو! مشکور، بہ معنیِ شُکر گزار، آج بھی برابر استعمال ہوتا ہے اور پہلے بھی بے تکلف استعمال کیا گیا ہے۔ مولفِ نور نے لکھا ہے کہ اہلِ علم اِس معنی میں استعمال نہیں کرتے؛ "اہلِ علم" ہی میں سے ایک ممتاز فرد کا یہ قول ہے؛

"عربی میں "مشکور" اُس کو کہتے ہیں جس کا شکریہ ادا کیا جائے، مگر ہماری زبان میں اُس کو کہتے ہیں جو کسی کا شکریہ ادا کرے؛ اِسی لیے بعض عربی کی قابلیت جتانے والے، اِس کو غلط سمجھ کر، صحیح لفظ "شاکر" یا "متشکر" بولنا چاہتے ہیں، مگر اُن کی یہ اصلاح شکریے کے ساتھ واپس کرنا چاہیے"۔

مولانا سید سلیمان ندوی (نقوشِ سلیمانی ص ۹۸)

پنڈت دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے؛

"جب "عادی" اور "مشکور" مدتوں سے "عادت گیرندہ" اور "احسان مند"

کے معنی میں استعمال ہو رہے ہیں اور متکلم اور سامع دونوں کا ذہن انہی معنی کی طرف جاتا ہے، تو اب قاموس اور صراح سے فتوا لے کر، ان الفاظ کو اردو سے خارج کرنے میں کیا مصلحت ہے؟" (منثورات، ص ۱۹۴)

اتمامِ حجت کے طور پر دو چار مثالیں بھی پیش کی جاتی ہیں:

رنگ رنگ اطعمہ ہیں بذل، پھر اس درجہ وفور — کیا خداوندی ہے اللہ، خدائی مشکور
میر (کلیاتِ میر مرتبہ آسی ص ۷۳۰)

آپ کے لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں — حلقہ در گوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں
شبلی (کلیاتِ نظم اردو ص ۱۲۰)

"جو کچھ ہو سکے وہ لکھا کرو اور ممنون و مشکور کیا کرو" — امیر مینائی
(مکاتیبِ امیر مینائی مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب، طبعِ دوم ص ۱۷۰)

"ان کے سبب سے میں آپ کا نہایت ممنون و مشکور ہوں" — سرسید
(مکاتیبِ سرسید مرتبہ مشتاق حسین ص ۲۷۳)

"آپ کا خط پہنچا، میں ممنون و مشکور ہوا" — سید حسن بلگرامی
(تاریخِ نثرِ اردو ص ۵۹۸)

"خادم آپ کی عنایت سے بے غایت کا حد درجہ ممنون و مشکور ہوا" — ابوالکلام آزاد
(مرقعِ ادب ص ۴۵)

رشک نے ایک جگہ "مشکور" اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ شعر یہ ہے:

شکرِ خدا کہ عشقِ بتاں میں مشکور ہوں
راحت ملی، جو رنج مجھے یار سے ملا

(مجموعۂ دواوینِ رشک ص ۶۹)

"مشکور" نام کے طور پر مستعمل ہے، مگر اس معنی میں اس نے رواج نہیں پایا۔

معتوب : مدمغ ، مفلوک ، معتوب ، مرقن جیسے بہت سے لفظ ، عربی الفاظ کے قیاس پر بن گئے ہیں اور قبولِ عام کی سند پا چکے ہیں۔ قواعد کی عینک لگا کر دیکھیے تو یہ سب لفظ غلط نظر آئیں گے۔ مولفینِ قاموس نے ایسے سبھی لفظوں سے اجتناب کا حکم دیا ہے۔ اس ضمن میں لفظ "معتوب" پر سب سے زیادہ عتاب کا اظہار کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اس کے بجائے صحیح لفظ "معاتب" استعمال کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اس بدمذاقی کو کوئی مردِ معقول خوش آمدید نہیں کہے گا۔ ذیل میں دو فقرے نقل کیے جاتے ہیں؛ ان میں "معتوب" کو "معاتب" سے بدل کر دیکھیے؛ خود اندازہ ہو جائے گا:

"ملا صاحب دربارِ اکبری سے معتوب ہوئے" مولانا شبلی
(شعر العجم، سوم ص ۴۷)

"وہ مجرمِ بغاوت میں خود معتوب تھا" محمد حسین آزاد
(دربارِ اکبری، اشاعت لکھنؤ ص ۳۱۳)

مجموعۂ نظمِ حالی (اشاعت مطبع العلوم علی گڑھ ۱۸۹۰ء) میں مولانا حالی کا ایک شعر یوں ہے:

دوست اللہ کے ہیں ٹھیرتے معتوب وہاں
اور مسیحائے زماں ہوتے ہیں مصلوب وہاں

اس شعر میں لفظ "معتوب" پر مولانا حالی نے یہ حاشیہ لکھا ہے:

"صحیح لفظ "معاتب" ہے، مگر اردو میں بجائے "معاتب" کے "معتوب" بولا جاتا ہے، جیسے بجائے "معفو" کے "معاف"۔ پس اردو میں یہی صحیح اور یہی فصیح ہے۔"

اس ضمن میں مولفِ لغت نامۂ دہخدا کا یہ قول ہمارے سامنے رہنا چاہیے:

"ما بوزن صیغ عربی از لغات فارسی چیزہا ساختہ و بکار بردہ ایم و گاہ عرب قدیم و معاصر را نیز باستعمال آن وا داشتہ ایم، مثل نزاکت

از نازکی، و فلاکت و مفلوک و مفالیک از کلمۂ فلک زدہ۔"

(لغت نامۂ دہخدا جلد ۳۴ ص ۴۰۴)

مولفِ لغت نامہ نے جس تصرف کا ذکر کیا ہے، اُس کا اطلاق اردو پر بھی ہوتا ہے۔ فارسی کی طرح اردو میں بھی اِس طرح کے بہت سے لفظ مستعمل ہیں؛ اُن میں سے کچھ لفظ فارسی سے ہم کو بنے بنائے ملے ہیں (جیسے، مفلوک، نزاکت، فلاکت وغیرہ) اور کچھ اُردو کی صلاحیتِ تراشش خراش کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ایسے سب لفظ اردو کے سرمایے کا قابلِ قدر حصہ ہیں۔ اِن سے اُردو کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوا ہے اور ادائے مفہوم کے لیے نئے نئے وسیلے ہاتھ آئے ہیں۔

لفظِ "معتوب" آصفیہ میں موجود نہیں۔ اُس میں صرف "معاتب" ملتا ہے۔ اِس سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولفِ آصفیہ کی رائے میں بھی "معتوب" قابلِ قبول نہیں۔ البتہ نور میں یہ لفظ موجود ہے، مگر اُس میں کوئی سند نہیں پیش کی گئی ہے۔ ہاں، رشک نے ایک غزل میں جس کے قوافی تپ اور لب ہیں "معاتب" بھی نظم کیا ہے۔ وہ شعر مع مطلع یہ ہے:

سادگی سے سبزۂ رخسار النسب ہو گیا
کیا مزلف ہوتے ہی چہرہ مرتب ہو گیا

جب نہ تپ نکلا کیا مجھ پر زمانے کا بخار
جس کو غصہ جس پر آیا میں معاتب ہو گیا

(مجموعۂ دواوینِ رشک ص ۳۰)

قواعد کی رو سے لفظ صحیح ہے، مگر کس قدر اجنبی بل کہ غیر فصیح معلوم ہوتا ہے!

شکیل: "معتوب" کی طرح "شکیل" بھی عربی میں نہیں پایا جاتا۔ اِس کا مادہ "شکل" ضرور عربی ہے۔ اِس لفظ کو بھی برِ بنائے احتیاط ترک کرنے کی فرمایش کی گئی ہے؛

"شکیل" خوب رو کے معنی میں ؛ اس کا ترک اولیٰ ہے، اگرچہ ذوقؔ نے لکھا ہے۔" (قاموس)

شاید ہی کوئی شخص فاضل مولفین کی ہم نوائی کر سکے۔ آصفیہ و نور میں یہ لفظ وجود ہے۔ مولفین نے یہ صراحت کردی ہے کہ یہ اردو نژاد لفظ ہے، مگر سند کسی نے نہیں پیش کی ہے۔ ذیل میں چند اسناد درج کی جاتی ہیں،

ناز و ادا کے ساتھ وہ دل بر شکیل ہے
تصویر چیں کی رو بہ رو اس کے ذلیل ہے

میرؔ (کلیات مرتبہ آسی ص ۳۴۸)

نام خدا، ہیں عونؔ و محمدؔ بھی کیا شکیل
اک مہر بے نظیر ہے، اک ماہ بے عدیل

انیسؔ (روح انیس، ص ۱۱۱)

صفدر جواں، شکیل جواں، نازنیں جواں
کس نے تجھے عزیز لیا، اے حسیں جواں

انیسؔ (روح انیس، ص ۱۶۵)

نور معنی ہے بہ ہر شکل نتیجہ اس کا
اللہ اللہ زہے شکل شہنشاہ شکیل

ذوقؔ (قصائد ذوق مرتبہ سر شاہ سلیمان ص ۴۳)

"ایک جوان شکیل، زعفرانی جوڑا پہنے، گدی پر بیٹھا ہے" میر امنؔ
(باغ و بہار مرتبہ مولوی عبد الحق ص ۲۸)

"سوداگروں کے غول میں ایک جوان، خوب صورت، شکیل" میر امنؔ
(باغ و بہار " " ص ۹۹)

"حاتم کے پاس ایک گھوڑا ہے اصیل و شکیل" میر امنؔ
(گنج خوبی، مطبوعہ کلکتہ، ص ۱۳۴)

"بیٹی اس کی نہایت جمیلہ و شکیلہ" شیر علی افسوسؔ
(آرائش محفل، مجلس ترقی ادب لاہور ص ۳۲۹)

میرا خیال ہے کہ یہ لفظ ہندستانی فارسی والوں کا بنایا ہوا ہے اور بہت پہلے بنا ہے۔ میں فی الوقت اس کی سند پیش کرنے سے قاصر ہوں، مگر اچھی طرح یاد ہے کہ بدایونی کی منتخب التواریخ میں ایک جگہ " زنِ جمیلہ و شکیلہ " موجود ہے۔ یہ کتاب اِس وقت دسترس سے باہر ہے اور جو یادداشت اس سے متعلق تیار کی گئی تھی، وہ بھی موجود نہیں۔

اِس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سلیمان حییم نے اپنے لغت میں "شکیل" کو "خوش قطع" کے معنی میں لکھا ہے اور یہ فقرہ بہ طورِ مثال درج کیا ہے، " این جعبہ خیلی شکیل است "۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسیِ جدید میں یہ لفظ موجود ہے، ذرا سے معنوی فرق کے ساتھ۔ لیکن حییم نے یہ غلطی کی ہے کہ اِس کو عربی لکھا ہے۔ فوربس پلیٹس، فیلن اور شیکسپیر نے بھی حییم کی طرح اس لفظ کو عربی لکھا ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہ صحیح نہیں۔ شیکسپیر اور فوربس نے "شکیل" کی تانیث " شکیلا " (الف کے ساتھ) لکھی ہے اور فوربس نے اس کو بھی عربی لکھا ہے۔ اردو (اور ہندستانی فارسی) میں "شکیلہ" ہے، اور "شکیلا" کوئی لفظ نہیں۔

تابعدار: " تابعدار، غلط ہے، اس لیے کہ تابع " خود اسمِ فاعل ہے، پھر اُس پر " دار " نہ صرف غیر ضروری بل کہ غلط ہے "۔ (قاموس)

مولفینِ قاموس کے علاوہ بعض اور لوگوں نے بھی اِس کو غیر صحیح بتایا ہے۔ مولفِ آصفیہ نے لکھا ہے کہ: " یہ لفظ غلط مشہور ہے کیوں کہ " تابع " خود فاعل کا صیغہ ہے "۔ یہی عبارت لفظ بہ لفظ نور میں موجود ہے۔ مولانا نظم طباطبائی نے بھی اِس کا شمار غلط الفاظ میں کیا ہے (معائبِ سخن ص ۳۶)۔ مولانا حالی نے ایک استفسار کے جواب لکھا تھا:

" تابعدار، غلط ہے۔ صرف فرماں بردار کہنا چاہیے۔ کیوں کہ " تابعدار " کے معنی

تابع رکھنے والا کے ہیں۔ فصحا کے کلام میں نہیں آیا ہے۔ عوام اور جہلا کی زبان پر اکثر جاری ہے۔" (مکاتیبِ حالی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ص ۷۶)

یہ لفظ بہ لحاظِ قواعد غلط سہی لیکن اردو میں مستعمل ہے۔ فرماں برداری کا جو مفہوم اِس لفظ سے ادا ہوتا ہے، وہ صحیح لفظ "تابع" سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اِسی سے "تابع داری" بنا ہے اور یہ بھی مستعمل ہے۔ اوروں کا کیا ذکر، خود مولانا حالی نے اِس لفظ کو کم از کم دو نظموں میں استعمال کیا ہے:

ماں باپ کے حکموں پہ پُتلی کی طرح پھرتی رہیں
غم خوار بالوں کی رہیں، ماؤں کی تابعدار تم
(چُپ کی داد)

اپنے اعضا یا دماغ و دل کے کب مختار ہیں
جیسے یہ محکوم ہیں، وہ سب بھی تابعدار ہیں
(جوانوں سے خطاب)

استعمالِ عام کا اِس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا! بعض اور مثالیں:

جو کچھ کہ حکم ہو، چاکر ہوں اور تابعدار
جو کچھ کہ امر ہو، بندہ ہوں اور خدمت گار
میر امّن (گنجِ خوبی مطبوعۂ کلکتہ ص ۱۳۲)

جب کہ دو لعاب ہے آپ تابعدار
نہیں کرتا کسی طرح تکرار
منیر شکوہ آبادی (کلیاتِ منیر ص ۴۶۸)

"پس تابعداری دانا مدبّروں کی واجب ٹھہری۔" میر امّن
(گنجِ خوبی ص ۱۹۱)

"انسان، جانوروں کو لگام لگا کر اپنا تابعدار بناتے ہیں۔" سید سلیمان ندوی [illegible]

تمکین کاظمی مرحوم نے داغ سے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے:

"بے نظیر کے میلے میں داغ بیٹھے ہوئے کسی سے بات چیت کر رہے تھے کہ اصغر علی خاں جنرل مرحوم اُدھر سے گزرے اور سلام کیا۔ مگر داغ اِتنے

منہمک تھے کہ سنا ہی نہیں.... اس پر انھوں نے پکار کر کہا، "ارے ہو تو آپ مرزا!
تمھارا تو مزاج ہی نہیں ملتا۔" یہ سنتے ہی داغ نے عرض کیا، "حضور! وہ ایسا
کیسا ملے، میں تو آپ کا تابعدار ہوں۔"

داغ (مصنفہ تمکین کاظمی، ص ۲۸۵)

حکیم برہم (تلمیذ امیر مینائی) نے ایک استفسار کے جواب میں، رسالۂ اصلاحِ زبانِ اُردو کے سلسلے میں لکھا تھا:

"مولّف نے "تابعدار" کو بھی غلط بتایا ہے۔ یہ لفظ بھی اب زبان سے جدا نہیں ہو سکتا۔ احتیاط کرنے کا ہر شخص کو اختیار ہے جس کو تقوا کہتے ہیں، مگر ترک کا فتوا دینا بہت دشوار ہے" (مکتوبِ برہم بہ نام صفدر مرزا پوری۔ مرقعِ ادب جلدِ دوم، ص ۵۵)

تنقید: "تنقید عربی میں نہیں آیا ہے، اُردو والے نقد و انتقاد کی جگہ کہتے ہیں۔ اس سے احتراز چاہیے، اس لیے کہ یہ غلط ہے۔" (قاموس)

نیاز صاحب بھی اس لفظ سے خفا تھے اور میرا خیال ہے کہ اُن کی یہ خفگی، مولفینِ قاموس کی تقلید کا نتیجہ تھی۔ سیماب اکبرآبادی نے ایک مصرعے میں اِس لفظ کو استعمال کیا تھا: "ہے غلط تنقید، مہمل طعنۂ بے جا ترا" نیاز صاحب نے اس کے متعلق لکھا تھا:

""تنقید" غلط ہے۔ عربی میں نقد و انتقاد تو آتا ہے، لیکن بابِ تفعیل سے "تنقید" کبھی استعمال نہیں کرتے۔" (انتقادیات اول ص ۲۷)

لیکن اِس لفظ کی ہمہ گیری کو کیا کہا جائے کہ خود نیاز صاحب نے اس کو متعدد جگہ استعمال کیا ہے، مثلاً:

"جب ہم کسی شاعر کے متعلق تنقید کریں" (مقدمۂ ریاضِ رضواں ص ۵۳)

"اگر کوئی تنقید ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اچھی لکھی گئی ہے یا بُری "

(استفساریات، جلد اوّل ص ۲۷)

یہ لفظ "نقد" اور "انتقاد" کے مقابلے میں کہیں زیادہ مستعمل ہے اور مستعمل رہے گا اور رہنا چاہیے۔

اِس لفظ کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ یہ صرف اردو میں مستعمل ہے، مگر فارسی کی دو جدید فرہنگوں میں اس کا موجود ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ فارسیِ جدید میں یہ لفظ مستعمل ہے۔ (۱) حییم نے اپنے لُغت میں اس کو درج کیا ہے۔ (۲) فرہنگِ امیر کبیر میں بھی یہ موجود ہے اور اس وضاحت کے ساتھ:

"تنقید" عیب جوئی کردن، خردہ گیری بر نوشتہ یا کتاب، تمیز دادنِ خوب و بد۔ در عربی از بابِ تفعیل نیامدہ است"

آخری جملے سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ فارسی میں مستعمل ہے۔

یہ لفظ فارسی کی طرح اردو میں بھی، اصل معنی کے ساتھ ساتھ، مطلق عیب جوئی یا نکتہ چینی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے:

اے مسلکِ صفی پر تنقید کرنے والو ۔۔۔ بے چارہ تھا غنیمت، اچھا تھا یا بُرا تھا

صفی لکھنوی (دیوانِ صفی ص ۱۹)

قاضی عبدالودود صاحب نے اِس لفظ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، اِس سے معلوم ہوگا کہ یہ لفظ بہت زمانے سے فارسی میں مستعمل ہے:

"تنقید، لیکن جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، یہ جعلی مصدر ہے جس سے عرب واقف نہیں۔ اس کے استعمال کی قدیم ترین مثال جو میرے علم میں ہے، ضیا برنی، معاصرِ خسرو کی تاریخ فیروز شاہی میں ملتی ہے: "در تنقید روایات و تعریفِ رواۃ" (ص ۱۰) شیرانی مرحوم نے ضمیمۂ

تنقیدِ شعر العجم (ص ۵۵۲) میں عبداللہ خاں اوزبک کے ایک درباری پایندہ محمد فنائی تخلص کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جس کا تاریخی نام تنقید الدرر ہے (۹۹۹ھ)۔ فہرستِ کتب خانۂ محمدیہ بمبئی (ص ۵۷۹) میں ایک کتاب تنقید الکلام المنسوب الیٰ غوث الانام ہے۔ اس کے مصنف کا نام حافظ ابوالاحیا محمد نعیم ہے اور مطبع نولکشور میں ۱۲۸۲ھ میں طبع ہوئی تھی۔

اِن مثالوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ بعض اصحاب کا یہ خیال کہ شبلی اس لفظ کے موجد ہیں، صحیح نہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اِس لفظ کو انھوں نے زندہ کیا ہے۔ اردو میں عام استعمال اُن کی بدولت ہوا ہو تو عجب نہیں۔ زمانۂ حال کے ایرانی مصنفین (مثلاً آقای پور داؤد) کے یہاں یہ لفظ ملتا ہے، مگر میرا خیال ہے کہ یہ اردو کا اثر ہے۔" (مجلّۂ معاصر ۱ ص ۱۳۵)

آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں یہ لفظ موجود ہے مگر مولف نے اس کو عربی لکھا ہے اور یہ درست نہیں۔

جواہرات : "جواہرات، غلط ہے۔ اس کی جگہ جواہر (جمع جوہر) کہنا کافی ہے۔ اردو میں جواہر کا اطلاق مفرد پر بھی ہوتا ہے؛ اس لیے اس کو مفرد سمجھ کر، جواہرات جمع بنالی ہے جو قابلِ ترک ہے۔" (قاموس)

اِس لفظ کو قابلِ ترک قرار دینا، خوش مذاقی کی جان پر ستم کرنا ہے۔ بہت سے جملے ایسے ملیں گے جن میں "جواہرات" کے بجائے "جواہر" لایا جائے تو جملے کے حسن اور مفہوم کی پُرکاری، دونوں پر حرف آ جائے گا۔ "جواہرات" میں صوتی اور معنوی پُرکاری کے لحاظ سے جو خوبی ہے، وہ "جواہر" میں نہیں۔ امیر مینائی نے اپنے شاگرد حکیم برہم کے ایک استفسار کے جواب میں لکھا تھا :

"جواہرات" بہ کثرت مستعمل ہے۔ اب اس کو داخلِ زبان سمجھنا چاہیے"

(مکتوب بہ نام صفدر مرزاپوری، مرقعِ ادب دوم ص ۵۵)

آصفیہ و نور میں، یہ لفظ موجود ہے، مگر دونوں میں سند نہیں ملتی۔ بعض مثالیں لکھی جاتی ہیں:

جو شخص ہے اُس جگہ پہ جاتا
ڈھیروں ہے جواہرات پاتا

نسیم (گلزارِ نسیم مرتبہ چکبست ص ۲۲)

دیکھے جو جواہرات کے ڈھیر
سب من کی ہوس سے ہوگئے سیر

نسیم (گلزارِ نسیم مرتبہ چکبست ص ۲۷)

"اگرچہ اِن شعروں میں اور اُن شعروں میں جو نسبت ہے، وہ ان جواہرات کے پرکھنے والے ہی جانتے ہیں" آزاد (آبِ حیات، ترجمۂ آتش) ــــ

"جس میں وقت کے محاورے نے اپنے جواہرات خرچ کیے تھے"

آزاد (آبِ حیات، ترجمۂ ولی)

"جھاڑوں میں مروارید و جواہرات جھلمل کرتے"

(دربارِ اکبری، شائع کردہ مکتبۂ کلیاں لکھنؤ ص ۱۶)

"اکسیر کو خاک، جواہرات کو پتھر، موتی کو سیپ ... کے برابر بھی لوگ نہیں جانتے"

غلام غوث بے خبر (انشائے بے خبر، شائع کردہ ادبی دنیا، علی گڑھ ص ۱۲)

"اور کہتے ہیں، اُن کے ساتھ جس قدر جواہرات تھا، سب دولتِ نیپال کی نذر ہوا"

شرر (گذشتہ لکھنؤ، گیلانی پریس لاہور ص ۷۳)

اُردو میں عام طور پر جمع الجمع کو اچھا نہیں سمجھا جاتا، جیسے القابوں، القابات، الفاظوں، احبابوں، علماؤں، اشعاروں (وغیرہ) بل کہ یوں کہیے کہ صحت اور فصاحت، دونوں کے خلاف قرار دیا گیا ہے اور ٹھیک بھی ہے، مگر "جواہرات" کو استثنا سمجھنا چاہیے۔ کثرتِ استعمال نے جواز کا حقدار بنا دیا ہے۔ لیکن دوسرے الفاظ کو اس پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

قاعدے کے لحاظ سے "جوہر" کی جمع " جواہر" بکسرِ [ہ] آنا چاہیے، لیکن شعرا نے اس کو بہ فتحِ [ہ] بھی نظم کیا ہے، مثلاً:

مہر کی تجھ سے توقع تھی، ستم گر نکلا — موم سمجھے تھے ترے دل کو، سو پتھر نکلا
گنج کاوی جو کی سینے کی غمِ ہجراں نے — اس دفینے میں سے اقسامِ جواہر نکلا

میر (کلیات مرتبہ آسی ص ۲۰)

جب کہے موردِ تحسین میں اکثر اشعار — کہا اُستاد نے مجھ سے مرے سُن کر اشعار
ان نصائح کی سند پھر ز کلامِ عُرفی — لائے وہ میرے لیے بہر جواہر اشعار

سودا (کلیات، نولکشور ص ۳۱۹)

مولفِ نور نے " جواہر" کی ایک دوسری جمع الجمع " جواہروں" کے متعلق لکھا ہے کہ " جواہروں متروک الاستعمال ہے" لیکن اس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

سینہ، علومِ مہر و وفا کی کتاب ہے — گویا کتابِ حُسن کا ایک ایک باب ہے
فقرہ ہر ایک منتخب و لاجواب ہے — اللہ رے مرتبہ، نظر اُس پر ثواب ہے

ہے صدقِ معرفت سے یہ سینہ بھرا ہوا
یا ہے جواہروں سے خزینہ بھرا ہوا

شاد عظیم آبادی (مراثیِ شاد اول ص ۹۵)

مندرجۂ بالا مصرعے میں یہ جمع اس طرح آئی ہے کہ پوری طرح کھپ گئی ہے؛ اس لیے اسے متروک الاستعمال قرار دینا کچھ ضروری نہیں۔ محلِ استعمال کے لحاظ سے فصاحت و عدمِ فصاحت کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے، دوسرے الفاظ کی طرح۔

راشی: مُعرّاشی: رشوت دینے والا۔ مرتشی: رشوت پانے والا۔

مرتشی کی جگہ راشی کہنا غلط ہے۔" (قاموس)

مولفِ نور کی بھی یہی رائے ہے: "رشوت لینے والے کو "راشی" کہنا غلط ہے۔ اس کے واسطے "مرتشی" صحیح ہے"۔ آصفیہ میں بھی "راشی" کو رشوت لینے والے کے معنی میں "غلط العوام" لکھا گیا ہے۔

عربی کے لحاظ سے صحیح بات وہی ہے جس کو مولفین لغات نے لکھا ہے یعنی "راشی" کے معنی ہیں: رشوت دینے والا۔ اور رشوت لینے والا "مرتشی" ہے۔ لیکن اردو میں "راشی" رشوت لینے والے کے معنی میں مستعمل عام وخاص ہے۔ "یہ حاکم بہت راشی ہے" اس کے بجائے "یہ حاکم بہت مرتشی ہے" کہیے تو خود یہ خود اندازہ ہو جائے گا کہ اردو میں صحیح صورت کیا ہے۔ عام طور پر لوگ رشوت خور شخص کو "راشی" کہتے ہیں اور لفظ "مرتشی" سے عام لوگ واقف نہیں، نہ اِس معنوی فرق سے واقف ہیں، اور ناواقف ہی رہیں تو اچھا ہے۔ آصفیہ میں "راشی" کو رشوت لینے والے کے معنی میں "غلط العوام" لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے کبھی یہ صورت ہو، مگر اب تو یہ "غلط العام" کے ذیل میں آتا ہے اور اِس نسبت سے اِس معنی میں یہی فصیح ہے۔ اردو کے لیے لفظ "مرتشی" بالکل اجنبی ہے۔ ہاں، قدیم تصنیفات میں لفظ "مرتشی" رشوت لینے والے کے معنی میں کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ ابن الوقت میں بھی ایک جگہ موجود ہے: "مرتشی بنا دیا، تمام تر بہتان" (ص ۲۹۶)۔ اور بھی بعض مثالیں مل سکتی ہیں؛ مگر اب یہ بالکل غیر مستعمل ہے اور اس کی جگہ "راشی" بولا جاتا ہے۔

ردّی: "ردی، خراب، ناکارہ، نکما، بگڑا ہوا۔ بہ تشدیدِ دال کہنا غلطی ہے۔" (قاموس)۔

عربی میں اِس لفظ کی صحیح صورت یہی ہے (ردیء)۔ لیکن مولفین نے اِس پر غور نہیں فرمایا کہ بے کار یا خراب کتاب، بے کار کاغذ، پرانے اخبار (جن کو فروخت کیا جاتا ہے) اِن

سب کو " ردّی " ہی کہا جاتا ہے۔ اکبر کے اِس شعر میں :

مرزا غریب چُپ ہیں، اُن کی کتاب ردّی　　　بڈھوا کڑ رہے ہیں، صاحب نے یہ کہا ہے

" ردّی " کی جگہ کسی طریقے سے " ردی " لا کر دیکھیے، شعر ہی ردّی ہو جائے گا۔ یہی صورت حالی کے اِس بند کی ہے :

وہ تقویم پارینہ یونانیوں کی　　　وہ حکمت کہ ہے ایک دھوکے کی ٹٹی

یقیں جس کو ٹھہرا چکا ہے نکمّی　　　عمل نے جسے کر دیا آ کے ردّی

(مسدسِ حالی، تاج کمپنی لاہور، ص ۶۷)

مولفِ نور اللغات نے اصل لفظ لکھ کر " ردّی " (بہ تشدیدِ دال) بھی لکھا ہے اور اس کو اُردو مانا ہے۔ مولفِ آصفیہ نے صراحت بھی کر دی ہے کہ، " اردو میں بہ تشدیدِ دال بولتے ہیں " یہ صحیح طریقہ ہے۔

ہاں، اُردو شعرا نے ردی (بغیر تشدید) بھی نظم کیا ہے، جیسے :

مانا مری حالت اب ردی ہے　　　بہتر ہے وہی جو کچھ بدی ہے

(مثنوی گلزارِ نسیم مرتبہ چکبست ص ۳۷)

ردی جب ہوا دفترِ آفتاب　　　کھلا دفترِ امتحانِ حساب

(کلیاتِ نعتِ محسن (کاکوروی) نامی پریس، ص ۱۶۷)

لیکن اس طرح کم استعمال میں آیا ہے۔ اس لفظ کی دونوں صورتوں (ردی، ردّی) کو صحیح ماننا چاہیے۔ جیسا محل ہو ویسا ہی لفظ منتخب کیا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ جس مفہوم کو پُرطاقت انداز سے اردو لفظ " ردّی " ادا کرتا ہے، وہ اُس کی نیم عربی صورت " ردی " سے ممکن نہیں (عربی میں " ردیؔ " ہے)۔ فوربس اور پلیٹس نے بہ تشدیدِ دال (ردّی) کو فارسی لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ بہ دالِ مشدّد، اُردو کا تصرف ہے۔

ذہانت : یہ لفظ چوں کہ عربی کے کسی لغت میں نہیں پایا جاتا، اِس لیے مولفینِ قاموس نے اِس کو ترک کرنے کی فرمایش کی ہے۔ کیسا اچھا اور جامع لفظ ہے، اور اس کو گردن زدنی قرار دیا گیا ہے! مولانا نظم طباطبائی نے بھی اپنے مقالے " ادب الکاتب والشاعر" میں "ذہانت" کا شمار اُن الفاظ میں کیا ہے جن سے دامن بچانا واجب ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ فیلن و پلیٹس نے بھی اِس کو شاملِ لغت نہیں کیا ہے۔ نور میں یہ لفظ موجود ہے، لیکن اسناد مذکور نہیں۔ ذیل میں کچھ اسناد لکھی جاتی ہیں،

"وہ خود بھی ذہانت میں دو شخصوں کے سوا کسی ہم عصر کو تسلیم نہ کرتے تھے۔"

محمد حسین آزاد (آبِ حیات، ترجمۂ مومن)

"اپنی طباعی اور ذہانت کا نشانہ نہ بناتے" حافظ محمود خاں شیرانی،

(مکتوبِ شیرانی صاحب، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر)

"ذہانت کے لیے بڑا میدان شعر و شاعری کا تھا" مولانا عبدالماجد دریا بادی،

(انشائے ماجد دوم، ص ۲۱۳)

"اُن کی ذہانت اور محنت کو دیکھا" ڈاکٹر عبدالستار صدیقی،

(نوائے ادب (بمبئی) اپریل ۱۹۶۱ء، ص ۱۴)

"ذہانت" ہی کی قبیل کا ایک اور لفظ بادشاہت ہے۔ مولفینِ قاموس نے اس کو بھی "عوام سے متعلق کر دیا ہے،" "بادشاہت، عوام بادشاہی کی جگہ کہتے ہیں" (قاموس)۔ صاحبِ آصفیہ نے بھی اِس کو "عوام" کا لفظ بتایا ہے۔ یہ فتوا بالکل صحیح نہیں۔ یہ لفظ مستعمل عام و خاص ہے۔ اثباتِ مدعا کے لیے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

بادشاہت پہ اُنھی لوگوں کی غش ہوں میں تو گلا تو اوجڑ بھی کوئی جن کے تصرف میں نہیں

انشا (کلامِ انشا، ص ۱۶۶)

ہو مے معشوق کے دروازے پہ نوکر عاشق　　　بادشاہت ہے اگر عہدۂ دربانی میں
انشا (کلامِ انشا ، ص ۸۹)

کھلونا آنکھوں میں اپنی ہر اک غزال ہوا　　　جنوں میں عالمِ طفلی کی بادشاہت کی
آتش (کلیات نولکشور ص ۸۹)

" اور بھی ریاستیں دیکھیں، بادشاہت بھی دیکھی "۔ داغ (زبانِ داغ ، ص ۱۵۲)

باغ و بہار مرتبۂ مولوی عبدالحق (شائع کردۂ انجمن ترقیِ اردو ہند) میں صفحات ۵، ۶، ۹، ۱۰، ۳۶، ۵۶، ۶۸، ۷۵، ۱۷۰، ۱۸۵، ۱۹۹، ۲۰۳، ۲۱۵، ۲۲۵ پر یہ لفظ موجود ہے۔
میرا خیال ہے کہ اثباتِ مدعا کے لیے یہ مثالیں ہی کافی ہیں۔

اُردو میں بہت سے عربی و فارسی اور ہندی الفاظ کے آخر میں "تاے مصدری یا یّت" کا اضافہ کر لیا گیا ہے، جیسے ، یگانگت ، دیہاتیت ، چودھرایت ، اپنایت ، بازاریت، چاہت ، رنگت ، ملایمت ، یکسانیت وغیرہ۔ اردو سے پہلے فارسی میں یہ طریقہ مستعمل رہا ہے۔ عربی و فارسی کے بہت سے لفظوں سے 'عربی مصادر کے انداز پر الفاظ بنا لیے گئے ہیں' جیسے ، فلاکت ، نزاکت ، حمازت وغیرہ۔ اس قبیل کے سب لفظ بالکل صحیح ہیں اور فصیح بھی ہیں۔

مُفَاعَلَت

کے وزن پر سارے الفاظ بہ فتحِ حرفِ چہارم صحیح ہیں۔" (قاموس)

اِس میں شک نہیں کہ عربی کے لحاظ سے اس وزن پر آنے والے الفاظ بہ فتحِ حرفِ چہارم ہی صحیح ہیں، جیسے ؛ مُبالَغہ ، مُشاعَرہ ، مُشاہَدہ وغیرہ ؛ مگر اُردو میں ایسے اکثر الفاظ بہ کسرِ حرفِ چہارم زبان زد ہیں۔ اِن کو اگر لغت کے مطابق ادا کیا جائے تو ثقالت کا شدید احساس ہوگا۔ کوشش کر کے، کچھ رُک کر، اور گفتگو کی روانی کو ختم کر کے، اِن کو بہ فتحِ حرفِ چہارم بولا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک مصدر ہے ، معالجہ ، "علاج معالجہ" زبان زد مرکب ہے ؛

اب اِس کو لُغت کے مطابق بہ فتحِ حرفِ چہارم بول کر دیکھیے، روانیِ کلام خود بہ خود مجروح ہو جائے گی۔ ایسے الفاظ کی (ناتمام) فہرست یہ ہے:

"مبالغہ، محاربہ، محاسبہ، مراقبہ، مطائبہ، مباحثہ، معالجہ، مجاہدہ، مشاہدہ، محاصرہ، معاہدہ، مشاہرہ، مناظرہ، موازنہ، مناقشہ، مغالطہ، ملاحظہ۔ مرافعہ، معانقہ، مضائقہ، مجادلہ، مقابلہ، مکالمہ۔

مراسلت، مخاطبت، مصاحبت، مکاتبت، مناسبت، مسامحت، مصالحت، مناکحت، مباشرت، مسافرت، مشاورت، معاشرت، منافرت، مہاجرت، موانست، مجالست، محافظت، متابعت، مجامعت، مدافعت، مراجعت، ممانعت، منازعت، مخالفت، مطابقت، مفارقت، منافقت، موافقت، مشارکت، مداخلت، مواصلت، مخاصمت، مزاحمت، مشایعت۔

اس سلسلے میں یہ پہلو بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ مندرجۂ بالا الفاظ میں سے بعض کے تلفظ میں کبھی کبھی ایک یہ صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ بولنے میں حرفِ چہارم کا زیر واضح طور پر ادا نہیں ہوتا اور نہ پوری طرح سکون کی کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔ سکون اور زیر کی درمیانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک لفظ ہے: مقابلہ، گفتگو میں ب کا زیر واضح نہیں ہوتا، بل کہ زیر اور سکون کی ملی جلی کیفیت نمایاں رہتی ہے۔ مگر یہ صورت صرف بول چال سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر ایسے الفاظ پر اعراب لگائے جائیں تو اُس صورت میں حرفِ چہارم پر کسرہ ہی لگانا چاہیے۔

ہاں، فارسیِ امروزہ میں' ایسے الفاظ میں یہ تغیر ہو چکا ہے'، یعنی حرفِ چہارم کا فتحہ' کسرے سے بدل گیا ہے۔ مولّفِ فرہنگِ آموزگار نے ایک عنوان قائم کیا ہے:

"تغیرات مبہم کردر لغاتِ عربی دادہ شد"؛ اُس کے ذیل میں لکھا ہے: "و تغیراتِ حرکت مانندِ مبارزہ، مباحثہ، مغالطہ؛ با کسرۂ حرفِ چہارم بجای فتحہ" (فرہنگِ آموزگار)

بابِ مفاعلۃ سے دو مصدر "مصافحہ" اور "مطالعہ" بھی آتے ہیں۔ ان کو اوپر کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ یہ دونوں لفظ ایک اور طرح بھی بول چال میں آتے ہیں، یعنی حرفِ چہارم مفتوح اور حرفِ پنجم ساکن (مصافحہ، بروزنِ لفافہ)۔ جس طرح "قلعہ" کے لام کو (جو اصلاً ساکن ہے) مفتوح کر کے، عین کو ساکن کر دیتے ہیں، اور "قلعہ" بروزنِ مستفع بولتے ہیں۔ یا "قلعی" کو (جو اصلاً بروزنِ فعلن ہے) بروزنِ فَعَل بولتے ہیں؛ اسی قسم کا تصرف "مصافحہ" اور "مطالعہ" میں ہوا ہے۔ گفتگو میں عام طور پر یہ دونوں الفاظ بروزنِ فعولن مستعمل ہیں۔ اِن لفظوں کے اس تلفظ کو بھی صحیح مان لینا چاہیے۔

یہاں پر ایک نکتہ توجہ طلب ہے: آتش اور ولی کے درجِ ذیل اشعار میں لفظ "مطالعہ" اِسی طرح نظم بھی ہوا ہے:

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا
ہے مطالعہ مطلعِ انوار کا
(کلیاتِ ولی، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ص ۷۰)

لکھے ہیں سرگذشتِ دل کے مضموں ایک قلم سر میں
تماشا قتل گہ کا ہے، مطالعہ میرے دیواں کا
(کلیاتِ آتش، نول کشور پریس، ص ۶۷)

بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اِن شعروں میں دونوں شاعروں نے غلطی سے "مطالعہ" کو "مطالع" نظم کیا ہے۔ لیکن یہ غلطی نہیں، رواجِ عام کی پیروی ہے۔ اِن شعروں میں اس لفظ کو لکھا تو جائے گا اصل کے مطابق یعنی "مطالعہ" مگر پڑھنے میں تلفظ "مطالع" بروزنِ فعولن آئے گا۔ یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ اس لفظ کے اِس طرح تلفظ ہونے سے [illegible] کا [illegible] ہرگز نہیں [illegible]۔ [illegible] "[illegible]" کو بھی، اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اِس قبیل کے چند لفظ اور بھی ہیں، جیسے، قلعہ، قلعی، رقعہ۔

مؤلفینِ قاموس نے "قلعہ" کو بہ فتحِ اول و سکونِ دوم لکھا ہے، اور بہ فتحِ لام کو غلط بتایا ہے۔ بہ لحاظِ لغت یہ بالکل صحیح ہے، لیکن بول چال میں یہ لفظ بہ کسرِ اول و فتحِ ثانی بر وزنِ ضلع آتا ہے۔ اس کو بھی صحیح مان لینا چاہیے۔ آصفیہ میں اس کو بہ فتحِ اول و بہ کسرِ اول، دونوں طرح لکھا گیا ہے اور دونوں صورتوں میں اس کو عربی مانا ہے۔ یہ درست نہیں۔ کسرہ، اردو کا اثر ہے۔ اِس غلطی کے ذمے دار اصلاً مولفِ غیاث اللغات ہیں۔ انھوں نے اِس کو بہ فتحِ اول و سکونِ لام لکھ کر، آخر میں لکھ دیا ہے، " در منتخب بکسرِ اول"۔ صاحبِ منتخب اللغات پر یہ اتہام ہے کہ انھوں نے اس لفظ کو بکسرِ اول بھی لکھا ہے۔ منتخب میں لفظ "قلعہ" کے ذیل میں فتحہ یا کسرے کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اِس لفظ کے ذیل میں صرف یہ عبارت ملتی ہے: "قلعہ۔ ابر بارہ و حصار کہ از سنگ ساختہ باشند" (منتخب اللغات، مطبعِ احمدی کانپور، اشاعتِ سوم)۔ آصفیہ میں لفظ "قلعہ" کے ق پر زبر اور زیر، دونوں اعراب لگے ہوئے ہیں، مگر اس کے مرکبات (جیسے قلعہ دار وغیرہ) میں ق پر صرف زیر لگا ہوا ہے، البتہ ل پر ہر جگہ جزم بنا ہوا ہے۔ یہ صورت تلفظ کی پوری طرح نمایندگی نہیں کرتی۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، بول چال میں یہ لفظ بہ کسرِ قاف و فتحِ لام بھی آتا ہے اور عام لوگ اسی طرح استعمال کرتے ہیں — فلیکس اور فیلن نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے کہ اس لفظ کے اصل اعراب لکھ کر، مزید لکھا ہے کہ مقبولِ عام تلفظ qila ہے۔ یہ صحیح صورت ہے۔ نظم میں تو یہ اصل تلفظ کے مطابق آ سکتا ہے، آیا بھی ہے؛ مگر گفتگو میں اُس کی پابندی نہیں کی جا سکتی؛ اس بنا پر اس لفظ کی دونوں صورتوں کو صحیح مان لینا چاہیے، یعنی قَلْعَہ بروزنِ فعلن، اور قِلَعہ، بروزنِ فِعَل — ہاں، اس کی صراحت کر دی جائے کہ بہت سے لوگ گفتگو میں بھی ق کو مفتوح رکھتے ہیں، یعنی "قَلَعہ" بروزنِ فَعَل کہتے ہیں۔ مناسب یہ ہوگا کہ اِس لفظ کی اِن سب صورتوں کو درجِ لغت کر لیا جائے، یعنی: قَلْعَہ، قِلَعَہ اور قَلَعہ (بروزنِ فَعَل)۔ اور "قَلْعَہ" کو عربی سے

مخصوص سمجھا جائے۔

قلعی : یہ لفظ بہ لحاظِ اصل بروزنِ فعلن ہے۔ اِس طرح نظم بھی کیا گیا ہے، جیسے :

گرد جی کوئی اُڑ سکتے ہیں، کُھل جائے ابھی قلعی
جو ہم ترکیب دیویں نقرۂ مہتاب کا گُٹکا

انشا (کلامِ انشا ، ص ۲۹)

مری آنکھوں سے اِس آئینے کی صورت نہ دیکھے گا
کُھلے گی حُسن کی قلعی جو کوئی تیغ بیں آیا

آتش (کلیات ، ص ۶۲)

مگر بول چال میں بروزنِ فَعَل آتا ہے، اور یہی کانوں کو اچھا لگتا ہے۔ اِس لفظ کی بھی اِن دونوں صورتوں کو صحیح مان لینا چاہیے۔ ہاں، یہ واضح کر دیا جائے کہ اِس کو بول چال کے مطابق، بروزنِ فَعَل نظم بھی کیا گیا ہے :

دیکھ کر رخسار تیرے کی صفا
آئنے کی یاں اُکھڑتی ہے قلَعی

درد (دیوانِ درد، مکتبہ جامعہ دہلی ص ۲۵)

کیا ہی مکھڑا ہے وہ کہ جس کے حضور
آئنے کی قلَعی اُکھڑتی ہے

قائم (دیوان مرتبہ خورشید الاسلام ص ۱۸۵)

رقعہ : اصل کے لحاظ سے یہ بہ ضمِ اوّل و سکونِ دوم و فتحِ سوم ہے (رُقْعَہ)۔ اُردو میں زبانوں پر بہ تشدیدِ قاف ہے۔ مولفِ غیاث اللغات نے خاص طور پر لکھا ہے کہ، "مردم از بے اتفاقی کہ بہ تشدیدِ قاف بدونِ عین خوانند، غلط" مگر یہ غلطی اُردو میں قبولِ عام کی سند حاصل کر چکی ہے اور اس حد تک کہ اب اس لفظ کو لُغت کی رعایت سے بہ سکونِ قاف و بہ فتحِ عین بولنا، غلطی کرنا ہے۔ صاحبِ نور اللغات نے استعمالِ عام کا احترام کیا ہے، اصل حرکات لکھ کر صراحت کی ہے کہ، "بول چال میں بیشتر بہ تشدیدِ دوم

وحذفِ عین یعنی رُقّہ ہے ۔" البتہ صاحبِ آصفیہ نے استعمالِ عام سے سروکار نہیں رکھا ہے، اور وہی عربی کی اصل حرکات درج کی ہیں۔ معانقہ، مطالعہ اور قلعہ کی طرح اِس لفظ کی بھی دونوں صورتوں کو درجِ لُغت رکھنا چاہیے۔ املا تو ایک ہی رہے گا، وہ تو کسی صورت میں نہیں بدلے گا۔ نظم میں کوئی چاہے تو اصل کی رعایت سے استعمال کرسکتا ہے البتہ گفتگو میں وہی صورت رہے گی جس کی صراحت کی گئی ہے۔

تعین ۔ تعینات ۔ تعیناتی : تعیّن اور تعیین، عربی کے دو مصدر ہیں، اِن کی جمع تعیّنات اور تعیینات آتی ہے۔ ان کے انداز پر دو نئے لفظ بن گئے، تعینات اور تعیناتی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ "تعینات" اردو میں بنا ہے، مگر ہندستانی فارسی دانوں کی کتابوں میں اس لفظ کا وجود، اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ لفظ یہاں بہت پہلے بن چکا تھا۔ دو کتابوں سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

"بار دیگر اُمرا کہ تعیناتِ صوبۂ دکن بودند" (جہانگیر نامہ ص ۱۸۳)

"و فردای آں دستک بنام جمیع منصب داران تعینات آنجا کردند"

(ذخیرۃ الخوانین جلد اول ص ۱۴۴)

اِن کتابوں میں یہ لفظ بار بار آیا ہے، مثلاً ذخیرۃ الخوانین کی پہلی جلد میں یہ لفظ صفحات ۱۵۹، ۱۸۵، ۱۸۸، ۱۹۶، ۱۹۹، ۲۰۶، ۲۲۱، ۲۴۳ پر بھی موجود ہے۔

مولفینِ قاموس نے لفظ "تعیّن" کے ذیل میں لکھا ہے، "اِسی سے تعینات اور تعیناتی بنا لیا ہے جو غلط ہے۔" مندرجۂ بالا اسناد کی روشنی میں خود یہ قول غلط قرار پاتا ہے۔ صاحبِ نوراللغات نے لکھا ہے کہ، "اُردو میں تعینات بروزنِ رسیدات، بہ معنیِ مقرر، مسلّط مستعمل ہے۔" مگر عام بول چال میں "تعینات" کی ع، ی سے اِس طرح مخلوط ہو جاتی ہے کہ علاحدہ آواز نہیں دیتی، اِس لیے بروزنِ

رسیدات" سے تلفظ کی صحیح طور پر نشان دہی نہیں ہوتی۔ یہ لفظ بر وزنِ "خیرات" بولا جاتا ہے اور یہی فصیح تلفظ ہے۔ یہی صورت "تعیناتی" کی ہے۔ اِن دونوں لفظوں میں بھی ع کا وہی حال ہوا ہے جو رقعہ، قلعہ اور مطالعہ میں ہوا ہے کہ املا میں وہ موجود ہے، مگر تلفظ میں نمایاں نہیں ہوتا۔

صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے اِن دونوں لفظوں کو "غلط العوام" میں شامل کیا ہے۔ مولفینِ قاموس کے اُس فیصلے کی طرح مولفِ آصفیہ کی اِس رائے کو بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ لفظ "تعینات" ہندستان میں اُردو سے پہلے فارسی میں رائج ہو چکا تھا۔ اُردو میں بھی خواص و عوام سبھی کا مستعمل ہے۔ "تعینات" کی طرح "تعیناتی"[1] بھی اُردو میں عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے:

"وہ بولے کہ بادشاہ نے تمھارے استقبال کے واسطے ہمیں تعینات کیا ہے۔"
میرامّن (باغ و بہار، مرتبہ ڈنکن فوربس ص ۲۴۳)
"اور لڑاکی فوج جنّوں اور عفریتوں اور پری زادوں کی تعینات کی۔"
(" " " " ص ۲۵۶)
"اور آدمی ہر عہدے کے تعینات ہیں کہ خبرگیری مسافروں کی ...."
(" " " " ص ۰)
"بالفعل ان کی تعیناتی تحصیل سانپلہ ضلع رہتک میں ہوئی ہے۔"
مولانا حالی (مکاتیبِ حالی، دوم ص ۳۸۵)

صاحبِ نور اللغات نے لکھا ہے:
"تعیین .... فارسیوں نے ایک ی تخفیفاً حذف کر کے، بر وزنِ امین

---

[1] ناسخ کے شاگرد کلب حسین خاں نادر نے لکھا ہے: "اور لفظ تعیناتی بھی غلط ہے۔ بجائے اُس کے "متعیّن" کہنا چاہیے۔" [تلخیصِ معلّیٰ ص ۱۲۳]

کرلیا ہے۔ ملا طغرا :

تعیں گشت ساعاتِ بزمِ طرب　　خوشی یافت از حکمِ او روز و شب"۔

طغرا کا یہ شعر بہارِ عجم میں اِس لفظ (تعین) کی سند میں لکھا گیا ہے۔ نور میں غالباً وہیں سے نقل کیا گیا ہے۔ بہ ہر صورت، فارسی کی طرح اردو میں بھی لفظ "تعیں" مستعمل رہا ہے جیسے :

اِس ضد سے بھلا فائدہ، بنتی ہے کہیں یوں　　جو بات میں کہتا ہوں، وہ کہتے ہیں، نہیں یوں
پھرتا تھا کنھیں روزوں میں وارستہ یہ کیا دل　　اب عشق اتالیق ہوا اس پہ تعیں یوں

میر حسن (دیوان، نول کشور پریس ص ۷۵)

مگر اب یہ متروک ہے۔

تبدیلی : "تبدیل" بجائے خود مصدر ہے، بہ ظاہر اُس میں مزید یائے مصدری کا اضافہ غلط معلوم ہوتا ہے، مگر فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ایسے متعدد الفاظ میں یائے مصدری کا اضافہ کرلیا گیا ہے، اور یہ لفظ مستعمل عام و خاص ہیں۔ جیسے 'سلامتی' زیادتی، طغیانی، انکساری وغیرہ۔ ایسے کچھ لفظ فارسی سے بنے بنائے اُردو کو ملے ہیں' اور کچھ لفظ اُردو میں بنا لیے گئے ہیں۔ "تبدیل" سے "تبدیلی" بھی اِسی طرح بنا ہے۔ آصفیہ و نور دونوں میں اِس کو "غلط العوام" بتایا گیا ہے اور مولفینِ قاموس نے بھی اس پر اعتراض کیا ہے : "تبدیل خود مصدر ہے، اُس پر یائے مصدری لگانے کی کیا ضرورت ہے"۔ لیکن اِس لفظ کی ہمہ گیری کا ادنا ثبوت یہ ہے کہ آصفیہ و نور کے مولفین نے خود اِس لفظ کو استعمال کیا ہے :

"یہ اخبار ۱۸۸۳ء میں سب سے اول خاص بیگماتی زبان میں شائع ہوا اور دو برس بعد، مالک کی تبدیلی ہوجانے سے ملتوی کر دیا گیا" (آصفیہ، جلدِ اول، [illegible]

"بدل کرنا، باہم ایک دوسرے کی تبدیلی کرنا" (نور، بہ ذیلِ "تبادلہ")۔

دو چار مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں:

بن گیا قطرۂ ناچیز ترقی سے گہر　　　ذات ہے ایک، فقط نام کی تبدیلی ہے

آرزو لکھنوی (جہانِ آرزو ص ۲۳۹)

وضعِ گدا کو ننگ ہے تبدیلِ لباس　　　میں خاکسار ایک ہی چادر میں قید ہوں

آرزو لکھنوی (جہانِ آرزو ص ۹۲)

"تمھاری تبدیلی کسی پاس کے ضلعے یا کم از کم لاہور کی قسمت میں ہو جائے"

حالی (مکتوباتِ حالی مرتبہ خواجہ سجاد حسین ص ۳۶)

"حصۂ اول کی ترتیب میں کچھ تبدیلی ہوئی"　آرزو لکھنوی (مقدمۂ نظامِ اردو)

"صرف و نحو میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے"　مولوی عبدالحق (مقدمۂ باغ و بہار ص ۳)

ہاں، یہ لفظ حییم کے لغت میں موجود ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ فارسیِ جدید میں بھی یہ مستعمل ہے۔ بہ ہر طور، سلامتی و زیادتی وغیرہ کی طرح "تبدیلی" بھی صحیح اور مستعمل لفظ ہے۔

جس طرح "تبدیل" سے "تبدیلی" بنا لیا گیا ہے، اُسی طرح "تبادُل" سے "تبادلہ" بنا لیا گیا ہے اور یہ لفظ اُردو میں مستعملِ عام و خاص ہے! اور اِس حد تک کہ اب اگر کوئی شخص، لُغت کی رعایت سے، اس کے بجائے صحیح یا اصل لفظ "تبادل" استعمال کرے تو کچھ عجیب سا معلوم ہوگا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

"لفظ "تبادلہ" عربی کے لحاظ سے غلط ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہماری زبان میں صحیح ہے۔ اِس کو چھوڑ کر "مبادلہ" یا "تبادل" بلوانا زبردستی ہے.....

"تبدیل" کے مقابلے میں "تبدیلی" غلط سہی، مگر وہ ہمارے ہاں صحیح ہے"

(نقوشِ سلیمانی ص ۳۲۱)

تبادُل، تبادلہ، تبدیلی، تبدُّل، مبادلہ؛ سب لفظ کم و بیش مستعمل ہیں اپنے اپنے محل پر۔

اِس سے بحث نہیں کہ عربی کے لحاظ سے کون سا لفظ صحیح ہے۔ اُردو کے لحاظ سے یہ سب لفظ صحیح ہیں۔ "تبادلہ" کے معنی میں "بدلی" بھی مستعمل ہے، جیسے : اُن کی بدلی ہوگئی ہے۔ مکاتیبِ حالی جلد دوم میں کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے (مثلاً صفحات ۲۲۰، ۲۶۶، ۱۳۷) : "منشی موہن لال کی بدلی دلّی کو ہوگئی ہے" (ص ۲۲۰) یہ بھی اُردو کی ایجاد ہے۔

خلاصی : "خلاص" میں فارسی والوں نے یائے مصدری کا اضافہ کرکے، ایک نیا لفظ "خلاصی" بنالیا۔ اسناد بہارِ عجم میں مندرج ہیں۔ اردو میں بھی یہ لفظ مستعمل رہا ہے اور اس کا شمار مفرّس الفاظ میں کیا جائے گا۔ آصفیہ میں اِس لفظ سے متعلق درجِ ذیل عبارت ملتی ہے :

> "خلاصی"۔ ۱۔ (۱) اسم مونث۔ رہائی، نجات، آزادی، رستگاری، چھٹکارا۔ (۲) اسم مذکر۔ توپ خانے یا جہاز کے کارندے۔ خیمہ استادہ کرنے والے۔ (اِس معنی میں لوگ بہ تشدیدِ لام خلّاصی بولتے ہیں۔ اوّل معنی میں بھی غلط مشہور ہے، اگرچہ بعضے لوگوں نے اِسے ایک قسم کا تصرّفِ فارسیان قرار دیا ہے، لیکن جس حالت میں "خلاص" خود مصدر ہے تو پھر یائے مصدری لگانی خلافِ عقل ہے)۔"

مؤلف نے اِس کو اُردو مانا ہے، حالاں کہ یہ مفرّس ہے۔ پھر وہ "خلاص" میں یائے مصدری کے اضافے کو "خلافِ عقل" قرار دیتے ہیں اور اِسی لیے یہ لکھنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ "اوّل معنی میں بھی غلط مشہور ہے"۔ اِس قبیل کے الفاظ سے مؤلفِ آصفیہ واقعتاً خوش نہیں تھے۔ مثلاً لفظ "طغیانی" کے ذیل میں انھوں نے لکھا ہے :

> "چوں کہ "طغیان" خود مصدر ہے، اس میں یائے تحتانی مصدری کی ضرورت نہ تھی؛ مگر اہلِ فارس کا قاعدہ ہے کہ وہ جب تک اس قسم کے مصدروں میں اپنے

ہاں کی یائے مصدری نہ لگالیں، اُن کو چین نہیں پڑتا۔ چناں چہ فضولی، خلاصی،
سلامتی سے ظاہر ہے۔ پس اس کو فارسی صورت میں خیال کرنا چاہیے۔"

یہ دراصل ایک طرح کا تذبذب ہے کہ چوں کہ فارسی والوں نے یائے مصدریِ زائد کا اضافہ کیا ہے؛ اس لیے غلط تو کہہ نہیں سکتے، مگر یہ اضافہ خلافِ عقل بھی معلوم ہوتا ہے۔ بہ ہر حال، اب ایسے سب الفاظ کو بالکل صحیح الفاظ میں شمار کیا جائے گا۔ تبدیلی، طغیانی، خلاصی، سلامتی، زیادتی، انکساری جیسے لفظ اسی ذیل میں آتے ہیں۔ "خلاصی" رہائی، آزادی اور نجات کے مفاہیم میں معروف ہے اور جہاز یا ریل وغیرہ پر کام کرنے والوں کے معنی میں اردو نژاد ہے۔ اسی تفریق کے ساتھ اس کو درجِ لغت کیا جائے گا۔

اس قبیل کے کچھ اور لفظ بھی ہیں، جیسے، پابوسی، قدیمی، انکساری، طغیانی۔

پابوسی : "پابوسی۔ غلط۔ اس میں ی زائد ہے۔ پابوسی حاصل مصدر ہے
پھر اُس پر یائے مصدری زائد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُردو میں قدم بوس،
پابوس کہنا صحیح ہے۔ پابوس کو فارسی والے پای بوس کہتے ہیں" (قاموس)

"خلاصی" کی طرح "پابوسی" بھی فارسی سے بنا بنایا اُردو کو ملا ہے۔ تفصیل بہارِ عجم میں موجود ہے۔ فارسی میں صرف "پای بوس" مستعمل نہیں، جیسا کہ مولفین کی تحریر سے متبادر ہوتا ہے۔ وہاں پابوس، پای بوس، پای بوسی، پابوسی؛ چاروں صورتیں ملتی ہیں۔ بہارِ عجم سے سند کے شعر نقل کیے جاتے ہیں جن سے اِن چاروں صورتوں کا مستعمل ہونا معلوم ہوگا:

بپای بوس تو دست از حیاتِ خود شستم
نثار جوہر جان است ساقِ سیمیں را

(فغانی)

ادای ذوقِ پابوسی ہمیں بس | کہ رنگِ نامۂ شوقت حنایی است
(مقید بلخی)

جز اشکِ خود مقید زکس رنگی ندید | ہر چند پای بوسیِ اہلِ زمانہ کرد
(مقید بلخی)

دم عیسوی چوں معطر شدہ | بپابوسیِ دود مجمر شدہ
(ظہوری)

آب از پیِ سرو قدت می آید از فرسنگہا | وز حسرتِ پابوسِ تو سر می زند بر سنگہا
(جامی)

اردو میں "پابوسی" بہ کثرت مستعمل ہے۔ مولفِ نور نے اِس لفظ کو فارسی لکھا ہے، مگر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "اس جگہ پابوس فصیح ہے"۔ اصل میں شوق نیموی نے اپنے رسالے اصلاح میں "پابوسی" کو متروکات کے ذیل میں شامل کیا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

"پابوسی، بہ زیارت یا، انتظاری کی طرح یہ بھی غیر فصیح ٹھہرا ہوا ہے" (ص ۱۳)۔

مولفِ نور نے غالباً اُسی کے زیرِ اثر "پابوسی" کو غیر فصیح فرض کر لیا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ اساتذہ نے اِس لفظ کو استعمال کیا ہے، اور آج کل تو قدم بوس، دست بوس اور پابوس کے مقابلے میں، قدم بوسی، دست بوسی اور پابوسی زیادہ مستعمل ہیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ مولفِ نور نے "دست بوسی" اور "قدم بوسی" کو غیر فصیح نہیں لکھا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ رسالۂ اصلاح میں بھی موجود نہیں۔ ذیل میں اِن الفاظ کے استعمال کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

نہ کرتے اُس کی بہ رنگِ حنا جو پابوسی | تو شکلِ برگِ حنا یوں پِسا نہ کرتے ہم
مومن (دیوان مرتبۂ ضیا احمد بدایونی ص ۱۲۳)

ہاں کی یائے مصدری نہ لگالیں، اُن کو چین نہیں پڑتا۔ چناں چہ فضولی، خلاصی،
سلامتی سے ظاہر ہے۔ پس اس کو فارسی صورت میں خیال کرنا چاہیے۔"

یہ دراصل ایک طرح کا تذبذب ہے کہ چوں کہ فارسی والوں نے یائے مصدری زائد کا اضافہ کیا ہے؛ اِس لیے غلط تو کہہ نہیں سکتے، مگر یہ اضافہ "خلافِ عقل" بھی معلوم ہوتا ہے۔ بہ ہر حال، اب ایسے سب الفاظ کو بالکل صحیح الفاظ میں شمار کیا جائے گا۔ تبدیلی، طغیانی، خلاصی، سلامتی، زیادتی، انکساری جیسے لفظ اسی ذیل میں آتے ہیں۔ "خلاصی" رہائی، آزادی اور نجات کے مفاہیم میں متروک ہے اور جہاز پر یا ریل وغیرہ پر کام کرنے والوں کے معنی میں اردو نژاد ہے۔ اِسی تفریق کے ساتھ اس کو درج لغت کیا جائے گا۔

اِس قبیل کے کچھ اور لفظ بھی ہیں، جیسے، پابوسی، قدبوسی، انکساری، طغیانی۔

پابوسی : "پابوسی۔ غلط۔ اس میں ی زائد ہے۔ پابوس حاصل مصدر ہے، پھر اُس پر یائے مصدری زائد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُردو میں قدم بوس، پابوس کہنا صحیح ہے۔ پابوس کو فارسی والے پای بوس کہتے ہیں" (قاموس)

"خلاصی" کی طرح "پابوسی" بھی فارسی سے بنا بنایا اُردو کو ملا ہے۔ تفصیل بہارِ عجم میں موجود ہے۔ فارسی میں صرف "پای بوس" مستعمل نہیں، جیسا کہ مولفین کی تحریر سے متبادر ہوتا ہے۔ وہاں پابوس، پای بوس، پای بوسی، پابوسی؛ چاروں صورتیں ملتی ہیں۔ بہارِ عجم سے سند کے شعر نقل کیے جاتے ہیں جن سے اِن چاروں صورتوں کا مستعمل ہونا معلوم ہوگا:

بپای بوس تو دست از حیاتِ خود شستم
نثار جوہر جان است ساقِ سیمیں را

(فغانی)

ادای ذوقِ پابوسی ہمیں بس کہ رنگِ نامۂ شوقت حنائی است
(مقید بلخی)

جز اشکِ خود مقید ز کس رنگی ندید ہر چند پای بوسیِ اہلِ زمانہ کرد
(مقید بلخی)

دم عیسوی چوں معطر شدہ بپابوسیِ دود مجمر شدہ
(طغرا)

آب از پے سروِ قدت می آید از فرسنگہا وز حسرتِ پابوسِ تو سر می زند بر سنگہا
(جامی)

اردو میں "پابوسی" بہ کثرت مستعمل ہے۔ مولفِ نور نے اِس لفظ کو فارسی لکھا ہے، مگر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "اس جگہ پابوس صحیح ہے"۔ اصل میں شوق نیموی نے اپنے رسالے اصلاح میں "پابوسی" کو متروکات کے ذیل میں شامل کیا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

"پابوسی، بہ زیادتِ یا، انتظاری کی طرح یہ بھی غیر فصیح ٹھہرا ہوا ہے" (ص ۱۳)۔

مولفِ نور نے غالباً اُسی کے زیرِ اثر "پابوسی" کو غیر فصیح فرض کر لیا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ اساتذہ نے اِس لفظ کو استعمال کیا ہے، اور آج کل تو قدم بوس، دست بوس اور پابوس کے مقابلے میں، قدم بوسی، دست بوسی اور پابوسی زیادہ مستعمل ہیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ مولفِ نور نے "دست بوسی" اور "قدم بوسی" کو غیر فصیح نہیں لکھا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ رسالۂ اصلاح میں بھی موجود نہیں۔ ذیل میں اِن الفاظ کے استعمال کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

نہ کرتے اُس کی بہ رنگِ حنا جو پابوسی تو شکلِ برگِ حنا یوں پسا نہ کرتے ہم
مومن (دیوان مرتبہ ضیا احمد بدایونی ص ۱۲۳)

دست بوسی پر کرو ہاں قتل اپنے ہاتھ سے
سچ تو کہتے ہیں، قبول انصاف غیر وں کا ہمیں
(" " ص ۱۴۴)

تیری پا بوسی سے اپنی خاک بھی مایوس ہے
نقشِ پا پر نقشِ پا، ظالم کفِ افسوس ہے
(" " ص ۱۹۴)

سر ترے کشتے کا دیکھے گا نہ ہرگز روے خاک
لے اُڑے گا شوقِ پا بوسی اُسے جلاد کا
ذوق (دیوان مرتبۂ آزاد ص ۹۲)

دست و بازو کے تصور میں ہوا آتش میں قتل
پاے بوسی کی ہوس نے خاک سے یکساں کیا
آتش (کلیاتِ نول کشور پریس ص ۷)

رنگ جو جو کچھ کر چاہیں لائیں بن میں آبلے
پاے بوسی کو ترستے تھے وطن میں آبلے
(" " ص ۲۳۵)

لو مبارک ہو قدم بوسیِ حضرت محسن
کس کو ہوتی ہے نصیب ایسی سعادت محسن
محسن کاکوروی (کلیاتِ نعت محسن ص ۴۴)

وہ افتخارِ خضر جو پہنچا میانِ آب
دوڑے حباب بہرِ قدم بوسیِ جناب
شاد عظیم آبادی (مراثیِ شاد، اول ص ۶۷)

جان کر سوتا تجھے، وہ قصدِ پا بوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر، وہ مسکرانا یاد ہے
حسرت موہانی (کلیات، طبع لاہور ص ۱۹)

وہ خوابِ ناز میں تھے اور تھے اے شوقِ پا بوسی
نہ بھی پستیِ ہمت تری، اِس لطفِ ایما کو
(" " ص ۲۸)

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، اُردو میں آج کل "قدم بوس" وغیرہ کے بجاے "قدم بوسی" وغیرہ ہی زیادہ مستعمل ہیں۔ قدم بوس، پا بوس، دست بوس؛ ترکیبِ فارسی میں آئیں تو دوسری بات ہے، ورنہ مفرد صورت میں یہ کچھ اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً

داغ کا یہ قطعہ دیکھیے :

قدم بوس حضرت کا حاصل ہوا — بڑے شوق سے اور ارمان سے
حضوری کی تاریخ پوچھیں اگر — یہ کہہ دو ، ملے داغ سلطان سے

(داغ - مصنفہ، تمکین کاظمی ص ۱۰۱)

اِس میں لفظ " قدم بوس " بالکل صحیح اور قطعاً فصیح ہونے کے باوصف ، اب کچھ اجنبی سا لگتا ہے۔

قدیمی : عربی کے لفظ " قدیم " میں یائے مصدری کا اضافہ کر لیا گیا ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے اِس کو نادرست قرار دیا ہے ، " در آخرِ ایں لفظ زیادتِ یا خطا باشد ، چنانکہ در زیادتی و جدیدی "۔ مولفینِ قاموس نے بھی اس لفظ کو غلط بتایا ہے : " قدیمی ' عربی میں قدیم ہے - چوں کہ صفت ہے ، اس لیے یا محض غلط ہے "۔

آج کل فارسی میں یہ لفظ مستعمل ہے۔ معین نے اِس کو اپنے لغت میں درج کیا ہے ، اور مثال میں یہ فقرہ لکھا ہے ، " او دوست قدیمی من است "۔ بعض اور مثالیں :

" کلمات و تعبیرات قدیمی عصر شاعر را کہ در عصر ایشان دیگر غیر مفہوم یا غیر مانوس شدہ "

(دیباچۂ دیوانِ حافظ ، مرتبۂ قزوینی و قاسم غنی ، ص کز)

" ثانیاً اینکہ و نسخ قدیمی معاصر یا بسیار قریب العصر با خود شاعر "۔ (" " ص کح)

" و آنہم نسخۂ بسیار قدیمی نزدیک بعصر حافظ است "۔ (" " ص ل)

" نہ از روی اصح نسخ صورت پذیرفتہ است ، نہ از روی قدیمی ترین نسخ موجودہ در جہان "۔ (دیباچۂ دیوانِ حافظ ، مرتبۂ ا ، بامداد)

" بابروس ، نام قدیمی بابل است " (فرہنگِ نوبہار ص ۸۲)

ہندستان کے فارسی مصنفین نے بھی اس لفظ کو بے تکلف استعمال کیا ہے۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں :

"دراثنای راہ بہ نواب سید حسن علی خاں کہ با ایشاں تعارفِ قدیمی داشت،
برخورد" (مجموعۂ نغز، ص ۱۱۶)۔

اُردو میں تو اس کو بالعموم استعمال کیا گیا ہے۔ چند مثالیں:

گردن پہ تری دل کو جو ہے طاق کی سوجھی تشبیہ قدیمی ہے نہیں آج کی سوجھی
حکیم قدرت اللہ قاسم (تذکرۂ سرور)

ٹک اس طرف تو دیکھیو آنکھیں ملا کے صاحب ہم سے قدیمی بندے، شائستۂ ستم ہوں
انشا (کلامِ انشا، ص ۱۵۰)

رِند ہے سرکارِ عالی میں قدیمی جاں نثار کب اُسے خلعت میں شمشیر و سپر ملتی نہیں
رِند۔ (دیوان نول کشور پریس، ص ۱۸۳)

"اگرچہ یہ مصرع قدیمی میاں مجذوب کا ہے" (آبِ حیات، ترجمۂ ذوق)

"ہندستان کے قدیمی عہد میں جب سنسکرت زندہ زبان مانی جاتی تھی"
احسن مارہروی (تاریخ نثرِ اُردو، ص ۳)

"آپکے ماموں صاحب قبلہ جو میرے قدیمی عنایت فرما اور محسن زادے ہیں"
منیر شکوہ آبادی (تاریخ نثرِ اردو، ص ۵۴۳)

آصفیہ و نور دونوں میں یہ لفظ موجود ہے۔ رچرڈسن اور فوربس نے "قدیمی" کو عربی لکھا ہے، اور جانسن نے "قدیمی" بہ یائے مشدد کو عربی بتایا ہے۔ اس کا غیر صحیح ہونا عیاں ہے۔ ہاں، میں اس وقت یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ یہ لفظ فارسیِ قدیم میں ہے یا نہیں۔

انکساری: آصفیہ، نور، امیر اللغات، سرمایۂ زبانِ اردو؛ اِن میں سے کسی لغت میں یہ لفظ موجود نہیں۔ یہ "انکسار" کا مزید علیہ ہے، اور قدیمی،

خلاصی، پابوسی (وغیرہ) کی طرح مستعمل ہے اور یہ لفظ بھی اُسی طرح بنا ہے جس طرح یہ سب لفظ بنے ہیں۔ مولفینِ قاموس نے اِس لفظ کو بھی غلط بتایا ہے۔ آثر لکھنوی مرحوم نے بھی اِسی رائے کا اظہار کیا تھا (الحمرا۔ لاہور۔ جنوری ۱۹۵۴ء)۔

"طغیانی" اور "خلاصی" کی طرح "انکساری" بھی اردو میں قبولِ عام کی سند پا چکا ہے اور اب یہ لفظ بھی ایسے دوسرے الفاظ کی طرح بالکل صحیح ہے اور اسے لغت میں باقاعدہ جگہ ملنا چاہیے۔

اندازاً۔ تخمیناً : آصفیہ، نور، امیراللغات؛ کسی میں بھی یہ لفظ موجود نہیں۔ "انداز" (یا اندازہ) فارسی کا لفظ ہے، قاعدے کے لحاظ سے اس پر تنوین نہیں آنا چاہیے؛ غالباً اسی بنا پر اِن لُغات میں اِس لفظ نے جگہ نہیں پائی۔ مولفینِ قاموس نے تو اِس لفظ کو غلط ہی بتایا ہے:

> "اندازاً، غلط ہے۔ عربی داں اصحاب نے "اندازہ" سے "اندازاً" بنا لیا ہے۔ اِس کی جگہ "تخمیناً" کا لفظ موجود ہے، جو صحیح ہے۔ "اندازاً" کی طرح "تخمیناً" بھی کہتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ تنوین، عربی الفاظ پر آتی ہے، نہ فارسی الفاظ پر" (قاموس)۔

راستے میں کوئی صاحب ملیں اور وقت پوچھیں؛ گھڑی پاس نہ ہو اور آپ اُن سے کہیں کہ "تخمیناً دو بجے ہوں گے" تو یقین کیجیے کہ وہ صاحب اگر زبان سے کچھ نسبت رکھتے ہوں گے تو اپنا سوال بھول کر، اِس "تخمیناً" پر آپ کا مُنہ دیکھتے رہ جائیں گے —— مولفین نے "اندازاً" کی جگہ تو "تخمیناً" بولنے کی فرمایش کی ہے، مگر یہ نہیں بتایا کہ "تخمیناً" کی جگہ کیا کہیں! اگر اردو کوئی زبان ہے تو پھر اِن الفاظ کے غلط ہونے کا کیا سوال! یہ دونوں لفظ عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔

پلیٹس نے "اندازا" کو فارسی لکھا ہے، مگر یہ اُردو نژاد ہے۔ رچرڈسن، جانسن اور شکسپیر نے "اندازا" بغیر تنوین لکھ کر، اِس کے معنی Throwing لکھے ہیں۔ غالباً یہ لوگ اِس کو فارسی کے مصدر "انداختن" سے مشتق کوئی نیا لفظ سمجھے ہیں۔ فارسی میں "انداختہ" اور "اندازہ" ضرور ہیں، "اندازا" کوئی لفظ نہیں۔

آصفیہ و نور میں "نموشا" بھی موجود نہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان لُغات کے مولفین نے "اندازا" کی طرح "نموشا" کو بھی ناقابلِ قبول قرار دیا ہے۔ یہ دونوں لفظ چوں کہ اُردو میں مستعمل ہیں اور بہ کثرت، اِس لیے اب اِن کو بھی لغت میں مناسب طور پر جگہ ملنا چاہیے۔ اُردو کے لحاظ سے یہ دونوں صحیح لفظ ہیں۔

آزردگی : مولفینِ قاموس نے اِس لفظ کو صرف بہ فتحِ زا لکھا ہے (آزَردگی) نور میں بھی "آزردہ" اور "آزردگی" کو بہ فتحِ دوم لکھا گیا ہے۔ امیر اللغات میں بھی "آزردہ" کی ز پر زبر لگا ہوا ہے (آزَردہ)۔ اِس میں "آزردگی" موجود نہیں۔ فارسی کے قدیم لغات میں بھی عموماً اِس کو بہ فتحِ زا لکھا گیا ہے۔ بعض لغات میں یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ بہ ضمِ زا غلط ہے۔ مثلاً:

"آزردن، بہ فتحِ زا ...... بہ ضمِ آں غلط است، چراکہ مخففِ آزاریدن است۔

از کشف" (مویّد الفضلا)۔

لیکن فارسی کے بعض جدید لُغات میں اِس کو بہ ضمِ زا لکھا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو فرہنگِ امیر کبیر اور سلیمان حییم کا لُغت۔ حییم نے "آزاریدن" اور "آزاردن" کی اصل "آزردن" کو بتایا ہے۔

اُردو میں آزردن، آزردہ، آزردگی؛ سب لفظ بہ ضمِ زا بولے جاتے ہیں۔ بہ فتحِ دوم بولیے تو اجنبیت کا احساس ہوگا۔ مثلاً اس مصرعے میں، "رات آزردہ ہوا یار جو مے نوشی میں" آزردہ کو بہ فتحِ زا پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ مصرعے کا سارا لطف تباہ ہو گیا۔ بل کہ یہ خیال ہوگا کہ

یہ کوئی نیا لفظ کہیں سے آگیا ہے۔ مولانا احسن مارہروی نے لکھا ہے :

"آزردہ ، لُغت میں بہ فتح زاے معجمہ ہے ، مگر پڑھے لکھے لوگ پیش سے بولتے ہیں۔" (تاریخ نثرِ اُردو ، ص ۳۵۶)۔

آصفیہ میں بھی "آزردگی" اور "آزردہ" کی ز پر پیش لگا ہوا ہے۔ اب اُردو لُغات میں اِن لفظوں کو صرف بہ ضمِ زا لکھنا چاہیے۔ بہ فتحِ زا کو فارسی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔

عربی کے کئی ایسے لفظ ہیں جو اصلاً بہ یاے مشدّد ہیں، مگر اُردو میں ان کو بہ یاے مشدّد و بہ یاے مخفف، دونوں طرح استعمال کیا جاتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ بول چال میں تو یہ لفظ تشدید کے بغیر ہی آتے ہیں اور تحریر میں (خاص طور پر نظم میں) اِن کی دونوں صورتیں ملتی ہیں۔ اِن میں کیفیت ، خاصیت ، نیت ، حیثیت ، انسانیت ، ماہیت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

"خاصیت ۔ ع ۔ مونث ۔ بہ تشدیدِ صادِ مکسور و یاے مفتوح ..... اُردو میں صرف بہ تشدیدِ یاے مفتوح مستعمل ہے" (قاموس)۔

آصفیہ میں بھی "خاصیت" لکھا ہوا ہے اور مولف نے اِس کے ذیل میں اِس طرح کی کوئی صراحت نہیں کی ہے کہ یہ لفظ بہ یاے مخفف بھی آتا ہے۔ فارسی میں اِس کو عربی کے مطابق بہ یاے مشدّد اور تفریس کے ساتھ بہ تخفیفِ یا بھی استعمال کیا گیا ہے (بہارِ عجم)۔ اُردو میں بھی یہی صورت ہے کہ اِس لفظ کو دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے اور استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ تفریق ملحوظ رہنا چاہیے کہ نظم میں تو اس کو دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے (اور استعمال کیا جاتا ہے) مثلاً :

عہد میں تیرے عجب کیا سرِ داغِ دلِ شمع شعلے میں مرہم کافور کی ہو خاصیت

ذوق (دیوان مرتبۂ آزاد، ص ۳۱۸)

سرگذشتیں نہ مری سُن کر اچٹتی ہے نیند — خاصیت یہ ہے مری جان اِن افسانوں کی

میر (کلیات، مرتبۂ آسی، ص ۱۴۹)

خاصیت سیماب کی ہے اِس تپِ بے تاب میں — جل کے خاکستر اگر ہوں تو بھی میں اکسیر ہوں

احسان دہلوی (تذکرۂ سرور)

مگر بول چال میں عموماً بہ یائے مخفف ہی آتا ہے۔ رچرڈسن نے اپنے لُغت میں، خاصیت کے ذیل میں، ایک مصدرِ جعلی "خاصیدن" بھی لکھا ہے، لیکن قوسین میں "مشکوک" بھی لکھ دیا ہے۔ فارسی میں "خاصیدن" کوئی مصدر نہیں۔

"انسانیت" عربی میں بہ یائے مشدد ہے (المنجد)۔ فارسی میں بھی عموماً بہ یائے مشدّد استعمال کیا گیا ہے، لیکن اُردو میں بول چال کی حد تک یہ صرف بہ یائے مخفف مستعمل ہے۔ نظم میں ضرورتاً بہ یائے مشدّد آسکتا ہے اور یہ محض مجبوری کا سودا ہوگا۔[1] قاموس میں اِس کو صرف بہ یائے مشدّد لکھا گیا ہے۔ آصفیہ، نور اور امیر اللغات میں اس لفظ پر تشدید نہیں ملتی۔ مولفین نے اس سلسلے میں وضاحت بھی نہیں کی ہے، حالاں کہ یہ ضروری بات تھی۔ امیر اللغات میں یہ فقرہ بہ طورِ مثال درج ہے: "آدمی بنو، ذرا انسانیت سیکھو، یہ کیا بد تہذیبی ہے"۔ یہی فقرہ نور میں منقول ہے؛ عربی یا فارسی کی رعایت سے اس فقرے میں "انسانیت" کو بہ یائے مشدّد پڑھ کر دیکھیے، سارا حُسن خاک میں مل جائے گا۔ ہاں، آصفیہ و نور میں "انسانیت" کو عربی لکھا گیا ہے۔ یہ ذرا مبہم صورت ہے۔ یہ صراحت ضروری تھی کہ عربی میں "ی" مشدّد ہے اور بہ تخفیف اردو کا اثر ہے۔ بعض مثالیں بھی پیش کی جاتی ہیں:

انسانیت سے اِن میں، نہ تہذیب کا ہے نام — دیں۔ کے لیے ہے جنگ، تو باجوں کا کیا ہے کام

شاد عظیم آبادی (مراثیِ شاد، ص ۱۲۹)

---

[1] جیسے:

بس کر اے نورِ یقیں، جھ میں ہے انسانیّت
عشق سوں بہتر ہے منم صورتِ انسان ہوا (ولی)

محبت عقل ہی کھو دے تو پھر پابندیاں کیسی
حدِ انسانیت تک آدمی مجبور رہتا ہے
آرزو لکھنوی (جہانِ آرزو ص ۱۸۲)

خطا تھی تو کب قابلِ درگزر تھی
یہ انسانیت کی کہ انسان جا؟!
(" ص ۳۷)

اسی قبیل کا ایک لفظ ہے: "آدمیت"۔ یہ بھی اصلاً بہ یائے مشدد ہے، لیکن اردو میں دونوں طرح مستعمل ہے۔ اِس لفظ کی دونوں صورتوں کو یکساں طور پر مستعمل مان لینا چاہیے۔ آصفیہ، نور اور امیر اللغات میں یہ لفظ صرف بہ یائے مشدد ملتا ہے۔ لفظ "انسانیت" میں اور اس لفظ میں یہ فرق ضرور ملحوظ رہنا چاہیے کہ "انسانیت" بہ یائے مشدد، بول چال میں نہیں آتا، لیکن "آدمیت" گفتگو میں دونوں طرح مستعمل ہے۔ شاد عظیم آبادی نے فکرِ بلیغ میں "آدمیت" بہ یائے مخفف کو تصرفاتِ جائز کی مثال میں پیش کیا ہے (ص ۵۲)۔

"محو" عربی کا لفظ ہے، اس میں "یت" کا اضافہ کرکے "محویت" بنا لیا گیا ہے، اور غالباً یہ اردو والوں کی کارگزاری ہے۔ ایسے اور الفاظ کے قیاس پر، اِس لفظ کو بھی دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے، مثلاً:

کبھی ہمت تھی مری قاعدۂ صرف میں صرف
کبھی تھی نحو میں ہر نحو مجھے محویت
ذوق (دیوانِ مرتبۂ آزاد ص ۳۱۱)

گم شدہ کی جستجو میں محویت کی حد ہوئی
سامنے جو شے نظر آئی اُسے دل کہہ دیا
آرزو لکھنوی (جہانِ آرزو ص ۵۱)

منزلِ الفت میں اپنی محویت کے میں نثار
مجھ کو ہر رہ رو پہ، تیری شکل کا دھوکا ہوا
عزیز لکھنوی (انجم کدہ ص ۴۴)

آصفیہ میں "محویّت" صرف بہ یائے مشدد لکھا ہوا ہے اور اس کو عربی بتایا گیا ہے۔ نور میں

بھی صرف بہ یائے مشدد ہے، مگر مولف نے یہ صراحت ضرور کردی ہے کہ "ہندستانیوں نے "لو" سے مصدر بنالیا ہے"۔ اس لفظ کی بھی دونوں صورتیں قابلِ قبول ہیں۔

جلیل مانک پوری (تلمیذِ امیر مینائی) نے ایک خط میں لکھا ہے:

"ملکیت بہ تخفیفِ یا، روزمرہ کی بول چال ہے۔ اگر بہ تشدیدِ یا بھی استعمال کیا جائے تو جائز ہوگا، جیسے، ماہیت، خاصیت، کیفیت وغیرہ، کہ یہ بہ تخفیفِ یا صحیح ہیں، اور کبھی بہ تشدیدِ یا بھی اِن کا استعمال کیا جاتا ہے"

(مکتوبِ جلیل، رسالہ الحمرا، لاہور، نومبر ۱۹۵۶ء)

جلیل نے یہ تو بالکل صحیح لکھا ہے کہ "ملکیت" بہ تخفیفِ یا، روزمرہ کی بول چال ہے؛ مگر اُن کا یہ سمجھنا کہ ماہیت، خاصیت، کیفیت" بہ تخفیفِ یا صحیح ہیں" اِس اعتبار سے درست نہیں کہ اصلاً یہ لفظ بہ تشدیدِ یا ہیں اور تصرف کے سبب بہ تخفیف مستعمل ہیں۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، ایسے لفظوں کی دونوں صورتوں کو صحیح مانا جائے گا۔

اُردو میں ایسے بہت سے لفظ مستعمل ہیں جو "گی" کے لاحقے کے ساتھ، حاصل مصدر کا فائدہ دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو قاعدے کے مطابق بنے ہیں اور بعض خلافِ قاعدہ۔ قاعدہ تو یہ ہے کہ لفظ کے آخر میں ہائے مختفی ہو تو "گی" کا لاحقہ آئے گا، جیسے غنچہ سے غنچگی اور تشنہ سے تشنگی اور بے چارہ سے بے چارگی اور آوارہ سے آوارگی۔ اگر لفظ کے آخر میں الف ہوگا تو "ئی" کا اضافہ کیا جائے گا، جیسے گدا سے گدائی، اور فضا سے فضائی۔ جس طرح بہت سے قاعدوں کی حدیں کہیں نہ کہیں ٹوٹ ہی جایا کرتی ہیں، وہی حال اس قاعدے کا ہوا، اور کئی لفظ خلافِ قاعدہ بن گئے۔ جیسے "ادا" سے قاعدے کے مطابق "ادائی" بننا چاہیے؛ بنا بھی ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک خلافِ قاعدہ صورت "ادائگی" بھی وجود میں آگئی۔ مولفینِ قاموس نے لکھا ہے:

"ادائگی - ا- اداکرنا- اداسے " ادائی " کہا جاسکتا ہے ، جیسے "صفا" سے "صفائی" - ادائگی .... کسی شاعر کے شعر میں نہیں دیکھا گیا "

ایسے لفظوں کو تین قسموں میں رکھا جاسکتا ہے ،

(ا) وہ لفظ جن کے آخر میں "ہ" موجود نہیں ، مگر "گی" بہ طورِ لاحقہ لگا کر ، حاصل مصدر بنالیے گئے تھے ، مگر یہ اب استعمال میں گویا نہیں آتے ، جیسے ، طفل سے طفلگی ، آزاد سے آزادگی ،

انشا کو لذت اُس کے جوانی کے حسن کی
ہے اور طفلگی کے بھی ایام سے لذیذ
انشا (کلامِ انشا ، ص ۸۳)

قیدِ ہستی سے ہنوز آزادگی حاصل کہاں
روح سے چھوٹا ہے یہ زندانِ آب و گل کہاں
آتش (کلیات نول کشور پریس ص ، ۱۵۷)

یہ تھی موج پہلے اس آزادگی کی
ہرا جس سے ہونے کو تھا باغِ گیتی
حالی (مسدسِ حالی)

"طفلگی" اور "آزادگی" متروک سے ہوگئے ہیں اور اب "طفلی" اور "آزادی" بالعموم مستعمل ہیں —— امیر اللغات و نور اللغات میں "آزادگی" موجود ہے ، کسی صراحت کے بغیر۔ فرہنگِ آصفیہ میں "آزادی" ہے ، مگر "آزادگی" موجود نہیں - اور نہ اِس سلسلے میں کچھ صراحت کی گئی ہے —— "طفلگی" نہ آصفیہ میں ہے اور نہ نور میں ، دونوں میں صرف "طفلی" ہے۔

(۲) ایسے لفظ جو دونوں طرح مستعمل ہیں ، جیسے ، "ناراض" سے ناراضی اور ناراضگی۔ "درست" سے درستی اور درستگی - یہ ایسے لفظ ہیں کہ تحریر و تقریر دونوں میں ، دونوں طرح استعمال میں آتے رہتے ہیں - مثلاً داغ کے اِس جملے میں ، " اور اب نہ کوئی وجہِ ناراضگی ہے " (زبانِ داغ ، ص ۷۹) یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی خلافِ قاعدہ لفظ استعمال میں

آ گیا ہے ــــ صاحبِ نور اللغات نے "ناراضی" کے ذیل میں لکھا ہے: "عام عورتیں ناراضگی" بولتی ہیں" اور مثال میں جان صاحب کا یہ شعر لکھا ہے:

ناراضگی سے جاتی ہو، ہوگا نہ حج قبول
ماں زار زار روتی ہے، اور زار زار باپ

عام عورتوں کی تخصیص درست نہیں، "خاص عورتیں" بھی بولتی ہیں اور مرد بھی بولتے ہیں۔ داغ کا منقولۂ بالا جملہ سند کے لیے کافی ہے۔ ایسے لفظوں کو دونوں طرح صحیح اور فصیح ماننا چاہیے۔ "ناراضگی" کی طرح "درستگی" بھی خلافِ قاعدہ بنا ہے اور اب "درستی" اور "درستگی" دونوں لفظ استعمال میں آتے ہیں۔ نور و آصفیہ میں صرف "درستی" ہے۔ "درستگی" موجود نہیں۔

(۳) ایسے لفظ جن کو دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے، مگر اب ان کی خلافِ قاعدہ صورت ہی استعمالِ عام میں نظر آتی ہے اور باقاعدہ صورت، کتابوں میں محفوظ ہو کر رہ گئی ہے، جیسے، "کرخت" سے کرختگی۔ "کرخت" سے قاعدے کے مطابق تو "کرختی" بنے گا، جیسے "سخت" سے سختی۔ نور میں واجد علی شاہ کا یہ شعر سنداً لکھا گیا ہے:

"وہ چھاتیوں کی غضب تھی سختی کب سیب میں ایسی ہے کرختی"

لیکن یہ باضابطہ بنایا گیا لفظ، اب قبولِ عام کی سند سے خالی ہاتھ نظر آتا ہے، اور اس کی جگہ "کرختگی" نے لے لی ہے۔ مثلاً مولوی عبدالحق صاحب کے اِس جملے میں:

"اصل الفاظ میں جو بھدا پن اور کرختگی اور تلفظ اور لہجے کی دقت تھی، بالکل جاتی رہی" (قواعدِ اردو، ص ۲)

اس لفظ "کرختگی" کی جگہ پر "کرختی" لکھ کر دیکھیے؛ لکھنے والے پر تازہ وارد ہونے کا شبہہ کیا جائے گا ــــ "ادائی" کتابوں میں کہیں کہیں نظر آجاتا ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ مولانا نظم طباطبائی کے دیوان میں بھی ایک جگہ آیا ہے؛ لیکن "کرختی" کی طرح اب اجنبی معلوم ہوتا ہے۔

سرمایۂ زبانِ اردو، امیر اللغات، آصفیہ اور نور میں نہ "ادائی" ہے، نہ "ادائگی"۔

نور میں "کرختی" اور "کرختگی" دونوں لفظ موجود ہیں، البتہ آصفیہ میں "کرختی" موجود نہیں، صرف "کرختگی" ہے۔ یہاں اس بحث سے قطعِ نظر کرتا ہوں کہ ان میں سے کون کون سے لفظ فارسی میں بھی موجود ہیں۔

شُبہ: اصل لفظ "شُبْہَہ" (بروزنِ نقطہ) ہے۔ فارسی میں یہ تصرف ہوا کہ ایک ہ ساقط ہوگئی اور ب پر زبر آگیا، یعنی "شُبَہ" بروزنِ کُلَہ ہوگیا۔ البتہ مع تصرف بہ حکم استعمال کیا گیا ہے۔ اس تصرف کا اظہار صاحبِ بہارِ عجم نے کیا ہے:

"شبہ بضمِ اول و فتحِ سوم..... و فارسیان بفتحِ دوم و ہائے ملفوظ نیز گویند۔ بدر چاچی:

بہانہ ایست غروب آفتاب را ہر شام | مرنج یا تو بجوئم کہ نیست شک و شبہ
چو آسماں بسوی قصرِ شاہ کرد نظر | ز نقش زیرِ آسماں فتاد کُلہ"

اُردو میں صورت یہ ہے کہ بول چال کی حد تک تو "شُبَہ" ہی مستعمل ہے، "شُبْہَہ" کوئی نہیں بولتا۔ البتہ نظم میں عموماً اصل کے مطابق "شُبْہَہ" استعمال کیا گیا ہے۔ آتش نے ایک شعر میں "شُبْہ" (بہ سکونِ حرفِ دوم) بھی باندھا ہے:

شیریں کلام کا بھی مزہ بھولتا نہیں | شیر و شکر سے ہے یہ بلا شبہ و شک لذیذ
(کلیاتِ نول کشور پریس، ص ۸۳)

عطف کی صورت میں یہاں "شبہ" یہ نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح اصل لفظ کے ساتھ ساتھ، اردو میں "شُبَہ" اور "شُبْہَہ" بھی مستعمل ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ گفتگو کی حد تک "شُبَہ" ہی سننے میں آتا ہے۔ مختصر یہ کہ اُردو میں اب اِس لفظ کی تین صورتیں مانی جائیں گی: شُبْہَہ، شُبَہ، شُبْہ۔ اِس کی جمع "شُبْہات" (بہ سکونِ دوم) مستعمل ہے۔

مولفینِ قاموس نے لکھا ہے :

"شبہ بروزنِ گنج کہنا غلط ہے۔ "شبہہ" بروزنِ نقطہ کہنا صحیح ہے۔

شبہہ کی جمع شُبُہات بضمتین ہے۔"

دونوں باتیں قابلِ قبول نہیں۔ اُردو کی بول چال میں صرف "شُبْہ" مستعمل ہے۔ اگر کوئی بدذوق شخص، عربی کی رعایت سے، گفتگو میں "شُبُہہ" لے آئے تو بات چیت کی بے ساختگی اور حُسن، دونوں پر حرف آجائے گا۔ یہی صورت "شبہات" کی ہے۔ عربی میں جو بھی صورت ہو، اردو میں یہ لفظ صرف بسکونِ دوم (شُبْہات) مستعمل ہے۔

نور و آصفیہ میں بڑی مبہم صورت ہے۔ آصفیہ میں "شبہہ، شبہہ کرنا، شبہہ مٹانا، شبہہ ہونا" چھپے ہوئے ملتے ہیں، مگر سنداً ناسخ کا جو شعر پیش کیا گیا ہے، اُس میں "شُبْہ" نظم ہوا ہے۔ "شبہہ" کے سامنے قوسین میں (ع) لکھا ہوا ہے۔ اِن دونوں باتوں سے بہ ظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ شاید یہاں پر کتابت کی غلطی ہے کہ ہر جگہ "شبہہ" کی جگہ "شبہہ" لکھ دیا گیا ہے مگر غلط نامے میں اِس کا کچھ ذکر نہیں ملتا۔ مولف نے اِس لفظ کے متعلق کسی طرح کی وضاحت بھی نہیں کی ہے، نہ تصرف کا ذکر کیا ہے۔ یہ واقعتاً الجھن میں ڈالنی والی صورت ہے۔

نور میں بالکل دوسری صورت ہے اور وہ بھی پریشان کن ہے۔ مولف نے اصل لفظ "شُبُہہ" لکھ کر، فارسی کے تصرف کا ذکر کیا ہے :

"فارسی شعرانے شبہہ بہ ضمِ اول و فتحِ دوم و سکونِ ہاے ملفوظ بروزنِ کُلَہ بھی کہا ہے۔"

اِس کے بعد اُردو کے جتنے شعر مثالاً لکھے ہیں، اُن سب میں "شبہہ" ہی نظم ہوا ہے۔ اِس لیے یہ احتمال پیدا ہو سکتا ہے کہ مولف نے فارسی کے جس تصرف کا ذکر کیا ہے، وہ فارسی تک محدود رہا، اور اردو میں اُس نے بار نہیں پایا۔ اِس طرح کی کوئی صراحت نہیں

ملی کہ اُردو میں یہ لفظ تصرف کے ساتھ بھی مستعمل ہے۔ اِسی طرح مؤلف نے اِس کی جمع "شبہات" کے اعراب کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے، یعنی یہ کہ یہ بہ ضمِ دوم ہے یا بہ سکونِ دوم۔

خرچ ۔ خراج : مؤلفینِ قاموس نے "خرچ" کو بہ جیمِ تازی "خرج" لکھا ہے اور سنداً فارسی کے کئی شعر پیش کیے ہیں، جن میں یہ لفظ "درج" وغیرہ کا ہم قافیہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فارسی میں (اصل کے مطابق) "خرج" ہی ہے، مگر اُردو میں اِس نے رواج عام نہیں پایا۔ اِس کے بجائے "خرچ" نے قبولِ عام کی سند پائی۔ اُردو کے بعض شعرا نے اِس کو بہ ضرورتِ قافیہ (فارسی کی رعایت سے) بہ جیمِ تازی نظم کیا ہے، لیکن اِس ضرورتِ شعری کو استعمالِ عام سے کوئی علاقہ نہیں۔ عام طور پر گفتگو اور تحریر، دونوں میں "خرچ" ہی آتا ہے۔ اُردو میں اِسی سے خرچا، خرچنا وغیرہ بھی بن گئے ہیں۔ نور میں صحیح طور پر اِس کو "خرچ" لکھا گیا ہے۔

"خرج" کی جمع "اخراجات" مستعمل ہے۔ اِس میں اصل لفظ کا جیم باقی رہا ہے۔ آصفیہ و نور میں "اخراجات" موجود ہے، مگر اِس کو عربی بتایا گیا ہے۔ یہ درست نہیں۔ یہ (غالباً) ہندستانی ایجاد ہے۔ "اخراجات" کے ذیل میں سند اِن دونوں لغات میں موجود نہیں، اِس لیے دو تین سندیں لکھی جاتی ہیں :

"ہم نے کس کس جاں کاہی، جاں نشانی اور اخراجات کی برداشت کر کے"

(مقدمۂ فرہنگِ آصفیہ، جلدِ اوّل، طبعِ دوم)

"اِن سب اخراجات کا بار خانم کے سر تھا" مرزا رسوا۔

(امراؤجان ادا، مکتبۂ شاہراہ دہلی، ص ۱۴۹)

"معمولی گفتگو کے بعد، تعیینِ اخراجات ہو کر "

(" " " ص ۱۵۶)

ہاں، متعدد شعرا کے دواوین میں ایسی غزلیں موجود ہیں جن کی ردیف "خرچ" ہے اور یہ غزلیں حرف ج کی ردیف میں ملتی ہیں۔ مثلاً:

(۱) فقیروں کے جان واہی خرچ اے میاں، ان کے ہیں الٰہی خرچ

انشا (کلام انشا، ص ۶۹)

(۲) الفت میں نقدِ عمر کر خرچ کہیں ہر چند ممسک تجھ کو زر خرچ

آتش (کلیات نول کشور پریس، ص ۳۶۳)

اُردو والوں نے "خرچ" سے "خراج" بنالیا ہے، عربی الفاظ کے قیاس پر یہ لفظ استعمال میں آتا رہتا ہے۔ آصفیہ و نور دونوں میں یہ لفظ موجود نہیں۔ بعض لوگ اب تک اِس لفظ کو مبتذل سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ لفظ جس مفہوم کو جس ہمہ گیری کے ساتھ ظاہر کرتا ہے، وہ دوسرے الفاظ سے شاید ہی ادا ہوسکے۔ "مرغن" "فوق البھڑک" اور "مدبّغ" وغیرہ کی طرح، اِس لفظ کو بھی صحیح مان لینا چاہیے اور لغت میں جگہ دینا چاہیے۔

ناوقفی، ناواقفیت کی جگہ "ناوقفی" کہنا غلط ہے، جیسا کہ آتش نے کہا ہے۔

"ناوقفی کی دلیل یہ تکیہ ہے دار کا منصور پہ گماں ہے مجھے نے سوار کا"

(قاموس)

یہ آتش پر اتہام ہے کہ انھوں نے "ناوقفی" لکھا ہے۔ شعر صحیح طور پر یوں ہے:

نافہمی کی دلیل یہ تکیہ ہے دار کا منصورِ پر یقیں ہے مجھے نے سوار کا

کلیاتِ آتش کے دو نسخے پیشِ نظر ہیں: ایک سنہ ۱۲۶۹ھ کا، اور دوسرا نول کشور پریس کا جس کا سالِ طبع سنہ ۱۹۲۹ء ہے، دونوں میں اس شعر کا متن اسی طرح صحیح ہے۔ ہاں "ناواقفی" ضرور استعمال کیا گیا ہے، جیسے:

"سعد بد سرمد محمد احمد کو ناواقفی نے آپ کی ملاقات سے

محروم رکھا" امیر مینائی (مکاتیبِ امیر مینائی، طبعِ دوم، ص ۲۴۲)

"پہلے تو یہ دیکھا جائے کہ اعتراض کیسا ہے، ایسا ہے کہ بالکل ہی معترض کی ناواقفی پر دلالت کرتا ہے" غلام غوث بےخبر (انشائے بےخبر، شائع کردہ ادبی دنیا علی گڑھ، ص ۱۲)

نور اور آصفیہ دونوں میں "ناواقفی" موجود نہیں ہے۔

مانند : فارسی میں "مانَند" بہ فتحِ نونِ اوّل ہے۔ مولفینِ قاموس نے بھی اسی طرح بولنے کی تاکید کی ہے اور لکھا ہے کہ، "بہ کسرِ نونِ اوّل کہنا غلطی ہے"۔ اُردو کی بول چال میں یہ لفظ بہ کسرِ نونِ اول مستعمل ہے اور اب اسی طرح کانوں کو اچھا لگتا ہے۔ اصل حرکت کے ساتھ، اس حرکت کو بھی صحیح مان لینا چاہیے۔ بعض لوگ اصل کی رعایت سے بہ فتحِ نونِ اول بولتے ہیں، لیکن بہت کم۔ عام طور پر بہ کسرِ نونِ اوّل بولا جاتا ہے — آصفیہ میں ن پر زبر لگا ہوا ہے (مانَند) اِس کے ساتھ ساتھ مولف نے قوسین میں مزید لکھا ہے، (عوام، مانِند)۔ مطلب یہ نکلا کہ مولف کے نزدیک صحیح تلفظ بہ فتحِ سوم ہے اور بہ کسرِ سوم، عامیانہ تلفظ ہے۔ اِس کے برخلاف مولفِ نور نے استعمالِ عام کا احترام ملحوظ رکھا ہے؛ اصل حرکات کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ، "اُردو میں زبانوں پر بہ کسرِ سوم ہے"۔ اور یہی صحیح صورت ہے۔

اصطبل : اصلاً اس لفظ میں الف پر زیر ہے، ط پر زبر ہے، اور ب ساکن ہے (اِصْطَبْل)۔ شعرائے اُردو نے اِس طرح نظم بھی کیا ہے، مگر بول چال میں یہ "بر محل" کے وزن پر آتا ہے (اَصْطَبَل)۔ کیا خواص، کیا عوام؛ سبھی اِسی طرح بولتے ہیں اور یہ اُردو کا تصرف ہے۔ بول چال میں اصل حرکات کی پابندی کی جائے تو بےحد اجنبیت کا احساس ہوگا۔

ہاں، متعدد شعرا کے دواوین میں ایسی غزلیں موجود ہیں جن کی ردیف "خرچ" ہے اور یہ غزلیں حرف ج کی ردیف میں ملتی ہیں۔ مثلاً :

د فقیروں کے جہان داہی خرچ اے میاں، ان کے ہیں الٰہی خرچ

انشا (کلام انشا، ص ۶۹)

رہ الفت میں نقدِ عمر کر خرچ کہیں ہر چند ممسک تجھ کو زر خرچ

آتش (کلیات نول کشور پریس ص ۳۶۴)

اُردو والوں نے "خرچ" سے "خراج" بنالیا ہے، عربی الفاظ کے قیاس پر۔ یہ لفظ استعمال میں آتا رہتا ہے۔ آصفیہ و نور دونوں میں یہ لفظ موجود نہیں۔ بعض لوگ اب تک اس لفظ کو مبتذل سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ لفظ جس مفہوم کو جس ہمہ گیری کے ساتھ ظاہر کرتا ہے، وہ دوسرے الفاظ سے شاید ہی ادا ہو سکے۔ "مرغن" "فوق البھڑک" اور "مدقق" وغیرہ کی طرح، اس لفظ کو بھی صحیح مان لینا چاہیے اور لغت میں جگہ دینا چاہیے۔

ناوقفی، ناواقفیت کی جگہ "ناوقفی" کہنا غلط ہے، جیسا کہ آتش نے کہا ہے۔

ناوقفی کی دلیل یہ تکیہ ہے دار کا منصور پہ گماں ہے مجھے نے سوار کا"

(قاموس)

یہ آتش پر اتہام ہے کہ انھوں نے "ناوقفی" لکھا ہے۔ شعر صحیح طور پر یوں ہے :

نافہمی کی دلیل یہ تکیہ ہے دار کا منصورِ پر یقیں ہے مجھے نے سوار کا

کلیاتِ آتش کے دو نسخے پیشِ نظر ہیں : ایک سنہ ۱۲۶۹ھ کا، اور دوسرا نول کشور پریس کا جس کا سالِ طبع سنہ ۱۹۲۹ء ہے، دونوں میں اس شعر کا متن اسی طرح ہے۔ ہاں "ناواقفی" ضرور استعمال کیا گیا ہے، جیسے :

" ۔۔۔ بعد سرمد محمد احمد کو ناواقفی نے آپ کی ملاقات سے

محروم رکھا" امیر مینائی (مکاتیبِ امیر مینائی، طبع دوم، ص ۲۷۲)

"پہلے تو یہ دیکھا جائے کہ اعتراض کیسا ہے، ایسا ہے کہ بالکل ہی معترض کی ناواقفی پر دلالت کرتا ہے" غلام غوث بےخبر (انشائے بےخبر، شائع کردہ ادبی دنیا علی گڑھ، ص ۳)

نور اور آصفیہ دونوں میں "ناواقفی" موجود نہیں ہے۔

مانند : فارسی میں "مانند" بہ فتحِ نونِ اوّل ہے۔ مولفینِ قاموس نے بھی اسی طرح بولنے کی تاکید کی ہے اور لکھا ہے کہ، "بہ کسرِ نونِ اوّل کہنا غلطی ہے"۔ اُردو کی بول چال میں یہ لفظ بہ کسرِ نونِ اول مستعمل ہے اور اب اسی طرح کانوں کو اچھا لگتا ہے۔ اصل حرکت کے ساتھ، اس حرکت کو بھی صحیح مان لینا چاہیے۔ بعض لوگ اصل کی رعایت سے بہ فتحِ نونِ اول بولتے ہیں، لیکن بہت کم۔ عام طور پر بہ کسرِ نونِ اوّل بولا جاتا ہے ــــ آصفیہ میں ن پر زبر لگا ہوا ہے (مانَند) اِس کے ساتھ ساتھ مولف نے قوسین میں مزید لکھا ہے: (عوام، مانِند)۔ مطلب یہ نکلا کہ مولف کے نزدیک صحیح تلفظ بہ فتحِ سوم ہے اور بہ کسرِ سوم، عامیانہ تلفظ ہے۔ اِس کے برخلاف مولفِ نور نے استعمالِ عام کا احترام ملحوظ رکھا ہے؛ اصل حرکات کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ، "اُردو میں زبانوں پر بہ کسرِ سوم ہے"۔ اور یہی صحیح صورت ہے۔

اصطبل : اصلاً اس لفظ میں الف پر زیر ہے، ط پر زبر ہے، اور ب ساکن ہے (اِصْطَبْل)۔ شعرائے اُردو نے اِس طرح نظم بھی کیا ہے، مگر بول چال میں یہ "برمحل" کے وزن پر آتا ہے (اَصْطَبَل)۔ کیا خواص، کیا عوام؛ سبھی اِسی طرح بولتے ہیں اور یہ اُردو کا تصرف ہے۔ بول چال میں اصل حرکات کی پابندی کی جائے تو بے حد اجنبیت کا احساس ہوگا۔

امیر اللغات میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ " اَصطَبل " صحیح نہیں : " یہ لفظ نہ بہ فتحِ اول صحیح ہے نہ بہ فتحِ بائے موحدہ "۔ یہی بات مولفینِ قاموس نے لکھی ہے۔ نور میں اِس کو صرف " بہ کسرِ الف و سکونِ صاد و فتحِ طا و سکونِ با و لام " لکھا گیا ہے۔ مطلب اِس سے بھی یہی نکلتا ہے کہ بہ فتحِ اول و چہارم صحیح نہیں۔ گویا اِن حضرات نے اِس لفظ میں اُردو کے تصرف کو قابلِ قبول نہیں سمجھا۔ البتہ آصفیہ میں مختلف صورت پائی جاتی ہے۔ اُس کی عبارت یہ ہے :

" اَصطَبل.... اِس کے تلفظ میں اختلاف ہے۔ روز مرۂ حال اور کشف اللغات کے موافق بہ فتحِ اول ہی درست ہے، مگر یونانی تلفظ اور صراح، منتخب، مزیل الاغلاط و غیاث میں بہ کسرِ اول و بائے موحدۂ موقوف پایا جاتا ہے، لیکن شعرائے ہند نے اس بے کو متحرک و موقوف، دونوں طرح باندھا ہے، چناں چہ ایک ایک مصرع لکھا جاتا ہے،

سودا : یہ میں یہ کہ اَصطَبل ادھر کرے ہزار۔
میر انیس : خالی ہوا اصطبل، چلے آتے ہیں گھوڑے "

مولفِ آصفیہ نے بجا طور پر روز مرۂ حال کے موافق اِس کو " اَصطَبَل " لکھا ہے۔ اگر کشف اللغات میں اِس کو بہ لحاظِ اصل، بہ فتحِ ب لکھا گیا ہے، تو یہ درست نہیں۔ اصلاً یہ صرف بہ سکونِ ب ہے۔ ب کا زبر، اُردو کا اثر ہے۔ اِسی طرح الف کا زیر بھی اُردو کا تصرف ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے لکھا ہے :

" صحیح یوں ہی ہے جس طرح لکھا ہے، اور شاعر بھی زیادہ تر اسی طرح نظم کرتے ہیں، مگر کیا خواص کیا عوام، بولتے اصطبل ہیں (بہ فتحِ اول و سکونِ صاد و فتحِ طا و با و سکونِ لام)" [فرہنگِ اثر ص ۱۳۷]

چوں کہ یہ لفظ نظم میں بیش تر اصل حرکات کے ساتھ اور کم تر مع تصرف نظم ہوا ہے، اور بول چال میں

صرف بہ فتحِ اول و فتحِ چہارم (اَصْطَبَل) آتا ہے؛ اِس بنا پر، اِس لفظ کی دونوں صورتوں کو صحیح مانا جائے گا۔ اِس صراحت کے ساتھ کہ "اَصْطَبَل" اردو کا تصرف ہے اور بول چال میں صرف اسی طرح آتا ہے اور نظم میں اس کو بیش تر بہ سکونِ بآ اور کم تر بہ فتحِ بآ باندھا گیا ہے۔

اصراف : قاموس الاغلاط، فرہنگِ آصفیہ، امیر اللغات اور نور اللغات؛ اِن سب میں اِس لفظ کو صرف بہ فتحِ اول لکھا گیا ہے۔ اصل کے لحاظ سے یہ بالکل صحیح ہے، لیکن بہ قولِ اثر لکھنوی مرحوم: "اردو میں بکسرِ اول بولتے ہیں۔ ہمارا لہجہ اِسی کا متقاضی ہے"

(رسالہ الحمرا (لاہور) جنوری ۱۹۵۳ء)۔

حرکت کا یہ اختلاف اردو میں ہی نہیں، جدید فارسی میں بھی ہے؛ حییم نے اپنے لغت میں اِس کو بکسرِ اول لکھا ہے۔

الائچی : "الاچی۔ ہ۔ معروف۔ الائچی کہنا غلط ہے" (قاموس)۔

نفس اللغۃ، نفائس اللغات اور امیر اللغات میں کسی طرح کی صراحت کے بغیر، صرف "الاچی" ملتا ہے۔ گویا اِن لغات کے مولفین کے نزدیک اِس لفظ کی صحیح صورت یہی ہے۔ سرمایۂ زبانِ اُردو میں "الاچی" تو موجود نہیں، البتہ "الاچی دانہ" موجود ہے۔ "الائچی" اس میں بھی موجود نہیں۔ گویا اِن سب کی رائے میں صحیح لفظ "الاچی" ہے۔ اثر صاحب نے فرہنگِ اثر میں لکھا ہے کہ،

"لکھنؤ میں "الاچی" فصحا کی زبان اور "الائچی" عوام کی زبان سمجھی جاتی ہے۔"

آصفیہ میں الاچی اور الائچی، دونوں لفظ ہیں اور کسی تفریق کے بغیر۔ عبارت میں بھی کئی جگہ "الائچی" آیا ہے۔ نوادر الالفاظ اور نور اللغات میں بھی یہ دونوں لفظ موجود ہیں۔ بول چال کی بھی یہی صورت ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح سننے میں آتا رہتا ہے۔ اثر صاحب کا یہ لکھنا

کہ لکھنؤ میں "الائچی" عوام کی زبان ہے ۔ یوں محلِ نظر قرار پاتا ہے کہ مثنوی گلزارِ نسیم میں یہ لفظ موجود ہے؛

چکنی ڈلی، عطر، الائچی، پان نقل و مے و جام و خوانِ الوان

آصفیہ کے اندراج سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اربابِ دہلی کے نزدیک یہ لفظ دونوں طرح صحیح ہے۔ اسی طرح نور اللغات کے اندراج اور نسیم کے مندرجۂ بالا شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں بھی اس کو دونوں طرح صحیح سمجھا گیا ہے ــــــــ چوں کہ اس لفظ کو دونوں طرح لکھا گیا ہے، اس لیے "الاچی" اور "الائچی" دونوں صورتوں کو صحیح مانا جائے گا۔

نور میں "الاچی" کو فارسی اور "الائچی" کو سنسکرت لکھا گیا ہے۔ اس قول کا جزوِ آخر صحیح نہیں۔ "الائچی" سنسکرت نہیں، ہندی ہے۔ فارسی میں الف پر زبر ہے (حییم کا لغت) مگر اُردو میں عموماً بہ کسرِ الف بولتے ہیں۔ نفائس اللغات میں "الاچی" کو بکسرِ اوّل لکھ کر، فارسی لکھا ہے۔ یہ محلِ نظر ہے۔ کسرہ اُردو کا اثر ہے۔ فارسی میں الف مفتوح ہے۔ خانِ آرزو نے نوادر الالفاظ میں لکھا ہے؛

(ص ۳۳)

"و نیز الائچی در کتبِ لغتِ فارسی آمدہ، پس از توافقِ لسانین باشد"

میری نظر سے فارسی میں "الاچی" گزرا ہے، "الائچی" میں نے نہیں دیکھا۔ اس کا امکان ہے کہ اصل عبارت میں "الاچی" ہو اور کاتب صاحب نے اُس کو "الائچی" بنا دیا ہو، اور غالباً یہی ہوا ہے۔ پلیٹس نے "الاچی" اور "الائچی" دونوں کو سنسکرت لکھا ہے۔ یہ درست نہیں۔

ارنی: مولفینِ قاموس نے "ارنی" کو صرف بکسرِ دوم (اَرِنی) لکھا ہے، جس سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ صرف بکسرِ را صحیح ہے اور بہ سکونِ را غلط۔ اس میں شک نہیں کہ اصلاً ر پر زیر ہے، لیکن فارسی میں اس کو بہ سکونِ را بھی نظم کیا گیا ہے اور یہ تصرف ہے۔ بہارِ عجم اور غیاث اللغات میں تفصیل موجود ہے۔ صرف ایک مثالیہ شعر نقل کیا جاتا ہے؛

"موسیٔ از پئے جام، ما دیدہ دست شیشہ بکم پایۂ ارنی شکست" (نظامی)

یہ لفظ مفرس ہو کر ہم تک پہنچا ہے اور اِس بنا پر اِس کو دونوں طرح صحیح سمجھا جائے گا (اَرنی ۔ اَرْنی)۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ امیر اللغات میں موجود ہے، مگر ضبطِ حرکات سے کام لیا گیا ہے اور نہ اِس کی صراحت کی گئی ہے، البتہ مثال میں جو شعر درج کیے گئے ہیں، اُن سب میں یہ بکسرِ دوم آیا ہے اور اِس سے بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مولّف کی رائے میں یہ لفظ صرف بکسرِ دوم صحیح ہے۔ غالب نے ایک خط میں لکھا ہے:

"اگر تقطیعِ شعر مساعدت کر جائے اور ارنی بروزنِ چمنی، گنجائش پائے تو نعم الاتفاق، ورنہ قاعدۂ تصرف مقتضیِ جواز ہے"

(ادبی خطوطِ غالب، ص ۹۰)

"ارنی" کی طرح عربی کے اور کئی لفظ ہیں جن کو بہ سکونِ حرفِ دوم استعمال کیا گیا ہے، جیسے: کلمہ، ثمرہ، درجہ، حرکت، برکت، عظمت۔ یہ سب لفظ "ارنی" کی طرح، بہ سکونِ حرفِ دوم بالکل صحیح ہیں، بل کہ اکثر تو اُردو کے لحاظ سے صرف بہ سکونِ حرفِ دوم ہی فصیح ہیں، جیسے عظمت، درجہ، برکت، کلمہ، ثمرہ۔ اگر "عظمت" یا "کلمہ" (فتحِ دوم) کہا جائے تو بولنے والے پر تو وارد ہونے کا شبہہ کیا جائے گا۔ فانی کی ایک رُباعی کا پہلا مصرع ہے، "اک کلمۂ شوق لب پہ لایا نہ گیا" یا جیسے مثنوی گلزارِ نسیم کا یہ مصرع: "ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری"؛ اِن میں یہ دونوں لفظ (کلمہ، ثمرہ) اُردو کے لحاظ سے صحیح طور پر آئے ہیں، یہی بول چال ہے۔ نظم کی مجبوری سے اِن لفظوں کو بہ حرکتِ دوم استعمال کیا جاسکتا ہے، استعمال کیا بھی گیا ہے؛ مگر یہ ضرورتِ شعری، استعمالِ عام کی نمایندگی نہیں کرتی۔ بہ ہر صورت، اِن لفظوں کو دونوں طرح صحیح مانا جائے گا، مگر ضرورتِ شعری اور استعمالِ عام کی وضاحت کے ساتھ۔

بابر: "بابر بہ ضمِ باے موحدہ صحیح ہے" (قاموس)۔

اِس میں شک نہیں کہ بادشاہِ معروف کے نام کے طور پر، اصلاً یہ لفظ بہ ضمِ بائے موحدہ ہے (غیاث)، مگر اُردو میں یہ لفظ صرف بہ فتحِ با مستعمل ہے، اور اب اُردو میں اِسی طرح صحیح سمجھا جائے گا۔ بہ ضمِ با کو اُردو سے کچھ تعلق نہیں۔

نور میں یہ لفظ بادشاہِ معروف کے نام کے طور پر موجود نہیں۔ آصفیہ میں ہے، مگر اُس میں، فارسی کی رعایت سے، صرف بہ ضمِ بائے موحدہ لکھا ہوا ہے۔ لغت نامۂ دہخدا میں بائے ثانی پر کسرہ لگا ہوا ہے (بابِر)، صاحبِ لغت نامہ نے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ رچرڈسن نے "بابر" کے ساتھ "پاپر" (بہ ہر دو بائے فارسی) بھی لکھا ہے، مجھے اس طرح اور کہیں نہیں ملا۔

بے وقوف : "وقوف کے واو کو عوام فتحہ سے کہتے ہیں" (قاموس)۔

تنہا لفظ "وقوف" عربی کے مطابق بہ ضمِ اول ہی مستعمل ہے، مگر لفظ "بے وقوف" صرف بہ فتحِ واو بولا جاتا ہے اور اردو کے لحاظ سے اسی طرح صحیح ہے۔ "بے وُقوف" کہنے میں اِس قدر تکلف یا اہتمام کرنا پڑے گا کہ گفتگو کی روانی کے ساتھ ساتھ مفہوم کی ہمہ گیری بھی مرحوم ہو کر رہ جائے گی۔

نور میں یہ لفظ موجود ہے، مگر اُس میں حرکات کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔

آصفیہ میں "بے وَقُوف" اور "بے وَقُوفی" ہے :

"بے وَقُوف۔ ف + ع۔ صفت۔ احمق، نادان، مورکھ، موڑھ"

"بے وَقُوفی۔ ف + ع۔ اسم مونث (۱) نادانی....."

اعراب تو ٹھیک ہیں، مگر یہ صراحت ضروری تھی کہ یہ مہند صورت ہے۔

تاہم : "تاہم۔ غلط ہے۔ اس کی جگہ "بریں ہم" یا "اِس پر بھی"،

"پھر بھی" کہنا چاہیے" (قاموس)۔
اُردو کے کسی جملے میں "بریں ہم" کا پیوند لگا کر دیکھیے، ٹاٹ اور کم خواب کے پیوند والی مثل یاد آجائے گی۔ یہ لفظ عام طور سے استعمال میں آتا رہتا ہے۔ آصفیہ و نور دونوں میں یہ لفظ موجود ہے اور مولفین نے عدمِ صحت یا ترک کی طرف مطلق اشارہ نہیں کیا ہے، اس لیے مثالیں پیش کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ترجمہ: "ترجمہ" بہ ضمِ جیم، سخت غلطی ہے" (قاموس)
اُردو میں ترجمہ، ترجمان، ترجمانی؛ یہ تینوں لفظ صرف بہ ضمِ جیم مستعمل ہیں۔ دو چار عربی داں اگر "ترجَمہ" (بہ فتحِ جیم) کہتے ہیں، تو اِس سے نہ استعمالِ عام کی نمایندگی ہوتی ہے اور نہ اِس پر حرف آتا ہے۔

اِس سلسلے میں ایک بات غور طلب ہے؛ یہ کہا گیا ہے کہ فارسی کے مرکّب "ترزبان" کو معرّب کرکے، "ترجمان" بنا لیا گیا ہے۔ لفظ "زبان" فارسی میں بہ فتحِ زا اور بہ ضمِ زا دونوں طرح ہے (غیاث) غالباً اسی بنا پر لفظ "ترجمان" عربی میں بہ فتحِ جیم اور بہ ضمِ جیم دونوں طرح ہے (صراح۔ المنجد)۔ "ترجمان" ہی سے "ترجمہ" بنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ "ترجمہ" عربی میں صرف بہ فتحِ جیم ہے، مگر اصل کے لحاظ سے، یعنی اس لحاظ سے کہ اِس کی اصل "ترجمان" ہے، جو بہ ضمِ جیم بھی درست ہے؛ اگر اُردو میں لفظ "ترجمہ" بہ ضمِ جیم ہے تو کچھ بے جا نہیں۔ مختصر یہ کہ اردو میں ترجمہ، ترجمان اور ترجمانی؛ یہ لفظ صرف بہ ضمِ جیم مستعمل ہیں اور اُردو کے لحاظ سے یہی صحیح ہے۔

آصفیہ میں ترجمہ کے ج پر زبر لگا ہوا ہے۔ یہ محض عربی کی رعایت ہے۔ البتہ ترجمان کے ج پر پیش لگا ہوا ہے۔ نور میں "ترجمان" کے متعلق تو لکھا گیا ہے کہ "یہ لفظ بہ فتحِ جیم اور بہ ضمِ جیم، دونوں طرح صحیح ہے، کیوں کہ "ترزبان" جس کا یہ معرّب ہے بہ فتحِ زا اور بہ ضمِ زا

صحیح ہے۔" اور لفظ "ترجمہ" کے متعلق لکھا ہے کہ، "مولّف کا قیاس یہ ہے کہ بعد معرب کرنے کے، جب مصدر بہ قاعدۂ عربی بنایا ہوگا تو عربوں نے اپنے یہاں کے مصادر کے اوزان کا لحاظ رکھا ہوگا اور اِس وجہ سے ترجمہ بکسرِ جیم بروزنِ تجربہ، تذکرہ وغیرہ، یا ترجمہ بہ فتحِ جیم، بروزنِ دَحرَجہ ہوا۔"

مولّف کا قیاس اپنی جگہ پر، مگر لغات میں عموماً "ترجَمہ" بہ فتحِ جیم ملتا ہے۔ غیاث اللغات میں خاص طور پر لکھا گیا ہے کہ: "مگر در لفظِ ترجمہ بحرکتِ جیم اختلاف نباید کرد کہ بر وزنِ دَحرَجہ است۔" لفظ "ترجمانی" کو نور میں حرکات کی صراحت کے بغیر لکھا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر غیاث اللغات کی ضروری عبارت نقل کر دی جائے، جس میں اِس لفظ کے مذکورہ متعلقات کا ذکر آگیا ہے۔ عبارت یہ ہے:

"ترجمہ۔ بہ فتحِ اول و سکونِ ثانی و فتحۂ جیم، بیان کردنِ مطالب زبانے بزبانِ دیگر۔ و ماخذِ ایں "ترجمان" است، کہ معرّبِ "ترزبان" باشد.... چوں عرباں "ترزبان" را معرب کردہ "ترجمان" ساختند، پس ازاں مصدر و افعال و اسما اشتقاق کردند، چوں تَرجَمَ یُترجِم ترجمۃً فہُو مترجِمٌ۔ چوں دَحرَجَ یدحرِج دحرجۃً فہُو مدحرِجٌ۔ اگرچہ در لفظ "ترجمان" بفتحہ و ضمّہ جیم بعضے اختلاف کردہ اند، چنانچہ صاحبِ منتخب و صراح، مگر در لفظ "ترجمہ" بحرکتِ جیم اختلاف نباید کرد، چراکہ بروزنِ "دحرجہ" است۔ سوائے ایں، بحرالجواہر و کشف و منتخب و کنز و مزیل الاغلاط ہمہ بفتحہ جیم ثابت میکنند۔"

ہاں، نور اللغات میں "ترجمہ" کے ذیل میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے آخر میں یہ عبارت بھی ہے: "تراجم، جمع، بہارِ عجم میں یہ لفظ بالفتح و ضمِّ ثالث لکھا گیا ہے، دیکھو ترجمان۔" اندازِ بیان میں ابہام ہے۔ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس عبارت کا تعلق "تراجم" سے ہے، مگر یہ دراصل "ترجمہ" سے متعلق معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ بہارِ عجم میں "تراجم" موجود نہیں۔

اِس کی تکرار کردی جائے کہ اُردو میں لفظ "ترجمہ" اور اس کے مشتقات کی مستعمل صورت یہ ہے : تَرجُمہ ، تَرجُمان ، تَرجُمانی ، تَراجِم ، مُتَرجِم ـــــ یہاں پر یہ لکھنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ بعض لوگ ناواقفیت کے سبب سے، یا محض کم احتیاطی کے باعث "مُترجّم" (بہ تشدیدِ جیم) کہہ دیتے ہیں ۔ یہ صحیح نہیں ۔ اسمِ فاعل "مُتَرجِم" تشدید کے بغیر ہے ۔ معنی ہوئے : ترجمہ کرنے والا ، اور یہی صورت "مُتَرجَم" کی ہے جو اسمِ مفعول ہے ۔

تنازُع : عربی میں ز پر پیش ہے (تنازُع) ، اور اس کے معنی ہیں ، باہم جھگڑا کرنا ۔ اُردو میں عام طور پر اِس کو بہ فتحِ زائے معجمہ بولتے ہیں ۔ اس کی ایک اور صورت "تنازِعہ" (بہ کسرِ زائے معجمہ) بھی استعمال میں آجاتی ہے ، لیکن نسبتاً کم ۔ مولفِ نور نے "تنازُع" کے ذیل میں لکھا ہے ، "عوام کی زبانوں پر تنازعہ ہے ۔" اب "عوام" کی قید اُڑا دینا چاہیے ۔ ہاں ایک ترکیب "تنازُع للبقا" میں ز پر پیش ہی رہے گا اور یہ استثنا ہے ۔ آصفیہ میں صرف "تنازُع" ہے ۔ فیلن نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے کہ "تنازُع" بہ ضمِ زا لکھ کر ، لکھا ہے کہ عام طور سے بہ فتحِ زا مستعمل ہے ـــــ اِس لفظ کی اِن تینوں صورتوں کو مان لینا چاہیے ، بہ ضمِ زا (تنازُع) عربی ترکیب میں کام آئے گا اور باقی دو صورتیں ، عام استعمال میں رہیں گی ۔

ہاں ، آتش نے ایک شعر میں "نزاع" کے بجائے "نزع" نظم کیا ہے :

حاصل ہوا نہ خاک بھی آپس کی نزع سے   دل میں غبار کا فرو دیں وار لے چلے

(کلیات ، نول کشور پریس ، ص ۳۸۵)

اُردو میں لفظ "نزع" اِس معنی میں ، اور کسی جگہ نظر سے نہیں گزرا ۔

تواں : "تواں ، بالفتح کہنے سے احتراز چاہیے ۔ اسی طرح توانا اور توانائی بہ ضمِ تا صحیح ہیں" (قاموس)

فارسی کے لغات میں عموماً توانستن اور اس کے مشتقات کو بہ ضمِ تا لکھا گیا ہے، مگر حکیم نے اپنے لغت میں اِن کو بہ فتحِ تا لکھا ہے۔ غالباً یہ جدید تلفظ ہے۔ اُردو میں بھی اِن سب کو بہ فتحِ تا استعمال کیا جاتا ہے، یعنی، توانا، توانائی، تواں (تاب و تواں)۔

مولفِ نور نے "تواں" لکھ کر، لکھا ہے: "بہ ضمِ اوّل صحیح ہے۔ اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے۔" جب زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے تو پھر "تَواں" لکھنا چاہیے تھا۔ یہ صراحت کی جا سکتی تھی کہ فارسی میں ت پر پیش ہے۔ آصفیہ میں ذرا پریشان کن صورت ہے۔ اُس میں "تواں" کے ذیل میں لکھا ہے: "تواں۔ ف۔ اسم مونث (بواوِ مجہول)...." یہ تو کوئی لفظ نہیں ہوا۔ البتہ "توانا" میں ت پر زبر لگا ہوا ہے اور "توانائی" میں واو پر زبر لگا ہوا ہے۔ عدمِ صراحت سے اور اِس انداز سے سخت الجھن ہوتی ہے ــــــ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، بول چال میں یہ لفظ بہ فتحِ حرفِ اوّل آتے ہیں۔

عربی کے ایسے متعدد لفظ ہیں جو بہ لحاظِ لغت بہ فتحِ اوّل صحیح ہیں، مگر اُردو کی بول چال میں عموماً بہ کسرِ اوّل مستعمل ہیں۔ بل کہ بعض لفظ تو صرف بہ کسرِ اوّل استعمال کیے جاتے ہیں۔ اردو والوں کے تلفظ کو پیشِ نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسے الفاظ میں حرفِ اول کا زبر، زیر سے جو بدلا ہے، تو یہ تبدیلی یہاں کے لہجے کا نتیجہ بل کہ تقاضا ہے۔ اور ایسے اکثر لفظوں کا حال یہ ہے کہ اُن کو بہ فتحِ اول بولنے میں، ہلکا سا سہارا تکلّف کا لینا پڑتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ بعض پڑھے لکھے، اُن لفظوں کو عربی کے مطابق، بہ فتحِ اوّل ہی بولتے ہیں؛ مگر اُن میں اکثریت اُنھی حضرات کی ہوتی ہے جن کو مدرسے میں، سبق کی تکرار کے دوران، اس تلفظ کی مشق ہو جاتی ہے، اور پھر زبان اُسی کو دہراتی رہتی ہے۔ یا ایسے حضرات کے بعض حوارئین ہوتے ہیں۔ "احمد" جیسے لفظوں کی صورت یہ ہے کہ اُن میں ح سے پہلے والے حرفِ مفتوح کی آواز ذرا ترچھے پن کے ساتھ نکلتی ہے۔ یہ اردو کا خاصہ ہے، یا یوں کہیے کہ یہاں کے لہجے کا تقاضا ہے؛ مگر ایسے حضرات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے جو عربی کی

مناسبت سے عربی کے مطابق "احمد" کو سیدھی طرح بر وزنِ اَفضل بولتے ہیں۔ اِس لفظ (اور اِس قبیل کے اور الفاظ) کا یہ تلفظ، علم کو تو ظاہر کرتا ہے، اور عربی زبان سے شناسائی کی بھی گواہی دے سکتا ہے، مگر مانگے ہوئے لہجے کی بھی چغلی کھاتا ہے۔ یہی صورت اُس وقت نمایاں ہوتی ہے جب مثلاً "جہل" کو عربی کی رعایت سے "جَہَل" کہا جائے، جب کہ اُردو والوں کا لہجہ، اِس لفظ میں جیم کے زیر سے مانوس ہے۔ ایسے الفاظ کے سلسلے میں مناسب صورت یہ ہوگی کہ اب لغت میں اُن کے اصل تلفظ کو لکھ کر، یہ وضاحت کردی جائے اُردو والے اِس طرح بولتے ہیں۔ بعض لفظ ایسے بھی نکلیں گے جن میں حرفِ اول کا فتحہ کبھی کبھی سُننے میں آتا رہتا ہے، کم سہی؛ ایسے لفظوں کی دونوں صورتوں کو مان لیا جائے گا، مگر اِس صراحت کے ساتھ کہ عام تلفظ بہ کسرِ اول ہی ہے۔ ایسے چند الفاظ یہ ہیں:

جہالت، رفاقت، رقابت، حماقت، حقارت:

مولفینِ قاموس نے اِن سب لفظوں کو، عربی کے مطابق، بہ فتحِ اول صحیح بتایا ہے، اور بہ کسرِ اول کو غلط۔ اِس میں شک نہیں کہ عربی میں یہ لفظ بہ فتحِ حرفِ اول صحیح ہیں، مگر اُردو میں یہ بہ کسرِ حرفِ اول بولے جاتے ہیں؛ اِس بنا پر بہ کسرِ اول کو غلط تو کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اِس کے برخلاف، بہ کسرِ اول کو اُردو کے لحاظ سے فصاحت کی سند حاصل ہوگی۔

مولفینِ قاموس کی طرح مولفینِ آصفیہ و نور نے بھی عربی کے تلفظ کو صحیح قرار دیا ہے۔ صورت یہ ہے کہ نور میں "جہالت" اور "حماقت" کے حروفِ اول پر زبر لگا ہوا ہے۔ اور کچھ صراحت نہیں، مگر "حقارت"، "رفاقت" اور "رقابت" کے ذیل میں یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ "بہ کسرِ اول غلط ہے"۔ آصفیہ میں اِن پانچوں لفظوں کے پہلے حروف پر زبر لگا ہوا ہے، کسی صراحت کے بغیر — یہ محض عربی کے تلفظ کی پابندی ہے اور اُردو کے تلفظ کو نظر انداز کرنا ہے۔ یہ سب لفظ اُردو میں عموماً بہ کسرِ حرفِ اول بولے جاتے ہیں۔ اب جو مفصل لغت مرتب ہو، اُس میں اصل حرکات کے ساتھ، اُردو کے اس تصرف کا ذکر ناگزیر

ہے۔ اِن میں سے اکثر لفظ ایسے ہیں کہ اگر اُن کو عربی کے مطابق بہ فتحِ اول بولا جائے تو اجنبیت کا احساس ہوگا۔ یقین نہ ہو تو "حَماقت" اور "حَقارت" بول کر دیکھ لیجیے۔ البتہ "رَقابت" اور "رَفاقت" کبھی کبھار بہ فتحِ حرفِ اول بھی سُننے میں آجاتے ہیں۔ کچھ لوگ ابھی اِس طرح بولتے ہیں۔ مناسب صورت یہ ہوگی کہ اِن لفظوں میں اِس کم مستعمل تلفظ کو بھی مان لیا جائے۔ اِس سے کچھ ہرج واقع نہیں ہوگا بل کہ احتیاط کی روش برقرار رہے گی اور یہ ضروری ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ بہ کسرِ اول کو غلط نہ کہا جائے جیسا کہ ہمارے لغت نویسوں کا انداز رہا ہے۔

"جہالت" کا مادّہ "جہل" ہے۔ عربی میں یہ بھی بہ فتحِ جیم ہے، مگر اردو میں "جہالت" کی طرح اِس کو بھی بہ کسرِ جیم بولتے ہیں، اور اب اِس لفظ کا بھی یہ تلفظ، اُردو کے لحاظ سے فصاحت مآب ہے۔

خزاں، رواج، رہا

"رواج" عربی میں بہ فتحِ اول ہے، مگر اُردو میں عام طور پر اِس کو بہ کسرِ حرفِ اول بولتے ہیں۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ ایسے اور الفاظ کے برخلاف، مولفینِ نور و آصفیہ دونوں نے، اِس لفظ میں حرکت کی تبدیلی کو تسلیم کیا ہے۔ صاحبِ آصفیہ نے لکھا ہے: "یہ لفظ عربی میں بہ فتحِ رائے مہملہ ہے، مگر اردو اور فارسی زبان میں بالکسر مروّج ہے"۔ نور میں بھی حرکت کی اِس تبدیلی کا ذکر ہے، مگر اندازِ نگارش ایسا ہے کہ ابہام کا دھندلکا ختم نہیں ہونے پاتا۔ مولفِ نور نے لکھا ہے: "رواج۔ ع۔ بفتحِ اول، فارسی بکسرِ اول بولتے ہیں (کذا)" یہ واقعتاً مبہم عبارت ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اردو میں کس طرح بولتے ہیں۔ مولفینِ قاموس نے البتہ اپنی روایت کو یہاں بھی برقرار رکھا ہے اور اِس لفظ کو صرف بہ فتحِ اول لکھا ہے۔ اُردو میں اب "رِواج" کو بہ کسرِ اول مرجّح ماننا چاہیے۔

"خزاں" موٴلفینِ قاموس نے اِس کو بھی صرف بہ فتحِ اوّل لکھا ہے۔ فارسی میں یہ لفظ بہ فتحِ اوّل ہی ہے، مگر اردو میں عام طور پر بہ کسرِ اوّل بولا جاتا ہے، البتّہ کبھی کبھی بعض لوگوں کی زبان سے بہ فتحِ اوّل بھی سننے میں آجاتا ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ اِس لفظ کے دونوں تلفّظ مان لیے جائیں، مگر اِس صراحت کے ساتھ کہ اکثر لوگ بہ کسرِ اوّل ہی بولتے ہیں۔

"رہا" فارسی میں بہ فتحِ اوّل ہے (رَہا)۔ اردو میں "رہا" اور "رہائی" دونوں لفظوں کو عموماً بہ کسرِ اوّل بولا جاتا ہے۔ آصفیہ میں کسی صراحت کے بغیر ر پر زیر لگا ہوا ہے۔ یہ بھی مناسب صورت نہیں۔ صراحت ضروری تھی کہ یہ اُردو کا تصرّف ہے۔ نور میں صحیح طریقہ اختیار کیا گیا ہے، "صحیح بہ فتحِ اوّل، زبانوں پر بہ کسرِ اوّل ہے"۔ فارسی میں حسبِ معمول اِس کو صرف بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے۔ ہاں، یہ عرض کردوں کہ مستشرقین کے لغات میں اِن سب لفظوں کے ذیل میں حرکات اور انتساب کی اچھی خاصی گڑبڑ ملتی ہے، مثلاً فیلن نے "رواج" کو بہ کسرِ اوّل لکھ کر "ہ" لکھا ہے، حالاں کہ یہ ہندی صورت ہے۔ اِسی طرح کی اور باتیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ پہلو سامنے رہنا چاہیے۔

رعایا، جریان : پہلا لفظ "رعایا" عربی کے لحاظ سے بہ فتحِ حرفِ اوّل ہے، موٴلفینِ قاموس نے بھی اِسی طرح بولنے کی فرمایش کی ہے، مگر اِس لفظ میں اُردو کے تصرّف نے حرفِ اوّل کے زبر کو زیر سے بدل دیا ہے اور کلیتاً۔ یعنی یہاں وہ صورت نہیں جو مثلاً "رقابت" یا "رواج" جیسے لفظوں کے ساتھ وابستہ ہے، کم تر ہی مگر بہ فتحِ اوّل بولے ضرور جاتے ہیں ــــــ آصفیہ میں ر پر زیر لگا ہوا ہے اور نور میں صراحت ملتی ہے کہ اردو میں بہ کسرِ اوّل مستعمل ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔

دوسرا لفظ "جریان" ہے۔ عربی میں اس کے معنی ہیں: بہنا۔ اور بہ فتحِ اوّل و دوم ہے (جَرَیان)۔ اُردو میں اِس معنی میں عام طور پر تو یہ لفظ اس [illegible]

آتا، البتہ خاص خاص مواقع پر اور خاص خاص تحریروں تک اس کا استعمال محدود ہے (اور یہ صورت عموماً پرانی تحریروں میں پائی جاتی ہے، جیسے، جریانِ آب۔) اِن معنی میں یہ چوں کر قلیل الاستعمال ہے، اس لیے حرفِ اول کا فتحہ باقی رہا مگر دوسرے حرف پر سکون آگیا۔ یہ تبدیلی پہلے فارسی میں ہو چکی تھی۔ فارسی سے اردو میں یہ لفظ اسی طرح منتقل ہو گیا۔

یہ لفظ ایک مشہور بیماری کا نام ہے اور یہ معنی، اُردو کا اضافہ ہیں، یعنی اِس معنی میں یہ لفظ اُردو ہے۔ استعمالِ عام کی بنا پر حرفِ اوّل کی حرکت میں تبدیلی ہوئی، یعنی اس کو "جِریان" بہ کسرِ جیم استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لفظ میں اختلافِ معنی کے لحاظ سے، اختلافِ حرکت کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ اصل معنی (بہنا) کے لحاظ سے یہ بہ فتحِ اول (جَریان) رہے گا اور مرضِ معروف کے لیے (جِریان) بہ کسرِ اول مانا جائے گا ——— آصفیہ میں اِس کو صرف بہ کسرِ جیم لکھا گیا ہے اور سب معانی میں عربی بتایا گیا ہے۔ یہ درست نہیں۔ عربی میں بہ فتحِ اول و دوم (جَرَیان) ہے، اور "بہنا" کے معنی میں آتا ہے۔ مرض کے نام کے طور پر اُردو میں استعمال ہوتا ہے اور بہ کسرِ اول و سکونِ دوم بولا جاتا ہے ——— نور میں صحیح طور پر لکھا گیا ہے کہ مرضِ مشہور کے معنی میں " اردو میں بہ کسرِ اول و سکونِ دوم زبانوں پر ہے"۔ ہاں، یہ وضاحت کر دی جائے کہ عربی میں ج اور ر دونوں حرفوں پر زبر ہے (جَرَیان)۔ فارسی میں اِس کو بہ سکونِ دوم استعمال کیا گیا ہے۔ باقی تصرفات اردو میں ہوئے ہیں۔

نشتر، نقاب: یہ دونوں لفظ اصلاً بہ کسرِ حرفِ اول ہیں (نِشتر، نِقاب)۔ فارسی و عربی کے بہت سے لفظ ایسے ہیں جو اُن زبانوں میں بہ کسرِ حرفِ اول ہیں، مگر اُردو میں پہلے حرف کا زیر، زبر سے بدل گیا ہے اور یہ اُردو کا تصرف ہے اور یہاں کے لہجے کا اثر ہے۔ یہ دونوں لفظ بھی اُسی فہرست میں شامل ہیں ——— مولفینِ قاموس نے اپنی روایت کے مطابق، اِن دونوں لفظوں کو بھی صرف بہ کسرِ اوّل صحیح بتایا ہے، مگر اردو کی بول چال میں

یہ دونوں لفظ بہ فتحِ اول مستعمل ہیں اور اُردو کے لحاظ سے یہ تلفظ بالکل صحیح ہے۔

آصفیہ میں "نقاب" کے "ن" پر اہتمام کے ساتھ کئی جگہ زیر لگایا گیا ہے (نِقاب) اور حرکات کے متعلق کسی طرح کی صراحت نہیں ملتی۔ گویا اِس لفظ میں مولّف نے کسی طرح کے تصرف کو تسلیم نہیں کیا اور صرف اصل حرکات کو صحیح سمجھا ہے۔ اِس کے برخلاف "نشتر" کے "نون" پر زبر لگا ہوا ہے (نَشتر)۔ حرکات کی صراحت یہاں بھی نہیں۔ مزید یہ کہ بہ فتحِ نون کو فارسی لکھا گیا ہے اور یہ بالکل درست نہیں۔ یہ صراحت ضروری تھی اِن دونوں لفظوں کے "نون" پر اصل کے لحاظ سے زیر ہے، اور اردو میں یہ تصرف ہوا ہے کہ اِن کو بہ فتحِ اول استعمال کیا جاتا ہے۔ نور میں صحیح طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ "نقاب" کے ذیل میں لکھا گیا ہے:

"صحیح بہ کسرِ اول ہے، ہندستان میں زبانوں پر بہ فتحِ اول ہے"۔ اِسی طرح کی صراحت "نشتر" کے ذیل میں بھی کی گئی ہے۔

کلید، کلیسا: فارسی میں "کلیسا" صرف بہ کسرِ حرفِ اول ہے اور "کلید" بہ فتحہ و بہ کسرِ اول، دونوں طرح ہے"۔ (غیاث اللغات ۔ بہارِ عجم)

مولّفینِ قاموس نے اِن کو صرف بہ کسرِ اول لکھا ہے۔ اردو میں اِن دونوں لفظوں میں حرفِ اوّل کا کسرہ مقبول نہ ہو سکا۔ خاص و عام سبھی اِن کو بہ فتحِ کاف بولتے ہیں، اور اب اُردو کی حد تک، صرف یہ تلفظ صحیح اور فصیح ہے۔ بہ کسرِ اول کو فارسی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔

آصفیہ میں دونوں لفظوں کو فارسی کی رعایت سے صرف بہ کسرِ اول لکھا گیا ہے، اُردو کے تصرف کا مطلق ذکر نہیں۔ نور میں "کلیسا" کے ذیل میں یہ صحیح طور پر لکھا گیا ہے کہ:

"اُردو میں بہ فتحِ اول و کسرِ دوم و سکونِ یائے معروف زبانوں پر ہے"۔

مگر "کلید" کو کسی صراحت کے بغیر بہ ہر دو حرکات لکھا گیا ہے۔ اس عدمِ صراحت سے یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اُردو میں یہ بہ فتحِ اول و کسرِ اول دونوں طرح مستعمل ہوگا۔ یہ لکھنا ضروری تھا کہ

اُردو میں صرف بہ فتحِ حرفِ اول مستعمل ہے۔ ہاں "کلیسا" کی ایک صورت "کلیسیا" بھی ہے اور اردو میں اِس کو استعمال کیا گیا ہے:

مرضی میں تیری کیا ہے اے وحشت آہ سچ کہہ
جاویں کلیسیا کو، یا زائرِ حرم ہوں
انشا (کلامِ انشا، ص-۱۵۰)

از خویش رفتگی ہی پہ ہم غش ہیں یاں نہیں
عزمِ کلیسیا و ارادہ حجاز کا
ممنون (تذکرۂ سرور)

نور میں اِس کا ذکر نہیں۔ آصفیہ میں یہ ہے مگر مختلف معانی میں:

"کلیسیا - یونانی - اسم مذکر- عیسائیوں کی ایک جماعت جو بُت پرست خیال کی جاتی ہے، اور وہ حضرت مریم کا بُت پوجتی ہے۔"

مندرجۂ بالا مثالوں سے یہ ثابت ہے کہ اُردو میں "کلیسیا" اور "کلیسا" ہم معنیٰ لفظوں کے طور پر مستعمل ہیں۔ جانسن کے لُغت میں "کلیسا" کی ایک صورت "کلیسہ" بھی ملتی ہے مگر "کلیسہ" نہ فارسی میں ہے، نہ اُردو میں۔

فریب، فرار، فرشتہ: مولفینِ قاموس نے اِن لفظوں کو صرف بہ کسرِ اول صحیح بتایا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فارسی میں یہ لفظ بہ کسرِ حرفِ اول ہیں، مگر اردو میں یہ صرف بہ فتحِ حرفِ اول مستعمل ہیں۔ اردو میں اب اِن لفظوں کو بہ فتحِ حرفِ اول ہی صحیح ماننا چاہیے، اور ف کے زیر کو فارسی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔

آصفیہ میں اِن تینوں لفظوں کے حرفِ اوّل پر صرف زیر لگا ہوا ہے (فرشتہ، فرار، فریب) اس کے علاوہ حرکات کے سلسلے میں کسی طرح کی صراحت نہیں۔ یہ فارسی کی تقلیدِ محض اور اردو کے چلن سے چشم پوشی ہے۔ نور میں "فرشتہ" کے ف پر زیر لگا ہوا ہے مع فرشتہ۔ "فرار" کے سلسلے میں تو یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ "بہ کسرِ اول صحیح و بہ فتحِ اول

غلط ہے۔" اور اِس کے برخلاف "فریب" کی فارسی کی حرکات درج کرنے کے بعد یہ لکھا گیا ہے کہ "اردو میں بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔" گویا ایک لفظ میں اردو بول چال کو ملحوظ رکھا گیا اور دو لفظوں میں اُس سے قطعِ نظر کو روا رکھا گیا۔ پلیٹس نے "فریب" بہ فتحِ اول کو عامیانہ تلفظ لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب اِس سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ فیلن نے "فرشتہ" کو بفتحِ اول لکھا ہے مگر اِس کو فارسی بتایا ہے۔ یہ مناسب صورت نہیں۔ فارسی میں تو صرف بکسرِ اول ہے۔ فتحہ، اُردو کا اثر ہے۔ فوربس، فیلن اور جانسن نے یہی غلطی "فریب" کے سلسلے میں بھی کی ہے۔

جیسا کہ لکھا جاچکا ہے، فریب، فریبی، فریبیا، فرشتہ، فرشتگان، فرار، فراری؛ سب لفظ صرف بہ فتحِ فا مستعمل ہیں اور اب اُردو میں اِن کی صرف یہی حرکت قابلِ تسلیم ہے۔

فریفتہ، فروخت، فرستادہ : "فریفتہ" فارسی میں بکسرِ اول ہے (فِریفتہ)۔ اردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اول ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ تو موجود ہے، مگر نہ اعراب لگے ہوئے ہیں اور نہ اُن کے متعلق کسی طرح کی صراحت ملتی ہے۔ نور میں صحیح طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اصل حرکات کے بعد، یہ صراحت کردی گئی ہے کہ، "یہ لفظ زبانوں پر بہ فتحِ اول و کسرِ دوم ہے۔" اُردو میں اب اِس کو بہ فتحِ اول ہی ماننا چاہیے۔

"فروختن" فارسی کے قدیم لُغات میں بہ کسرِ اول ملتا ہے۔ اِس کے مشتقات کی بھی یہی صورت ہے۔ اور "فرستادن" بھی بہ کسرتین ہے۔ (فِروختن۔ فِرستادن) مولفینِ قاموس نے اِسی وجہ سے "فروختہ" کو صرف بہ کسرِ اول یہ صحیح بتایا ہے۔ اُردو میں اِن دونوں مصدروں کے مشتقات صرف بہ فتحِ حرفِ اول مستعمل ہیں، یعنی، فَروخت، فَروختہ، فَروش، فَروشندہ (وغیرہ) اور فَرستادہ۔ اور اُردو میں اب اِن کو اِسی طرح صحیح ماننا چاہیے۔

آصفیہ میں "فِروخت" اور "فِروخت کرنا" اور "فِرستادہ" لکھے ہوئے ہیں، یعنی ف پر زیر لگا ہوا ہے، اور کسی طرح کی صراحت نہیں ملتی۔ یہ فارسی کی تقلیدِ محض کا نتیجہ ہے۔ نور میں آصفیہ

کی طرح "فرِستادہ" کے ف پر زیر لگا ہوا ہے (فرِستادہ) اور کچھ صراحت نہیں۔ اِس کے برخلاف "فروخت" کے ف پر زبر لگا ہوا ہے (فَروخت) اور صراحت یہاں بھی موجود نہیں۔ مولّف نے "فَروخت" کو فارسی لکھا ہے۔ اِس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ یہ لفظ فارسی میں بھی بہ فتحِ اول ہوگا۔ مولّف نے جس طرح "فریفتہ" کے ذیل میں صراحت کی تھی کہ اردو میں بہ فتحِ اول مستعمل ہے؛ اُسی طرح اِن لفظوں کے ذیل میں بھی صراحت کرنا چاہیے تھی۔

ہاں، "فرِوختن" فارسی کے پُرانے لغات میں بہ کسرِ اوّل ہے، لیکن آج کل ایران میں بہ ضمِ اول مستعمل ہے۔ حییم نے اس کو صرف بہ ضمِ اول لکھا ہے۔ برہانِ قاطع میں "فروختہ" کو بہ کسرِ اول لکھا گیا ہے۔ برہان کے ایرانی اڈیشن کے مرتّب ڈاکٹر محمد معین نے اس کے حاشیے میں لکھا ہے: "فروختن، بہ ضمِ اول و دوم و فتحِ پنجم (در زبانِ کنونی)"۔ گویا فارسی میں فروختن (اور اس کے مشتقات) کی دو شکلیں ہیں: بہ کسرِ اول (فرِوختن) اور بہ ضمِ اول (فُروختن)۔ اردو میں اِس کے مشتقات صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہیں۔

عیال، عیاں، عصمت، عیادت، عمامہ:

عیاں اور عیال کو بہ کسرِ حرفِ اول صحیح، اور بہ فتحِ حرفِ اول غلط بتایا گیا ہے (قاموس)۔ نوراللغات میں بھی یہی لکھا گیا ہے: "عیال.... بہ کسرِ اول صحیح و بہ فتحِ اول غلط ہے"۔ "عیاں.... بہ کسرِ اول صحیح، بہ فتحِ اول غلط"۔ آصفیہ میں بھی دونوں لفظوں کے ع پر زیر لگا ہوا ہے (عِیال۔ عِیاں)۔ اِن سب حضرات نے عربی کے تلفّظ سے سروکار رکھا ہے اور استعمالِ عام کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ اردو میں اِن دونوں لفظوں کو کوئی بھی بہ کسرِ اول نہیں بولتا اور خاص و عام کی مطلق قید نہیں

میں یہ لفظ صرف بہ فتحِ اوّل مستعمل ہیں، اور اب اِن کی صرف یہی حرکت قابلِ تسلیم ہے۔ بہ کسرِ عین کو عربی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔ مولانا نظم طباطبائی نے لکھا ہے:

"فارسی و عربی کے بعض الفاظ اردو میں غلط بولے جاتے ہیں، اور اُن کو غلط ہی بولنا چاہیے۔ اُن کو صحیح کر کے بولنا، ہندیوں کی زبان پر ثقیل ہے، جیسے: عیادت، عیال، عیاں بہ کسرِ عین ہیں، مگر بولتے بہ فتحہ ہیں۔ ایک نقل میں نے سُنی ہے کہ حکیم میر ضامن علی مرحوم جلالؔ سے نواب کلب علی خاں مرحوم والیِ رام پور نے پوچھا کہ آپ عیاں کو عِیاں کہیں گے؟ تو اُنھوں نے جواب دیا کہ عِیاں تو ہم کبھی نہ کہیں گے"۔

(اردوئے معلّٰی، بابت فروری و مارچ ۱۹۱۲ء)

عصمت عربی میں صرف بہ کسرِ اول ہے۔ اردو لغات میں بھی اِس کو بہ کسرِ حرفِ اول ہی لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں ع پر زیر لگا ہوا ہے، اور کچھ مذکور نہیں، مگر نور میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "بالکسر صحیح، بالفتح غلط ہے"۔ قاموس میں بھی یہی لکھا ہوا ہے: "بالفتح غلط ہے"۔ یہ لفظ بہ فتحِ حرفِ اول بھی زبانوں پر ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ اِس لفظ کو بہ فتحِ حرفِ اول اور بہ کسرِ حرفِ اول، دونوں طرح صحیح مان لیا جائے۔ لکھنے میں دونوں طرح آتا ہے۔

عیادت بھی عربی میں بہ کسرِ عین ہے۔ آصفیہ و نور دونوں میں کسی صراحت کے بغیر ع پر زیر لگا ہوا ہے (عِیادت)۔ اردو میں اس کو بہ کسرِ اول شاید ہی کوئی بولتا ہو۔ عیال اور عیاں کی طرح، اس کو بھی صرف بہ فتحِ عین (عَیادت) بولا جاتا ہے۔ اردو میں اِس لفظ کی اِسی حرکت کو صحیح ماننا چاہیے اور بہ کسرِ عین کو عربی لغات کے حوالے کر دینا چاہیے۔

عمامہ۔ بالکسر۔ خود، مغفر، دستار، وہ جو سر پر لپیٹیں۔ بالفتح (عَمامہ) غلط

ہے" (قاموس)۔

یہ صحیح ہے کہ عربی میں "عِمامہ" بہ کسرِ عین ہے۔ فارسی میں بھی یہی صورت ہے، لیکن اردو میں صرف بہ فتحِ اول بولا جاتا ہے۔ یہ اردو کا تصرف ہے۔ آصفیہ میں تو عربی کی تقلید میں عَ پر زیر لگا ہوا ہے (عِمامہ) مگر نور میں اردو کے اِس تصرف کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مؤلفِ نور نے اصل حرکات درج کرنے کے بعد لکھا ہے: "اردو میں بہ فتحِ اوّل زبانوں پر ہے"۔ اِس لفظ کو بھی اردو میں صرف بہ فتحِ اول ماننا چاہیے۔

فارسی میں اس لفظ کو بہ تشدیدِ میم اول بھی استعمال کیا گیا ہے۔ یہ فارسی کا تصرف ہے (بہارِ عجم)۔ اردو میں بھی یہی صورت ہے کہ بہ تشدیدِ میم بھی اِس کو نظم کیا گیا ہے۔ مثلاً:

ٹک دیکھیے گا جبّہ و عمّامۂ زاہد ہے اُس پہ مجھے بلغمِ باعور کی سوجھی
انشا (کلامِ انشا، ص ۲۴۰)

خرقہ ہے نصیب یاسمن کو عمّامہ ملا ہے نسترن کو
محسن کاکوروی (کلیاتِ نعتِ محسن، نامی پریس ص ۹)

ستم ہیں، قہر ہیں لونڈے شراب خانے کے اُتار لیتے ہیں عمّامہ ہر نمازی کا (میر)
مفت آبروے زاہدِ علّامہ لے گیا اک مغ بچہ اُتار کے عمّامہ لے گیا
(میر)

سرِشت، سرایت، جراحت، بہشت:

سرشت اور سرایت، یہ دونوں لفظ بہ لحاظِ اصل بہ کسرِ حرفِ اول ہیں (سِرشت، سِرایت)۔ اردو میں، ایسے کچھ اور الفاظ کی طرح، حرفِ اول کا زیر، زبر سے بدل گیا، مگر لغات میں اِن کو اصل کی رعایت سے بہ کسرِ اول ہی لکھا گیا ہے۔

آصفیہ میں "سرِشت" کے "س" پر زیر لگا ہوا ہے۔ نور میں حرکات کی باقاعدہ صراحت کی گئی ہے: "سرِشت ..... بکسرِ اول و دوم و سکونِ سوم"۔ اسی طرح "سرایت" کے ذیل میں لکھا گیا ہے: "بکسرِ اول و فتحِ چہارم" مولفینِ قاموس نے اور زیادہ وضاحت سے کام لیا ہے: "سرایت، بالکسر صحیح ہے اور بالفتح غلط"۔ "سرشت، بہ فتحِ سینِ مہملہ صحیح نہیں"۔

اردو میں یہ دونوں لفظ، عیاں، عیال اور عمامہ وغیرہ کی طرح، صرف بہ فتحِ حرفِ اوّل استعمال کیے جاتے ہیں۔ اب اردو میں ان کو اسی طرح صحیح ماننا چاہیے اور بکسرِ اول کو اردو سے غیر متعلق سمجھنا چاہیے۔

"جراحت، بہ فتح جیم صحیح نہیں" (قاموس) عربی میں یہ لفظ بکسرِ اول ہی ہے۔ فارسی میں بھی یہی صورت ہے۔ غیاث اللغات میں خاص طور پر یہ صراحت کی گئی ہے کہ بہ فتحِ اول صحیح نہیں: "جراحت، بالکسر..... و بالفتح خطاست"۔ مگر اردو میں "سرایت" کی طرح اِس کو جیم کے زبر سے بولتے ہیں۔ نور میں جیم پر زبر لگا ہوا ہے، اور مزید صراحت اس طرح کی گئی ہے: "عربی میں بکسرِ اول"۔ گویا مؤلف نے کم سے کم اس لفظ میں اردو کے تصرّف کو تسلیم کر لیا۔ آصفیہ میں اِس کو عربی بتایا گیا ہے اور اعراب اِس طرح لگے ہوئے ہیں کہ اِس لفظ کو بالفتح بھی پڑھا جا سکتا ہے اور بالکسر بھی۔ یہ کتابت کی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ یہ صراحت ضروری تھی کہ عربی میں ج پر زیر ہے، اور اردو میں بہ فتحِ جیم ہے۔ پلیٹس نے بکسرِ اول کو عربی اور بہ فتحِ اول کو فارسی لکھا ہے۔ اس قول کا جزوِ آخر صحیح نہیں۔ عربی کی طرح فارسی میں بھی بکسرِ اوّل ہے۔ جیم کا زبر، اردو کا اثر ہے۔

بہشت: فارسی میں بکسرتین ہے (بِہِشت)۔ تعجب اس پر ہے کہ صاحب نور اللغات نے بھی اِس کو مطلقاً فارسی کے مطابق لکھا ہے: "بکسرِ اول و دوم و سکون

سوم ہے۔ اردو میں تو اِس طرح کوئی نہیں بولتا۔ سب لوگ بہ فتحِ اول و کسرِ دوم (بہشت) بولتے ہیں۔ جس طرح فارسی کا "فِرِشتہ" اردو میں "فَرِشتہ" بن گیا، اُسی طرح "بِہشت" یہاں "بَہِشت" ہو گیا ہے۔ اردو میں اب صرف اِسی تلفظ کو صحیح ماننا چاہیے۔ آصفیہ میں ب پر زبر لگا ہوا ہے (بَہِشت) اور صحیح طور پر اس کو فارسی کا لفظ بتایا گیا ہے۔ قابلِ لحاظ بات بس یہ ہے کہ اِس اندازِ نگارش سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ فارسی میں بھی یہ بہ فتحِ اول ہوگا۔ یہ لکھنا ضروری تھا کہ فارسی میں بہ کسرِ اول ہے، اور اردو میں بہ فتحِ اول۔

چنگیز، خزانہ، دریغ:

آصفیہ و نور دونوں میں "چنگیز" موجود نہیں۔ مولفینِ قاموس نے اِس کو بہ کسرِ اول لکھا ہے۔ فارسی میں حرفِ اول ضرور مکسور ہے (غیاث اللغات) مگر اردو میں اس کو صرف بہ فتحِ حرفِ اول بولا جاتا ہے اور اب اردو کی حد تک اِسی حرکت کو مرجح ماننا چاہیے۔

خزانہ، عربی میں بہ کسرِ حرفِ اول ہے۔ ایسے اور الفاظ کی طرح، اردو میں اِس لفظ کے پہلے حرف کا زیر، زبر سے بدل گیا۔ یہ یہاں کے لہجے کا اثر ہے۔ اردو میں اب اس کو صرف بہ فتحِ حرفِ اول بولتے ہیں۔ بہ کسرِ حرفِ اول (خِزانہ) کو عربی کے حوالے کر دینا چاہیے۔

نور اور آصفیہ دونوں میں پریشان کُن صورت پائی جاتی ہے۔ نور میں اس کو پہلے "بہ کسرِ اول" لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے: "موید الفضلا میں بہ کسرِ اول و بہ فتحِ اول دونوں طرح لکھا ہے"۔ مگر مولف نے یہ نہیں لکھا کہ اردو میں کیا صورت ہے؟ اِس سے الجھن پیدا ہوتی ہے ـــــ آصفیہ میں "خَزانہ" لکھا ہوا ہے، یعنی خ پر زبر

لگا ہوا ہے اور مزید صراحت یہ کی گئی ہے کہ: "مشہور بفتحِ خا اور صحیح بکسرِ خائے معجمہ ہے۔" اِس سے بات پوری طرح صاف نہیں ہوتی۔ یہ وضاحت ضروری تھی کہ عربی میں یہ بکسرِ اول ہے، مگر اردو میں اِس کو بفتحِ اول بولتے ہیں اور اردو میں اب یہی حرکت صحیح ہے۔

دریغ، فارسی میں بکسرتین ہے (دِرِیغ)۔ فرشتہ اور بہشت کی طرح، اردو میں اس لفظ میں بھی حرفِ اول کا کسرہ، فتحے سے بدل گیا، اور اب اردو والے اِس کو (دَرِیغ) بولتے ہیں۔ اردو میں اس کی یہی صورت مرجح ہے — آصفیہ میں یہ لفظ موجود ہے، لیکن نہ ضبطِ حرکات سے کام لیا گیا ہے اور نہ صراحت کی گئی ہے۔ البتہ نور میں اِس کو فارسی لغات کے مطابق "بکسرِ اول و دوم" ہی لکھا گیا ہے۔ قاموس میں بھی فارسی حرکات کو صحیح بتایا گیا ہے۔ اردو میں "دریغ" اور "دریغا" دونوں لفظ صرف بفتحِ دال استعمال کیے جاتے ہیں۔

درود، دروغ، رعونت:

لفظ "درود" اصلاً بضمِ دال ہے (دُرود)۔ آصفیہ اور قاموس میں دال پر پیش لگا ہوا ہے، اور صاحبِ نور اللغات نے مزید صراحت کی ہے کہ: "بفتحِ دال غلط ہے۔" یہ اُن کی زیادتی ہے۔ عام لوگ، خاص طور پر عورتیں اِس کو بفتحِ دال بولتی ہیں۔ مناسب یہ ہوگا کہ اِس لفظ کو دونوں طرح صحیح مان لیا جائے۔ کچھ لوگ (بلکہ بعض لوگ) بضمِ اول بولیں گے، اور اکثر بولنے والے اس کو بفتحِ دال استعمال کریں گے۔

"دروغ، بہ فتحِ دال ہے۔" (قاموس)۔ مگر یہ قول بجائے خود غلط ہے۔ برہانِ قاطع کے ایرانی مرتب ڈاکٹر محمد معین نے "دروغ" کو حاشیے میں بضمِ اول

لکھ کر اس کا افغانی تلفظ بہ فتحِ اول لکھا ہے۔ اردو میں بھی اس کو بہ فتحِ اول استعمال کیا جاتا ہے۔ آصفیہ میں تو اس کو فارسی کے مطابق صرف بہ ضمِ اول لکھا ہے، مگر نور میں ہے کہ: "بہ ضمِ اول و دوم و نیز بہ فتحِ اول"۔ اصل میں صاحبِ غیاث اللغات نے لکھا ہے کہ "بہ فتحِ اول نیز آمدہ"۔ مولفِ نور نے غالباً غیاث کے اسی اندراج کی بنا پر اس کو دونوں طرح لکھا ہے۔ لیکن فارسی کے اور لغات میں اس کو صرف بہ ضمِ اوّل لکھا گیا ہے۔

بہرصورت، اردو میں "دروغ" صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔ بہ ضمِ اول کو اب صرف فارسی تک محدود سمجھنا چاہیے۔ دروغ بیانی، دروغ گوئی، دروغ حلفی؛ مستعمل مرکبات ہیں، ان میں "دروغ" کو بہ ضمِ اول بول کر دیکھیے؛ تلفظ کی ثقالت آنکھیں دکھائے گی۔

"رعونت" کے متعلق قاموس میں لکھا گیا ہے کہ: "بہ فتحِ را کہنا غلط ہے"۔ آصفیہ و نور میں بھی ر پر پیش لگا ہوا ہے؛ اِس کا مطلب یہی ہوا کہ دونوں مولفین کے نزدیک بھی یہ لفظ بہ ضمِ را صحیح ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لفظ عربی میں صرف بہ ضمِ اول ہے، مگر اردو میں یہ لفظ عموماً بہ فتحِ اول بولا جاتا ہے۔ بہ ضمِ اول شاید ہی کوئی بولتا ہو۔ اردو میں اب اِس لفظ کو بہ فتحِ اول مرجح ماننا چاہیے۔

جمہور، سوال، مروّت:

لفظ "جمہور" عربی میں بہ ضمِ جیم ہے۔ فارسی کے لغات میں بھی اِس کو بہ ضمِ جیم لکھا گیا ہے۔ اِسی رعایت سے قاموس میں اِس کو "فتحِ جیم غلط" لکھا گیا ہے۔ اردو میں یہ لفظ صرف بہ فتحِ جیم مستعمل ہے۔ اسی طرح "جمہوری" اور "جمہوریت" کو بھی بہ فتحِ اول بولا جاتا ہے۔ اردو میں اِس لفظ کو صرف بہ فتحِ اوّل ماننا چاہیے۔

نور میں "جمہور" کے ج پر پیش لگا ہوا ہے (جُمہور) اور کسی طرح کی صراحت نہیں ملتی۔ اِس کے برخلاف، آصفیہ میں ج پر زبر لگا ہوا ہے (جَمہور)، اور اس کو عربی لکھا گیا ہے۔ یہ صحیح صورت نہیں۔ یہ صراحت ضروری تھی کہ عربی میں ج پر پیش ہے، اور اردو میں اِس کو بہ فتحِ جیم بولتے ہیں۔

"سوال" کے ذیل میں نوراللغات میں یہ اندراج ملتا ہے: "سوال۔ ع۔ بہ ضمِ اول و فتحِ ہمزہ کہ بہ صورتِ واو ہے۔" یعنی صحیح لفظ "سُؤال" ہے۔ یہ نری عربی کی تقلید ہے۔ مولفِ نور نے جو کچھ لکھا ہے، اُس کا تعلق دراصل عربی سے ہے اور اُسی سے رہنا چاہیے۔ مولفینِ قاموس نے بھی بہ ضمِ اول کو صحیح بتایا ہے: "بہ فتحِ سین کہنا درست نہیں۔"

اُردو میں اِس کو "سَوال" بہ فتحِ س و واو بولا جاتا ہے اور اُردو میں اِسی طرح مرجح قرار دینا چاہیے۔ فیلن نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے کہ "سُؤال" لکھ کر لکھا ہے کہ عام تلفظ بہ فتحِ اول مع واو ہے، اور صحیح بات بھی یہی ہے ـــــ آصفیہ میں "سوال" لکھا ہوا ہے۔ نہ تو اس پر زیر زبر لگے ہوئے ہیں اور نہ صراحت کی گئی ہے، البتہ "سُوالات" کے س پر پیش لگا ہوا ہے۔ یہ بھی درست نہیں۔ اردو میں "سوالات" کو بھی صرف بہ فتحِ س استعمال کیا جاتا ہے (سَوالات)۔ اِسی طرح "سَوالی" بھی صرف بہ فتحِ س بولا جاتا ہے۔

لفظِ "مروّت" اردو میں بہ ضمِ اول و فتحِ دوم بولا جاتا ہے (مُرَوّت) اور اب اردو والوں کے لیے یہ اِسی طرح صحیح ہے۔ آصفیہ میں "مُرَوّت" لکھا ہوا ہے، مگر نور میں "مُرُوّت" ہے، مگر اِس صراحت کے ساتھ: "بہ ضمِ اول و دوم و فتحِ واوِ مشدد صحیح۔"

لکھ کر اس کا اتفاقی تلفظ بہ فتحِ اول لکھا ہے۔ اردو میں بھی اس کو بہ فتحِ اول استعمال کیا جاتا ہے۔ آصفیہ میں تو اس کو فارسی کے مطابق صرف بہ ضمِ اول لکھا ہے، مگر نور میں ہے کہ: "بہ ضمِ اول و دوم و نیز بہ فتحِ اول"۔ اصل میں صاحبِ غیاث اللغات نے لکھا ہے کہ "بہ فتحِ اول نیز آمدہ"۔ مولفِ نور نے غالباً غیاث کے اسی اندراج کی بنا پر اس کو دونوں طرح لکھا ہے۔ لیکن فارسی کے اور لغات میں اِس کو صرف بہ ضمِ اوّل لکھا گیا ہے۔

بہ ہر صورت، اردو میں "دروغ" صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔ بہ ضمِ اول کو اب صرف فارسی تک محدود سمجھنا چاہیے۔ دروغ بیانی، دروغ گوئی، دروغ حلفی؛ مستعمل مرکبات ہیں، ان میں "دروغ" کو بہ ضمِ اول بول کر دیکھیے؛ تلفظ کی ثقالت آنکھیں دکھائے گی۔

"رعونت" کے متعلق قاموس میں لکھا گیا ہے کہ: "بہ فتحِ را کہنا غلط ہے"۔ آصفیہ و نور میں بھی ر پر پیش لگا ہوا ہے؛ اِس کا مطلب یہی ہوا کہ دونوں مولفین کے نزدیک بھی یہ لفظ بہ ضمِ را صحیح ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لفظ عربی میں صرف بہ ضمِ اول ہے، مگر اردو میں یہ لفظ عموماً بہ فتحِ اول بولا جاتا ہے۔ بہ ضمِ اول شاید ہی کوئی بولتا ہو۔ اردو میں اب اِس لفظ کو بہ فتحِ اول مرجح ماننا چاہیے۔

جمہور، سوال، مروّت:

لفظ "جمہور" عربی میں بہ ضمِ جیم ہے۔ فارسی کے لغات میں بھی اِس کو بہ ضمِ جیم لکھا گیا ہے۔ اِسی رعایت سے قاموس میں اِس کو "فتحِ جیم غلط" لکھا گیا ہے۔ اردو میں یہ لفظ صرف بہ فتحِ جیم مستعمل ہے۔ اسی طرح "جمہوری" اور "جمہوریت" کو بھی بہ فتحِ اول بولا جاتا ہے۔ اردو میں اِس لفظ کو صرف بہ فتحِ اوّل ماننا چاہیے۔

نور میں "جمہور" کے ج پر پیش لگا ہوا ہے (جُمہور) اور کسی طرح کی صراحت نہیں ملتی۔ اِس کے برخلاف، آصفیہ میں ج پر زبر لگا ہوا ہے (جَمہور)، اور اس کو عربی لکھا گیا ہے۔ یہ صحیح صورت نہیں۔ یہ صراحت ضروری تھی کہ عربی میں ج پر پیش ہے، اور اردو میں اِس کو بہ فتحِ جیم بولتے ہیں۔

"سوال" کے ذیل میں نور اللغات میں یہ اندراج ملتا ہے: "سوال۔ ع۔ بہ ضمّ اوّل و فتحِ ہمزہ کہ بہ صورتِ واو ہے"، یعنی صحیح لفظ "سُؤال" ہے۔ یہ نری عربی کی تقلید ہے۔ مولّفِ نور نے جو کچھ لکھا ہے، اُس کا تعلق دراصل عربی سے ہے اور اُسی سے رہنا چاہیے۔ مولّفینِ قاموس نے بھی بہ ضمِّ اول کو صحیح بتایا ہے: "بہ فتحِ سین کہنا درست نہیں"۔

اُردو میں اِس کو "سَوال" بہ فتحِ س و واو بولا جاتا ہے اور اُردو میں اِسی طرح مرجّح قرار دینا چاہیے۔ فیلن نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے کہ "سَوال" لکھ کر لکھا ہے کہ عام تلفظ بہ فتحِ اول مع واو ہے، اور صحیح بات بھی یہی ہے ـــــ آصفیہ میں "سوال" لکھا ہوا ہے۔ نہ تو اس پر زیر زبر لگے ہوئے ہیں اور نہ صراحت کی گئی ہے؛ البتہ "سُوالات" کے س پر پیش لگا ہوا ہے۔ یہ بھی درست نہیں۔ اردو میں "سوالات" کو بھی صرف بہ فتحِ س استعمال کیا جاتا ہے (سَوالات)۔ اِسی طرح "سَوالی" بھی صرف بہ فتحِ س بولا جاتا ہے۔

لفظِ "مروّت" اردو میں بہ ضمِّ اول و فتحِ دوم بولا جاتا ہے (مُرَوَّت) اور اب اردو والوں کے لیے یہ اِسی طرح صحیح ہے۔ آصفیہ میں "مُرَوّت" لکھا ہوا ہے، مگر نور میں "مُرُوّت" ہے، مع اِس صراحت کے ساتھ "بہ ضمِّ اول و دوم و فتحِ واوِ مشدّد صحیح"۔

نمود، نمونہ، نقص :

مولفینِ قاموس نے نمود اور نمونہ، دونوں کو بہ ضمِ اول لکھا ہے۔ بیشتر فارسی لغات میں یہ دونوں لفظ بہ ضمِ اوّل و دوم ہی ہیں، مگر برہانِ قاطع میں نمودار اور نمونہ کو بہ فتحِ اول لکھا ہے۔ نیز نمونہ کے ذیل میں لکھا ہے: "بہ کسرِ اول ہم بہ نظر آمدہ است"۔ برہان کے ایرانی اڈیشن کے مرتب ڈاکٹر معین نے اس کے حاشیے میں لکھا ہے: "و در لہجہ مرکزی بہ کسرِ اوّل، نیز بہ ضم و فتحِ اول تلفظ شود"۔ صاحبِ حاشیہ نے "نمونہ" کو "نمودن" سے مشتق مانا ہے۔ نیز "نمودار" کو جو صاحبِ برہان نے بہ فتحِ اول لکھا ہے، اُس سے اختلاف بھی نہیں کیا ہے۔ اِس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ "نمودن" اور "نمونہ" فارسی میں بہ فتحِ اول اور بہ ضمِ اول دونوں طرح صحیح ہیں۔ محمد علی تبریزی نے فرہنگِ نوبہار میں نمودار اور نمونہ کو بہ فتحِ اول اور بہ ضمِ اول، دونوں طرح لکھا ہے۔

اردو میں یہ دونوں لفظ عموماً بہ فتحِ اول مستعمل ہیں۔ نور میں "نمود" کو تو صرف بہ ضمِ اول و دوم لکھا گیا ہے، البتہ "نمودار" کے ذیل میں یہ صراحت ملتی ہے: "فارسی میں بہ ضمِ اول و دوم، اردو میں بہ فتحِ اول و ضمِ دوم زبانوں پر ہے"۔ گویا ایک لفظ میں اختلاف کو تسلیم کیا گیا اور ایک لفظ میں اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ہاں "نمونہ" میں مولف نے اختلاف کا پوری طرح احترام ملحوظ رکھا ہے، لکھا ہے: "ف، بہ ضمِ اول و دوم صحیح ہے۔ اردو میں بہ فتحِ اول زبانوں پر ہے"۔ آصفیہ میں نمود، نمودار، نمونہ؛ سب میں نؔ پر زبر لگا ہوا ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، اردو میں نمود، نمودار، نموداری، نمونہ؛ یہ سب لفظ بہ فتحِ نون بولے جاتے ہیں اور یہی صورت مرجح ہے ——— ہاں "نمونہ" سے "نمونتاً" بھی اردو میں مستعمل ہے۔ مولفینِ قاموس نے نوٓر سے بھی غلط بتایا ہے، کیوں کہ

• "نمونۃً" فارسی کا لفظ ہے، اس پر عربی کی تنوین کیسے آسکتی ہے! مگر اردو میں "نمونۃً" اور "نمونتاً" دونوں لفظ مستعمل ہیں اور اردو کے لحاظ سے یہ بالکل صحیح لفظ ہیں۔

• "نقص" عربی کا لفظ ہے اور عربی میں ن پر زبر ہے، فارسی میں بھی یہ: بہ فتحِ نون ہے، لیکن اردو میں عموماً بہ ضمِ نون "نُقص" مستعمل ہے۔ اکثر لوگ اِسی طرح بولتے ہیں۔ از راہِ احتیاط اِس لفظ کو دونوں طرح صحیح مان لینا چاہیے، اِس صراحت کے ساتھ کہ اردو میں عام سطح پر یہ بہ ضمِ نون مستعمل ہے۔

نور میں اِس کو عربی کے مطابق بالفتح لکھا گیا ہے اور یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "بالضم غلط ہے"۔ آصفیہ میں "نُقص" لکھا گیا ہے، مگر اس صراحت کے ساتھ کہ "مشہور بہ ضمِ نون ہے، مگر صحیح بہ فتحِ نون"۔ قاموس میں بھی بہ ضمِ نون کو غلط بتایا گیا ہے۔ بہ ضمِ نون کو غلط نہیں کہا جا سکتا، بل کہ حسبِ قولِ صاحبِ آصفیہ "مشہور بہ ضمِ نون ہے"۔

چغد، صفر، نقل،

آصفیہ، نور، قاموس، سب میں "چغد" کو صرف بہ سکونِ دوم لکھا گیا ہے۔ بل کہ قاموس میں تو یہ بھی صراحت ملتی ہے کہ: "جہلا چُغَد، بہ فتحِ غین کہتے ہیں"۔ فارسی میں یہ لفظ بہ سکونِ غین ہے۔ اردو میں شعرا نے اِس کو بہ سکونِ غین ہی نظم کیا ہے، مگر بول چال کی زبان میں اِس کا تلفظ بھی بدل گیا اور معنی بھی۔ فارسی میں "چُغد" اُلّو کا مرادف ہے۔ اردو میں بھی اِس معنی میں مستعمل ہے، لیکن بول چال میں "چُغَد" بہ فتحِ غین، احمق کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور بہ کثرت۔ اِس لفظ کی دونوں حرکات کو مان لینا چاہیے، مندرجۂ بالا امتیاز کے ساتھ۔ ایک نہایت معروف مصرع، جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اُس میں یہ لفظ بہ فتحِ غین آیا ہے اور اِس طرح کہ پوری طرح کھپ گیا ہے۔ مصرع یہ ہے: ہما کو کب چُغد پہچانتا ہے۔ اِس سے بول چال کے اثر

کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ہاں، ترکیب کی صورت میں، اصل کے مطابق، بہ سکونِ دوم ہی اچھا معلوم ہوگا۔

"صفر، بہ فتحِ فا (صفَر) کہنا غلط ہے" (قاموس)۔ عربی کے لحاظ سے ضرور غلط ہے، مگر اُردو میں زبانوں پر بہ فتحِ فا ہے (صفَر)۔ یہی راے صاحبِ نوراللغات کی ہے: "زبانوں پر بالفتح ہے۔" البتہ آصفیہ میں ف پر جزم لگا ہوا ہے (صفْر) کسی طرح کی صراحت کے بغیر۔ یہ عربی کی تقلید ہے۔ اردو میں شعرا نے اِس کو اصل کے مطابق بہ سکونِ فا نظم کیا ہے، مگر بول چال میں اُس کا عمل دخل نہیں ہو پایا ہے۔ گفتگو میں بہ فتحِ فا ہی آتا ہے۔ اِس لفظ کو بھی دونوں طرح صحیح مان لینا چاہیے۔

"صفر" کی طرح "نفل" بھی زبانوں پر بہ حرکتِ دوم (نَفَل) ہے، حالاں کہ اصلاً یہ بھی بہ سکونِ دوم ہے۔ اِس لفظ میں بھی مولفِ نوراللغات نے اردو کے تلفظ کو ملحوظ رکھا ہے، اصل حرکات لکھ کر، لکھا ہے: "اردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اول و کسرِ دوم ہے۔" مگر آصفیہ میں عربی کے مطابق صرف بہ سکونِ دوم ملتا ہے (نَفْل)۔ اِس لفظ کی بھی دونوں صورتوں کو صحیح مان لینا چاہیے۔

اِس وزن کے متعدد لفظ ہیں جو اصلاً بہ سکونِ دوم ہیں، مگر اردو کی بول چال میں بہ حرکتِ دوم مستعمل ہیں۔ یہ تبدیلی یہاں کے لہجے کا اقتضا ہے اور فطری عمل ہے۔ اِس کی طرف سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی اور اس کے تسلیم کرنے میں، عربی فارسی اور اردو لغات کے اندراجات سنگِ راہ نہیں ہوسکتے۔ مثلاً دخل، لہر، حمل، نفی (وغیرہ) بہت سے لفظ ہیں جو بول چال میں ہمیشہ بہ حرکتِ دوم آتے ہیں۔ ایسے سب الفاظ کے متعلق ایک اصول یہ قرار دینا چاہیے کہ ان کو دونوں طرح درست مانا جائے گا۔ اور اسی طرح درجِ لغت کیا جائے گا۔ یہ انداز کہ ایسے الفاظ کو بہ حرکتِ دوم غیر صحیح یا غیر فصیح سمجھا جائے، کسی طرح درست نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر

آرزو لکھنوی مرحوم کی ایک عبارت کو نقل کر دیا جائے۔ انھوں نے لفظ نفی کو ایک جگہ بہ کسرِ دوم نظم کیا ہے اور مفرد نہیں، ترکیب فارسی کے ساتھ، اور پھر اُس پر حاشیہ لکھا ہے۔ وہ شعر اور حاشیے کی عبارت درج ذیل ہے:

• آرزو اک بے بضاعت آدمی جس کا کل سرمایہ اک لائے نفیِ[1]

[1] یہ لفظ ساکن الاوسط ہے۔ میں نے اسے جن وجوہ کی بنا پر ساکن الآخر لانا! اور پھر اضافتِ فارسی کے ساتھ استعمال کرنا جائز جانا ہے، وہ حسبِ ذیل ہیں:

(۱) اردو بولنے والوں کے لہجے میں یہ ساکن الآخر ہے۔ متقدمین نے "نشأ" وغیرہ کے استعمال میں اس اعتبار کو ہر جگہ دخل دیا ہے، اور "وفا" کے قافیے میں "نشا" نظم کر گئے ہیں۔ وہ جاہل نہ تھے، اور نہ میں اس لفظ کی حقیقت سے بے خبر ہوں۔ عربی کے لیے ساکن الاوسط صحیح و فصیح ہے، مگر اردو کے لیے ساکن الآخر ہی صحیح بھی ہے اور فصیح بھی، خاص کر آخرِ کلام میں۔

(۲) ختمِ کلام حرفِ متحرک پر محال ہے؛ اس لیے آخر لفظ اگر ساکن الآخر نہیں ہوتا تو ساکن کر لیا جاتا ہے۔ اسی مقصد سے فارسی کے متحرک الآخر الفاظ میں ہائے مختفیہ بڑھا دیتے ہیں کہ حرکتِ آخر، حرفِ ساکن کے موجود ہونے سے، کھینچ کر اک حرف کی آواز پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے: "ہمہ" "و "رمہ" مشہور لفظیں ہیں۔

(۳) صرف حرکت و سکون کی تبدیلی ایسی چیز نہیں جس سے لفظ اصل سے دور ہو کر مثل "ناخون" اور "صابن" کے سند مان لیا جائے؛ لہٰذا اُس میں اضافتِ فارسی کا لانا بھی غلط نہیں ہو سکتا۔ ہاں، ترکیب عربی ہوتی تو درست نہ سمجھی جاتی۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے، میں دوسروں کو اس طرزِ عمل

پر مجبور نہیں کرتا۔" (جہانِ آرزو، نظامی پریس لکھنؤ، ص ک)

ایک زبردست استاد، اہلِ زبان اور زبان داں نے جو کچھ کہا ہے، وہ توجہ سے پڑھنے کی چیز ہے۔ انھوں نے جس اصول کو پیش کیا ہے، اُس کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو ایسے لفظوں کے متعلق صحیح طور پر فیصلہ کرنا آسان ہوگا۔ ہاں، یہاں پر یہ یاد دلانا بھی بے محل نہ ہوگا کہ مثنوی گلزارِ نسیم کے مباحثے کے دوران، اور اعتراضات کے علاوہ، لفظ "تحمل" کو بہ حرکتِ دوم نظم کرنے پر بھی اعتراض کیا گیا تھا۔ یہ کہا گیا تھا کہ صحیح لفظ بہ سکونِ دوم (تحمل) ہے، اِس کو "تحَمُّل" نظم کیا گیا ہے۔ چکبست نے بہ حرکتِ دوم کی سند میں کئی شعر پیش کیے تھے، اُن میں سے ایک شعر واجد علی شاہ کا بھی تھا۔

"گھر میں میرے بھی لے خوش اطوار آثار حمل کے ہیں نمودار"

اور اس اعتراض کے سلسلے میں چکبست نے یہ بھی لکھا تھا:

"یہ اعتراض اس اصول سے بے خبری ظاہر کرتا ہے کہ شاعر الفاظ اُسی صورت پر نظم کرتا ہے جس صورت سے کہ وہ اہلِ زبان کی زبان پر جاری ہوتے ہیں۔ بعض لغت کے "تلفظ" کی پیروی شاعر کے لیے ضروری نہیں ہوتی۔ یہ مانا کہ لغت کی رو سے "تحمل" درست ہے، لیکن شرفائے لکھنؤ کی زبان پر اس لفظ کا یہی "تلفظ" جاری ہے۔۔۔۔ لفظ "تحمل" پر موقوف نہیں، متعدد الفاظ ایسے ہیں جن کا "تلفظ" لغت کی رو سے کچھ اور ہے، اور نظم، عام محاورے کے مطابق کیا جاتا ہے۔ مثلاً اصل لفظ "گلہ" ہے، یعنی لام بالکسر ہے، لیکن محاورے میں چوں کہ بہ سکونِ لام بولتے ہیں، اس لیے شعرا نے اسی طرح نظم کیا ہے۔"

(مضامینِ چکبست، ص ۱۹۰)

حرکت، برکت، عظمت، ثمرہ، کلمہ جیسے بہت لفظ مثالاً پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اصل لفظ "تلفّی" ہے مگر اس کو محاورۂ عام کے مطابق بہ سکونِ لام نظم کیا گیا ہے

شکوۂ غم کرکے، نادم ہے بہت پاسِ وفا   یعنی ہم نے کس لیے غلطی جتائی آپ کی
(حسرت موہانی)

لفظ "نفی" کی بعض اور مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں، مثلاً:

جو سمجھے تو ناداں تو اک بات ہے   نفی ہی تری اُس کا اثبات ہے
قائم (دیوان، عکسی نسخہ، انڈیا آفس لندن، ورق ۱۸۶ الف)

ہم نے اس بات کو اثبات کیا موج سے یوں   دم بہ دم ذکرِ نفی میں ہے یہ محرابِ حباب
(شاہ نصیر)

حبشی، نمکین، غبن:

لفظ "حبشی" کے متعلق قاموس میں لکھا گیا ہے کہ اس کو "بہ سکونِ با نہیں کہنا چاہیے" اس بے چارے "حبشی" نے کیا ایسی خطا کی ہے کہ اِس قبیل کے اور الفاظ میں اردو کے تصرف کو مان لیا جائے اور اس کو اُس صف میں شامل نہ کیا جائے! آصفیہ و نور دونوں لغات میں، عربی کی تقلید میں اِس کو صرف بہ فتحِ دوم لکھا گیا ہے۔ استعمالِ عام میں یہ صرف بہ سکونِ با ہے۔ اِس لفظ کی دونوں حرکات کو مان لینا چاہیے۔ بہ فتحِ دوم کبھی کبھار نظم کے کام آجائے گا اور بہ سکونِ دوم، بول چال کے کام آتا رہے گا۔ فیلن نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے، اُس نے بہ فتحِ دوم لکھ کر لکھا ہے کہ مقبولِ عام تلفظ بہ سکونِ ثانی ہے۔ ہاں جو صاحب بہ فتحِ دوم پر اصرار کریں، وہ "حبشی حلوا سوہن" میں اس کو بہ فتحِ دوم بول کر دیکھیں؛ بات سمجھ میں آجائے گی۔

نور، آصفیہ، قاموس؛ سب میں "نمکین" کو بہ فتحِ دوم (نَمَکین) لکھا گیا ہے؛ اور ان سب مولفین نے اِس بات کو قطعاً جھٹلا دیا کہ بول چال میں یہ صرف بہ سکونِ دوم آتا ہے۔ نظم میں یہ لفظ بہ فتحِ دوم آسکتا ہے، آتا بھی ہے، مگر گفتگو میں صرف بہ سکونِ میم آتا ہے۔ اس لفظ کو بہ سکونِ دوم بھی صحیح ماننا چاہیے، عموماً نظم میں ہو اور خواہ گفتگو میں۔

لغت میں بھی اِسی تفصیل کے ساتھ اس کو لکھنا چاہیے۔

غَبْن اور غَبَن، دو لفظ ہیں: "غَبَن، بہ فتحتین: خطا شدن در رائے و تدبیر۔ و بہ فتحِ اول و سکونِ ثانی: زیاں یافتن در خرید و فروخت" (غیاث اللغات)۔ اردو میں عام طور پر غَبَن (بہ فتحتین) خیانت، خورد بُرد کے معنوں میں مستعمل ہے۔ یہ گویا اردو کا تصرّف ہے۔ "غَبْن" کوئی نہیں بولتا اور نہ بولنے کی کچھ ایسی ضرورت ہے۔ اردو کی بعض پُرانی تحریروں میں "غَبْنِ فاحش" کی ایک ترکیب کہیں کہیں مل جاتی ہے، اور بس۔ اِس کے علاوہ اس لفظ کا استعمال شاید ہی کہیں ہو۔

آصفیہ میں "غَبْن" اور "غَبْن کرنا" ملتے ہیں۔ مولّف نے عربی کا تلفظ مدِ نظر رکھا ہے، اور اردو کے معنوں کو اُس سے وابستہ کر دیا ہے۔ خیانت وغیرہ کے معانی میں اردو میں "غَبْن" کوئی نہیں بولتا۔ صرف "غَبَن" کہتے ہیں۔ نور میں البتہ استعمالِ عام کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے: "اردو میں بہ فتحِ اول و دوم مستعمل ہے"۔ مولفینِ قاموس نے اپنی روایت کے مطابق، بہ فتحِ اول و دوم کو غلط بتایا ہے۔ اور اُن کا یہ قول بجائے خود غلط ہے۔ اردو میں اب اِس لفظ کو خیانت وغیرہ کے معانی میں، صرف بہ فتحِ اول و دوم ماننا چاہیے۔

طرفین، خفگی، خلجان، جمعہ:

"طرفین، بہ فتحتین صحیح ہے، اور بہ سکون غلط" (قاموس)۔ آصفیہ میں تو یہ لفظ موجود ہی نہیں۔ نور میں ہے، مگر عربی کے مطابق اِس کو "طَرَفین" لکھا گیا ہے۔ اردو میں یہ لفظ بہ سکونِ را بھی مستعمل ہے اور بہ کثرت۔ نظم کی ضرورت سے یا کسی خاص ترکیب میں چاہے "طَرَفین" آجائے، مگر استعمالِ عام میں یہ بہ سکونِ دوم ہی آتا ہے۔ اِسی صراحت کے ساتھ، اِس لفظ کی دونوں صورتوں کو تسلیم کر لینا چاہیے۔

"غلجان" بہ لحاظِ اصل بہ فتحتین ہے (غَلَجان)۔ آصفیہ و نور میں بھی اس کو صرف بہ فتحِ اول وثانی لکھا گیا ہے۔ نور میں حرکات کی صراحت کی گئی ہے: "بہ فتحِ اول و دوم"۔ قاموس میں بھی یہی صورت ہے۔ اِن مولفینِ کرام نے استعمالِ عام سے مکمل طور پہ چشم پوشی کی ہے۔ بول چال میں یہ لفظ، ایسے اور الفاظ کی طرح، صرف بہ سکونِ ثانی مستعمل ہے اور اردو میں اب اس کی یہ حرکات قابلِ قبول ہیں۔ بہ فتحتین کو غلط تو نہیں کہا جاسکتا، اِس بناپر کہ نظم میں کبھی نہ کبھی یا کہیں نہ کہیں مل سکتا ہے، البتہ بول چال میں صرف بہ سکونِ دوم ہے۔

"خفگی" بھی بول چال میں صرف بہ سکونِ دوم آتا ہے۔ اِس طرح نظم بھی کیا گیا ہے:

ماں کی خفگی سے ہے بہت ڈرتی اُس کے تیور ہے دیکھتی رہتی

حالی (جواہراتِ حالی)

نور میں لکھا گیا ہے کہ: "بہ فتحِ اول و دوم صحیح ہے، اور بہ سکونِ دوم غلط"۔ مگر اس کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ بہ فتحتین کا تعلق فارسی سے رہے گا، اور اردو میں اس کو بہ سکونِ دوم ہی مانا جائے گا۔ آصفیہ میں اس کو بہ سکونِ فا (خَفْگی) ہی لکھا گیا ہے اور اردو کے لحاظ سے یہ بالکل صحیح ہے۔

یہاں پر ایک وضاحت کی ضرورت ہے: آصفیہ میں "خفگی" کو اردو لکھا گیا ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ اردو میں یہ لفظ بہ سکونِ دوم ہی ہے، مگر مولف کے اندازِ نگارش سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ اس لفظ کو بہ اعتبارِ اصل اردو سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ فارسی الاصل ہے: "خفہ" "گرفتگیِ گلو کے مفہوم میں آتا ہے، اُسی سے "خفگی" بن گیا ہے، جس کے حقیقی معنی تو ہیں: "گلو فشردگی، گرفتنِ راہِ نفس" (فرہنگِ امیر کبیر) لیکن بہ طورِ مجاز، ناراضی کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے: "دراصل بہ معنیِ افسردگیِ گلوست، و بہ معنیِ ضبطِ غضب و آزردگیِ خاطر مجاز باشد" (غیاث اللغات)

"خفگی، بہ فتحِ اول و دوم [ازخفہ (خفک) + ی (مصدری)] در پہلوی XAFAKIH حالتِ فشردگی گلو و حبسِ نفس۔ اضطرابِ خاطر۔ کمی و فشردگی ہوا" (حاشیۂ برہانِ قاطع، تہران اڈیشن)۔

فیلن نے "خفگی" کے ساتھ ساتھ "خفا" کو بہ معنیِ ناراض، فارسی لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ فارسی میں "خفہ" ہے، اور اس کے معنی "فشردنِ گلو" ہیں۔ "خفا" بہ معنیِ ناراض، فارسی میں نہیں، یہ اُردو میں "خفہ" کی مہنّد صورت ہے۔

مولفینِ قاموس نے لفظ "جمعہ" کو بہ ضمِ اول و دوم، اور بہ ضمِ اول و سکونِ دوم لکھا ہے۔ اردو میں بہ ضمِ اول و دوم تو مستعمل نہیں۔ اگر کہیں نظم میں اِس طرح آیا ہے، تو اُسے ضرورتِ شعری کا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ استعمالِ عام کو اُس سے علاقہ نہیں۔ بہ ضمِ اول و سکونِ دوم (جُمْعہ) اردو میں استعمال کیا گیا ہے لیکن نظم میں۔ بول چال میں اس کی ایک اور ہی صورت ہے، یعنی جیم پر پیش، میم پر زبر، عین اور ہ دونوں ساکن۔ ایسے کئی لفظ ہیں جو عوام و خواص، سب کی بول چال میں اسی طرح مستعمل ہیں، جیسے "قلعہ" کہ اصل میں ق پر زبر ہے اور لام ساکن ہے، مگر گفتگو میں یہ بہ فتحِ لام۔ بہ سکونِ عین و ہ آتا ہے۔ ایسے الفاظ کی اِس صورت کو بھی تسلیم کر لینا چاہیے۔ "جمعہ" سے "جمعرات" بنا ہے، اور اِس لفظ میں یہ تلفظ پورے طور پر نمایاں ہے ـــــ آصفیہ میں "جمعہ" کو صرف بہ ضمِ اول و سکونِ دوم و فتحِ سوم (جُمْعَہ) لکھا گیا ہے، لیکن "جمعرات" کو بہ ضمِ اول و کسرِ دوم و سکونِ سوم (جُمِعْرات) لکھا گیا ہے۔ یہاں پر آخرکار استعمالِ عام نے مولف کو مجبور کر ہی دیا۔

نور میں بہ ضمتین اور بہ ضمِ اول و سکونِ دوم لکھنے کے بعد، مزید لکھا گیا ہے کہ "بیشتر بول چال میں جما ہے، جمعہ نہیں ہے"۔ مولف نے بول چال کا لفظ "جما" لکھا ہے! تلفظ کی حد تک تو یہ صورت ٹھیک ہے، لیکن تحریر میں "جمعہ" ہی رہے گا۔ یعنی لکھا جائے گا

"جمعہ" اور پڑھا جائے گا "مجا"۔ ہاں "مجما" کو الف سے لکھا جائے گا۔ یہ گویا نیا لفظ بن گیا۔

مختصر یہ کہ اردو میں یہ لفظ بہ ضمِ اول و سکونِ دوم و فتحِ سوم (جُمْعَہ) بھی ہے اور جُمَعہ بروزنِ "ہما" بھی۔ اور بہ ضمتین (جُمُعَہ) کو عربی سے مخصوص سمجھا جائے گا اور اردو سے غیر متعلق۔

ہاں "جمعرات" کو آصفیہ میں "جُمْعَرات" (بہ کسرِ میم) اور نور میں بہ فتحِ میم "جُمَعْرات" لکھا گیا ہے۔ یہ لفظ دونوں طرح سننے میں آتا ہے؛ اِس بنا پر، اِس کی دونوں صورتوں کو تسلیم کیا جائے گا۔

فوق البھڑک، فی زمانہ، قران:

• فوق البھڑک، اِس کی ترکیب غلط اور بے معنی ہے" (قاموس)۔ یہ ترکیب ازروے قواعد غلط سہی، لیکن بے معنی ہرگز نہیں؛ بل کہ جو مفہوم اِس مرکب سے ادا ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے لفظ سے ادا نہیں ہوتا۔ اردو میں خلافِ قاعدہ بنے ہوئے بہت سے کار آمد لفظ مستعمل ہیں، اور یہ لفظ بھی انھی میں سے ایک ہے۔ ایسے سب الفاظ کو اب اردو کے صحیح الفاظ میں شامل سمجھنا چاہیے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے لکھا تھا: "فوق البھڑک، قاعدے سے یقیناً غلط ہے، مگر ہم نے نہ معلوم کتنے ایسے لفظ گڑھ لیے ہیں، اور ان کا استعمال اس لیے جائز ہے کہ زبان میں ان کا بدل موجود نہیں ہے" (رسالۂ الحمرا، اکتوبر ۱۹۵۲ء)۔ سرشار نے جامِ سرشار (ص ۲۲۹) میں لکھا ہے: "مس فوق البھڑک لباس زیبِ تن کیے اِتراتی پھرتی تھی"۔ اِس عبارت میں "فوق البھڑک" کی جگہ کوئی لفظ رکھ دیجیے، یہ بات پیدا نہیں ہوگی۔

نور میں یہ لفظ موجود ہے، مگر اِس کو "عوام" سے منسوب کیا گیا ہے۔ آصفیہ میں

اِس سے زیادہ قطعیت کے ساتھ اِس کو "غلط العوام" لکھا گیا ہے ۔ اب اِن اندراجات کو تسلیم نہیں کیا جائے گا ۔ یہ لفظ کس طرح استعمال میں آتا ہے، اُس کی سب سے اچھی مثال یہ ہے کہ مؤلفِ آصفیہ، جنھوں نے اِس کو "غلط العوام" لکھا ہے، خود اِس کے استعمال کرنے والوں میں سے ہیں: "زرق برق ہو کر آنا" کے ذیل میں انھوں نے لکھا ہے:

"بن سنور کر آنا، فوق البھڑک بن کر آنا" اِس کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔

مؤلفینِ قاموس نے "فی زمانہ" کے بجائے "فی زماننا" بولنے کی فرمایش کی ہے۔ مؤلفِ نور نے بھی اِس کو عوام کے حوالے کر دیا ہے۔ "فی زماننا" کے ذیل میں لکھا ہے: "عوام اس جگہ فی زمانہ بولتے ہیں"۔ اصل لفظ "فی زماننا" اچھا خاصا ثقیل مرکب ہے۔ اردو والوں کی خوش مذاقی نے اگر اس کو تراش کر "فی زمانہ" جیسے سبک لفظ میں بدل لیا ہے تو اِس پر تو خوش ہونا چاہیے۔ بہ ہر صورت، اربابِ لغت کچھ بھی کہیں، یہ لفظ (فی زمانہ) اردو کا ہے اور اس کا شمار بالکل صحیح اور فصیح الفاظ میں کیا جائے گا ——— آصفیہ میں "فی زمانہ" کے سامنے "ع + ف" لکھا ہوا ہے، مگر یہ اردو کا تراشیدہ لفظ ہے۔ بہرحال قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مؤلف نے اس کو نہ غلط کہا ہے نہ "غلط العوام" لکھا ہے۔

"قرآن" کے ذیل میں لکھا گیا ہے: "بجائے الفِ ممدودہ، الفِ مقصورہ سے قران کہنا غلط ہے" (قاموس)۔ یہ غلط فہمی کہ "قران" بروزنِ زبان غلط ہے، مؤلفینِ قاموس تک محدود نہیں، بعض اور لوگ بھی اس کا شکار ہوئے ہیں۔ غالباً سب سے پہلے غالب نے اس طرف توجہ کی۔ شہاب الدین احمد خاں ثاقب کو ایک خط میں لکھا ہے: "معاذ اللہ! امیر خسرو "قرآن" کو، کہ بہ سکونِ رائے قرشت والفِ ممدودہ ہے، قران، بروزنِ پُران لکھیں گے۔ یہ دونوں غزلیں، دو گدھوں کی ہیں۔ شاید ایک نے مقطعے میں حافظ اور ایک نے مقطعے میں خسرو لکھ دیا ہے۔" (خطوطِ غالب، مہر، ص ۱۰۹)۔ مولانا نظم طباطبائی نے شرحِ غالب میں یہی اعتراض تیرہ گے اس مصرعے پر کیا ہے، "گر آدے شیخ پہن کے جامۂ قرآن کا"

اس لفظ میں اصلاً اساتذۂ فارسی نے تصرف کیا ہے اور اس کو بروزنِ زبان نظم کیا ہے۔ قران بروزنِ زبان کو، عوام کا گڑھا ہوا لفظ خیال دو وجوں سے سمجھا گیا، ایک تو یہ کہ فارسی کے اس تصرف کا ذکر، فارسی کے لغات میں نہیں ملتا۔ دوسرے یہ کہ ہندی کے بعض دوہوں میں یہ اس طرح آیا ہے، مثلاً:

پنڈت پوتھی بانچتے، ملا پڑھے قران ۔۔۔ لوک دکھاوا لاکھ پڑھو، نہیں ملے بھگوان

(آصفیہ)

ان وجوہ سے یہ سمجھا گیا کہ بہ الفِ مقصورہ غیر مستند ہے۔ فارسی کی چند اسناد درج ذیل ہیں:

سرو دیدستم کہ باشد رستہ اندر بوستاں ۔۔۔ بوستاں ہرگز نہ دیدم رستہ بر سرو رواں

مدح او خواں، گر قراں خواندن ندانی از قیاس ۔۔۔ تا ہمی خوانی مدیح او، ہمی خوانی قراں

(فرخی)

الاماں اے دل کہ زحمت دشت آرد الاماں ۔۔۔ زیں مغیلاں گاہ غولاں بر گراں شو بر کراں

گر نہ داری ہیچ فرزندے شرف داری کہ حق ۔۔۔ ہم شرف زیں داد و اینک لم یلد خواں از قراں

(خاقانی)

ماہِ رمضان آمد اے ترک سمن بر ۔۔۔ برخیز و مرا سبحہ و سجادہ بیاور

بانگے بشبستاں شد و در صف نخستیں ۔۔۔ بنشست و قراں خواند و بجنباند ہمی سر

(قاآنی)

مخدومی قاضی عبدالودود صاحب نے "غالب بہ حیثیت محقق" میں "قران" بالف مقصورہ کی متعدد سندیں پیش کی ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

آنم کہ ہمی گویم، پاژند قران است (لبیبی)

درگشتن ایں قصد ہمہ اہلِ قران است (منوچہری)

آیات قرآن و شعر حجت (ناصر)

اے خوانده بصد حیله و تقلید قراں را

ملکت چو قراں او چو معانی قرآن است (منوچہری)

سرِ قرآں، قراں نکو داند (سنائی)

اردو میں بھی اِس کی تقلید کی گئی ہے۔ گفتگو میں تو اکثر یہ لفظ بغیر مد سننے میں آتا ہی ہے، اِس طرح نظم بھی کیا گیا ہے، مثلاً:

مت مانیو کہ ہوگا یہ بے درد اہلِ دیں
گر آوے شیخ، پہن کے جامہ قران کا
میر (کلیات مرتبۂ آسی، ص ۴۹)

یار، مجھ کو قران کی سوگند
جی چلا، تیری جان کی سوگند
میر سوز (دیوانِ سوز، قلمی، مملوکہ انجمن ترقیِ اردو ہند، ورق ۳۵ ب)

کھا قسم، جھوٹ بولے ہے کتنا
چُپ ہو چپ، بس قران کے صدقے
انشا (تذکرۂ میر حسن)

مت ڈبو اپنے مصحفِ رخسار کی قسم
رکھ جائے گا ابھی کوئی ہاتھ اِس قران پر
میر امانی اسد (مجموعۂ نغز، جلد اوّل)

سب حفظِ قران دے کے برباد
اک رکھے ہے آیۂ نگلو، یاد
قائم چاند پوری (مثنوی در ہجو اکول۔ دیوان نسخہ انڈیا آفس لندن، ص ۱۳۲)

یہ دل ربا کا ہے قصہ جو لوگ پڑھتے ہیں
قران میں، وہی انجیل میں، وہی بہ زبور
احمد گجراتی (دو نایاب زمانہ بیاضیں، ص ۱۲)

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی نماز اور قران یاں
اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے، سو وہ بھی ہے آدمی (نظیر اکبر آبادی)

آصفیہ میں فارسی کے اِس تصرّف کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اُس میں صرف "قرآن" ہے۔ "قرآن کا جامہ پہننا" کی سند میں میر کا وہ شعر بھی لکھا گیا ہے جس میں "قُران" نظم ہوا ہے، مگر اس سلسلے میں کچھ صراحت نہیں کی گئی۔ اور میر کے اُس شعر میں بھی "قرآن" چھپا ہوا ہے۔ بہ ظاہر اس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ میر کے اس شعر میں، مولف کے نزدیک "قرآن" ہی نظم ہوا ہے، اور یہ کہ اس لفظ میں کسی طرح کا تصرف نہیں ہوا! یہ دونوں باتیں درست نہیں — نور میں البتہ یہ صراحت ملتی ہے کہ "فارسیوں نے قران بروزنِ زبان بھی کہا ہے" اور یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "اردو میں عورتیں قران بروزنِ زبان ہی بولتی ہیں"۔ اس میں یہ اضافہ کرنا چاہیے کہ عام لوگ بھی اس طرح بولتے ہیں۔ بہ ہر حال، اردو میں اس لفظ کو دونوں طرح صحیح مانا جائے گا۔

جلالؔ نے سرمایۂ زبانِ اردو میں "قران کا جامہ پہننا" لکھا ہے، اس میں "قران" بغیر مد ہی ہے، سند میں بھی میر کا وہی شعر لکھا گیا ہے جس میں "قران" بہ الفِ مقصورہ آیا ہے؛ مگر چوں کہ انھوں نے صراحت نہیں کی، اس لیے بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی، شک سا رہ جاتا ہے۔

فہمایش، رہایش، پیدایش، زیبایش، گرمایش:

"رہایش، سکونت و قیام کے معنی میں جاہل کہتے ہیں" (قاموس)۔ یہ خیال صرف مولفینِ قاموس کا نہیں، کئی اہلِ علم نے اردو کے اِس مستعمل لفظ کو کرشمۂ جہالت بتایا ہے۔ آرزو لکھنوی مرحوم نے لکھا ہے: "رہایش کی وضع بھی صحیح نہیں، کہ کسی زبان کے مخصوص حروف کا امتزاج غیر زبان کے کلمات کے ساتھ درست نہیں" (نظامِ اردو، ص ۲۰)۔ پنڈت کیفی نے شوق قدوائی کا یہ قول نقل کیا ہے: "سفنی خیزاور رہایش وغیرہ سے بحث فضول ہے۔ یہ جہلا کے تراشے ہوئے ہیں۔ فصحا ان کا استعمال

نہیں کرتے۔" (منشورات، ص ۲۲۶)

آرزو صاحب نے جس قاعدے کا ذکر کیا ہے، وہ اردو میں ہزار جگہ ٹوٹ چکا ہے۔ فارسی کے نہ معلوم کتنے الفاظ کے آگے عربی کے حروفِ جمع بڑھا کر، جمع بنالی گئی ہے۔ یہی نہیں، خالص اردو الفاظ کے ساتھ بھی یہ سلوک کیا گیا ہے، جیسے، گمٹذرات، دیہات، بھتات، فرمایشات، خواہشات وغیرہ۔ ایسے اور بھی قاعدے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اِس بنا پر "رہایش" کے غلط ہونے کی یہ کوئی دلیل نہیں۔

رہایش، رہنا سے بن گیا ہے۔ یہ قیاس فارسی قواعد کے عین مطابق ہے۔ فارسی میں "زایش" ہے، لیکن اُس کے معنی وہی ہیں، جو "زہائی" کے ہیں (حکیم) نقلِ معنی عام بات ہے اور اس میں کچھ عیب نہیں۔ عربی میں حجامت، تردد، رقم، مذاق، محنت، خلیفہ، بخار، جلوس؛ جن معانی میں ہیں، اردو میں ان کے علاوہ دوسرے معانی میں بھی اِن کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں، بہت سے ایسے لفظوں کے اصل معنی اردو میں مراد لیے ہی نہیں جاتے، جیسے: تردّد، محنت، غصہ وغیرہ۔

الشانے دریاے لطافت میں "رہایش" کو "رہنا" کا حاصل مصدر لکھا ہے (ترجمۂ دریاے لطافت، ص ۲۴۲) سند کے لیے یہ کافی ہے۔ آصفیہ و نور دونوں میں یہ لفظ موجود ہے، مگر دونوں لغات میں اس کو "عوام" سے متعلق بتایا گیا ہے۔ یہ تحدید قابلِ قبول نہیں۔ اس کا شمار عام الفاظ میں کیا جائے گا۔ نور میں اس کے حسب ذیل معنی لکھے ہوئے ہیں: "قیام، بود و باش، سکونت، گنجایش، ضبط، برداشت۔" لیکن ضبط، گنجایش اور برداشت کے معنوں میں یہ لفظ مجھے کہیں نہیں ملا۔ مولّف نے نہ کوئی سند پیش کی ہے، نہ حوالہ دیا ہے۔ جب تک کوئی مثال نہ ملے، اُس وقت تک یہ معنی محلِّ نظر رہیں گے۔

"رہایش" کی طرح فہمایش کو بھی غلط کہا گیا ہے۔ غالب نے اپنے انداز میں

لکھا ہے:

"فہمایش کا لفظ میاں بُدھا ولد میاں بُھگا اور لالہ گنیش داس ولد بھیروں ناتھ کا گھڑا ہوا ہے ... فہمیدن فارسی الاصل نہیں ہے، مصدر جعلی ہے۔ فہم لفظ عربی الاصل ہے ... اِس قاعدے میں یہ کلیہ ہے کہ لغتِ اصلِ عربی آخر کو امر بن جاتا ہے۔ حاصل بالمصدر فہمش اور طلبش ہونا چاہیے: "فہم" تھا صیغۂ امر "فہمد" سے نکلا تھا۔ الف اور ی کہاں سے آیا؟ "فہمائی" تو نہیں جو "فہمایش" درست ہو" (بہ نام میر مہدی مجروح)

یہ لفظ علی الرغم غالب، اردو میں مستعمل رہا ہے۔ اور اس میں خاص و عام کی کچھ قید نہیں، اور مستند ین کے یہاں سے اِس کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً معرکۂ چکبست و شرر میں منشی سجاد حسین کا ایک مضمون ص ۲۹۱ سے شروع ہوتا ہے؛ اِس مضمون میں "فہمایش" سات آٹھ جگہ آیا ہے۔ آزاد کی تصنیف دربارِ اکبری میں یہ جگہ جگہ ملتا ہے۔ میرے سامنے اِس کتاب کا وہ اڈیشن ہے جس کو لکھنؤ کے مکتبۂ کلیاں نے شائع کیا ہے، اس میں ص ۲۰۰، ۲۶۰، ۲۶۳، ۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۳، ۳۸۱، ۵۴۰، ۵۴۲، ۸۹۱، پر اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔ امراؤ جان ادا میں بھی یہ لفظ موجود ہے: "مگر ایک مشکل ہے، جب کسی کو کسی بات کی فہمایش کی جائے" (نیا ادارہ لاہور، ص ۳۱۸) نیز ص ۹۸۔ یا جیسے: "بعض رسالے عام اہلِ اسلام کی فہمایش کے لیے اردو میں لکھے" (آبِ حیات، ص ۲۶)۔ اس کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

جس طرح "فہمایش" بنا ہے، اسی طرح "زیبایش" بنا ہے۔ مضارع "زیبد" ہے؛ اس سے "زیبش" بن سکتا تھا، مگر بنا "زیبا" سے "زیبایش"۔ قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے: "زیبایش، ایرانی نظم و نثر میں آج تک نہیں ملا، اردو میں ہے اور ہندی فارسی میں بھی ہو تو ہو" (تعینِ غالب، ص ۳۱۲)۔ اردو میں اِس کو بے تکلف استعمال

کیا گیا ہے اور بہ ترکیب فارسی بھی لکھا گیا ہے، مثلاً:

آرائشِ گلشن کے لیے جامۂ رنگیں
زیبائشِ غنچہ کے لیے تنگ قبائی
ذوقؔ (دیوان مرتبۂ آزاد، ص ۳۰۵)

دیوانہ ہوں تیرا، مجھے کیا کام کروں گُل
زیبائشِ سر کو ہیں مرے داغِ جنوں، گُل
ذوقؔ (دیوان مرتبۂ آزاد، ص ۱۲۰)

جس طرح "زیبا" سے "زیبائش" اور "رہا" سے "رہائش" بنا، اُسی طرح "پیدا" سے "پیدائش" بنا ہے۔ یہ لفظ فارسی میں استعمال ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے نقدِ غالب، ص ۲۱۲۔ اُردو میں عام طور پر مستعمل ہے۔ صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

کون تجھ سا ہے ولی اللہ، لے مولا مرے
کعبہ، پیدائش سے تیری، گھر خدا کا ہو گیا
آتشؔ (کلیاتِ طبع نول کشور، ص ۲۳۱)

گرمائش نیا لفظ ہے۔ میں نے اِس کو ایک معروف کپڑا مِل کے اشتہار میں سُنا تھا۔ غالباً پچھلے سال (یعنی ۱۹۷۰ء میں) "وگیا پن کاری کرم" میں اُس مِل کے اونی کپڑوں کے اشتہار میں "گرمائش اور آرام کے لیے" کا ٹکڑا بار بار سُننے میں آتا تھا۔ مجھے یہ لفظ بہت دل چسپ اور کارآمد معلوم ہوا۔ اِس کو بھی "پیدائش" اور "رہائش" کی طرح صحیح مان لینا چاہیے۔ "گرما" سے "گرمائش" بہ خوبی بن سکتا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ مفہوم کو ادا کر سکتا ہے۔ نئے لفظ اِس طرح بھی بنتے ہیں۔

گرہ، زرہ، شکریہ:

"زرہ، بہ فتح را، مہمل غلط ہے" (قاموس)۔ نوریں میں بھی اس کو صرف بہ کسرِ اول و ثانی لکھا گیا ہے۔ یہ فارسی کی پیروی ہے۔ فارسی میں یہ لفظ، بہ کسرِ اول و دوم ہی ہے،

مگر اردو میں یہ بہ کسرِ اول و فتحِ دوم مستعمل ہے :

فقیرانہ ہے دل مقیم اُس کی رہ کا — غرض کیا کہ محتاج ہو بادشہ کا

خدنگ آہ کا اے فلک بے طرح ہے — بھروسا تو تاروں کی مت کر زرہ کا

تری آشنائی میں کیا میں نے پایا — دیا نقدِ دل اور اپنی گرہ کا

انشا (کلامِ انشا، ص ۲۳)

مردِ سپاہی ہے وہ، اُس کی زرہ لا الٰہ — سایۂ شمشیر میں اُس کی پنہ، لا الٰہ

اقبال (مسجدِ قرطبہ)

"زرہ" کی طرح فارسی میں "گرہ" بھی بہ کسرِ تین ہے (گِرِہ) اردو میں اس کو بھی بہ فتحِ ثانی استعمال کیا گیا ہے۔ انشا کے مندرجۂ بالا اشعار میں یہ قافیہ بھی موجود ہے۔ یہ دونوں لفظ بول چال میں تو صرف بہ فتحِ دوم آتے ہیں، البتہ فارسی کی رعایت سے ان کو بہ کسرِ دوم بھی نظم کیا گیا ہے، جیسے :

نعرہ جدا، صدائے بگیر و بدِہ جدا — گوشے کماں سے دور، تو گوشوں سے زِہ جدا

بکتر جدا زمین پہ ٹکڑے، زِرِہ جدا — نیزوں کو دیکھیے تو گرہ سے گِرِہ جدا

انیس (روحِ انیس، طبع اول ص ۱۲۹)

نل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی، یہ گری — برچھی سے اُڑ گئی وہ سناں، یہ گِرِہ گری

ترکش کٹا، کمانِ کیانی سے زِہ گری — یہ سر گرا، وہ خود گرا، یہ زِرِہ گری

انیس (ایضاً ص ۱۸۵)

اب ان لفظوں کی صحیح حرکات کو صحیح مان لینا چاہیے، مگر اس تفصیل کے ساتھ کہ بول چال میں یہ دونوں لفظ بہ فتحِ دوم آتے ہیں اور یہ اردو کا تصرف ہے۔

"شکریّہ" بہ تشدید کہنا چاہیے۔ "قاموس" مسند میں ز کا یہ شعر لکھا ہے :

زباں قاصر ہے، کیوں کر اُس کا شکریّہ ادا ہوگا — عنایت کا، توجہ کی نظر کا، مہربانی کا

میرے سامنے کلیاتِ رند مطبوعۂ نول کشور پریس کان پور ہے، اُس میں یہ شعر اس طرح ہے:
زباں قاصر ہے، کیوں کر شکریہ اُس کا ادا ہوگا عنایت کا، توجہ کی نظر کا، مہربانی کا
نور اللغات میں یہی شعر بہ تخفیفِ یا کی سند میں لکھا ہوا ہے، مگر اُس میں پہلا مصرع یوں ہے: زباں قاصر ہے، اُس کا شکریہ کیوں کر ادا ہوگا۔ یہی صورت معین الشعرا میں ہے۔ بہ ہر صورت، یہ شعر بہ یائے مشدد کی سند میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ مولفینِ قاموس کا یہ کہنا کہ "شکریہ" بہ یائے مشدد کہنا چاہیے، اِس حد تک ضرور صحیح ہے کہ بعض شعرا نے اس کو بہ یائے مشدد نظم کیا ہے۔ نور میں محسن کاکوروی کا یہ شعر سند آ لکھا ہوا ہے:

لے شکریے میں اُس بُت شکن کو خوانِ صد نعمت
یہ مہمانی ہوئی باغِ خلیلِ ابنِ آزر میں
(کلیاتِ نعتِ محسن، نامی پریس ص ۲۰۸)

لیکن عام طور پر تحریر و تقریر میں بہ یائے مخفف ہی مستعمل ہے۔ یہ لفظ عربی کا نہیں، اردو تراشیدہ ہے؛ اس بنا پر یہ بالکل ضروری نہیں کہ اِس میں ی مشدد ہو۔ ضرورتِ شعری کی بنا پر اس کو بہ یائے مشدد نظم کیا گیا ہے، جیسے انشا کا یہ شعر:

حمد کے بعد بہ شکریہ ادا کرتا ہوں شکر صد شکر ہے اے حمد و ثنا کے الیق
(کلامِ انشا ص ۲۹۱)

مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ استعمالِ عام پر بھی اس کا اثر پڑے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔

عنقا، شجاعت، ہتک:

"عنقا، بالضم غلط ہے" (قاموس)۔

یہی رائے مولفِ نور کی ہے: "بالفتح صحیح و بالضم غلط"۔ صاحبِ آصفیہ نے الفاظ میں تو اس کی صراحت نہیں کی مگر ع پر زبر لگا ہوا ہے؛ مطلب اس سے بھی یہی نکلتا

ہے۔ یہ لفظ بہ لحاظِ اصل بہ فتحِ اول ہے، مگر اُردو میں اِس کو عام طور پر بہ ضمِ عین استعمال کیا جاتا ہے۔ دو چار عربی دانوں کے سوا اور کوئی بہ فتحِ عین نہیں بولتا۔ بہتر یہ ہوگا کہ اس کی دونوں حرکات کو تسلیم کرلیا جائے۔

عنقا کی طرح شجاعت بھی اصلاً بہ فتحِ اول ہے۔ مولفینِ نور و قاموس نے بہ فتحِ اول (شَجاعت) کو صحیح اور بہ ضمِ اول (شُجاعت) کو غلط بتایا ہے۔ آصفیہ میں بھی شش پر زبر ہی لگا ہوا ہے یہ لفظ بھی زبانوں پر بہ ضمِ اوّل ہے۔ بہ فتحِ اول میں اجنبیت کا شائبہ بھی شامل ہو جاتا ہے اُردو میں صرف اس کو بہ ضمِ اول ماننا چاہیے۔

یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ اس وزن کے کئی لفظوں میں فارسیِ جدید میں تصرّف ہوا ہے۔ اِس فہرست میں یہ لفظ (شجاعت) بھی شامل ہے کہ اِس کو اردو کی طرح بہ ضمِ اول لکھا گیا ہے۔ فرہنگِ آموزگار میں ایک عنوان ہے "تغیراتِ مہم کہ در لغاتِ عربی وادہ شد" اُس کے ذیل میں لکھا گیا ہے: "تغیّر در حرکات، مانند مبارزہ، مباحثہ، مبالغہ (باکسرۂ حرف چہارم بجای فتحہ) وشجاعت با ضمِ شین بجای فتحہ"۔

محبّت اور مسرّت بھی اِسی ذیل میں آتے ہیں۔ خاص لوگ اِن کو اصل کے مطابق بہ فتحِ میم بولتے ہیں، اور عام لوگ بہ ضمِ میم۔ اِن دونوں لفظوں میں حرکات کا یہ اختلاف، عنقا اور شجاعت کے مقابلے میں ذرا مختلف حیثیت رکھتا ہے؛ اس لیے محبت اور مسرت میں میم کی دونوں حرکات کو صحیح مان لینا چاہیے (مَحبت، مُحبت۔ مَسرت، مُسرت)۔

• چٹنک بہ فتحتین کہنا غلط ہے" (قاموس)۔

آصفیہ میں بھی ت پر جزم لگا ہوا ہے (چٹنک)۔ اُردو میں یہ لفظ اصل حرکات کے ساتھ بہ فتحِ دوم بھی مستعمل ہے؛ اِس لیے

اِس لفظ کو دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے۔

نور میں پہلے تو یہ لکھا گیا ہے "عام لفظ صحیح دبہ فتحِ اول و دوم غلط، لیکن اردو میں بیگمات کی زبان پر بہ فتحِ اول و دوم ہی ہے"۔ پھر بہ فتحِ دوم کی سند میں واجد علی شاہ کا یہ شعر لکھا ہے:

محکوموں نے ہم پہ فتح پائی　　　　کیا کیا ہم نے ہتک اٹھائی

اِن اسناد کے بعد یہ لکھنا کہ "بہ فتحِ اول و دوم غلط" ہے، یا یہ لکھنا کہ بہ فتحِ دوم (صرف) بیگمات کی زبان پر ہے، کیوں کر صحیح ہوگا۔ بہ ہر صورت، اردو میں زبانوں پر اکثر بہ فتحِ دوم اور کم تر بہ سکونِ دوم ہے۔ دونوں صورتیں قابلِ تسلیم ہیں۔

مہوّس، مرغّن، ملتہب، مفرور: "مہوّس غلط ہے۔ ہوس سے بنالیا ہے۔ جیسے روغن سے مرغّن" (قاموس)۔ "مفرور، غلط ہے۔ عربی میں مفرور کی جگہ فرّ و فار آتا ہے، جو فارسی وار اردو میں مستعمل نہیں ہے۔ مفرور کی جگہ، فرار شدہ کہہ سکتے ہیں" (قاموس)

غنیمت ہے کہ مولفینِ قاموس نے "فرار شدہ" ہی بولنے کی فرمایش کی۔ اگر یہ لکھ دیتے کہ "مفرور" کی جگہ "فرّ" یا "فار" ہی بولنا چاہیے، تو کوئی کیا کر سکتا تھا! مرغّن، روغن سے، اور مہوّس، ہوس سے بنا لیے گئے ہیں اور اس طرح کے الفاظ کی ایک طویل فہرست پیش کی جا سکتی ہے جو عربی الفاظ کے قیاس پر فارسی میں یا اردو میں بن گئے ہیں۔ مثلاً فلک سے فلاکت اور مفلوک، فارسی میں بنا لیے گئے ہیں، اِسی طرح روغن سے مرغّن، اردو میں بن گیا ہے۔ کسی طرح کی تفریق کے بغیر، یہ سب لفظ، اردو کے مستعمل اور قطعاً صحیح اور فصیح لفظ ہیں۔

آصفیہ میں "مفرور" اور "ملتہب" کو عربی لکھا گیا ہے۔ یہ درست نہیں۔ "مرغّن" اُس میں موجود ہی نہیں، البتہ "مہوّس" کو کیمیاگر کے معنی میں اردو لکھا گیا ہے اور یہ

درست ہے، کیوں کہ "کیمیاگر" کے معنی میں یہ اردو نژاد ہے۔ نور میں "مہوّس" کو صحیح طور پر "اردو" لکھا گیا ہے، البتہ "مفرور" کو اس میں بھی عربی لکھا گیا ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہ درست نہیں۔ "ملتبب" کے ذیل میں مولّفِ نور نے لکھا ہے: "فصحائے متاخرین اس جگہ "لبالب" ہی فصیح سمجھتے ہیں"۔ یہ قید بھی غیر مناسب ہے۔ مدمغ اور معتوب اور مقروض کی طرح، اسے بھی عام الفاظ میں شامل سمجھنا چاہیے۔۔۔ مہوّس کی بعض اسناد پیش کی جاتی ہیں، نور و آصفیہ میں اسناد موجود نہیں:

لے مہوّس جو ملی خاک درِ جاناں کی ۔۔۔ ایک چٹکی میں مسِ قلب ہے کندن کیسا

صبا (دیوان ص ۳۸)

بے تابیِ دل کو مری کیا سمجھے مہوّس ۔۔۔ اس نسخے سے ہم کرتے ہیں سیماب شگفتہ

انشا (کلامِ انشا ص ۱۸۹)

اچھوں سے بُرے مل کے بنا لیتے ہیں جوڑا ۔۔۔ مکّار مہوّس ہیں، زمانہ ہے دغل کا

بحر (ریاض البحر ص ۱۳)

اکسیر پر مہوّس، اتنا نہ ناز کرنا ۔۔۔ بہتر ہے کیمیا سے اپنا گداز کرنا

میر درد (دیوان، مکتبہ جامعہ دہلی ص ۱۵)

سنا جائے ہے اک مہوّس کا حال ۔۔۔ کہ رکھتا تھا بت کیمیا کا خیال

قائم

قدم یار تلک پہنچوں تو پارس ہوں میں ۔۔۔ اے مہوّس! تجھے اکسیر مبارک ہو دے

میر سوز

مرتّب، مزلّف، ملتبب: یہ سب الفاظ استعمال کیے گئے ہیں:

وہ چھوٹے چھوٹے خود، وہ زرہیں تنوں میں تنگ ۔۔۔ بوٹا سے اُن قدوں پہ مرتّب سلاحِ جنگ

شاد عظیم آبادی (مراثیِ شاد، اول ص ۱۳۱)

سادگی سے سبزۂ رخسار انسب ہو گیا   کیا مزیّف ہوتے ہی چہرہ مرتّب ہو گیا
رشک (مجموعۂ دو دواوینِ رشک ص ۳)

ننگِ استغنا ہے، ہوں منت کشِ ساقی اگر   شیشۂ دل میں ملبّب بادۂ خوناب ہے
فغاں (دیوان ص ۱۲۹)

مولّفِ رسالۂ اصلاح نے لکھا ہے: "متلاشی بہ معنیِ تلاش کنندہ، مرغن بہ معنیِ روغن دار، یا اس قسم کے دوسرے الفاظ جن کا مادّہ عربی نہیں، مگر ان کا اشتقاق بہ طورِ عربی ہوا ہے، اور عام طور پر بولے جاتے ہیں؛ اُن کا استعمال میرے نزدیک کچھ مضائقہ نہیں" (رسالۂ اصلاح، ص ۳۰)۔

ذو معنی: اس کے متعلق لکھا ہے: "عوام کہتے ہیں، کتبِ معتبرہ میں نہیں پایا گیا (قاموس)۔ غنیمت ہے کہ صاف صاف غلط نہیں کہا، نہ کرشمۂ جہالت بتایا۔ اردو میں "ذو معنی" بالکل صحیح لفظ ہے "کتبِ معتبرہ" میں ہو یا نہ ہو۔ اصل لفظ "ذو معنیین" اردو میں بہت کم مستعمل ہے۔ چند خاص قسم کے پڑھے لکھے لوگوں کے سوا، اب شاید ہی کوئی بولتا یا لکھتا ہو۔ بعض شعرا نے جو "ذو معنیین" نظم کیا ہے، وہ استعمالِ عام کے ذیل میں نہیں آتا۔ عام طور پر "ذو معنی" ہی مستعمل ہے۔ دو مثالیں کتبِ معتبرہ" کے ذیل میں آنے والی دو کتابوں سے پیش کی جاتی ہیں: (۱) "کہ مکرنی میں عورتوں کی زبان سے ذو معنی بات بیان کی جاتی ہے" (مقدمۂ فرہنگِ آصفیہ، جلدِ اول، ص ۶۱)۔ (۲) "ذو معنی مشتقاتِ مصدر کے استعمال کو بعض حضرات حُسنِ کلام کا موجب سمجھتے ہیں" (حسرت موہانی۔ رسالہ معائبِ سخن ص ۵۴)۔ اِس فصل کا عنوان ہے: "ذو معنی مشتقاتِ مصدر کا استعمال"۔ یہی نہیں، امانت لکھنوی نے اس کی جمع "ذو معنیاں" بھی نظم کی ہے:

بولے ذومعنیاں اس ڈھب کی کہ شرما جائے   پھبتی ایسی وہ کہے گرم کہ تجھ پر چھا جائے

(واسوخت امانت، بند نمبر ۲۴، مجمع الاشعار ہندی، مطبوعہ مطبع حیدری، بمبئی)

نور میں "ذومعنی" کے ذیل میں "بامعنی، ضد مہمل کا" لکھا گیا ہے۔ بہ لحاظِ اصل تو یہ درست ہے، مگر استعمالِ عام میں "ذومعنی" اِس مفہوم میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ اِس کی جگہ "بامعنی" کہتے ہیں۔ اردو میں "ذومعنی" ایسے لفظ یا بات کو کہتے ہیں جس میں پہلوداری ہو، دو مفہوم نکلتے ہوں۔ اصلاً اِس معنی میں "ذومعنیین" تھا، مگر استعمالِ عام میں اُس کی جگہ "ذومعنی" نے لے لی ہے۔ آصفیہ میں صحیح طور پر "ذومعنی" کے صرف یہی مستعمل اردو معنی لکھے گئے ہیں: "ذومعنی ... وہ بات ہے جس میں کئی پہلو یا معنی نکلتے ہوں"۔ مگر مؤلف نے اِس لفظ کو اس معنی میں عربی لکھا ہے۔ یہ محلِ نظر ہے۔ اردو لکھنا چاہیے تھا۔ عربی کے لحاظ سے اِس معنی میں "ذومعنیین" ہے۔ ہاں، "ذومعنیاں" نہ آصفیہ میں ہے نہ نور میں۔

حسین: "لغات و کتبِ عربیہ میں حسین کا لفظ نہیں پایا گیا، صرف صاحبِ منتخب نے لکھا ہے؛ لہٰذا خوب صورت، جمیل، حسن والا کے معنی میں مہمل ہے"۔ (قاموس)۔

یہ لفظ المنجد میں بھی موجود ہے۔ نیاز فتح پوری نے غالباً مؤلفینِ قاموس کے اِسی قول سے متاثر ہو کر سیماب اکبر آبادی کے ایک مصرعے میں "خوابِ حسیں" کی ترکیب پر بھی اعتراض کیا تھا (استفساریات، اوّل، ص ۱۵۵)۔ المنجد میں اِس لفظ کا موجود ہونا، مؤلفین کے اُس قول کی تردید کے لیے کافی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اساتذۂ اردو نے اِس لفظ کو بہ ترکیب نظم کیا ہے اور اس کی جمع "حسیناں" بھی بنائی ہے:

شرم یاں تک ہے کہ مانگے نہ خدا سے وہ دعا   کر لے ہاتھوں سے نہ تا روئے حسیں کا پردہ

(جرأت: تذکرۂ سرور، ص ۱۹۸)

آخر مرے گھر آ ہی گیا وہ بُتِ حسیں ۔۔۔ کچھ شک نہیں ہے قدرتِ پروردگار میں

جلیل مانک پوری

ہر طرف گل ہائے رنگا رنگ گلشن میں کھلے ۔۔۔ جیسے صبحِ عید یک جا ہوں حسینانِ جہاں

امیر مینائی (مرآۃ الغیب)

مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے ۔۔۔ داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

غالب

نور و آصفیہ دونوں میں یہ لفظ موجود ہے، البتہ سند مذکور نہیں۔

دمشق، خسرو، عفو، لیلیٰ، کنیت : مولفینِ قاموس نے دمشق کو بہ کسرِ اول لکھا ہے۔ لغت میں بھی یہی صورت ہے۔ اردو میں بالعموم بہ فتحِ اول و کسرِ ثانی (دَمِشق) مستعمل ہے، اور اردو میں صرف یہی تلفظ قابلِ تسلیم ہے۔ نور و آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ ہاں، غیاث اللغات میں بہت تفصیل کے ساتھ یہ لکھا گیا ہے کہ دم کی حرکت میں ذرا سا اختلاف ہے، اس کو بالفتح اور بالکسر، دونوں طرح کہا گیا ہے۔ یعنی اربابِ لغت کے نزدیک یہ "دَمِشق" بھی ہے اور "دِمِشق" بھی۔ دال پر بہ ہر طور زیر ہے۔ اس سارے اختلاف کو فارسی و عربی سے متعلق سمجھنا چاہیے، اور اردو میں اس کو صرف بہ فتحِ اول و کسرِ ثانی (دَمِشق)، ماننا چاہیے۔

قاموس میں خسرو کو بہ فتحِ را لکھا گیا ہے (خُسَرو)۔ یہی رائے مولفِ نور اللغات کی ہے: "بالضم و فتحِ را"۔ آصفیہ میں اس کو بہ کسرِ اول و فتحِ سوم (خِسَرو) لکھا گیا ہے۔ اس لفظ کی حرکات میں خود فارسی کے اربابِ لغت نے اختلاف کیا ہے۔ خانِ آرزو کی رائے میں بہ کسرِ اول ہے۔ صاحب بہارِ عجم کی رائے میں بہ ضمِ اول و سوم ہے اور مولفِ غیاث نے بہ ضمِ اول کو غلط اور بہ کسرِ اول و فتحِ سوم کو مرجح بتایا ہے۔ یہ تفصیل بہارِ عجم

اور غیاث اللغات میں موجود ہے۔ اردو میں صورت یہ ہے کہ زبانوں پر بہ ضمِ اول وسوم (خُسرُو) ہے۔ نظم میں اس کو بہ فتحِ سوم "ضَو" وغیرہ کا ہم قافیہ کیا گیا ہے۔ گویا حرفِ اول پر ہر حال میں پیش رہتا ہے اور حرفِ سوم پر اکثر پیش اور کم تر زبر آتا ہے (ضرورتِ شعری کے نتیجے میں)۔ اردو میں اِسی صراحت کے ساتھ، اِس لفظ کی اِن دونوں صورتوں کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ بہ کسرِ اول جیسا کہ آصفیہ میں لکھا گیا ہے، اردو میں مستعمل نہیں، اس کو فارسی سے متعلق سمجھنا چاہیے۔

"عفو" کے متعلق لکھا گیا ہے: "بہ فتحِ اول وضمِ فا صحیح نہیں" (قاموس) —— یہ قول درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عربی میں یہ لفظ بہ سکونِ فا ہے (عَفْو) مگر فارسی میں اس کو بہ ضمِ فا بھی نظم کیا گیا ہے: "فارسیاں بہ ضمِ فا نیز استعمال کردہ اند" (بہارِ عجم)۔ صاحبِ غیاث اللغات کے الفاظ میں بہ ضمِ دوم "نوعے از تفریس است"۔ بہ ضمِ دوم کی سند میں یہ دو شعر لکھے گئے ہیں:

عفو کردم از وے عملہای زشت　　　　بہ فضلِ خودش آورم در بہشت

(سعدی)

اگر سہوے بود در وے، عفو کن　　　　دریدہ پردۂ کارم، رفو کن

(ناصر خسرو)

اردو میں اس لفظ کو بہ سکونِ دوم اور بہ ضمِ دوم، دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے۔ مثالیں نور میں موجود ہیں۔ جناب اثر لکھنوی مرحوم نے میرے خط کے جواب میں لکھا تھا: "لکھنؤ میں بہ فتحِ اول وضمِ دوم زبانوں پر ہے، مگر واوِ معروف کے بدلے، واوِ مجہول کے ساتھ بولتے ہیں" —— اردو میں اس لفظ کو بہ سکونِ دوم اور بہ ضمِ دوم، دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے: عَفْو، عَفُو —— یہ بات کہ واو معروف ہے یا مجہول، اِس کو بولنے والے پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اہلِ لکھنؤ ایسے بعض الفاظ کو بہ واوِ مجہول ہی بولتے ہیں۔

• عفو کے متعلق آثر صاحب کی رائے اوپر پیش کی جا چکی ہے؛ اسی وزن کا ایک لفظ ہے، عمو۔ اس کے متعلق مولانا نظم طباطبائی نے لکھا ہے: "میر عوض علی خاں، میر انیس کے ایک شاگرد تھے، انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے "عمو" کو بہ واوِ معروف پڑھا، تو میر صاحب نے منع کیا" [اردوئے معلّٰی، بابت فروری و مارچ ۱۹۱۲ء]۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ کے لوگ اس کی پیروی کریں۔ کچھ لوگ بہ واوِ معروف بولیں گے اور کچھ بہ واوِ مجہول۔ اس سلسلے میں کوئی پابندی عائد نہیں کرنا چاہیے، یہی مناسب صورت ہوگی۔

کنیت کے متعلق لکھا گیا ہے: "بہ تشدیدِ نونِ مکسور (کنّیت) کہنا غلط ہے" (قاموس)۔ نور اللغات میں بھی یہی لکھا گیا ہے: "بالضم و فتحِ سوم صحیح، و بہ کسرِ نونِ مشدّد غلط"۔ دونوں کتابوں کے مولفین نے جن حرکات کو صحیح بتایا ہے، وہ عربی سے متعلق ہیں، مگر اردو میں اس کو بہ کسرِ نونِ مشدّد ہی بولا جاتا ہے۔ یہ تلفظ خواہ عربی و فارسی لغات کے اندراجات کے خلاف ہو، مگر اردو کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔ آصفیہ میں اس کو "کنّیت" بہ نونِ مشدّد لکھا گیا ہے۔ اردو میں یہی تلفظ ہے، البتہ مولف نے بہ نونِ مشدّد کو عربی لکھا ہے؛ یہ درست نہیں۔ یہ صراحت ضروری تھی کہ بہ نونِ مشدّد، اردو کا تصرف ہے۔

مولفینِ قاموس نے لئیق کو بھی غلط بتایا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ لفظ عربی میں نہیں پایا جاتا، فارسی والے بھی اس سے واقف نہیں؛ یہ لفظ اردو میں بنا ہے؛ اور اردو میں بنے ہوئے ایسے بہت سے لفظوں کی طرح، بالعموم مستعمل ہے۔ لئیق احمد اور لئیقہ، بہ طورِ نام بھی مستعمل ہیں۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں ہے، مگر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ: "فصحا اس جگہ "لائق" بولتے ہیں"۔ غالباً فصحا "لئیق احمد" اور "لئیق الرحمان" کو بھی "لائق احمد" اور "لائق الرحمان" کہتے ہوں گے! اردو میں یہ لفظ بالکل صحیح ہے اور پوری طرح قابلِ قبول ہے، اسی طرح جس طرح "شکیل" اور "عادی"، "قابلِ قبول" بلکہ "واجب القبول"

زیبا ـــــــ ہاں، آصفیہ میں "لیئق" تو موجود نہیں، مگر "لائق" ہونے کے ذیل میں اِس کے مرادف کی حیثیت سے اِس نے جگہ نکال ہی لی ہے: "لائق ... واجب، سزاوار ... ذی جوہر، ذی ہنر، لیئق، گُنی ..."۔ اِس سے استعمالِ عام کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

گھائل: اِس لفظ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ "بہ کسرِ یا غلط" (قاموس)۔ مولفین کو غلط اور نادرست کہنے کی ایسی لت پڑ گئی ہے کہ الفاظ کے متعلقات کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اِس لفظ کی صورت یہ ہے کہ اصل کے لحاظ سے تو یہ لفظ بہ فتحِ یا ہے۔ اڑیل اور سڑیل اور مریل کی طرح "گھایل" بھی اسی قبیلے کا لفظ ہے۔ "یل" کا لاحقہ اس میں بھی ہے؛ اِس بنا پر بعض اساتذہ نے اس کو بہ فتحِ یا صحیح قرار دیا ہے، مگر استعمال کا حال یہ تھا کہ متقدمین اور متوسطین کے دواوین میں یہ لفظ اکثر قاتل اور سائل کا ہم قافیہ رہا ہے اور کم تر پھل اور بادل کے قافیے میں آیا ہے۔ اساتذۂ متاخرین یعنی امیر و جلال کے زمانے میں یہ لفظ بھی معرضِ بحث میں آیا۔ ناسخ کے شاگرد (بحر لکھنوی) نے اس لفظ کی اصل پر نظر رکھتے ہوئے، اس کو بہ فتحِ یا صحیح قرار دیا، مگر اُس زمانے کے اکثر اساتذہ نے اِس فیصلے کو تسلیم نہیں کیا اور متقدمین کی طرح، اس کو سائل کا ہم قافیہ سمجھتے رہے۔ گویا اکثریتی استعمال نے لفظ کی اصلیت پر ترجیح حاصل کی۔ امیر مینائی نے ایک خط میں اِس پہ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اِس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو یہاں پر نقل کر دیا جائے:

"گھایل کو قدما میں اکثر شعرا نے بہ فتحِ یا موزوں کیا ہے ... مگر متوسط طبقہ شعرا نے بہ کسرِ یا موزوں کیا۔ البتہ اِس طبقے میں بحر مرحوم نے بہ فتحِ یا کہا ہے۔ اور مجھ سے بالمشافہہ یہ ذکر کیا کہ وزن سے لوگوں کو دھوکا ہو گیا ہے، در حقیقت ہندوی لفظ ہے، وہ بہ فتحِ یا۔ اُس بحث میں اسیر مرحوم بھی موجود تھے، اُن کے نزدیک بہ کسرِ یا ہی روا، اور انھوں نے فرمایا کہ طبقۂ متوسطین میں جو شعر لطیف

بہ کسرِ یا کہا ہے؛ تقلیدِ اُنھی کی مناسب ہے۔ اور خود وہ، اور اُن کے اتباع سے میں بھی، بہ کسر ہی استعمال کرنا بہتر اور راجح سمجھتا ہوں"۔

(مکتوبِ امیر مینائی بنامِ حافظ سید عبدالجلیل مارہروی۔ تاریخ نثرِ اردو، ص ۵۵۳)

جلال نے بھی یہی لکھا ہے:

"جنابِ شیخ امداد علی بحر مغفور کہ ارشد تلامذہ میں سے جنابِ شیخ ناسخ مرحوم کے تھے، وہ اِس لغت کو یاے تحتانی کے فتحے سے صحیح فرماتے تھے، اور صندل، محل وغیرہ کے قافیے میں لاتے تھے، لیکن اتفاق جمہور فصحاے لکھنؤ کا لغتِ مذکور میں یاے تحتانی کے کسرے ہی پر ہے، یعنی مکسور پڑھتے ہیں اور دل، بسمل کے قافیے میں لاتے ہیں"۔ (سرمایۂ زبانِ اردو)

شوق نیموی نے رسالۂ اصلاح میں اس بحث کو تفصیل سے لکھا ہے اور فحواے عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک اساتذۂ متاخرین نے بہ فتحِ یا کو مرجح سمجھا ہے۔ مگر اُن کی اِس راے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ امیر و جلال کی تصریحات سے ثابت ہے، اکثریت نے اِس کو سائل/ مائل کا ہم قافیہ قرار دیا ہے۔ مولفِ آصفیہ کی تحریر سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ دہلی و لکھنؤ کے شعرا کی اکثریت، اِس کو سائل کے وزن پر استعمال کرتی رہی ہے۔ اُن کی عبارت یہ ہے:

"اِس لفظ کے تلفظ کے سلسلے میں ذرا سا جھگڑا ہے، وہ یہ کہ حضرت ناسخ اور اکثر شعراے لکھنؤ و دہلی تو اس کو سائل و مسائل کے وزن پر، دل، تل، مشکل، بسمل، قائل وغیرہ کے ساتھ قافیہ باندھنا فصیح سمجھتے ہیں، مگر بعض اہلِ دہلی اور ہندی لغات والے بہ فتحِ تحتانی صحیح اور فصیح خیال کرتے ہیں"۔

اِس عبارت میں بس ایک کمی ہے اور وہ یہ کہ "بعض اہلِ دہلی" کے ساتھ "بعض اہلِ لکھنؤ" بھی ہونا چاہیے تھا۔ بہرصورت، بہ فتحِ یا ماننے والوں کی تعداد "بعض" کے ذیل میں آتی ہے،

دہلی و لکھنو دونوں جگہ۔

ہاں، یہ صراحت ضروری ہے کہ جب یہ لفظ پھل اور بادل کا ہم قافیہ ہوگا تو اس کو ی سے لکھا جائے گا، جیسے:

گماں کیوں کر نہ ہو خلد بریں کا صحنِ مقتل پر
تصدق ہوتی ہیں حوریں، ترے خنجر کے گھایل پر

اور جب یہ دل، بسمل، سائل وغیرہ کے ساتھ آئے گا تو اس کو ہمزہ سے لکھا جائے، مثلاً:

نہ احباب کی تیغِ احساں سے گھائل
نہ بیٹھے سے طالب، نہ ہو بیخ سائل

لغت میں اس لفظ کی دونوں صورتوں کو صحیح اور مستعمل لکھا جائے گا، مگر مندرجۂ بالا تفصیل کے ساتھ۔

گروہ، گوارا، گواہ: مولفینِ قاموس نے اِن تینوں لفظوں کو بہ ضمِ اول صحیح مانا ہے اور یہ نری فارسی کی تقلید ہے۔ فارسی میں یہ لفظ بہ ضمِ اول ہیں، مگر اردو میں یہ صورت نہیں۔ آصفیہ میں بھی اِن لفظوں میں گاف پر اہتمام کے ساتھ پیش لگایا گیا ہے، مثلاً گواہ، گواہی، گواہی دینا وغیرہ۔ یہ فارسی کی پیروی ہے۔ اردو میں "گواہ" اور "گواہی" کوئی نہیں بولتا۔ نور میں "گواہ" اور "گوارا" کے ذیل میں تو بجا طور پر یہ صراحت کی گئی ہے کہ یہ دونوں لفظ، اردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اول ہیں، مگر "گروہ" کو صرف بہ ضمِ اوّل لکھا گیا ہے۔

اردو میں گواہ اور گوارا تو صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہیں اور اب ان لفظوں کی صرف یہی صورت قابلِ تسلیم ہے۔ بہ ضمِ اوّل کو اردو سے قطعاً غیر متعلق سمجھنا چاہیے۔ اور "گروہ" کو اکثر لوگ بہ کسرِ اوّل بولتے ہیں اور بعض لوگ بہ فتحِ اول بھی کہتے ہیں، مگر بہ ضمِ اول کوئی نہیں بولتا۔

غمی، طمانینت، فضا : مؤلفینِ قاموس نے "غمی" کو چھوڑ کر "غم" بولنے کی تاکید کی ہے۔ کیا فرماتے ہیں مؤلفینِ محسن کاکوروی کے اِس شعر کے متعلق :

فراغت، آتش، ستی ہو گئی　　　جہنم کے گھر میں غمی ہو گئی

(کلیاتِ نعت، نامی پریس، ص ۱۸۸)

اِس میں جو مفہوم "غمی" سے ادا ہو رہا ہے کیا وہ "غم" سے ادا ہو سکتا ہے مؤلفین یہ بھول گئے کہ یہ دو مستقل لفظ ہیں۔ اردو میں "غمی" "غم" کا مرادف نہیں، بل کہ وہ دوسرے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ فارسی میں "غمی" "غمیں" کا مرادف ہے (جلیم) مگر اردو میں موت، ماتم، رنج کے مفہوم میں آتا ہے۔ آصفیہ و نور دونوں میں یہ لفظ موجود ہے۔

"فضا" کو بالکسر غلط بتایا گیا ہے (قاموس) یہ قول بھی محلِ نظر ہے۔ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ "فضا" کے اصل معنی ہیں : فراخی اور کھلا ہوا میدان ـــ بہار، رونق اور کیفیت کے معنوں میں یہ ہندی ہے۔ پھر جب ایک لفظ کے معنوں میں تصرف کیا جا سکتا ہے تو اُس کی حرکات میں تصرف کیوں نہیں ہو سکتا؟ مؤلفینِ قاموس کو معلوم نہیں کہ "فضا" (بہ کسرِ اول) کو اردو میں جائز ہی نہیں، مرجح بتایا گیا ہے۔ صاحبِ نور نے بہ فتحِ اول لکھ کر مزید لکھا ہے کہ: "اردو میں زبانوں پر بہ کسرِ اول ہے"۔ جلیل مانک پوری کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"فضا، بالفتح ہے مگر اردو بول چال میں بالکسر مستعمل ہے۔ اگر کوئی صاحب صحت کے خیال سے بالفتح کہیں، تو مضائقہ نہیں"۔

(مکتوبِ جلیل، ماہ نامہ الحمرا، لاہور، نومبر ۱۹۵۶ء)

البتہ آصفیہ میں اِس کو صرف بہ فتحِ اول لکھا گیا ہے ـــــــ اِس لفظ میں حرفِ اول کی دونوں حرکات کا استعمال قابلِ تسلیم ہے۔

"طمانینت" کے ذیل میں لکھا گیا ہے "طمانیت کہنا بسخت غلطی ہے" (قاموس)، حالاں کہ اردو میں صرف "طمانیت" مستعمل ہے۔ یہی بات صاحبِ نور نے لکھی ہے "طمانینت" کو تو اردو لغات میں لکھنا ہی نہیں چاہیے۔ تعجب ہے صاحبِ آصفیہ پر جنھوں نے اردو میں بھی "طمانینت" کو صحیح اور "طمانیت" کو غلط بتایا ہے۔ اُن کی عبارت یہ ہے "یہ لفظ جس طرح بہ فتحِ طائے (غیر) منقوط و یک نونِ مکسور مشہور ہے، غلط ہے۔ صحیح بہ ضمِّ اول و کسرِ نونِ اول و یائے معروف و فتح نونِ ثانی، بہ معنیِ سکونِ قلب تصور کرنا چاہیے، گو صراح سے ایک نون کے حذف کا جواز ظاہر ہوتا ہے۔" یہ عجیب منطق ہے۔ "طمانینت" اردو میں تو کوئی بولتا ہی نہیں۔ اس قدر ثقیل لفظ رائج ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ جب صراح سے ایک نون کے حذف کا جواز ملتا ہے، تو پھر اُسے کیوں نہ مانا جائے؟ لغت پرستی بھی عجیب چیز ہے کہ بعض اوقات خوش مذاقی بھی اُس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔ اردو میں ط کا زبر ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ بہ ہر صورت، اردو میں اب صرف ایک لفظ ہے "طمانیت"۔ ط مفتوح، اور ن مکسور، آگے آیت۔

سفلی، سنسنی خیز، دن بہ دن:

قاموس میں "سفلی" کو عربی کی رعایت سے بہ ضمِّ اول لکھا گیا ہے۔ عربی میں ضرور یہ بہ ضمِّ اول ہے (المنجد)، مگر اردو میں زبانوں پر بہ کسرِ سین (سِفلی) ہے۔ اردو میں اس لفظ کے صرف اسی تلفظ کو صحیح ماننا چاہیے، اور بہ ضمِّ اول کو عربی کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔

آصفیہ میں "سُفلی" لکھا ہوا ہے، یعنی س پر پیش بھی ہے اور زیر بھی، مطلب یہ ہوا کہ اردو میں یہ لفظ دونوں طرح مستعمل ہے، مگر اس کے بعد "سفلی عمل" میں سین پر صرف زیر لگا ہوا ہے؛ اِس سے استعمالِ عام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نور میں صرف "سِفلی"

ملتا ہے اور اردو کے اعتبار سے یہی صورت صحیح اور فصیح ہے۔

مولفین نے "سنسنی خیز" کو بھی غلط بتایا ہے۔ اور "دن بہ دن" کو بھی غلط ٹھہرایا ہے۔ اردو میں معلوم نہیں کتنے ایسے لفظ ہیں جن کا ایک جز فارسی یا عربی ہے اور ایک جز ہندی ہے، جیسے، پھول دار، تھانے دار، لٹھ باز، چوکی دار وغیرہ، کس کس کو نکالا جائے گا۔ ذرا اس شعر کو دیکھیے:

اک بسنتی پوشش سے آغوشِ رنگیں کیجیے
جی میں ہے، اِس مصرعِ موزوں کو تضمیں کیجیے

یا مثلاً یہ شعر:

یہی جھینکنا کو بہ کو، گھر بہ گھر ہے پسر کو ٹھکانا، نہ بیٹی کو بر ہے

اور ایسی ہی بے شمار مثالیں۔ مولفینِ قاموس ہوں یا کوئی اور بزرگ، اس طرح کے اقوال قابلِ التفات نہیں۔

یگانگت، یک سانیت:

مولفینِ قاموس نے "یگانگت" کو غلط بتایا ہے اور "یک سانیت" کو بھی اسی کے ساتھ نادرست قرار دیا ہے۔ آرزو لکھنوی نے بھی "یگانگت" کو ترک کرنے کی فرمایش کی ہے: "یگانگی کی جگہ یگانگت بولنا صحیح نہیں ہے" (نظامِ اردو، ص ۴۶)۔ مولفِ آصفیہ نے بھی یہی کہا ہے: "یہ لفظ غلط ہے، یگانگی صحیح ہے"۔ یہی رائے مولانا نظم طباطبائی کی تھی (معائبِ سخن، ص ۴۸)۔

زبان میں قواعد کی پابندیاں ٹوٹتی رہتی ہیں اور اس کے نتیجے میں بہت سے نئے لفظ بھی بن جاتے ہیں اور نئے لفظوں کے اضافے سے زبان کا دامن وسیع ہوتا ہے۔ اردو میں تو بہت سے لفظ اسی طرح بنے ہیں۔ اگر قاعدوں کی پابندی ہی کی جاتی رہتی

تو یہ ذخیرہ عالم وجود میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ جب کوئی لفظ بن جائے اور رواج پا جائے، تو اُسے قبول کر لینا چاہیے۔ قواعد کی خاطر، ارتقائے زبان پر پابندیاں نہیں لگائی جا سکتیں، بل کہ زبان کی خاطر، قواعد کو لچک دار بننا پڑے گا۔ مولفِ آصفیہ نے "یگانگت" کے بجائے صحیح لفظ "یگانگی" بولنے کی فرمایش کی ہے۔ فرمایش کرنے کی حد تک تو یہ قول بجا معلوم ہو سکتا ہے، جب اس پر عمل کیا جائے گا تب اندازہ ہوگا کہ یہ مشورہ کس قدر غلط ہے مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی کی اس عبارت میں "یگانگت" کے بجائے "یگانگی" کا پیوند لگا کر دیکھیے، خود اندازہ ہو جائے گا:

"انگریزی کے سہارے یگانگت کا خیال، پرائے مال پر دولت مند بننے کی آرزو ہے" (نقوشِ سلیمانی، ص ۹۹)

ذیل کے جملوں میں یہی بات پائیے گا:

"کہتے ہیں کہ سلطانِ مصر نے بادشاہِ روم سے طرح یگانگت کی ڈالی"
میر امّن (گنجِ خوبی، ص ۴۵)

"سو مسلمانوں میں یگانگت دین و مذہب کی کفایت کرتی ہے"
میر امّن (گنجِ خوبی، ص ۱۹۷)

مصحفی کے اس شعر کو بھی دیکھیے:

اعتمادِ یگانگت بھی تھا　　اتحادِ موافقت بھی تھا (مثنوی بحر المحبت، ص ۵۵)

مصحفی نے تو اس کو بہ ترکیبِ فارسی نظم کیا ہے، اب کیا فرماتے ہیں فصحائے کرام! "یگانگت" کی طرح "یکسانیت" بھی مستعمل لفظ ہے اور اب بالکل صحیح ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ قاعدہ کیا کہتا ہے۔ قاعدے کی رو سے تو "معتوب" اور "تشکیل" بھی غلط ہیں، اور "مشکور" بھی اسی ذیل میں آتا ہے، وغیرہ وغیرہ؛ کیا ان سب کو چھوڑا جا سکتا ہے؟ آصفیہ و نور دونوں میں "یکسانیت" موجود نہیں۔

15656

مشترک الفاظ

اردو میں مشترک الفاظ اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ مشترک الفاظ سے، وہ لفظ مراد ہیں جن کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف کئی طرح کا ہے: کچھ لفظ تو دہلی و لکھنؤ کے دبستانی اختلاف کے تحت آتے ہیں۔ کچھ لفظوں کی صورت یہ ہے کہ ایک ہی دبستان کے بعض لوگ مذکر کہتے ہیں اور بعض مونث۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک لفظ ایک زمانے میں مثلاً مذکر تھا، رفتہ رفتہ اُس کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا، یا اس کے برعکس۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ لغات میں یا متعلقہ کتابوں میں ایسی بہت سی تفصیلات موجود نہیں؛ اور اس وجہ سے بعض اوقات، الجھن کے ساتھ ساتھ، غلط فہمی سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔

بہت سے لفظوں کی صورت یہ ہے کہ شروع میں اُن کی تذکیر و تانیث کا تعین نہیں ہو سکا، استعمال میں دونوں طرح آتے رہے؛ کچھ دنوں کے بعد کسی نے ایک صورت کو قبول کر لیا، کسی نے دوسری صورت کو اور نتیجہ یہ ہوا کہ کسی کتاب میں ایک قول کو ترجیح دی گئی اور کسی میں دوسرے قول کو درج کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے لکھا ہے:

"جنس یا تانیث و تذکیر کا اختلاف ہر دور میں رہا ہے، اور یہ اختلاف مکانی اور زمانی دونوں پر مبنی ہے۔ بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ زمانی و مکانی کا

تفاوت نہیں، پھر بھی اختلاف موجود ہے۔ ایک ہی شاعر ایک لفظ کو کبھی مونث، کبھی مذکر کہہ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اردو نے مختلف اور متعدد زبانوں سے لفظ لیے ہیں؛ جب کوئی نیا لفظ آیا، اگر اُس میں اردو کی رُو سے کوئی علامت تانیث یا تذکیر کی نہ تھی، تو ایک مدت تک اُس کی جنس معین نہ ہو سکی، اور اسی لیے اکثر لفظوں کا فیصلہ آج تک نہ ہو سکا۔ جنس ہی کے معین ہونے پر جمع کی صورت کا انحصار ہوا کرتا ہے؛ اسی لیے اردو میں جنس اور عدد، دونوں سیّال حالت میں ہیں۔" (مقدمۂ کلیاتِ ولی، طبع دوم، ص ۳۴)

اِن کے علاوہ دو صورتیں اور ہیں: ایک تو یہ کہ کسی شاعر نے غلطی سے ایک جگہ کسی لفظ کو رواجِ عام کے خلاف مذکر یا مونث نظم کر دیا؛ اُس استعمال کو قبولِ عام تو حاصل نہیں ہوا، مگر بعض لغت نویسوں نے اُس کو سند کے طور پر قبول کر کے، اُس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ کے زمرے میں شامل کر دیا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جن اشعار کو یا کسی ایک شعر کو کسی لفظ کی تذکیر یا تانیث کے لیے بہ طورِ سند پیش کیا گیا؛ اُن اشعار کو یا اُس شعر کو اصولاً بہ طورِ سند قبول کیا ہی نہیں جا سکتا تھا، محض غلط فہمی کا کرشمہ تھا؛ لیکن اُس سے ایک غلط اندراج کا اضافہ ہو گیا اور بعد والوں کے لیے وہ ایک اختلافی مسئلہ بن گیا۔

اِس طرح کے الفاظ کا جائزہ، ایک دل چسپ اور مفید کام ہوگا اور اُس سے بعض غلط فہمیوں کے ازالے میں مدد ملے گی۔ ذیل میں ایسے چند الفاظ کو ضروری تفصیلات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اِس تحریر میں اِن الفاظ پر گفتگو کی گئی ہے، آب، اساد، الاپ، ایجاد، آغوش، املا۔

آب :

یہ لفظ حقیقی معنی کے لحاظ سے "پانی" کا مرادف ہے اور بالاتفاق مذکر ہے۔ مجازاً،

تاب اور آب داری کے معنوں میں بھی آتا ہے اور اِن معانی میں مونث ہے۔ اردو لغت میں بھی اِس کو اِن معانی میں مونث ہی لکھا گیا ہے؛ لیکن جلال نے اپنے رسالۂ تذکیر و تانیث[1] مفید الشعرا میں اِس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کیا ہے (اگرچہ مونث کو مرجح لکھا ہے) اور مذکر کی سند میں، آتش کا ایک شعر اور ایک مصرع، اور تجر[2] کا

[1] حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی، متوفی ۱۹۰۹ء (تذکرۂ کاملانِ رام پور) کا یہ قابلِ قدر رسالہ پہلی بار ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں شائع ہوا تھا۔ اُس وقت اِس کا نام کارآمدِ شعرا تھا۔ نظرِ ثانی کے بعد یہ مفید الشعرا کے نام سے شائع ہوا۔ اِس رسالے کے کچھ مندرجات سے اختلاف کیا گیا ہے، مگر اس کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے اور مستند سمجھا گیا ہے۔ جلال کے سب سے بڑے مخالف مولوی سید ظہیر احسن شوق نیموی نے، مختلف رسائلِ تذکیر و تانیث کا ذکر کرتے ہوئے، اِس رسالے کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے:

اِن میں مفید الشعرا، جناب جلال کی تالیفات سے ہے۔۔۔۔ یہ رسالہ باعتبارِ حجم اگرچہ چھوٹا ہے اور سند کے اشعار بھی بہت کم ہیں؛ مگر الفاظ اس میں سب رسالوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ چوں کہ اس کا مولف نامی اساتذۂ لکھنؤ سے ہے، اور زبانِ حال لکھی ہے؛ اگرچہ بعض جگہ بہ مقتضاے بشریت فاحش لغزش بھی ہے، مگر پھر بھی اِس کو ترجیح ہے، کیوں کہ دوسرے رسالوں کی بنا صرف تتبع پر ہے، زبانِ قدیم و جدید و شاذ وغیرہ کی کیفیت اُن سے ظاہر نہیں ہوتی۔ رشحاتِ صفیر میں اس کی کوشش کی گئی ہے؛ مگر وہ بات جو مفید الشعرا میں ہے، نہیں۔"

(حاشیۂ رسالۂ اصلاح، ص ۲۱)

[2] شیخ امداد علی تجر لکھنوی، تلمیذِ ناسخ (تذکرۂ نادر) "تحقیق الفاظ میں، رشک کے بعد ناسخ کے شاگردوں میں یہی ممتاز تھے" (آبِ بقا، ص ۱۴۲) ان کا مطبوعہ دیوان موجود ہے، جس کا نام ریاض البحر ہے۔ قواعدِ زبان و لغت پر مشتمل ایک رسالہ بھی مرتب کیا تھا جس کا مخطوطہ (اگلے صفحے پر:

ایک شعر پیش کیا ہے۔ جلاؔل کی تقلید میں، "رشحاتِ صفیر[1]" اور "ارمغانِ احباب[2]" میں بھی اِس لفظ کو مختلف فیہ لکھا گیا ہے، اور مذکر کی سند میں آتشؔ کا وہی شعر درج کیا گیا ہے، جس کو جلاؔل نے لکھا ہے ——— لیکن جلاؔل کا یہ فیصلہ محلِ نظر ہے۔ جلاؔل نے مذکر کی درج ذیل اسناد پیش کی ہیں:

کیا گھر کی قدر، جب آب گُہر جاتا رہا ‖ نشے ہی میں یا الٰہی سے کشوں کو موت دے[3]

(آتشؔ)

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے، اس کا نام بحر البیان ہے۔ کتابوں میں بحرؔ کا سالِ وفات ۱۳۰۳ھ لکھا ہوا ہے۔ غالباً سب سے پہلے صفیرؔ بلگرامی نے جلوۂ خضر میں اس سنہ کو لکھا تھا، بعد کو اسی کو نقل کیا جاتا رہا۔ امیرؔ مینائی کے ایک شاگرد (مولوی مہدی علی خاں ممتازؔ رام پوری) نے ایک مجموعۂ قطعاتِ تاریخ وفات مرتب کیا تھا جس کا مخطوطہ رضا لائبریری میں محفوظ ہے، اُس کا نام تاریخِ لطیف ہے: اُس میں امیرؔ کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ وفاتِ بحرؔ موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحرؔ کا انتقال ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں ہوا تھا۔ اُس قطعے کا شعرِ آخر یہ ہے:

"تا ختم فکر بہ تاریخ وفاتش چو امیرؔ ‖ گفت دل: "بحر بیک موج بگوہر برسید"

یہ واضح رہے کہ امیرؔ کا انتقال ۱۳۱۸ھ میں ہوا ہے۔

[1] سیّد فرزند احمد صفیرؔ بلگرامی، متوفی ۱۸۹۰ء (تلامذۂ غالب، ص ۱۹۴) کی معروف تالیف ہے۔ میرے سامنے اس کتاب کا وہ اڈیشن ہے جو صفیرؔ کی نظرِ ثانی کے بعد، مطبعِ احمدی (پٹنہ) سے شائع ہوا تھا۔

[2] مولّفہ منشی قادر علی صفی پوری، ملازم ریاست بھوپال۔ یہ رسالہ مطبعِ شاہ جہانی (بھوپال) میں ۱۸۹۱ء میں چھپا تھا۔ اچھا خاصا رسالہ ہے، البتہ تحقیق سے کم کام لیا گیا ہے۔

[3] کلیاتِ آتشؔ، طبع دوم، ص ۳۲۔ یہ کلیات "کارخانہ علی بخش خاں" (لکھنؤ) میں چھپا تھا۔ پہلا دیوان ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ میں اور دوسرا دیوان جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ میں مکمل ہوا تھا۔ صفحات کے نمبر مسلسل ہیں۔

ع : ڈوبوں گا میں، ڈبوئے گا آبِ گہر مجھے (آتشؔ)

جب سے کہ سمجھے زندگی، مرنا بہ شمشیرِ یار
اپنے حق میں آبِ حیواں، آبِ آہن ہو گیا
(بحرؔ)

اس سلسلے میں کئی باتیں قابلِ توجہ ہیں :

۱۔ "آب" بہ معنیِ تاب و آب داری مونث ہے، لیکن جب یہ مرکب ہو، جیسے : آبِ گہر، آبِ آہن، آبِ تیغ وغیرہ، اور اس کو مذکر استعمال کیا جائے؛ تو وہاں در حقیقت آبِ حقیقی سے استعارہ ہوتا ہے، لفظِ "آب" کے مجازی معنی (آب داری) مراد نہیں لیے جاتے۔ ایسے مقامات پر آبِ حقیقی کے لوازم مذکور ہوتے ہیں؛ اس لیے اُن مرکبات کو لازماً مذکر استعمال کیا جائے گا۔ اس سے مفرد لفظ "آب" (بہ معنیِ آب داری) کی تانیث پر کچھ اثر نہیں پڑے گا، جیسا کہ امیر مینائی نے لکھا ہے :

شعرا جب آبِ گہر یا آبِ تیغ کو مذکر باندھتے ہیں، تو وہ آبِ حقیقی سے استعارہ ہوتا ہے، اور لوازم آبِ حقیقی کے ثابت کرتے ہیں۔ جیسا کہ بحر کے اس شعر میں، گھٹنوں تک یا گلو تک ہونا، آبِ حقیقی کے لوازم سے ہے:۔

کوچے کٹواتے ہیں میرے، بازو پر ہے آبِ تیغ
آج گھٹنوں تک ہوا، کل تا گلو ہو جائے گا"

(امیر اللغات، جلد اوّل، ص ۱۲)

آتش کے مصرعے اور بحر کے شعر میں آبِ آہن اور آبِ گہر کی یہی صورت ہے کہ

لہ پورا شعر یوں ہے، جب دیکھتا ہے یار، تو ہے دانت پیستا ؛ ڈوبوں گا میں ڈبوئے گا آبِ گہر مجھے۔ (ایضاً ص ۱۷۲)

ٰلہ ریاض البحر، ص ۲۸۔

ٰلہ یا جیسے آتش کا یہ شعر : تشنگی کرتی جو محتاجِ دمِ خنجر مجھے ؛ آبِ آہن بشیر دایہ کی حلاوت مانگتا (کلیاتِ آتش، طبع دوم، ص ۷)

معمولِ شعرا کے مطابق، دونوں جگہ آبِ حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہے، اور آبِ حقیقی کے لوازم موجود ہیں؛ اِس لیے اِن دونوں مثالوں کو، مفرد لفظ "آب" (یعنی آبِ داری) کی تذکیر کی سند میں کسی طرح پیش نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ آتش کے شعر (نشّے ہی میں یا الٰہی ...) میں آبِ گہر ضرور اس طرح آیا ہے کہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں اُن سے تسامح ہوا، اور انھوں نے بے خیالی میں "آبِ گہر" کو اس طرح نظم کر دیا جیسے آبِ حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہو۔ حالاں کہ یہاں لفظ "آب" مجازی معنی میں آیا ہے۔ اِس خیال کی تائید کئی طرح ہوتی ہے:

(الف) آتش کے کلیات میں، زیرِ بحث شعر کے علاوہ، جہاں بھی یہ لفظ اس طرح آیا ہے، آبِ حقیقی کے لوازم کے ساتھ آیا ہے، مثلاً:

تیرے دانتوں کی نہ دانتوں میں صفائی ہوتی
کلیاں آبِ گہر کی بھی جو خوش رنگ کرتے

(کلیات، طبعِ دوم، ص ۲۲۱)

بھرا جاتا ہے جو پانی وہ صنم چاہِ زنخداں میں
ہمارے اشک کے قطرے ہیں حاضر آبِ گوہر سے

(" " " ص ۱۳۱)

روح کو تفریح اُن دانتوں کے دیکھے سے ہوئی
آبِ گوہر سے، ہرا دل کا صنوبر ہو گیا

(" " " ص ۹۲)

الٰہی! بازوِ قاتل میں زورِ دستِ قدرت دے
روانی ہے اسی کے دم سے آبِ خشکِ خنجر میں

(" " " ص ۱۲۹)

(ب) آتش نے مفرد لفظ "آب" کو مجازی معنی میں کہیں اور مذکر نظم نہیں کیا، البتہ ایک جگہ مونث ضرور لکھا ہے، شعر یہ ہے:

جلے برمۓ تن، اے کاش میں گردن رکھتا
آب، ابرو کے ہر اک بال میں، تلوار کی تھی

(" " ص ۱۸۴)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ آتشؔ درحقیقت اِس کی تانیث ہی کے قائل تھے۔

(ج) آتشؔ اور اُن کے تلامذہ کے یہاں (زیرِ بحث شعر سے قطعِ نظر) "آب گہر" (موتی کی آب کے معنی میں) کہیں مذکر نظم نہیں ہوا ہے، البتہ تانیث کی مثالیں مل سکتی ہیں، مثلاً:

چاہیے انسان کو بھی پاسِ حفظِ آبرو　　　یاد رکھیے، جا کے پھر آبِ گہر ملتی نہیں

رندؔ (دیوان مطبوعۂ نول کشور پریس، ص ۱۸۴)

(د) آتشؔ کے زیرِ بحث شعر کو، مفردِ لفظِ آب کی تذکیر کی سند کے طور پر جلالؔ اور اُن کی تقلید میں مولّفِ ارمغانِ احباب کے علاوہ، اور کسی نے تسلیم نہیں کیا؛ بل کہ اور لوگوں نے یہ صراحت کردی ہے کہ آتشؔ نے یہ خلافِ جمہور کہا ہے۔ صفیرؔ بلگرامی، جنھوں نے جلالؔ کی تحریر کے پیشِ نظر، اس لفظ کو مختلف فیہ لکھ دیا ہے، لکھتے ہیں:

"یا بعض الفاظ جن میں سب شعرا و فصحا متفق ہیں، مگر ایک دو شاعروں نے اُن کے خلاف باندھا؛ تو ہم کو جمہور کی تقلید کرنی ہوگی۔ جیسے "آبِ گہر" کہ جو قواعد کی رو سے بھی مونث ہے، اور فصحا کا برتاو بھی یہی ہے؛ اُس کو آتشؔ مذکر باندھ گئے ہیں۔" (رشحاتِ صفیر، ص ۳۹)

شوقؔ نیموی[1] نے رسالۂ اصلاح میں "آب" بہ معنیِ آب داری کو مونث لکھ کر، لکھا ہے:

---

[1] مولوی سیّد ظہور احسن شوقؔ نیموی، تلمیذِ شمشادؔ لکھنوی۔ اپنے زمانے کے معروف اہلِ علم میں تھے۔ جلالؔ پر بہت سے اعتراض کیے تھے اور اچھی خاصی معرکہ آرائی ہوئی تھی۔ اس کی کچھ تفصیل اُن کی کتاب یادگارِ وطن میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ متوفّی ۱۱ رمضان ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء)۔ "شوقِ سخنور" مادۂ تاریخ وفات ہے۔ اُن کی مثنوی سوز و گداز کے آخر میں قطعاتِ تاریخِ وفات بھی شامل ہیں۔ ایک قطعے میں اُن کی تصانیف کے نام بھی ہیں (مثنوی سوز و گداز، مطبوعۂ نظامی پریس پٹنہ)۔ اُن کا رسالہ اصلاح، اُس زمانے میں مقبول ہوا تھا۔ میرے سامنے وہ اڈیشن ہے جس کو (باقی اگلے صفحے پر)

"بعضوں نے جو اِس کو مذکّر استعمال کیا ہے، وہ جمہور شعرا کے خلاف ہے"۔ (ص ۲۱) یہ درحقیقت ایراد ہے جلال کے اُس قول پر کہ یہ لفظ مشترک الفاظ میں سے ہے ـــــ اِسی ذیل میں شوق نے مزید لکھا ہے: "ہاں جہاں پانی کی رعایت کی گئی ہو، وہاں مذکّر بھی استعمال کرنا درست ہے"۔ اور مثال میں ناسخ کا ایک مصرع اور بحر کا وہی شعر لکھا ہے جس کو جلال نے "آب" (بہ معنیِ آب داری) کی تذکیر کی سند میں پیش کیا ہے۔ یہ بھی درحقیقت ایراد ہے اس پر کہ جلال نے سند میں صحیح شعر پیش نہیں کیا، اور "لوازمِ آبِ حقیقی" والے نکتے تک اُن کی نظر نہیں پہنچی۔

مولفِ معین الشعرا[1] نے "آب" بہ معنیِ آب داری کو مونّث لکھ کر حاشیے میں لکھا ہے: "خلاف جمہور کے ایک جگہ آتش نے مذکر بھی لکھا ہے"۔

(۲) بحر کا جو شعر جلال نے مذکّر کی سند میں درج کیا ہے؛ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اُس کو لفظِ "آب" کی تذکیر کی سند میں نہیں پیش کیا جا سکتا، اور نہ جلال کے سوا کسی نے اُس کو پیش کیا ہے۔ اِس ضمن میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ بحر نے ہر جگہ "آب" بہ معنیِ آب داری کو مونّث ہی نظم کیا ہے۔ اُن کے دیوانِ مطبوعہ

(بقیۂ صفحۂ گذشتہ) مولانا حسرت موہانی نے، اردو پریس علی گڑھ سے شائع کیا تھا۔ یہ دراصل دو رسائل کا مجموعہ ہے: ایک فارسی رسالہ ازاحۃ الاغلاط، جو لغت کے موضوع پر ہے، اور دوسرا اصلاح، جس میں مختلف قواعدِ زبان و شاعری جمع کیے گئے ہیں۔ اِس رسالے کے حواشی کا نام انھوں نے ایضاح رکھا تھا، یہ گویا ایک ضمنی رسالہ ہوا۔ کارآمد رسالہ ہے۔

[1] مولفہ منشی غلام حسین آفاق بنارسی، شاگردِ جلیل مانک پوری، متوفی ۹ را کتوبر ۱۹۳۳ء (مقدمۂ معین الشعرا)۔ تذکیر و تانیث کے موضوع پر غالباً سب سے ضخیم تالیف ہے، بل کہ اچھا خاصا لغت ہے۔ اسناد کے ساتھ، ہر لفظ کے اعداد بھی لکھ دیے ہیں۔ یہ کتاب مولف کے انتقال کے بعد، صدیق بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ سالِ طبع درج نہیں، سنہ تکمیلِ تالیف ۱۳۵۲ھ (۳۴-۱۹۳۳ء) ہے۔ اچھی خاصی کتاب ہے۔

میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جس میں یہ لفظ بہ تذکیر آیا ہو۔ بہ طورِ مثال، موٴنث کی چند اسناد اُن کے دیوان سے نقل کی جاتی ہیں:

جواب آئنے کی جائے، ہم مکدّر ہوں
وہ کون ہیں، جو کسی کی ہیں آبرو لیتے
(ریاض البحر، ص ۲۰۰)

مٹائی موتیوں کی آب اُس کے دانتوں نے
اڑا دیا لبِ رنگیں نے رنگ لالوں کا
(ریاض البحر، ص ۱۴)

گردونِ دوں کے در پئے، زندوا پیو پیا پئے
پھر ایک قطرۂ مئے، موتی کی آب ہو گا
(ریاض البحر، ص ۲۰)

نیز بحرؔ کے دیوان میں "آبِ گہر" یا اِس نوع کا کوئی مرکّب، جس میں آب حقیقی سے استعارہ نہ ہو، بل کہ آب داری کے معنی مراد ہوں؛ مذکّر نظم نہیں ہوا ہے۔

(د) اردو کے کسی لغت نگار نے لفظ "آب" بہ معنیِ آب داری کو مذکّر نہیں لکھا، سب نے صرف موٴنث لکھا ہے۔ نیز آبِ گہر، آبِ آہن، آبِ تیغ جیسے مرکّبات کو، جن میں آب داری کے معنی ہوں، صرف موٴنث لکھا ہے۔ اِسی طرح، جن رسائلِ تذکیر و تانیث کا ذکر آچکا ہے، اُن کے علاوہ دوسرے قابلِ ذکر رسائل میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے، مثلاً: رسالۂ بسیط[۱۵] اور رسالۂ جلیل[۱۶]۔

---

[۱۵] یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا مخطوطہ رضا لائبریری (رام پور) میں ہے۔ موٴلفہ: آغا محسن علی عرف آغا جو بنددی لکھنوی، ابنِ محمد علی خاں، ابنِ نواب شجاع الدولہ (تذکرۂ انتخابِ یادگار)۔ یہ دربارِ رام پور سے متعلق تھے۔ یہ مخطوطہ، فہرستِ کتب خانہ کی صراحت کے بہ موجب، موٴلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں الفاظ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: مذکّر، موٴنث، مشترک۔ مشترک الفاظ میں اس کی بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ موٴلف کی رائے میں ترجیح کسے ہے۔ رسالے کا سالِ اتمام سنہ ۱۲۹۳ھ ہے۔ موٴلف کی شخصیت کے لحاظ سے بھی یہ رسالہ قابلِ ذکر ہے۔ سنہ ۱۳۰۰ھ (۸۳-۱۸۸۲ء) میں انتقال ہوا (تاریخِ لطیف) (باقی اگلے صفحے پر)

مختصر یہ کہ مفرد لفظ "آب" بہ معنیِ تاب و آب داری متفق علیہ موٴنث ہے۔ اِس کے مرکبات، جن میں آبِ حقیقی سے استعارہ ہو، مذکر آتے ہیں۔ جن میں آب داری کا مفہوم ہو، وہ موٴنث آتے ہیں۔ آتش کے اُس ایک شعر کی حیثیت شاذ کی ہے، یہ آتش کا تسامح ہے؛ اِس لیے اُس شعر کی بنا پر اس کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ جلال نے آتش کے جس مصرعے، اور بحر کے شعر کو، تذکیر کی سند میں پیش کیا ہے؛ اُن دونوں میں، ایسے دوسرے اشعار کی طرح، آبِ حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہے؛ اِس لیے اُن کو "آب" بہ معنیِ آب داری کی بحث میں پیش ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جلال کا تسامح ہے۔

صاد :

عربی کے حروفِ تہجی میں چودھواں حرف ہے، آنکھوں کو بھی اِس سے تشبیہ دیتے ہیں، صحیح یا منظور ہونے کی علامت بھی ہے؛ اِن سب معانی میں اِس کو مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ اسناد لغات میں موجود ہیں۔ لیکن ایک غلط فہمی کی بنا پر اس کو بھی مشترک الفاظ میں شامل کر لیا گیا۔ معلوم نہیں اِس غلط فہمی کا آغاز کس طرح ہوا، البتہ یہ معلوم ہے کہ بیش تر اربابِ لغت و رسائل اِس میں مبتلا ہوئے۔ ایک ایسے شعر سے اِس کی تانیث پر استدلال کیا گیا، جس کو تانیث کی سند میں پیش کیا ہی نہیں جا سکتا تھا؛ مگر نقلِ قول کو کیا کہا جائے کہ رفتہ رفتہ اِس کا مختلف فیہ ہونا مسلّم ہو گیا۔

جلال نے مفید الشعرا میں اِس کو صرف مذکر لکھا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے، مگر مولفِ آصفیہ نے اِس کو "اسم مذکر و موٴنث" لکھ کر، مثال میں مثنوی گلزارِ نسیم کا یہ شعر لکھا ہے:

"صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی   بینائی کے چہرے پر نظر کی"

لہ حافظ جلیل حسن جلیل، مانک پوری (تلمیذ و جانشینِ امیر مینائی) کی تالیف۔ اِس کا نام رسالۂ تذکیر و تانیث ہے۔ سالِ ترتیب ۱۳۲۲ھ [illegible] ہے۔ اخبار دکن پریس حیدرآباد میں چھپا تھا۔

اور اس شعر کے نیچے مزید صراحت کی ہے کہ "تانیث کی مثال بھی اِس شعر سے ثابت ہے"۔

نور اللغات، رشحات اور ارمغانِ احباب میں بھی نسیم کے اِسی ایک شعر کو تانیث کی سند میں لکھا گیا ہے۔ اِس طرح "صاد" بھی مختلف فیہ الفاظ میں شامل ہو گیا، حالاں کہ نسیم کے اِس شعر سے تانیث ثابت نہیں ہوتی۔ اثباتِ تانیث کے لیے یہ ضروری ہے کہ مصرعِ اوّل کو یوں لکھا جائے: "صاد آنکھوں کی دیکھ کر لپ کی"؛ لیکن یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس مصرعے میں "آنکھوں کی" کے بجائے "آنکھوں کے" نہیں ہے؟

اب سے پہلے یائے معروف و مجہول کی کتابت میں امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا؛ اِسی لیے اُس زمانے کی کسی تحریر میں اگر کوئی لفظ بہ یائے معروف یا بہ یائے مجہول لکھا ہوا ہو، یا چھپا ہوا ہو؛ تو اُس کتابت کی بنا پر، اُس لفظ کی تذکیر یا تانیث کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ایسے کسی شعر کو سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، اور یہ مسلّمہ قاعدہ ہے۔ مثنوی گلزارِ نسیم کا پہلا اڈیشن ۱۲۶۰ھ میں، مطبعِ حسنی میر حسن رضوی[لے] سے شائع ہوا تھا۔ اُس میں، اُس زمانے کے رواج کے مطابق، یائے معروف و مجہول کا امتیاز نہیں ہے؛ یہ مصرع اُس میں اِس طرح چھپا ہوا ہے: "صاد آنکھوں کی دیکھ کر لپ کی"۔ لطیفہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۵ء میں چکبست نے اِس مثنوی کا جو اڈیشن چھاپا، اُس میں بھی "صاد آنکھوں کی" ہے۔ جن لوگوں نے پہلے اڈیشن کو یا نسخۂ چکبست کو دیکھا اور اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ یہاں "کی" یا "کے" میں سے کیا مرجّح ہو سکتا ہے؛ یا یہ کہ "کی" ہو یا "کے"، اس سے نہ تانیث پر استدلال کیا جا سکتا ہے نہ تذکیر پر؛ اُنھوں نے "صاد آنکھوں کی" پڑھا اور اس کتابت کی بنیاد پر یہ فرض کر لیا کہ نسیم نے اِس کو مونث نظم کیا ہے۔

[لے] یہ دونوں اڈیشن اب کم یاب ہیں۔ رضا لائبریری رام پور میں یہ دونوں اڈیشن موجود ہیں؛ اور میں نے انھی سے استفادہ کیا ہے۔

شروع میں ایک لغت نویس نے اِس غیر صحیح بات کو لکھا ؛ دوسروں کے لیے محض اُس لغت نویس کا لکھنا آیت و حدیث ہوگیا۔

مجھے ... اِس پر ہے کہ صفیر بلگرامی نے رشحات میں اِس شعر کو تانیث کی سند میں کیسے قبول کر لیا اور اس طرح اِس کو بھی مشترک الفاظ میں شامل کر دیا ؛ جب کہ انھوں نے اپنی اس کتاب میں کئی جگہ یہ صراحت کی ہے کہ جن اشعار میں غلط الکاتب کا احتمال ہو، یا محض "کی" یا "کے" پر سند کا انحصار ہو، تو ایسی اسناد کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں، انھوں نے دوسروں پر اس سلسلے میں اعتراض بھی کیا ہے۔ مثلاً جلاؔل نے مفید الشعرا میں لفظ "مشتری" کی تانیث کی سند میں یہ دو شعر لکھے ہیں :

نقدِ جاں لائی ہے، تالے مول نور اُس ماہ سے مشتری رکھا ہے نام اپنے لیے برجیس کا
(ناسخ)

تیرا غلام کچھ مہِ کنعاں فقط نہیں کہتی ہے مشتری بھی، میں تیری خرید ہوں
(ناسخ)

صفیر نے اِن اسناد پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے :

"مؤلف کہتا ہے کہ کارآمد شعرا کی ان مثالوں سے مؤنث ہونا کچھ ضرور نہیں کہ ثابت ہو، کیوں کہ کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی نقدِ جاں لایا ہے" اور "کہتا ہے مشتری" بھی کہہ سکتے ہیں۔" (رشحاتِ صفیر، ص ۶۷)

جلاؔل نے "طوطی" کی تانیث کی سند میں رشک کا یہ شعر بھی لکھا ہے :

طوطیِ سبزۂ خط صاف یہی کہتی ہے ہیں وہی عارضِ آئینۂ جاناں اب تک

صفیر نے اِس پر بھی یہی اعتراض کیا ہے :

"اور رشک کے شعر کی جو سند دی گئی، اس کو ماننا مشکل ہے، کیوں کہ "طوطیِ سبزۂ خط صاف یہی کہتا ہے" بھی ہو سکتا ہے۔ از روے غلطیِ کتابت، یہ مثال کافی نہیں۔ حضرت جلاؔل ایسی ہی مثالیں دیا کرتے ہیں۔" (رشحاتِ صفیر، ص ۶۸)

ایک طرف تو یہ احتیاط کہ افعال میں بھی غلطیِ کتابت کے احتمال کی بنا پر، سند کو قبول نہ کرنا؛ اور دوسری طرف یہ صورت کہ جس سند کی بنا محض "ی" کی "اور" "ے" کے قدیم اندازِ کتابت پر ہے، اُس کو بے تکلف قبول کرلیا!!

بہرصورت، "صاد" مذکر ہے۔ جن لوگوں نے گلزارِ نسیم کے زیرِ بحث شعر کی بنا پر اِس کو مونث فرض کرکے، اِس کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کردیا؛ اُن سے غلطی ہوئی۔ اِس شعر میں "صاد آنکھوں کے" پڑھا جائے گا، کیوں کہ یہ مذکر ہے اور اب تک اِس کی تانیث کی کوئی قابلِ قبول سند نہیں ملی ہے۔ بالفرض، کوئی صاحب اِس قرائت کو مرجح نہ مانیں؛ تب بھی اصولاً اِس شعر کو تانیث کی سند میں نہیں پیش کیا جاسکتا۔ اور جب تک تانیث کی کوئی مثال نہ ملے، اُس وقت تک اِس کو مختلف فیہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔

الاپ:

جلال نے مفید الشعرا میں "الاپ" کو مشترک الفاظ میں شامل کیا ہے، مگر یہ صراحت نہیں کی کہ ترجیح کسے ہے۔ البتہ آغا تجو ہندی نے رسالۂ بسیط میں مذکر کو مرجح لکھا ہے۔ جلال نے مذکر کی سند میں ایک شعر لکھا ہے، اور مونث کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی سند کلامِ اساتذہ میں نہیں ملی۔ اُن کی عبارت یہ ہے:

"الاپ، مختلف فیہ ہے۔ مذکر و مونث دونوں طرح بولا جاتا ہے، چناں چہ قدرت نے مذکر کہا ہے:

ایک ہی پردے کے، تم سمجھو، تو ہیں یہ سب الاپ
گر صدائے بانگ ہے، در نغمۂ ناقوس ہے

اور مونث کی کوئی مثال مولّف کو کلامِ اساتذہ میں ملی نہیں، اِلّا یاد پڑتا ہے کہ مونث بھی بولا گیا ہے۔" (مفید الشعرا)

جلال نے مذکر کی سند میں جو شعر درج کیا ہے، وہ شاہ قدرت اللہ قدرت کا ہے۔

تذکرۂ میر حسن، تذکرۂ ہندی اور سخنِ شعرا میں یہ انھی کے نام سے ملتا ہے۔ یہ اُن کی مشہور غزل کا شعر ہے، جس میں وہ معروف قطعہ بھی شامل ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے — کیا ہی ملکِ عدم ہے، کیا سرزمین روس ہے

مگر اصولاً قدرت کے اس شعر کو تذکیر کی سند میں پیش نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ تذکیر کا انحصار "کے" پر ہے، اور یہاں "کی" بھی ہو سکتا۔ یہ بات پہلے لکھی جاچکی ہے کہ ایسے اشعار کو سند کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا جن میں "کی" یا "کے" پر سند کا انحصار ہو۔ جن تذکروں کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، اُن میں اس شعر کے متن کی صورت یہ ہے:

ایک ہی پردے کی گر سمجھو تو ہے یہ سب الاپ — گر صدائے بانگ ہے، در نغمۂ ناقوس ہے

(تذکرۂ میر حسن)

ایک ہی پردے کے یہ سب سمجھیے تو ہیں الاپ — گر صدائے بانگ ہے، در نغمۂ ناقوس ہے

(تذکرۂ ہندی)

ایک ہی پردے کی گر سمجھو تو یہ ہیں سب الاپ — گر صدائے چنگ ہے، یا نغمۂ ناقوس ہے

(سخنِ شعرا)

تذکرۂ میر حسن کے مطبوعہ نسخے کے ساتھ ساتھ، اُس کا ایک خطی نسخہ مخزونۂ رضا لائبریری رام پور بھی پیشِ نظر ہے؛ دونوں میں اِس شعر کا متن یک ساں ہے، اور اِس طرح یہ شعر تانیث کی گواہی دے سکتا ہے۔ مگر جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے، اِس شعر کو (اور اس قبیل کے اور اشعار کو بھی)، نہ تانیث کی سند کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، نہ اس سے تذکیر کا استناد کیا جاسکتا ہے۔

اب صورت یہ ہے کہ مفید الشعرا، رسالۂ بسیط اور رشحاتِ صفیر میں اس کو مختلف فیہ لکھا گیا ہے۔ جلال نے مذکر کی سند میں قدرت کا جو شعر درج کیا ہے، وہی رشحات میں بھی منقول ہے۔ گویا مذکر کی سند میں صرف ایک شعر پیش کیا گیا ہے، اور وہ شعر ایسا ہے جس کو

از روے قاعدہ، بہ طورِ سند پیش نہیں کیا جا سکتا۔

آصفیہ، نور، امیر اللغات، رسالۂ جلیل اور معین الشعرا میں اِس لفظ کو صرف مؤنث لکھا گیا ہے۔ نور میں تانیث کی سند میں واجد علی شاہ اختر کا یہ شعر لکھا ہوا ہے :

"طبلوں پہ لگیں وہ پڑنے تھاپیں
پہنچیں گر دوں پہ وہ الاپیں"

یہی شعر معین الشعرا میں منقول ہے۔ آصفیہ میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا یہ شعر، تانیث کی سند میں لکھا گیا ہے :

"وہ رقصِ بُتاں، اور وہ ستھری الاپ
وہ گوری کی تانیں، وہ طبلوں کی تھاپ"

یہی شعر امیر اللغات میں ہے۔ صاحبِ بہارِ ہند[1] نے بھی، تذکیر و تانیث کی صراحت کے بغیر، اسی شعر کو درج کیا ہے۔ لیکن قدرت کے اُس شعر کی طرح میر حسن کے اِس شعر کو بھی سند کے طور پر نہیں پیش کیا جا سکتا؛ "ستھرے الاپ" بھی ہو سکتا ہے۔ اختر کے شعر سے تانیث ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ میں فی الوقت یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ یہ شعر اُن کی کس مثنوی کا ہے، اور یہ کہ اصلاً اِسی طرح ہے۔ اگر اس شعر کا متن صحیح ہے اور یہ اختر کا ہے، تو اثباتِ تانیث کے کام آسکتا ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اس سند سے، یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ یہ لفظ صرف مؤنث ہے۔ جیسے رشک کے اس شعر سے :

---

[1] مولف مرزا محمد مرتضا، عرف مچھو بیگ عاشق لکھنوی۔ اودھ پنچ میں "ستم ظریف" کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ یہ لغت جون ۱۹۰۵ء میں مطبعِ شوکتِ جعفری لکھنؤ میں چھپا تھا۔ مولف کی صراحت کے مطابق، اس کو چار جلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ تھا، لیکن صرف حصۂ اوّل چھپ سکا۔ یہ حصہ، صرف حرفِ الف پر مشتمل ہے۔ مولف، لکھنؤ کے ارباب اعتبار میں سے تھے؛ اگر یہ لغت مکمل ہو جاتا تو بہت مفید ہوتا، بہ قولِ چکبست، "لکھنؤ کی زبان اور محاوروں کی جتنی تحقیق مرزا سے مرحوم کو تھی، اس کا اندازہ، ان کی مشہور تالیف بہارِ ہند کے دیکھنے سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ملک نے اس لغت کی کافی قدر نہ کی، ورنہ اگر اس کے باقی تین حصے بھی چھپ جاتے تو اردو زبان کی اصطلاحوں اور محاوروں کا ایک لاجواب مجموعہ مرتب ہو جاتا۔" (مضامینِ چکبست، ص ۲۴۵)

فسانہ میرے عشق کا، ہے جا بہ جا غلط   لفظیں غلط، حروف غلط، مدعا غلط

(مجموعۂ دواوینِ رنگ، ص ۵۵)

یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ لفظ "صرف مونث" ہے۔

ہندی کے متعدد اساتذہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سنسکرت اور ہندی میں "الاپ" مذکر ہے۔ لغات میں بھی صرف مذکر لکھا ہوا ہے، ملاحظہ ہو۔

ہندی شبد ساگر (شائع کردہ ناگری پرچارنی سبھا)، برہت ہندی کوش (شائع کردہ گیان منڈل بنارس)، سنسکرت شبدارتھ کوستبھ (مرتبہ دوارکا پرشاد شرما)

یہ لفظ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے؛ اِس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اِس فن سے تعلق رکھنے والے حضرات سے استصواب کیا جائے۔ اِس سلسلے میں، میں نے شاہد احمد دہلوی (مرحوم) سے رجوع کیا تھا۔ مرحوم اس فن کے جاننے والوں میں تھے۔ اُن کے مکتوب کا اقتباس درجِ ذیل ہے:

"پیشہ وروں کی زبان پر "الاپ" مذکر ہے اور کتابوں میں بھی؛ اِس لیے میں بھی مذکر ہی بولتا ہوں۔"

(۱) معارف النغمات مصنفہ ٹھاکر نواب علی خاں، جو اردو کی واحد مستند کتاب ہے، اس میں بھی ص ۱۱ پر یہ عبارت درج ہے: "آج کل الاپ بھی، دھرپد کی طرح، چار حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔"

(۲) آجکل کے موسیقی نمبر مطبوعہ اگست ۱۹۵۵ء کے ص ۸۶، کالم ۱، سطر ۸ میں کہا گیا ہے کہ: "دھرپد کا الاپ یا بین کار کا جوڑ وہ ماحول پیدا کرتا ہے جو دوسری گائیکیوں یا باج نے ابھی تک پیدا نہیں کیا ہے۔" مضمون نگار ہیں استاد رحیم اللہ خاں ڈاگر، جن کا کام ہی الاپ کرنا اور دھرپد گانا ہے۔

(۲) کتاب اسرارِ کرامت، عرف نغماتِ محبت، مطبوعہ ۱۹۰۸ء، ص ۸، ص ۹: "ہر راگ کے الاپ کے واسطے تین نے مقرر کی گئی ہیں۔" یہ کتاب نعمت اللہ خاں نے لکھی تھی اور اس کی تکمیل ان کے بیٹے کرامت اللہ خاں نے کی تھی۔ نعمت اللہ خاں، دربارِ نیپال کے گایک تھے۔

"الاپ تمذکر ہی بولا جاتا ہے، مگر غیر پیشہ وروں سے مونث بھی سنا ہے۔ لغت میں شاید اسی وجہ سے دونوں طرح درج کر دیا گیا ہو۔"

اس عبارت سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ اس تخصیص کے ساتھ کہ فنِ موسیقی سے تعلق رکھنے والے عام طور پر اس کو مذکر استعمال کرتے رہے ہیں (اور غالباً یہ ہندی کا اثر ہے)۔ دوسرے لوگ مونث کہتے رہے ہیں، اور اسی لیے اکثر اربابِ لغت نے اس کو صرف مونث لکھا ہے۔ مولانا حالی کے کلام میں ایک جگہ یہ لفظ بہ تانیث نظم ہوا ہے، اور ایک جگہ اس کی جمع "الاپیں" آئی ہے۔ شعر یہ ہیں:

کان کو اپنی ہی بھاتی تھی الاپ سر دُھنا کرتے تھے ہم آپ ہی آپ

(نظم "تعصب و انصاف" مجموعۂ نظمِ حالی، ص ۵۸)

الاپیں مطربوں کی جب سنیں، چپ لگ گئی سب کو بہت تھا مرغانِ چمن کو خوش نوائی کا

(جواہراتِ حالی، ص ۱۱۶)

اِن دو مثالوں سے اس قیاس کی مکمل طور پر تائید ہوتی ہے کہ فنِ موسیقی سے متعلق اصحاب کے علاوہ، شعرا نے اس کو بہ تانیث استعمال کیا ہے۔ واجد علی شاہ اختر کا ایک شعر پہلے آچکا ہے، اور اس طرح اِس کی تانیث کا ثبوت مکمل ہوجاتا ہے۔ حالی و اختر کا استعمال، تانیث کی ترجیح کے لیے کافی ہے، تاوقتیکہ دوسرے شعرا کے یہاں مذکر کی مثالیں نہ ملیں، اِس لفظ کی تانیث مرجح رہے گی۔

اختر اور حالی کے اشعار کے بعد، سروشِ سخن کی اس عبارت کو بھی، تائیدِ محض کی حد

قبول کیا جاسکتا ہے: "شہانے میں کانڑے کی الاپ، گھنگروؤں کی صدا، طبلے کی تھاپ۔"
(سروشِ سخن، طبعِ پانزدہم، نول کشور پریس، ص ۱۵)

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ یہ لفظ واقعتاً مختلف فیہ ہے، مگر اس تفصیل کے ساتھ کہ فنِ موسیقی سے تعلق رکھنے والے، اِس لفظ کو، اصل کی رعایت سے، مذکر استعمال کرتے ہیں، اور شعرا نے اِس کو مونث باندھا ہے۔ اب نثر و نظم میں تو استعمالِ شعرا کی پیروی کی جائے گی، فنِ موسیقی کی تصانیف اور تحریروں میں اِس کو مذکر لایا جاسکتا ہے، اور اِس فن کی پُرانی تصانیف میں اِس کو مذکر ہی مانا جائے گا۔

اصل بحث کے بعد، ایک ضمنی بات کہنا ہے:

مولفِ آصفیہ نے "آلاپ" (بہ الفِ ممدودہ) لکھا ہے، اور اُس کے آگے "عوام (الاپ)" لکھا ہے۔ اِس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں پر مولف نے فیلن کی تقلید کی ہے۔ فیلن کے لغت میں بھی یہی صورت ہے کہ اُس میں اصل لفظ "آلاپ" ہے۔ سنسکرت میں یہ "آلاپ" ہے، بہ الفِ ممدودہ (سنسکرت انگلش ڈکشنری، مولفہ وی۔ ایس۔ آپٹے)۔ ہندی میں "آلاپ" اور "الاپ" دونوں صورتیں ہیں (ہندی شبد ساگر)؛ اور اردو میں صرف "الاپ" ہے۔ نور میں صحیح طور پر اِس کو "الاپ" لکھ کر، قوسین میں نشان دہی کی گئی ہے کہ ہندی اور سنسکرت میں "آلاپ" ہے۔

ایجاد:

اِس لفظ کی داستان خاصی دل چسپ ہے۔ اساتذۂ دہلی و لکھنؤ نے بالعموم (اور بالاتفاق) اِس لفظ کو مذکر استعمال کیا ہے؛ لیکن متعدد تصریحات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اِس کی تذکیر و تانیث کسی نہ کسی حد تک معرضِ بحث میں رہی ہے، اگرچہ تانیث کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکی ہے۔ شاید اِس کی وجہ یہ ہو کہ دِکّھو لوگوں کی بول چال میں بہ تانیث آجاتا ہوگا؛ چوں کہ جملہ اساتذہ اِس کو مذکر مانتے رہے ہیں، اِس لیے بہ تانیث

نظم کرنے کی جرات نہیں کی جاسکی ۔ پھر یہ ہوا کہ جس لفظ کو دونوں دبستانوں کے اساتذہ متفقہ طور پر مذکر مانتے آئے تھے؛ رفتہ رفتہ اُس کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا، یہاں تک کہ آج کل عام طور پر اس کو مونث استعمال کیا جاتا ہے۔

مفید الشعرا، ارمغانِ احباب، امیر اللغات، اور آصفیہ میں اِس کو صرف مذکر لکھا گیا ہے اور اختلاف کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ صفیر نے بھی رشحات میں اِس کو مذکر ہی لکھا ہے، اور اِس صراحت کے ساتھ کہ: "مولف کہتا ہے کہ "ایجاد" جو مونث مشہور ہے، اس کی سند مجھے ابھی تک نہیں ملی" (ص ۱۵۱)۔ اِسی کتاب میں انھوں نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ: "عوام میں "ایجاد" کا لفظ مونث مستعمل ہے، حالاں کہ مذکر ہے" (ص ۲۲۴)۔ نور میں بھی اِس کو مذکر لکھا گیا ہے، مگر اس صراحت کے ساتھ: "بعض حضرات کی زبان پر یہ لفظ مونث ہی ہے"۔ مطلب یہ نکلا کہ تانیث کا گزر محض گفتگو تک تھا، خواص اس کو مذکر ہی مانتے تھے اور نظم میں مذکر ہی لایا جاتا تھا؛ یہی وجہ ہے کہ اس کی تانیث کی کوئی سند پیش نہیں کی جاسکی، اور صفیر کو یہ لکھنا پڑا کہ: "ایجاد جو مونث مشہور ہے، اُس کی سند مجھے ابھی تک نہیں ملی"۔

مولفِ معین الشعرا نے "ایجاد" کو مذکر لکھ کر حاشیے میں یہ بھی لکھا ہے کہ منشی امیر اللہ تسلیم نے اِسے مونث بھی نظم کیا ہے، اور سند میں تسلیم کا یہ شعر لکھا ہے:

"رشکِ اعدا سے کیا تسلیم خستہ کو شہید دیکھیے ایجاد اُس ترکِ ستم ایجاد کی"

لیکن مولف کا یہ خیال صحیح نہیں۔ مخدومی مولانا امتیاز علی عرشی (زاد مجدہ) کے خط سے معلوم ہوا کہ اس غزل کی ردیف "کی" کے بجائے "کا" ہے، یعنی دوسرا مصرع یوں ہے: "دیکھیے ایجاد اس ترکِ ستم ایجاد کا"۔ یہ غزل اُن کے دیوان موسوم بہ نظمِ دل افروز میں ص ۳۰۹ پر ہے۔ اِس طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ اِس لفظ کی تانیث کی کوئی سند نہیں ملی تھی۔

امیر مینائی نے امیر اللغات میں تو اختلاف کی طرف اشارہ نہیں کیا، البتہ ایک خط میں اِس کا ذکر کیا ہے:

"ایجاد" مذکر ہے۔ اِس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے... سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغ کا قول ہے کہ دلّی میں مونث ہے، مگر کلام میں مونث کا پتا نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مونث کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے۔ اور بغیر کلام میں آئے ہوئے کہیں کہیں بول چال میں ہونا، کافی نہیں۔" (مکاتیبِ امیر مینائی، طبع دوم ص ۱۴۲)

امیر نے اور جو کچھ لکھا ہے، وہ سب صحیح ہے، مگر انھوں نے داغ سے جس قول کو منسوب کیا ہے، وہ قطعاً درست نہیں۔ یہ روایت بالکل غلط ہے کہ داغ اِس لفظ کو مونث کہتے تھے۔ بصورتِ حال اِس کے برعکس ہے۔ داغ کے کسی شاگرد نے اپنی غزل میں "ایجاد" کو مونث لکھ دیا، اور وہ غزل چھپ بھی گئی؛ اس پر داغ نے برہمی کے عالم میں؛ مولانا احسن مارہروی کو لکھا تھا:

"ایک اشتہار اس گل دستے میں آپ چھاپ دیجیے۔ اکثر استاد کے شاگرد بجائے خود استاد بن کر، اپنی غزلیں بے اصلاح چھپوا دیتے ہیں، اس میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کسی شخص نے لفظ "ایجاد" اور "ارشاد" کو مونث باندھا، حالاں کہ اہلِ دہلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکر ہیں۔" (انشائے داغ، ص ۱۴۳)

اِسی سلسلے میں، مولانا احسن مارہروی نے، داغ کے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا:

"میری غزل میں "ایجاد" کہیں مونث نہیں ہے، اور نہ میں نے لکھا: غالباً حضور نے ملاحظہ نہیں فرمایا۔ میاں احسن شاہ جہاں پوری نے مونث لکھا ہے، جس کی اگلے پرچے میں صحت ہو جائے گی۔ مولوی عبدالحی بیخود نے "ایجاد" کو مونث

لکھا ہے۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ ایسے کہنہ مشق بھی ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں۔" (انشائے داغ، ص ۱۳۶)

مختصر یہ کہ بعض لوگوں" کے علاوہ، دہلی و لکھنؤ کے مستندین اس لفظ کو بالاتفاق مذکر مانتے رہے ہیں، مگر رفتہ رفتہ اس لفظ کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔ مولانا احسن مارہروی کے خط کا اقتباس اوپر پیش کیا گیا ہے، جس میں انھوں نے اس لفظ کو مؤنث نظم کرنے کو "فاش غلطی" بتایا ہے، اور اپنی طرف سے اُستاد (داغ) کو یقین دلایا ہے کہ مجھ سے یہ غلطی نہیں ہوئی؛ یہی مولانا احسن، ایک زمانے کے بعد، اپنی کتاب "تاریخ نثرِ اردو" میں لکھتے ہیں:

"لفظ "ایجاد" کہ اس کو تمام یا بہ کثرت شعرائے دہلی و لکھنؤ نے مذکر استعمال کیا ہے، لیکن اب چند شعرا کے سوا، اس کی تذکیر پر ہر شخص کو تامل ہے۔ یہی حال لفظ "فہم" وغیرہ کا ہے۔" (تاریخ نثرِ اردو، ص ۳۵۸)

آج کل عام طور پر یہ لفظ بہ تانیث سننے اور دیکھنے میں آتا ہے۔ جیسے: امریکہ کی ایک نئی ایجاد۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ: امریکہ کا ایک نیا ایجاد۔ یا جیسے: "زبانوں کا سیکھنا سکھانا، انسٹا جدید زمانے کی ایجاد ہے"۔ مولوی عبدالحق صاحب (قواعدِ اردو، ص ۳) حضرت اثر لکھنوی نے میرے استفسار کے جواب میں لکھا تھا: "ایجاد اور اپیل، میری زبان پر مؤنث ہیں، مگر اس کے برخلاف بھی سنا ہے۔ تذکیر و تانیث کے لحاظ سے مختلف فیہ کہنا مناسب ہوگا۔" (مکتوب بنام راقم الحروف)۔

مناسب یہ ہے کہ فی الحال اس لفظ کو مختلف فیہ مان لیا جائے، اس صراحت کے ساتھ کہ اب عام طور پر بہ تانیث استعمال میں آتا ہے۔ کثرتِ استعمال کو دیکھتے ہوئے کہا

لے اگرچہ اب سے پہلے اسی طرح لکھا جاتا تھا، جیسے: "چونکہ پہلا ایجاد تھا، اس لیے تعریف کی آوازیں دور تک پہنچیں"۔ محمد حسین آزاد (آبِ حیات، ترجمہ میر خلیق)

جا سکتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد استعمالِ عام میں صرف مونث مانا جائے گا۔

ہاں، یہ بات لکھنے سے رہ گئی کہ اس سے پہلے امیر خود امیر اللغات (جلد دوم، ص ۴۹) میں داغ کا یہ شعر "ایجاد" کی تذکیر کی سند کے طور پر لکھ چکے تھے:

"ایجادِ ستم سے ہمیں برباد کریں گے   گر تمیس دن ایسے ہی وہ ایجاد کریں گے"

یہ شعر گلزارِ داغ میں ہے (ص ۲۲۶)۔ اس کے بعد، داغ کے متعلق امیر کو یہ بدگمانی ہونا نہیں چاہیے تھی کہ وہ "ایجاد" کو مونث کہتے ہوں گے، یا یہ کہتے ہوں گے کہ دلی میں مونث ہے۔

آغوش:

جلال نے مفید الشعرا میں لکھا ہے: "آغوش، بعضوں کے عندیے میں، گود کے معنی پر، مونث ہے، حالاں کہ بہ قیدِ نظم مذکر پایا جاتا ہے"۔ انھوں نے مذکر کی سند میں آتش و رند کا ایک ایک شعر پیش کیا ہے۔

جلال کی عبارت سے صحیح صورتِ حال سامنے نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اساتذۂ دہلی نے اِس لفظ کو مونث مانا ہے، اور اساتذۂ لکھنؤ نے مذکر کہا ہے۔ اساتذۂ لکھنؤ میں سے صرف میر علی اوسط رشک کا ایک شعر عام طور پر تانیث کی سند میں پیش کیا گیا ہے، شعر یہ ہے:

شبِ فرقت کی آمد پا کے، آغوشِ لحد پھیلی
قضا کی مہربانی ہے، اجل سرگرمِ احساں ہے (مجموعۂ دواوینِ رشک، ص ۳۴)

رشک کے مجموعۂ دواوین میں، اور کہیں یہ لفظ اس طرح مجھے نہیں ملا کہ تذکیر یا تانیث کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہی جاسکے، مثلاً:

منظورِ الٰہی تھی، ہم آغوشیِ جاناں   تب تو مری آغوشِ تمنا کو بنایا (ص ۸۰)

آغوشِ زمیں تو ہاتھ آئی   ہم مردودِ آسماں ہیں (ص ۲۲۳)

دونوں شعروں میں "مری" اور "آئی" کو بہ یائے مجہول بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اِس طرح رشکؔ کے اِس شعر کی حیثیت، اساتذۂ لکھنؤ کے عام طرزِ عمل کے مقابلے میں، شاذ کی سی قرار پاتی ہے۔

جلالؔ کا یہ لکھنا کہ "بہ قیدِ نظم مذکر پایا جاتا ہے"، صرف اِس حد تک صحیح ہے کہ اساتذۂ لکھنؤ نے عموماً اِس لفظ کو مذکر باندھا ہے۔ لیکن اساتذۂ دہلی نے اِس کو مؤنث باندھا ہے اور اس کی مثالیں عام ہیں۔ اِسی طرح کی عدمِ صراحت امیر اللغات میں بھی ہے، مؤلف نے لکھا ہے کہ: "شعرا نے مذکر بھی کہا ہے اور مؤنث بھی استعمال کیا ہے، چناں چہ مثالوں سے پیدا ہے، مگر مؤلف کے نزدیک اس کی تذکیر کو ترجیح ہے" (امیر اللغات)۔

صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ لکھنؤ سے متعلق حضرات میں سے بیشتر نے اِس لفظ کو یا تو صرف مذکر لکھا ہے (تلخیصِ معلّی[1]، رسالۂ بسیط) یا مذکر کو مرجّح بتایا ہے (امیر اللغات، مفید الشعرا، معین الشعرا، رسالۂ اصلاح)۔ صفیرؔ نے رشحات میں اِس کو مختلف فیہ لکھا ہے مگر یہ صراحت نہیں کی کہ ترجیح کسے ہے۔ صرف نورؔ میں مؤنث کو مرجّح لکھا گیا ہے۔ اور رشکؔ کے علاوہ دیگر اساتذۂ لکھنؤ نے عموماً اِس کو مذکر نظم کیا ہے۔

دہلی سے متعلق حضرات نے اس کو صرف مؤنث مانا ہے۔ ابتداءً فرہنگِ آصفیہ میں "آغوش" مذکر چھپا تھا۔ اِس کے متعلق مؤلفِ اختلاف اللسان[2] نے لکھا تھا:

---

[1] تصنیف کلب حسین خاں نادرؔ، تلمیذِ ناسخؔ۔ کتاب کا نام تاریخی ہے، جس سے سالِ تصنیف (یا تکمیلِ تصنیف) ۱۲۸۰ھ نکلتا ہے۔ اسی سال یہ مطبع منشی رام سروپ واقع کیمپ فتح گڑھ میں چھپی تھی۔ کل ۱۳۶ صفحے ہیں۔ متروکات، تذکیر و تانیث، عروض وغیرہ کے مختصر بیانات ہیں۔ بعض اعتبارات سے یہ کتاب اہم حیثیت رکھتی ہے۔

[2] مؤلفہ منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی، تلمیذِ داغؔ۔ سالِ طباعت ۱۹۰۰ء، مطبوعہ رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور۔ مؤلف کے الفاظ میں اِس کتاب میں "دہلی اور لکھنؤ کی

(بقیہ اگلے صفحہ)

"آغوش، لکھنؤ میں مذکر بولا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔منشی سیّد احمد صاحب دہلوی نے فرہنگِ آصفیہ میں "آغوش" کو مذکر لکھا ہے۔ اس کے متعلق صاحبِ فصیح اللغات نے شبہہ ظاہر کیا ہے کہ یا تو کاتب کی غلطی ہے، یا حقیقت میں اہلِ دہلی بھی اس لفظ میں اختلاف رکھتے ہیں۔ حضرت استادِ مرحوم (فصیح الملک داغ دہلوی) نے فرہنگِ آصفیہ میں "آغوش" کو مذکر چھپا دیکھ کر، قافیہ و ردیف کے لحاظ سے یہ لفظ مونث کہا ہے:

سنتا ہی نہیں وہ مجھ سے قوش ہماری
خالی ہے شبِ وصل بھی آغوش ہماری

اہلِ دہلی "آغوش" کو عموماً مونث ہی بولتے ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں جو اس کو مذکر لکھا ہے، تو یہ یقیناً کتابت کی غلطی ہے، کیوں کہ ایسی غلطیاں کتاب مذکورہ میں اکثر پائی جاتی ہیں۔" (اختلاف اللّسان، ص ۲)

اختلاف اللّسان کے مولّف کا خیال صحیح تھا، اور یہ کتابت ہی کی غلطی تھی، کیوں کہ اس کے بعد جو جلدِ اوّل باضابطہ شائع ہوئی تو اُس میں یہ لفظ مونث ہی ہے، لیکن اِس تبدیلی یا تصحیح کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ لفظ مختلف فیہ الفاظ میں سے ہے اور یہ اختلاف، دبستانی حیثیت رکھتا ہے، کہ عموماً اربابِ لکھنؤ نے اس کو مذکر کہا ہے، (رشک کے ایک شعر کے علاوہ) اور اساتذۂ دہلی نے متفقہ طور پر اس کو مونث مانا ہے۔ یہ اختلاف، اب بھی سننے میں آتا ہے اور تحریر میں بھی دکھائی دے جاتا ہے۔

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) زبان کے الفاظ اور محاورات کا فرق" بیان کیا گیا ہے۔ ۴۰ ۸ صفحے کا رسالہ ہے مگر بہت سی کار آمد باتیں اس میں پائی جاتی ہیں۔ مولّف نے سرورق پر زبانِ دہلی کو "اردوے معلّا" اور زبانِ لکھنؤ کو "اردوے معلاّ" لکھا ہے۔

دو ضمنی باتیں لکھی جاتی ہیں:

۱۔ آصفیہ میں "آغوش" کے ذیل میں "آغوش کھول کر لینا" بھی لکھا ہوا ہے، اور مؤلف نے اس کی سند میں قلق کا یہ شعر لکھا ہے:

دوڑی آغوش کھول کر ہر موج ہو گئی بے قرار تر ہر موج

صاف ظاہر ہے کہ یہ شعر "آغوش کھول کر لینا" کی سند نہیں ہو سکتا۔ امیر اللغات و نور اللغات میں "آغوش کھول کر لینا" موجود ہی نہیں، ہاں "آغوش کھول کر لپٹنا" ضرور درج ہے اور سند میں ناسخ کا یہ شعر لکھا ہوا ہے:

بسانِ ساحلِ دریا ہو مشکل چھوٹنا ناسخ
لپٹ جاؤں اگر میں کھول کر آغوشِ جاناں سے

۲ امیر اللغات میں "آغوش سے نکلنا" کی سند میں داغ کا ایک شعر لکھا ہوا ہے، جس میں یائے معروف کے بجائے یائے مجہول کے آنے سے، اِس لفظ کی تانیث، تذکیر سے بدل گئی ہے۔ غالباً یہ غلطیِ کتابت ہے۔ شعر یہ ہے:

جس طرح تو مرے آغوش سے نکلا اے شوخ یوں ہی ہاتھوں سے نکلتی ہے طبیعت میری

"مرے آغوش" کی جگہ "مری آغوش" ہونا چاہیے؛ اس لیے کہ دیگر اساتذۂ دہلی کی طرح، داغ بھی اس لفظ کو حتمی طور پر مؤنث مانتے تھے۔ حوالہ اوپر آ چکا ہے۔

املا:

جلال نے مفید الشعرا میں اِس کو مختلف فیہ لکھا ہے:

"املا مختلف فیہ ہے، یعنی مذکر و مؤنث دونوں طرح بولا جاتا ہے لیکن مذکر بیش تر اور مؤنث کم تر۔ جیسا کہ رشک مغفور مؤنث فرماتے ہیں:

نامۂ جاناں ہے کیا لکھی امری تقدیر کا خط کی انشا اور ہے، لکھنے کی املا اور ہے

الّا، مؤلف اِس کی تذکیر ہی کا قائل ہے"؛

اِس کے برخلاف، مولّفِ[1] فصیح اللغات نے اِس کو مذکر لکھ کر صراحت کے ساتھ اِس کی نفی کی ہے کہ فصحا اِس کو دونوں طرح بولتے ہیں۔ اُن کی عبارت یہ ہے:

[1] داغ کے عزیز شاگرد مولانا احسن مارہروی نے اس لغت کی ترتیب کا کام شروع کیا تھا بقولِ مولانا احسن: "اول اول تو حضرت مبرور کو اس کتاب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوئی، مگر رفتہ رفتہ جب میرے شوق اور خلوصِ عقیدت کا اندازہ فرمایا تو اس کتاب کی طرف متوجہ ہوئے اور ایسی توجہ فرمائی کہ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، احسن ہے اور فصیح اللغات، فصیح اللغات ہے اور اس کی تالیف" (مقدمۂ یادگارِ داغ)

داغ کا خیال یہ تھا کہ اس طرح "زبانِ دہلی" کا ایک صحیح لغت مرتب ہو جائے گا۔ فرہنگِ آصفیہ بھی "زبانِ دہلی" کا گنجینہ ہے، مگر مولفِ آصفیہ کے متعلق داغ کی جو رائے تھی، وہ مولوی عبد الرزاق کان پوری (مصنفِ البرامکہ) کے بیان سے معلوم ہو گی۔ مولوی صاحب نے دہلی دربار کے موقع پر داغ سے ملاقات کی تھی، اُس کا حال لکھتے ہوئے، انھوں نے لکھا ہے:

> میں نے دریافت کیا کہ مولوی سید احمد دہلوی نے تیس سال کی محنت میں فرہنگِ آصفیہ لکھی ہے، تحقیقاتِ لغات اور محاورات اور زبان کی حیثیت سے اس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے؟ فرمایا کہ "سید احمد، عرب سرائے کے باشندے تھے" اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مکرر سوال کرنا، میں نے بھی ادب کے خلاف سمجھا۔ (یادِ ایام، ص ۲۵۴)

یہ بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ عرب سرائے پرانی دہلی کے باہر ہے۔ اِس سے داغ کی رائے کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ مولوی صاحب کو مستند اہلِ زبان میں سے نہیں سمجھتے تھے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ لغت (فصیح اللغات) مکمل نہیں ہو سکا۔ حیدرآباد کے کسی مطبع میں اس کے کچھ اجزا چھپے تھے، لیکن معلوم نہیں کہ وہ سب کیا ہوئے۔

مولانا احسن نے مئی ۱۹۰۵ء سے رسالہ فصیح الملک جاری کیا (مقدمۂ یادگارِ داغ) اُس لغت کے کچھ اجزا اس میں شائع ہوئے تھے۔ اب اِس رسالے کے سب شمارے بھی باقی نہیں رہے۔ (باقی اگلے صفحے پر)

"یہ لفظ ناواقفوں کی بول چال میں بہ حالتِ تذکیر و تانیث، دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے، مگر اب تک شعرائے متقدمین و متاخرین میں، رشک لکھنوی کے سوا، اور کسی کے کلام میں "املا" کی تانیث نہیں پائی گئی۔"

(رسالۂ فصیح الملک، مئی سنہ ۱۹۰۹ء)

صفیر نے رشحات میں، ترجیح کی صراحت کے بغیر، صرف مختلف فیہ لکھا ہے۔ مولفینِ امیر اللغات، نور اللغات، معین الشعرا نے اس کو مذکر لکھ کر، یہ صراحت کر دی ہے کہ رشک نے مونث لکھا ہے۔ رشک کے لغت نفس اللغة[1] کے دیباچہ نگار نے بھی یہی بات لکھی ہے: "یہ لفظ عموماً زبانوں پر تذکیر کے ساتھ ہے.... لیکن رشک نے مونث باندھا ہے" (دیباچۂ نفس اللغة) مولفِ آصفیہ نے اِس کو صرف مذکر لکھا ہے، اور

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) ایک جا شاید ہی ملیں۔ صولت پبلک لائبریری رام پور میں اس کے کئی سال کے شمارے محفوظ ہیں۔ داغ اس لغت کے لیے سند کے شعر خاص طور پر کہا کرتے تھے۔ اس کا التزام کیا گیا تھا کہ اس لغت میں سند کے شعر صرف داغ کے کہے ہوئے ہوں گے۔ اگر یہ مکمل ہو جاتا تو واقعی ایک عمدہ ذخیرہ ہوتا۔

[1] یہ رشک کا لغت ہے۔ نام تاریخی ہے۔ اس کا صرف حصۂ اول، اُن کی موت کے بعد، نیر پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ یہ حصہ حرف ت پر ختم ہو جاتا ہے۔ باقی حصوں کا پتا نہیں چلتا۔ امیر مینائی نے ایک خط میں لفظ "مسالا" کے ذیل میں، اِس لغت کی عبارت لکھی ہے: اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغت کم سے کم حرف م تک تو ضرور مکمل ہو چکا تھا، اور اُس کا مخطوطہ امیر کی نظر سے گزرا تھا۔ امیر مینائی کا یہ خط مکاتیبِ امیر مینائی، مرتبۂ احسن اللہ خاں ثاقب میں شامل ہے۔ نفس اللغة کے حصۂ اول کا دیباچہ نشتر لکھنوی نے لکھا ہے، جس میں بہت سی کام کی باتوں کو یک جا کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ لغت مکمل ہو چکا تھا۔

اختلاف کا ذکر نہیں کیا ہے۔ رشک کے مجموعۂ دواوین میں یہ لفظ اور کہیں اس طرح نہیں آیا ہے کہ تذکیر یا تانیث کے متعلق کوئی فیصلہ کُن بات کہی جا سکے۔

صاحبِ فصیح اللغات کا یہ لکھنا کہ یہ لفظ ناواقفوں کی بول چال میں بہ حالتِ تذکیر و تانیث آتا ہے، صحیح نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اکثریت تذکیر کی قائل ہے اور بالعموم اساتذہ نے اس کو مذکر استعمال کیا ہے، لیکن بعض اربابِ نظر اس کی تانیث کے بھی قائل رہے ہیں اور انھوں نے اس کو بہ تانیث استعمال بھی کیا ہے۔ اوپر یہ لکھا جا چکا ہے کہ صفیر نے رشحات میں اس کو مختلف فیہ لکھا ہے اور ترجیح کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر اُن کے تذکرے جلوۂ خضر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تانیث کے قائل تھے۔ جلوۂ خضر کی پہلی جلد میں، ص ۸ پر ایک جملہ یوں چھپا ہوا ہے: "کوئی کہتا ہے اس کے املا اعراب ہے"۔ کتاب کے غلط نامے میں یہ بتایا گیا ہے کہ "اس کے املا" غلط ہے، اس کی جگہ "اس کی املا" لکھا جائے۔ اس اندراج سے قطعی طور پر اس کا تعین ہوتا ہے کہ صفیر اس لفظ کو مونث مانتے تھے۔

غالب نے اپنے رسالے تیغِ تیز میں ایک جگہ لکھا ہے: "جو علما و شعرا ایران سے آئے، لہجہ ان کا ہندی نہیں ہوا، املا اہلِ ہند کی املا کے موافق رہی ہے" (تیغِ تیز، مطبوعۂ اکمل المطابع، ص ۲۴ ـــ نیز قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ، مرتبۂ قاضی عبدالودود صاحب، ص ۲۸۵)۔ اس سے معلوم ہوا کہ دہلی والوں میں سے مرزا غالب، اس کی تانیث کے قائل تھے۔

۱؎ میر علی اوسط رشک لکھنوی، تلمیذِ ناسخ، متوفی ۱۲۸۴ھ (کلیاتِ منیر شکوہ آبادی)۔ عہدِ ناسخ اور ناسخ سے منسوب بہت سی اصلاحاتِ زبان و قواعد کے واضع دراصل رشک تھے۔ (ملاحظہ ہو مقدمۂ انتخابِ ناسخ، شائع کردۂ مکتبۂ جامعہ، دہلی۔ آبِ حیات، بہ ذیلِ ترجمۂ ناسخ۔ تلخیص معلّیٰ) رشک کے دو دیوان ایک ہی جلد میں چھپے تھے، ایک کا نام نظمِ مبارک ۹ اور دوسرے کا نام نظمِ گرامی ہے۔ دونوں تاریخی نام ہیں۔ یہ مجموعہ ان کی زندگی ہی میں (باقی اگلے صفحے پر)

آغا حجو ہندی لکھنوی نے رسالۂ بسیط میں، اِس لفظ کو مختلف فیہ لکھ کر مونث کو مرجح لکھا ہے۔ ہندی کا شمار لکھنؤ کے مستندین میں کیا جاتا ہے۔ اِن مثالوں کے بعد، رشک کے مندرجۂ بالا شعر کو بھی "املا" کی تانیث کے ثبوت میں بلا تکلف قبول کیا جاسکتا ہے۔ اِس طرح لکھنؤ کے دو مستند استادوں کے یہاں "املا" کی تانیث کی اسناد ملتی ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ لفظ "املا" درحقیقت مختلف فیہ ہے، مگر اس طرح کہ دہلی و لکھنؤ کے اکثر اساتذہ نے اس کو مذکر استعمال کیا ہے، اور کم لوگوں نے اس کو مونث مانا ہے۔ مونث ماننے والوں میں مرزا غالب، صفیر بلگرامی، رشک لکھنوی اور آغا حجو ہندی لکھنوی کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ البتہ آج کل اِس لفظ کو بالعموم مذکر استعمال کیا جاتا ہے، اور اب شاید ہی کوئی شخص اس کو بہ تانیث استعمال کرتا ہو، کم از کم میری نظر سے ایسی کوئی مثال نہیں گزری۔

اصل بحث کے بعد، بعض ضمنی باتیں لکھی جاتی ہیں:

مہذب اللغات میں "املا" کو مذکر لکھا گیا ہے۔ مولف نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ: "رشک اور اختر (شاہِ اودھ) نے مونث بھی نظم کیا ہے، لیکن موجودہ دور میں مذکر ہی ہے"۔ مولف نے تانیث کی سند میں رشک کا وہ شعر لکھا ہے جس کا حوالہ اوپر آچکا ہے، اور واجد علی شاہ اختر کا یہ شعر پیش کیا ہے:

"مگر یہ بھی نکلا سراپا غلط   تھی انشا غلط اور املا غلط"

مولفِ مہذب اللغات کا یہ خیال ہرگز صحیح نہیں کہ اختر کے اِس شعر سے "املا" کی تانیث

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) ۱۲۶۳ھ میں چھپا تھا۔ ایک دیوان حوض میں ہے، اور ایک حاشیے پر۔ تیسرا دیوان جو ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا، (دیباچۂ نفس اللغۃ) شائع نہیں ہوسکا۔ اس کا ایک نسخہ پاکستان میں ہے، اور ایک آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے۔

(حواشی تذکرۂ ابنِ امین اللہ طوفان، ص ۴۴)

ثابت ہوتی ہے۔ اس شعر سے نہ تانیث ثابت ہوتی ہے نہ تذکیر۔ مصرعِ ثانی میں یہ لازم نہیں کہ ستی "کا اطلاق "املا" پر بھی ہو۔

مولف نے اسی ذیل میں مزید لکھا ہے: "املے کی کاپی، املے کا قلم، وغیرہ رائج ہیں تو لفظ" املا "میں امالہ روا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مولفِ مہذب اللغات" انشے کی کاپی "لکھنے پر تیار نہیں ہوں گے۔ جس طرح" انشے کی کاپی "نہیں لکھا جاسکتا، اسی طرح" املے کی کاپی "بھی نہیں لکھ سکتے۔ عربی کے جو مصادر بابِ افعال سے آتے ہیں اور اردو میں مستعمل ہیں؛ اُن میں امالہ نہیں ہوتا۔

۲ ارمغانِ احباب میں ایک دلچسپ صورت یہ ہے کہ اُس میں مفرد لفظ "املا" موجود نہیں، البتہ "املا و انشا" ملتا ہے، گویا یہ مرکب امتزاجی ہے! مولف نے اس "مرکب" کو مونث لکھ کر سند میں رشک کا زیرِ بحث شعر درج کیا ہے؛ اور انھوں نے اِس لفظ کی تذکیر کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے۔

۳ مفید الشعرا میں رشک کے مذکورہ شعر کا مصرعِ اول اِس طرح چھپا ہوا ہے:
"نامۂ جاناں ہے کیا لکھا مری تقدیر کا" اس رسالے کے جو اڈیشن میری نظر سے گزرے ہیں، اُن میں یہ مصرع اِسی طرح ہے۔ رشک کے دیوان میں "یا لکھا مری تقدیر کا" ہے (مجموعۂ دواوینِ رشک، ص ۲۵۵)۔ ہاں نور میں صحیح طور پر "یا لکھا" ملتا ہے۔

۴ جلال، صفیر، مولفِ ارمغانِ احباب، مولفِ نور، صاحبِ فصیح اللغات اور مولفینِ امیر اللغات و معین الشعرا نے رشک کے جس ایک شعر سے "املا" کی تانیث کی سند لی ہے، کیا اُس کو قبول کیا جاسکتا ہے؟ یہ بات واضح کردی جائے کہ غالب، ہندی اور صفیر کے حوالوں کے بعد، رشک کا شعر بھی بلا تکلف قابلِ قبول ہے اور اب اُس میں کسی طرح کا شک نہیں کیا جاسکتا، مگر جلال اور صفیر نے، تذکیر و تانیث کی اسناد کو قبول کرنے کے لیے جو شرائط رکھی ہیں؛ اُن کے پیشِ نظر، یہ دونوں حضرات رشک کے صرف اِس شعر

سے فائدہ استناد حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ ان دونوں صاحبوں نے صرف رشک کا یہی ایک شعر تانیث کی سند میں پیش کیا ہے، اور کوئی دوسرا حوالہ اُن کے سامنے نہیں تھا؛ اِس لیے، اپنے ہی بنائے ہوئے اصول کے تحت، یہ دونوں حضرات اِس شعر کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔

جلال نے لفظ "رقم" کے ذیل میں، اِس اصول کی صراحت اِس طرح کی ہے:

"ہندسے کے معنی پر "رقم" کو جناب مرزا والاجاہ مرحوم نے مذکر فرمایا ہے:

ہمارے رزق کا ہے فردِ قسمت میں رقم خالی
ہمیشہ صفر کے مانند رہتا ہے شکم خالی

حالاں کہ "رقم" بہ معنیِ مذکورہ بالاتفاق مونث بولا جاتا ہے۔ پس مولفِ مستہام کہتا ہے کہ عجب نہیں ہے کہ اصل میں یہاں "کی" ہو اور کاتب نے "کا" لکھ دیا ہو۔"

مطلب یہ نکلا کہ جن اشعار میں صرف "کی" یا "کا" پر تذکیر یا تانیث مبنی ہو، اُن میں غلط الکاتب کا احتمال رہتا ہے۔ رشک کے شعر میں بھی تانیث کا انحصار صرف لفظ "کی" پر ہے (ع: خط کی املا اور ہے، لکھنے کی انشا اور ہے) یہاں بھی وہی احتمال پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید اصلاً "خط کا املا" ہو۔

صفیر نے بھی اسی اصول کو مانا ہے، مانا ہی نہیں، دوسروں پر اعتراض بھی کیا ہے۔ حرفِ "واو" کی تذکیر و تانیث کے بیان میں انھوں نے لکھا ہے:

"واو کی سند کے لیے اگرچہ مرزا دبیر صاحب کا یہ بند موجود ہے:

خیر النسا کا لال اِدھر، وہ شقی اُدھر
اور بیچ میں وہ گرزِ گراں بار، الحذر
جس طرح واوِ عطف کا مابینِ خیر و شر

مگر میرے اصول کے خلاف ہے، کیوں کہ علف کا "ی کی جگہ "علف کی" بھی ہو سکتا ہے" (رشحاتِ صفیر، ص ۱۲۰)

یہی نہیں؛ افعال پر اُنھوں نے اِسی طرح کے اعتراض کیے ہیں، مثلاً جلالؔ نے "طوطی" کی تانیث کی سند میں رشکؔ کا یہ شعر لکھا ہے:

"طوطیِ سبزۂ خط صاف یہی کہتی ہے — ہیں وہی عارضِ آئینۂ جانانہ بانگ"

صفیرؔ نے اِس پر اس طرح اعتراض کیا ہے:

"اور رشکؔ کے شعر کی سند جو دی گئی، اُس کو ماننا مشکل ہے، کیوں کہ "طوطیِ سبزۂ خط صاف یہی کہتا ہے" بھی ہو سکتا ہے۔ از روئے غلطیِ کتابت یہ مثال کافی نہیں۔ حضرت جلالؔ ایسی ہی مثالیں دیا کرتے ہیں" (رشحات، ص ۹۸)

اصول پرستی اور اصول پسندی کے اِس انداز کے بعد، "لغاتِ املا" کے سلسلے میں رشکؔ کے اُس شعر کو، اِن دونوں حضرات کو، کسی قید کے بغیر، قبول نہیں کرنا چاہیے تھا۔

لُغت اور استعمالِ عام

اردو، بہت سی زبانوں کے لفظوں کا مجموعہ ہے۔ اِس مجموعے میں عربی وفارسی کے لفظوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ یہ لفظ کئی اعتبارات سے اہمیت رکھتے ہیں۔ عربی کے اکثر لفظ، اردو کو فارسی کے واسطے سے ملے ہیں۔ یہاں کے پڑھے لکھے لوگ، عربی سے واقف تو ہوا کرتے تھے، مگر عربی کو یہ مرتبہ کبھی حاصل نہیں ہو سکا کہ وہ ہندستان میں دفتری زبان بن سکے، یہ شرف فارسی کے حصّے میں آیا اور اِسی لیے فارسی کے اثرات، عربی کے مقابلے میں ہمہ گیر رہے۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر، ایرانی تہذیب اور زبان کو، عربی تہذیب اور زبان کے مقابلے میں ہندستان سے قریب کی نسبت تھی، اور حکم راں خاندان بھی عموماً اُسی طرف سے آتے رہے۔ یہ خاندان آئے ہوں کسی علاقے سے، مگر ایرانی اثرات اُن کے ساتھ آئے۔ ایرانی تہذیبی اثرات تھے ہی اِس قدر طاقت ور، ہمہ گیر اور ہمہ جہت۔ فارسی زبان کا مزاج بنیادی طور پر عربی سے مختلف ہے۔ یہ دونوں زبانیں، زبانوں کے دو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ عربی اثرات بہت طاقت ور تھے، مگر ایرانی مزاج نے اُن کو کبھی حکم راں نہیں بننے دیا۔ فارسی کے مقابلے میں عربی زبان کہیں وسیع اور باقاعدہ تھی، مگر دوسری طرف ایرانی تہذیب مجموعی طور پر کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی، اور اُس نے لسانی سطح پر بھی عربی کے اثرات کو اِس طرح غالب نہیں ہونے دیا کہ فارسی کی اپنی خصوصیات دب جائیں

یا فنا ہو جائیں۔ سیاسی اثرات کی بنا پر یہ لازم تھا کہ عربی کے لفظ فارسی میں اپنی جگہ بنائیں اور ایسا ہوا۔ بے شمار عربی لفظ فارسی زبان کا حصّہ بن گئے، مگر فارسی نے بہت سے لفظوں کو اِس طرح قبول کیا کہ وہ اُس کے مزاج سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ حرکات اور بناوٹ بدل کر معانی میں بھی بہت سے تصرفات کیے اور بہت سے لفظوں میں تو املائی تغیرات کو بھی شامل کر دیا۔ اِن تصرفات کے اثر سے عربی کے لفظ فارسی زبان کا جُز معلوم ہونے لگے۔ یہی صورت عروض کی ہوئی جو فارسی کی بدولت نغمگی کے بہت سے اجزا سے روشناس ہوا۔ ایرانی آہنگ نے کچھ اوزان کو جو اُس کے لہجے سے میل نہیں کھاتے تھے، قبول نہیں کیا۔ دوسری طرف بہت سے مترنم اوزان کا اضافہ کیا۔ طاقت ور زبانوں کی ایک پہچان یہ بھی ہوا کرتی ہے۔

جس طرح عربی کے بہت سے لفظوں کو فارسی میں تصرفات سے دوچار ہونا پڑا تھا، وہی صورت اردو میں رونما ہوئی کہ عربی فارسی کے بہت سے لفظوں کو، یہاں کے تقاضوں کے کے تحت تصرفات سے دوچار ہونا پڑا، اور یہ ہونا ہی تھا۔ ہر زبان کا مزاج اور لہجہ مختلف ہوتا ہے۔ عربی کے بہت سے لفظوں کا صحیح تلفظ ہمارے لیے مشکل ہی نہیں، نامانوس بھی ہے۔ فارسی کے کچھ لفظوں کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً "عیال" عربی کا لفظ ہے اور بہ کسرِ اول ہے (عِیال) اردو والا اِس کو "عَیال" کہے گا تو لہجہ بگڑ جائے گا۔ یا جیسے فارسی میں "فرشتہ" کی ف پر زیر ہے مگر اردو میں سب "فَرِشتہ" کہتے ہیں، اگر اِس کو اردو میں "فِرِشتہ" کہا جائے تو ذہن بگڑنے کا احتمال ہوگا۔ یا جیسے عربی کے متعدد ایسے لفظ ہیں جن کے اعراب میں کوئی اختلاف نہیں، مگر تلفظ میں فرق ہے۔ اور یہ فرق ہندستانی لہجے کا آفریدہ ہے۔ مثلاً احمد، محمود، محشر وغیرہ، کہ یہ عربی میں بہ فتحِ حرفِ اول ہیں، اردو میں اِن کو بہ فتحِ حرفِ اول ہی مانا جاتا ہے، مگر فتحے کا تلفظ وہ نہیں ہوتا جو اہلِ عرب کا خاصّہ ہے، بل کہ ایسے الفاظ کے تلفظ میں ایک طرح کی امالے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بعض لوگ ایسے الفاظ کو اصل کی پابندی کے زعم میں، اُسی تلفظ کے ساتھ بولتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اردو کے لحاظ سے

یہ تلفظ قطعاً غیر فصیح ہے۔ جیسے "احمد" اصلاً بروزنِ "افضل" ہے، لیکن اردو میں الف کے زبر میں ترچھا پن در آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے "احمد" "خیبر" کے وزن پر زبان سے ادا ہوا ہے۔ یا جیسے "محل" (بمعنیٔ قصر) کی ح پر زبر ہے، لیکن ہمارے تلفظ میں زبر کی آواز زیر کی آواز سے مشابہ ہو کر نکلتی ہے۔ اردو میں اِسی تلفظ کو فصاحت کی سند حاصل ہے۔ [محل بہ لامِ مشدّد، جیسے، محلِ استعمال، اس کی صورت مختلف ہے، اس کو ذہن میں رکھنا چاہیے] اِسی قبیل کے ہندی کے بھی کچھ افعال ہیں، جیسے بہل گیا، بہک گئے، مہک اٹھا، دہک گیا وغیرہ؛ ان میں ہائے ہوّز مفتوح ہے، لیکن فتحے کی آواز، کسرے سے قریب ہو کر نکلتی ہے۔ قافیے میں بہل "نکل" کے ساتھ آتا ہے اور مہک "جھجک" کے ساتھ آئے گا؛ مگر تلفظ میں وہی املائی کیفیت رہے گی۔

اشتقاق، تلفظ، معانی اور املا کے لحاظ سے عربی و فارسی لفظوں میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں، اور یہ ضروری ہے کہ ایسے سب تغیرات کا جائزہ لیا جائے اور اُن تغیرات کو بہ خوشی قبول کیا جائے۔ اِس مضمون میں اختصار کے ساتھ صرف تلفظ کے تغیرات پر گفتگو کی جائے گی، اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اِس اہم موضوع کی طرف باضابطہ توجُّہ کو منعطف کرایا جائے۔ اردو میں اب اگر کوئی مفصّل لُغت مرتّب ہو (اور ہونا چاہیے) تو اُس میں ایسے تغیرات کی نشان دہی لازم ہوگی، اور ضروری ہوگا کہ ایسے لفظوں میں تلفظ کے تغیرات کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ اردو کے تلفظ کو اب معیاری حیثیت دی جائے۔ کچھ لفظوں کے متعلق متفرق طور پر یہ لکھا بھی گیا ہے، مگر ایسے الفاظ کی پوری فہرست نہیں بنائی گئی ہے۔ عربی فارسی کے ایسے لفظوں کی تعداد اچھی خاصی ہے جن میں اعراب کی تبدیلی ہوئی ہے۔ یہاں اُن سب کا احاطہ کرنا مقصود نہیں، مقصد صرف یہ ہے کہ بطورِ مثال ایسے الفاظ کی ایک فہرست مرتّب کی جائے اور تفصیلات کے بغیر، مختصر الفاظ میں تبدیلیِ حرکات کا ذکر کیا جائے۔ لغت نویس کے لیے اِس فہرست کی حیثیت ایک اشارہ نما کی سی ہوگی۔ اِس اتفاق

کیا جائے گا کہ یہ موضوع ہماری خصوصی توجہ کا مستحق ہے، اور یہ کہ اس سلسلے میں ابھی تک باضابطہ کام نہ ہونے کے برابر ہوا ہے۔ لغت میں املا کے بعد دوسری بنیادی حیثیت تلفظ کی ہوتی ہے اس لیے یہ از بس ضروری ہے کہ لفظوں کے تلفظ کا قطعی طور پر اور صحیح طور پر تعین کیا جائے۔ اِس کے بغیر کوئی لغت مکمل نہیں ہو سکتا۔

زبان پہلے بنتی ہے، قواعد و لغت کی کتابیں بعد کو مرتب کی جاتی ہیں۔ اِس طرح اصول طور پر ہونا تو یہ چاہیے کہ جو لفظ (عام طور پر) جس طرح بولا جاتا ہے، اُس کو اُسی طرح درج لغت بھی کیا جائے، یا کوئی اور صورت ہے تو اُس اختلاف کی نشان دہی کی جائے، مگر اردو لغات میں اکثر لفظوں کے متعلق اِس سلسلے میں ناتمامی پائی جاتی ہے۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایک زمانے تک عربی فارسی لغات سے اختلاف کرنا کچھ اچھا نہیں سمجھا گیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ کچھ لفظوں میں تلفظ کا اختلاف اِس قدر نمایاں تھا کہ اُس کو نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اردو لغات میں کچھ لفظوں کے ذیل میں اختلاف یا تغیر کا ذکر ملے گا اور کچھ لفظوں کے ذیل میں نہیں ملے گا۔ یا یہ کہ ایک لغت میں ایک اختلاف کا ذکر ہو گا اور دوسرا اُس سے خالی ہو گا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ لفظ کو لغت میں تو "معیاری" حرکات کے ساتھ ہی لکھا جائے، خواہ بول چال میں وہ کچھ اختلاف کے ساتھ آتا ہو۔ اور "معیار" کا تصور غیر واضح سا تھا۔ کہیں تو اُس سے اصل زبان کے لغات یا قواعد کی مطابقت مراد ہوتی تھی، اور کہیں اُس سے اہلِ علم و اہلِ اعتبار کے محدود طبقے کا طرزِ عمل مراد لیا جاتا تھا، اور کہیں اہلِ زبان کے مختارات سے مراد لی جاتی تھی۔ اِس غیر واضح صورتِ حال کا یہ نتیجہ ہونا ہی تھا کہ اِس سلسلے میں انتشار باقی رہے، اور مختلف مقامات پر مختلف صورتیں رونما ہوں۔

دوسری وجہ یہ ہوئی کہ شعر میں لفظ کی حرکت کا تعین بالعموم قافیے میں کیا جاتا ہے۔ قافیے کے علاوہ ساکن و متحرک حروف کا تعین تو بعض اوقات شعر میں قافیے کے علاوہ

ہو سکتا ہے، مگر زیر، زبر کا تعین نہیں ہو پاتا۔ قافیے میں روی و ماقبلِ روی، کی حرکات محسوب ہوتی ہیں۔ اِس طرح جو لفظ سہ حرفی و چہار حرفی وغیرہ ہوتے ہیں، اُن کے حرفِ اوّلیں کی حرکات کا تعین شعر میں نہیں ہو پاتا۔ چوں کہ لُغت میں عموماً اسناد میں شعر پیش کیے جاتے رہے ہیں، اور الفاظ کی حرکات کا بھی اکثر تعین اُن کے واسطے سے ہوتا رہا ہے، اِس لیے اوّلین حروف کی حرکات کا تعین مشکل تھا۔ مثلاً شعر کی مدد سے لفظ "عیاں" یا "عیال" کی عین کی حرکت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کے بخلاف مثلاً "گھائل" میں ماقبلِ روی کی حرکت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اب "عیاں" یا "عیال" کے حرفِ اول کی حرکت کا تعین کس طرح ہو؟ تو آسان طریقہ یہی تھا کہ لُغت کی طرف رجوع کیا جائے، اور اُس میں اِس کو "بہ کسرِ حرفِ اول" لکھا گیا ہے، تو اُسی کو نقل کر لیا جائے۔ ورنہ اور سند کہاں ملے گی؟ یہی وجہ ہے کہ عموماً تین حرفی، چہار حرفی وغیرہ الفاظ کے حروفِ اوّلیں کی حرکات کے تعین میں زیادہ اختلاف ملتا ہے اور ناتمامی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اور یہ بات اہم ہے کہ تلفظ کی اکثر تبدیلیاں مختلف الفاظ میں شروع کے دو حرفوں میں ہوئی ہیں، جیسے، فرشتہ، بہشت، عیال، نفی، ہیئت، سیّد، حرکت، قلعہ، کلمہ، ارنی، عظمت، تلعی وغیرہ۔

اردو میں عربی و فارسی (وغیرہ) کے جن لفظوں میں حرکات کی تبدیلی ہوئی ہے، تو وہ تبدیلی، یہاں کے لہجے کا تقاضا تھا۔ ہر زبان میں یہی ہوتا ہے کہ دوسری زبانوں کے لفظ (اکثر و بیش تر) اُس زبان کے سانچے میں اِس طرح ڈھل جاتے ہیں کہ اجنبیت کا شائبہ بھی نہیں رہتا۔ حرکات کی تبدیلی پہلے زبانوں پر اپنی جگہ بناتی ہے، اور پھر لُغت میں جگہ پاتی ہے۔ یہ درمیانی وقفہ (یعنی زبانوں سے نکل کر لُغت میں جگہ پانا) خاصا صبر آزما ہوتا ہے۔ اِس میں زیادہ اُلجھن اِس لیے ہوتی ہے کہ استعمالِ عام کی سطحیں مختلف ہوتی ہیں۔ یہ مسلّمات میں سے ہے کہ قابلِ قبول تبدیلیوں کا تعین ذرا دیر میں ہو پاتا ہے۔ جب تک کوئی تغیر استعمالِ عام کی اُس سطح تک نہ پہنچ جائے جہاں پہنچ کر اُس کو اعتبار کی سند ملتی ہے، اُس وقت تک وہ

لغت کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس میں قیاس ساتھ نہیں دیتا۔ یعنی اِس بنا پر کہ ایک لفظ میں حرکت کا تغیر قابلِ تسلیم ہے، یہ لازم نہیں کہ اُس انداز کے دوسرے الفاظ میں بھی وہی تغیر رونما ہوا ہو، یا قابلِ تسلیم بھی ہو۔ مثلاً "نفی" میں اصلاً ف ساکن ہے، مگر یہ اردو میں بہ کسرِ دوم مستعمل ہے اور یہ استعمال اُس سطح تک پہنچ چکا ہے جہاں سے استناد کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں؛ اِس لیے اِس کو بہ کسرِ دوم بھی قبول کیا جائے گا، مگر اس کے قیاس پر، اِس کے ہم وزن الفاظ کو لازماً شامل نہیں کیا جا سکتا، جیسے "تخت" کو "تخَت" کی صورت میں نہیں مانا جائے گا، جب کہ استعمال کی ایک سطح پر یہ تلفظ ملتا ہے، مگر قابلِ قبول سطح تک یہ ابھی نہیں پہنچ سکا ہے۔ اور یہی وہ فرق ہے جس کو قدما نے اور لغت نویسوں نے "غلط العام" اور "غلط العوام" کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔ "غلط العوام" کو آپ جو بھی حیثیت دیجیے، شوق کے ساتھ سینے بھی، مگر اُس کو لغت میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ "نظم" کو کچھ لوگ "نظَم" کہنے لگیں اور اُن میں دو چار "مبیّنہ" پڑھے لکھے بھی ہوں؛ تب بھی اِس کو قابلِ قبول نہیں قرار دیا جائے گا۔ میں اِس امکان سے انکار نہیں کرتا کہ کسی زمانے میں یہ قابلِ تسلیم ہو سکتا ہے؛ مگر وہ زمانہ کب آئے گا، اِس کا مجھے علم نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ استعمالِ عام کی نچلی سطح پر تلفظ میں جو مختلف قسم کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، وہ سب لازماً قابلِ قبول نہیں ہوتیں۔ اُن تبدیلیوں کو قابلِ قبول سطح تک آنے کے لیے اور اپنی جگہ بنانے کے لیے ایک طویل وقفے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہت سی تبدیلیوں میں سے کچھ تبدیلیاں ہی قابلِ قبول سطح تک پہنچ کر، اپنی جگہ بنا پاتی ہیں اور اُسی صورت میں وہ لغت کے لیے قابلِ قبول ہو سکتی ہیں۔ اِس بات کو ضرور پیشِ نظر رہنا چاہیے۔

ایک دوسری بات یہ ہے کہ بہت سے لفظ ایسے ہیں کہ بول چال کی حد تک اُن میں تبدیلی نمایاں ہو چکی ہے، مگر نظم میں اور فارسی ترکیب میں وہ عموماً اصل کے مطابق ہی

آتے ہیں۔ اس ذیل میں ساکنُ الاوسط الفاظ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً "شمع" اور "جمع" میں اصلاً م ساکن ہے لیکن اردو کی بول چال میں یہ عموماً بہ فتحِ م آتے ہیں، اور یہ صورت قابلِ قبول سطح پر اپنی جگہ بنا چکی ہے؛ مگر شعر میں اور فارسی ترکیب کی صورت میں یہ بہ سکونِ م ہی آتے ہیں۔ شعر میں اگر "شَمَع" باندھا جائے تو فوراً غیر مناسب معلوم ہوگا اور گفتگو میں اگر "شمْع" کہا جائے تو اچھا نہیں لگے گا۔ ایسے الفاظ کے متعلق یہ خیال رکھا جائے گا کہ نظم میں تو یہ اُسی طرح رہیں گے جس طرح اب تک رہے ہیں، اور دوسری طرف بول چال میں بھی اُن کی مروّج صورت محفوظ رہے گی۔ ضرورتِ شعری اور روایتِ شعری اور بول چال کے ضابطے اپنی اپنی جگہ پر رہیں گے اور دونوں مقامات پر ان ضابطوں کے تحت ہی الفاظ اپنے کو نمایاں کرتے رہیں گے۔ اس امتیاز کو لازماً برقرار رہنا چاہیے اور اس کو ختم کرنے کی کوشش ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ بے امتیازی یوں بھی بہت بڑا عیب ہے، پھر یہ بات بھی ہے کہ ادبی زبان اور بول چال کی زبان میں کچھ نہ کچھ فرق تو رہتا ہی ہے اور رہے گا بھی، اور یہ بھی مسلّمات میں سے ہے۔

اردو میں لُغت نویسی کی روایت خاصی پُرانی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ مختلف ادوار میں اس کا تسلسل ملتا ہے۔ آخری مفصّل لُغت تو نوراللغات تھا، مگر اُس کے بعد بھی اِس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہا ہے۔ ان لُغات کے مرتّبین نے (جن میں مولّفِ نوراللغات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں) تغیّرِ حرکات کا ذکر کیا ہے، مگر بہت سے لفظ اُس سے محروم رہے ہیں اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایسے الفاظ کا تفصیل کے ساتھ ہمارے یہاں جائزہ نہیں لیا گیا؛ اب ضروری ہے کہ اس ضروری کام کو مکمل کیا جائے، کیوں کہ اس کے بغیر لغت کی تکمیل نہیں ہو سکے گی، اور پُرانے لغات میں تلفظ کی حد تک جس ناتمامی کا احساس ہوتا ہے، وہ صورتِ حال اُسی طرح باقی رہے گی۔ اِس ذیل میں قابلِ قبول تغیّرات کا تعین اصل کام ہوگا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، بہت سے

لفظوں میں مختلف سطحوں پر طرح طرح کے تغیرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، مگر وہ سب لازماً قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔ زبان کی شائستگی اور اعتبار بڑی چیز ہے، اور لغت اُس کا آئینہ دار اور امین ہوتا ہے۔ جس طرح عربی و فارسی لُغات کی آنکھیں بند کرکے تقلید نہیں کی جا سکتی، اُسی طرح استعمالِ عام کے نام پر ہر خوب و ناخوب کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں الفاظ کی فہرست مرتّب کرنا ہوگی اور نہایت احتیاط کے ساتھ اُس پر غور کرکے، ہر لفظ کے متعلق الگ الگ فیصلہ کرنا ہوگا۔ لغات میں ایسے کچھ لفظوں میں اختلافِ حرکات کا ذکر ملتا ہے، اُس کو بھی مثال کے طور پر سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ اِس مضمون کا مقصد بھی یہی ہے کہ ایسے الفاظ کی پہلی فہرست پیش کی جائے، اور اُن تغیراتِ حرکات کی نشان دہی کی جائے جو مضمون نگار کی رائے میں لغت کے لیے ہر اعتبار سے قابلِ قبول ہیں۔ اِس سلسلے کے کچھ لفظ ایک اور عنوان "صحتِ الفاظ" میں زیرِ بحث آئے ہیں؛ اُن کو بھی اِس فہرست کا جُز سمجھنا چاہیے۔ اِس مضمون میں نوراللغات کے لیے عموماً نور اور فرہنگِ آصفیہ کے لیے آصفیہ بہ طورِ مخففات استعمال کیے گئے ہیں۔

آصف: اصلاً ص مفتوح ہے، مگر اردو میں زبانوں پر اکثر بہ کسرِ صاد ہے۔ نوراللغات میں یہ لفظ موجود ہے، مگر ضبطِ حرکات کے بغیر، البتہ امیراللغات میں ص پر زبر لگا ہوا ہے (آصَف) اور فرہنگِ آصفیہ میں ص پر زیر لگا ہوا ہے ــــ اِس لفظ کی دونوں حرکات قابلِ تسلیم ہیں، اِس صراحت کے ساتھ کہ بہ کسرِ صاد اردو کا تصرّف ہے اور اب اکثر اِسی طرح بولا جاتا ہے۔

اچار: آصفیہ میں اِس کو "آچار" لکھا گیا! ... "اچار" کو عوام سے متعلق کیا گیا ہے۔ "آچار بنانا، آچار ڈالنا، آچار کرنا، آچاری" سب کو الفِ ممدودہ کے

ساتھ ہی لکھا گیا ہے۔ اردو میں "اچار" بولا اور لکھا جاتا ہے اور اردو کے لحاظ سے یہی صورت صحیح اور فصیح ہے۔ "آچار" کو فارسی سے مخصوص قرار دینا چاہیے۔

احدی: اصلاً ح پر زبر ہے۔ اردو میں کاہل اور نکمّے آدمی کو کہتے ہیں اور اس معنی میں یہ بہ سکونِ ح مستعمل ہے۔

ارجمند: فارسی میں ج ساکن ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے خاص طور پر صراحت کی ہے کہ بہ ضمِ جیم غلط ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں ہے اور اُس میں بھی بہ ضمِ جیم کو غلط بتایا گیا ہے۔ البتہ امیر اللغات میں ج پر پیش بنا ہوا ہے: "اَرجُمَند"۔ اردو میں یہ لفظ اسی طرح مستعمل ہے۔ گفتگو میں ج کا ضمہ نمایاں رہتا ہے اور بہ سکونِ جیم، اردو کے لہجے سے میل نہیں کھاتا۔

اسفندیار: فارسی میں بہ کسرِ اول ہے، مگر اردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اول ہے اور اب یہی حرکت مرجح ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور اور امیر اللغات میں اس کو فارسی حرکات کے مطابق (اِسفندیار) لکھا گیا ہے۔

اسلحہ: عربی کے لحاظ سے ل پر زیر ہے۔ بول چال میں یہ بہ فتحِ لام (اَسلَحہ) بھی آتا ہے۔ اِس لفظ کی دونوں حرکات قابلِ تسلیم ہیں۔ بہ فتحِ لام کو اردو کا تصرف مانا جائے گا۔ اردو لغات میں اِس کو عربی کے مطابق لکھا گیا ہے۔

اصفہان: فارسی میں یہ بہ کسرِ اول ہے مگر اردو میں بہ فتحِ اول زیادہ مستعمل ہے۔ آصفیہ میں یہ موجود نہیں۔ امیر اللغات و نور اللغات میں اِس کو اصل کے مطابق بہ کسرِ اول ہی لکھا گیا ہے۔ اِس لفظ کی دونوں حرکات کو لغت میں درج کرنا چاہیے، اِس صراحت کے ساتھ کہ اردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اول ہے۔

افق: اصلاً بہ ضمتین ہے (اُفُق)۔ آصفیہ، نور اور امیر اللغات میں بھی اِس کو

اصل کے مطابق بہ تحتین ہی لکھا گیا ہے۔ اردو میں اس کا ایک تلفظ "اُفُق" بھی ہے (بہ ضمِ اول و فتحِ ثانی)۔ اِس تلفظ کو بھی مان لینا چاہیے اور درجِ لغت کرنا چاہیے۔

اکسیر : بہ لحاظِ لغت بکسرِ اول ہے۔ آصفیہ، نور، امیر اللغات، سب میں اِس کو بکسرِ اول لکھا گیا ہے، بل کہ مولفِ نور نے صراحت بھی کر دی ہے کہ "بالفتح غلط ہے"۔ اردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اول بھی ہے اور "اِکسیر" کے مقابلے میں "اَکسیر" زیادہ سُننے میں آیا ہے۔ بہ ہر صورت، اِس لفظ کے دونوں تلفظ درجِ لغت ہونا چاہییں، اِس صراحت کے ساتھ کہ بہ فتحِ اول، اردو کا تصرّف ہے اور اکثر اِسی طرح سُننے میں آتا ہے۔

الماس : اصلاً حرفِ اول مفتوح ہے (اَلماس)۔ اردو میں زبانوں پر بکسرِ اول بھی ہے، اور اب بیش تر اِسی طرح سُننے میں آتا ہے۔ اردو لغات میں اِس کو اصل کے مطابق صرف بہ فتحِ اول لکھا گیا ہے۔ اِس لفظ کو دونوں طرح تسلیم کر لینا چاہیے۔ بکسرِ اول، اردو کا تصرّف ہوگا۔

ایوان : اردو میں یہ لفظ صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہے اور اِسی طرح ماننا چاہیے۔ غیاث اللغات میں اختلافِ حرکت کا ذکر کیا گیا ہے (اِیوان، اَیوان) مگر اردو میں اِس اختلاف کا گزر نہیں۔ نور میں یہ لفظ موجود ہے مگر حرکات کی صراحت کے بغیر —— فرہنگِ آصفیہ میں اور امیر اللغات میں یہ لفظ موجود ہے اور اِن میں الف پر زبر لگا ہوا ہے۔

باقر : بہ لحاظِ لغت قؔ مکسور ہے (باقِر)۔ نور میں بھی اِس کو اصل کے مطابق بہ کسرِ سوم لکھا گیا ہے۔ اردو میں اِس کو بہ کسرِ قاف شاید ہی کوئی بولتا ہو، سب لوگ "باقَر" کہتے ہیں۔ باقر خانی بھی بہ فتحِ سوم مستعمل ہے۔ اردو میں اب اِس لفظ کو صرف بہ فتحِ سوم ماننا چاہیے۔ آصفیہ

میں "باقر" موجود نہیں، البتہ "باقرخانی" ہے اور اُس میں قاف پر زبر لگا ہوا ہے۔ نور میں "باقرخانی" اعراب یا صراحت کے بغیر ہے۔

ببر : آصفیہ میں "بَبَر" لکھا ہوا ہے۔ توسین میں لکھا ہے "صحیح، بَبْر"۔ صاحبِ نوراللغات نے اختلافِ حرکت کا ذکر کیا ہے، مگر یہ بھی لکھا ہے کہ "اُردو میں زبانوں پر بروزنِ گَجَر ہے۔" فارسی میں یہ بہ سکونِ دوم ہے۔ بہارِ عجم میں اِس کو بہ فتحِ دوم بھی لکھا گیا ہے مگر یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ فارسی والے بہ سکونِ دوم استعمال کرتے ہیں۔ بہر طور اردو میں یہ لفظ صرف بہ فتحتین مستعمل ہے، اور اردو کے لیے اب یہی صورت مرجح ہے۔ یہ نظم میں بہ سکونِ دوم آسکتا ہے۔

برادر : غیاث اللغات میں اِس کو بہ فتحِ اول لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں ب پر زبر اور زیر دونوں حرکات لگائی گئی ہیں، "بَرادر"؛ یعنی مؤلف کے نزدیک یہ لفظ دونوں طرح مستعمل اور صحیح ہے۔ نور میں غیاث اللغات کی عبارت کا ترجمہ کر دیا گیا ہے مگر یہ بھی لکھا ہے کہ "یہ لفظ زبانوں پر بہ کسرِ اول ہے۔" بول چال میں یہ لفظ صرف بہ کسرِ اول ہے اور اردو میں اِس لفظ کو صرف بہ کسرِ اول ماننا چاہیے۔

برقع : عربی میں قاف پر زبر بھی ہے اور پیش بھی (صراح) اردو میں یہ صرف بہ فتحِ سوم مستعمل ہے۔ بہ ضمِ سوم کو عربی سے مخصوص سمجھنا چاہیے اور اردو سے غیر متعلق۔

برہنہ : بہ لحاظِ اصل حرفِ اول مفتوح ہے۔ اردو میں اِس طرح بھی استعمال کرتے ہیں اور بہ کسرِ اول بھی بولتے ہیں۔ یہی صورت "برہمن" کی ہے کہ اصلاً حرفِ اول مفتوح ہے، مگر گفتگو میں بہ کسرِ اول بھی آتا ہے۔ اِس کو اردو کا تصرف قرار دے کر شاملِ لغت کر لینا چاہیے۔

بشارت : اصلاً ب پر پیش اور زیر ہے۔ اردو والے صرف بہ فتحِ اول استعمال کرتے ہیں۔ آصفیہ میں "بِشارت" لکھا ہوا ہے۔ مؤلف نے مزید لکھا ہے،

"بول چال میں بہ فتحِ موحدہ، صحیح بہ ضمّ یا بکسر با"۔ اِس طرح کے اندراجات غلط فہمی پیدا کرتے ہیں۔ اردو میں "بُشارت" لکھنے کا مطلق جواز نہیں۔ یہی صورت "پشارت" کی ہے۔ اردو میں اب صحیح صورت "بشارت" ہے اور اِس لفظ کو صرف اِسی طرح ماننا چاہیے۔

بقراط: نور میں یہ لفظ موجود نہیں۔ آصفیہ میں "بُقراط" (بہ فتحِ اول) ہے۔ مولف نے صراحت بھی کی ہے: "صحیح بہ فتحِ موحدہ، اور زبان زدِ خاص و عام بہ ضمِّ موحدہ"۔ جب زبان زدِ خاص و عام بہ ضمِّ حرفِ اول ہے، تو پھر "بَقراط" لکھنے کا جواز کیا ہے؟ اردو میں اب اِس لفظ کو صرف بہ ضمِّ اول ماننا چاہیے اور بہ فتحِ اول کو اردو سے غیر متعلق سمجھنا چاہیے۔

بنفشہ: نور میں اِس کو "بہ فتحِ با و نون و شین" لکھا ہے، اردو میں اِسی طرح بولتے ہیں، مگر مولف نے اس تلفظ کو فارسی سے بھی متعلق بتایا ہے: یہ درست نہیں۔ فارسی میں بہ فتحِ اول و ضمِّ نون اور بہ ضمّتین ہے۔ آصفیہ میں "بَنَفشہ" لکھا ہوا ہے، مگر اِس میں بھی یہ وضاحت نہیں کہ یہ اُردو کا تصرف ہے۔ اس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ فارسی میں جو بھی صورت ہو، اردو میں یہ صرف بہ فتحِ اول و دوم و چہارم مستعمل ہے، اور اردو کی حد تک اِسی کو صحیح ماننا چاہیے۔

بہادر: لُغات میں اِس کو بہ ضمِّ دال لکھا گیا ہے۔ یہ لفظ اِس طرح بھی مستعمل ہے اور اس کا ایک تلفظ بہ فتحِ دال بھی ہے۔ اِس تلفظ کو بھی تسلیم کرلینا چاہیے۔ یہ اردو کا تصرف ہوگا۔

بہزاد: بہ لحاظِ اصل یہ لفظ بکسرِ اول ہے (بِہزاد) مگر اردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اول ہے، اور اردو کے لحاظ سے یہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔ آصفیہ میں

یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں ہے اور اُس میں اصل کے مطابق بہ کسرِ اول ہی لکھا گیا ہے۔

بہشت : نور میں اِس کو بہ کسرتین لکھا گیا ہے، مگر اردو میں بہ کسرِ اول و دوم کوئی نہیں بولتا۔ اُردو میں اِس لفظ کو بہ فتحِ اول و کسرِ دوم ہی سمجھنا چاہیے۔

بیاباں : فارسی میں حرفِ اول کو مفتوح بھی بتایا گیا ہے اور مکسور بھی۔ اردو میں یہ عموماً زبانوں پر بہ کسرِ اول ہے، نور میں اِس لفظ کے اعراب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ دونوں حرکات قابلِ تسلیم ہیں (بِیاباں، بَیاباں)

پروردگار : اصل کے لحاظ سے دال موقوف ہے، نور اللغات میں بھی اِسی طرح ملتا ہے؛ مگر گفتگو میں دال مکسور ہو جاتا ہے۔ اگر اصل کے مطابق کوشش کرکے دال کو موقوف رکھا جائے اور "پَرْ وَرْدْ گار" کہا جائے تو گفتگو کی روانی پر اچانک حرف آجائے گا۔ یہ صورت اِس لفظ سے خاص ہے۔ جیسے ایک اور لفظ ہے "خداوندگار"، اُس کی یہ صورت نہیں، اُس میں دال موقوف ہی ہے۔

پریشاں : فارسی میں حرفِ اول مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی۔ اِسی رعایت سے مولفِ نور نے اِس کو دونوں طرح لکھا ہے، اور اُن کی تحریر سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ فارسی کی طرح اردو میں بھی حرفِ اول مکسور اور مفتوح ہے۔ مگر یہ ٹھیک نہیں۔ اُردو میں یہ صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔ بہ کسرِ اول کو فارسی سے متعلق قرار دینا چاہیے۔

پژمردہ : فارسی میں حرفِ اول مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی۔ اردو میں یہ صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔

پنجرہ : آصفیہ میں اِس کو "پِنجرہ" لکھا گیا ہے، یعنی نون ساکن اور جیم موقوف۔ اس کے برخلاف نور میں "پِنجَرہ" ہے، یعنی جیم مفتوح۔ مولف نے

قوسین میں یہ بھی لکھا ہے : " اردو میں بہ سکونِ جیم بھی مستعمل ہے " ۔ اِس انداز نگارش سے مترشح ہوتا ہے کہ مولف کی رائے میں اردو میں یہ لفظ دونوں طرح مستعمل ہے ۔ بہ حرکتِ جیم کی سند میں تنیر کا یہ شعر لکھا گیا ہے :

جوشش جنوں ہمیشہ ہے دل ہائے چاک میں
شیروں سے خالی ایک گھڑی پنجرے نہیں

مگر استعمالِ عام میں یہ لفظ صرف بہ جیم موقوف آتا ہے ۔ بہ حرکتِ جیم کو اسے قسم شاذ اور اب متروک سمجھنا چاہیے ، اور اس کی صراحت کی جانا چاہیے ۔

پوچ : فارسی میں واو معروف ہے ۔ اسی رعایت سے نور میں بھی واو پر معروف ہونے کی علامت ملتی ہے (پُوچ) ۔ بول چال میں عام طور پر یہ بہ واوِ مجہول سننے میں آتا ہے ، بہ واوِ معروف شاید ہی کوئی بولتا ہو ۔ اردو میں بہ واوِ مجہول کو مرجح قرار دینا چاہیے ۔ آصفیہ میں معروف و مجہول کی صراحت نہیں ملتی ۔

تشنہ : آصفیہ میں " تشنہ " اور " تشنگی " کی ت پر زیر لگا ہوا ہے ۔ اِس کے برخلاف نور میں اِس کو بہ فتحِ اول لکھا گیا ہے اور بہ کسرِ اول کو غلط بتایا گیا ہے : " بہ فتحِ تا صحیح ہے ، بہ کسرِ تا غلط " ۔ فارسی میں جو بھی صورت ہو ، اردو میں زبانوں پر یہ دونوں لفظ عموماً بہ کسرِ اول ہیں ، اور یہی تلفظ مرجح ہے ۔ اِن لفظوں کی دونوں حرکات کو درجِ لغت ہونا چاہیے ، مگر اس صراحت کے ساتھ کہ اردو میں مستعمل بہ کسرِ اول ہیں ، اور یہ اردو کا تصرف ہے ، اور صحیح دونوں طرح ہیں ۔

تغلق : غیاث اللغات میں اِس کو بہ ضمِ اول و سوم (تُغلُق) لکھا گیا ہے اور صراحت کر دی گئی ہے کہ " از لغاتِ ترکی نوشتہ شدہ " ۔ اردو میں یہ لفظ بہ ضمِ اول و فتحِ سوم (تُغلَق) مستعمل ہے ، اور اردو کے لیے اس کی یہی صورت

صحیح مانی جائے گی۔ آصفیہ و نور میں یہ لفظ موجود نہیں۔

تلمیذ : صاحبِ نور اللغات نے لکھا ہے : "تلمیذ ع۔ یہ لفظ عربی میں بالفتح، فارسی میں بالکسر ہے۔" یہ برعکس بات ہے۔ یہ لفظ عربی میں بہ کسرِ اول ہے (المنجد) یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ شاید یہ فارسی کے لفظ "تلمیذ" بہ فتحِ اول کی تعریب ہے : "تلمیذ بالکسر، شاگرد، تلامذہ جمع۔ وظاہرا فارسی است و عربیِ فصیح نیست، ولہذا صاحبِ قاموس نیاوردہ، اما تحقیق آن است کہ معرّبِ تلمیذ است بالفتح" (منتخب اللغات)۔ مطلب یہ ہوا کہ فارسی میں بہ فتحِ اول ہے۔ اور عربی میں بہ کسرِ اول۔ اردو میں صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔ بہ کسرِ اول کو عربی سے متعلق سمجھنا چاہیے۔

تیمور : آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں اِس کو اصل کے مطابق بر وزنِ "ذی نور" لکھا گیا ہے، مگر اردو میں عموماً زبانوں پر بہ فتحِ اول ہے۔ اور کبھی کبھار بہ کسرِ اول و یائے مجہول بھی سُننے میں آجاتا ہے۔

جبروت : اصلاً بہ فتحِ اول و دوم ہے۔ اردو میں یہ بہ سکونِ دوم بھی مستعمل ہے، اور یہ اردو کا تصرّف ہے۔ اِس لفظ کی دونوں صورتیں تسلیم کر لینا چاہیے۔ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں یہ لفظ اصل کے مطابق صرف بہ فتحِ اول و دوم ہے۔

جدّہ : عربی میں بہ فتحِ اول و دالِ مشدّدِ مفتوح کے معنی ہیں : مادرِ مادر و مادرِ پدر (منتخب اللغات)۔ اور معروف بندرگاہ کے معنی میں بہ کسرِ اول اور بہ ضمِ اول دونوں طرح ہے (غیاث اللغات)۔ اردو میں اِن دونوں معانی میں یہ لفظ صرف بہ فتحِ اول و دالِ مشدّدِ مفتوح مستعمل ہے، اور اردو میں اسی طرح صحیح مانا جائے گا۔

جرح : اردو میں یہ لفظ بکسرِ اول و فتحِ دوم بھی بول چال میں آتا ہے، اور اس کی یہ صورت بھی قابلِ تسلیم ہے۔ آصفیہ کے اندراج سے یہ معلوم ہوتا ہے: "قانونی معنی میں بالفتح پڑھنا چاہیے"۔ یعنی مؤلف کے نزدیک اس کی صرف دو صورتیں ہیں، جُرْح، جَرْح۔ مگر "جُرْح" (بہ ضمِ اول و سکونِ دوم) تو اردو میں مطلقاً مستعمل نہیں۔ اس کو عربی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔ ترکیب کی صورت میں عموماً یہ بہ سکونِ دوم آتا ہے، جیسے، جرح و تعدیل۔ ج کو عموماً زیر کے ساتھ ہی بولا جاتا ہے، ممکن ہے کہ کچھ لوگ بہ صورتِ ترکیب اس کو بہ فتحِ اول بھی بولتے ہوں، مگر مفرد لفظ "جرح" بہ کسرِ اول و فتحِ دوم ہی گفتگو میں آتا ہے۔ "جرح کرنا" میں بھی اِس لفظ کی یہی صورت رہتی ہے۔

جسارت : اصلاً بہ فتحِ اول ہے۔ بول چال میں یہ بہ کسرِ اول بھی آتا ہے۔ اِس لفظ کی دونوں حرکات مان لینا چاہیے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں ہے اور صرف بہ فتحِ اول۔

جفر : (ایک علم کا نام) اصلاً بہ سکونِ دوم ہے۔ اردو میں بہ فتحِ اول و دوم مستعمل ہے، اور اردو کے لحاظ سے یہ مرجح ہے۔ چوں کہ نظم میں یہ اصل کے مطابق بہ سکونِ دوم استعمال کیا گیا ہے، اِس لیے اِس لفظ کو دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے، مگر اس صراحت کے ساتھ کہ اردو میں اب مستعمل بہ فتحتین ہے۔

جمع : اصلاً یہ لفظ بہ سکونِ دوم ہے۔ اِس طرح استعمال میں بھی آتا ہے۔ ترکیبوں میں تو صرف اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے اور اسی طرح استعمال بھی کرنا چاہیے، البتہ گفتگو میں عام طور پر یہ بہ فتحِ دوم آتا ہے، جیسے، بہت مال جمع ہو گیا ہے۔ اِس صراحت کے ساتھ اِس لفظ کو بہ فتحِ دوم بھی درست مان لینا چاہیے، اور یہ اردو کا تصرف ہوگا۔ تراکیب میں یہ بہ دستور بہ سکونِ دوم رہے گا۔ (توصیفی)

اضافی، عطفی، کوئی سی بھی ترکیب ہو)۔

جنازہ : عربی میں حرفِ اول مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی (منتخب اللغات)۔
اردو میں صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔

جنوب : اصل میں ج پر زبر ہے۔ اُردو میں بہ ضمِّ دوم استعمال ہوتا ہے، اور اب یہی مرجّح صورت ہے۔ لغت میں دونوں حرکات کا اندراج ہونا چاہیے، مگر صراحت کے ساتھ۔

چراغ : فارسی میں حرفِ اول کو مفتوح بھی کہا گیا ہے اور مکسور بھی (غیاث اللغات)۔ اردو میں بھی یہ دونوں طرح سننے میں آتا ہے، مگر بہ فتحِ اول کم اور بہ کسرِ اول زیادہ۔ "چراغی" تو بہ کسرِ اول ہی بولا جاتا ہے۔ "چراغاں" دونوں طرح سننے میں آیا ہے۔ اردو میں دونوں صورتوں کو صحیح ماننا چاہیے مگر مندرجۂ بالا صراحت کے ساتھ۔ آصفیہ میں "چَراغ" لکھا ہوا ہے، اور بہ کسرِ اول کے متعلق کچھ وضاحت نہیں کی گئی۔ نور میں فارسی کے اختلاف کا تو ذکر کیا گیا ہے، مگر یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ اُردو میں کیا صورت ہے۔

چکن : اردو میں یہ لفظ صرف بہ کسرِ اول و فتحِ دوم مستعمل ہے، اور اردو میں اب اِسی طرح صحیح اور فصیح ہے۔ آصفیہ میں "چِکَن" لکھا گیا ہے مگر قوسین میں یہ بھی لکھا ہوا ہے، "میم بہ کسرِ تین"۔ اِس اندراج سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اردو میں بھی یہ بہ کسرِ اول و دوم ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہوگا اور مولّف کا بھی یہ مطلب نہیں۔ بہ کسرِ تین کو فارسی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔ نور میں اِس کی اصل حرکات "بہ فتحِ اول و کسرِ دوم" بتائی گئی ہیں، مگر یہ اندراج صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اصلاً یہ بہ کسرِ اول و دوم ہے۔ اور اُردو میں یہ صرف بہ کسرِ اول و فتحِ دوم ہے۔

ججم : اصلاً یہ لفظ بہ سکونِ دوم صحیح ہے۔ اردو کی بول چال میں یہ اکثر بہ فتحِ دوم

آتا ہے۔ اِس لفظ کو دونوں طرح صحیح مان لینا چاہیے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں صرف بہ سکونِ دوم ہے۔

حلق : بہ لحاظِ لغت بہ فتحِ اول و سکونِ دوم ہے، مگر زبانوں پر بہ فتحِ اول و دوم بھی ہے۔ دونوں طرح مان لینا چاہیے۔ ترکیب کی صورت میں اصل کے مطابق بہ سکونِ دوم ہی آتا ہے۔

حلقوم : لغت میں ح پر پیش ہے، مگر استعمالِ عام میں بہ فتحِ اول ہے۔

حلیہ : خلعت اور صورت و خلقت کے معنی میں اصلاً بہ کسرِ اول ہے اور سونے چاندی (وغیرہ) کے زیور کے معنی میں بہ کسرِ اول و بہ ضمِ اول دونوں طرح ہے (منتخب اللغات)۔ اردو میں یہ لفظ صورت، چہرہ، خط و خال (جو شناخت کے لیے لکھے جائیں) کے معانی میں بہ ضمِ اول استعمال ہوتا ہے، اور اب یہی حرکت قابلِ قبول ہے۔

حوصلہ : لغت میں اِس کو بہ فتحِ اول و سوم و چہارم لکھا گیا ہے۔ نور و آصفیہ میں بھی یہی صورت ملتی ہے۔ بول چال میں بہ سکونِ سوم آتا ہے اور عموماً اِسی طرح مستعمل ہے، اور یہی صورت مرجح ہے۔

خانقاہ : نور میں بہ فتحِ نون اور بہ سکونِ نون دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ اردو میں صرف بہ سکونِ نون مستعمل ہے اور صرف یہی صورت قابلِ قبول ہے۔

خاوند : اصلاً بہ فتحہ واو ہے۔ زبانوں پر بہ کسرِ واو ہے، اور یہی صورت مرجح ہے۔ نور میں لکھا ہوا ہے کہ "اردو میں بہ کسرِ واو زبانوں پر ہے"۔

خباثت : عربی میں خ پر زبر ہے (المنجد)۔ اردو میں زبانوں پر بہ کسرِ اول بھی ہے۔ دونوں حرکات درجِ لغت ہونا چاہیے اِس صراحت کے ساتھ کہ اردو میں عام طور پر بہ کسرِ اول مستعمل ہے، ہاں، آصفیہ و نور دونوں میں

مخباشت" لکھا ہوا ہے۔ آصفیہ میں تو حرکات کے متعلق اور کچھ نہیں لکھا گیا ہے، البتہ نور میں قوسین میں "بہ فتحِ اول" بھی لکھا ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خ پر پیش کتابت کی غلطی ہے، مگر یہ دلچسپ بات ہے کہ دونوں لغات میں یہ غلطی پائی جاتی ہے۔

خجستہ: اصلاً بہ ضمِ اول و فتحِ دوم ہے، مگر اردو میں بہ ضمِ اول و کسرِ دوم مستعمل ہے اور یہی صورت مرجح ہے۔

خدمات: بہ لحاظِ لغت بہ کسرِ اول و فتحِ دوم (خِدَمات) ہے، مگر اردو میں صرف بہ کسرِ اول و سکونِ دوم مستعمل ہے اور اسی طرح فصیح ہے۔ نور میں اس کو عربی کے مطابق "بہ کسرِ اول و فتحِ دوم" لکھا گیا ہے۔ اردو کے تصرف کا ذکر نہیں ملتا۔ آصفیہ میں اس کے برعکس "خِدْمات" ملتا ہے اور اس کو عربی لکھا گیا ہے۔ یہ انتساب صحیح نہیں، یہ تو مہند صورت ہے۔ یہ لکھنا ضروری تھا کہ اصلاً "خِدَمات" ہے اور اردو میں "خِدْمات" مستعمل ہے اور یہ مہند صورت ہے۔

خدیجہ: اصل کے لحاظ سے یہ بہ فتحِ اول و کسرِ دوم، بر وزنِ "نتیجہ" ہے۔ آصفیہ میں یہ موجود نہیں۔ نور میں ہے اور اصل کے مطابق۔ اردو میں یہ لفظ بہ طورِ نام مستعمل ہے اور عام طور پر بہ ضمِ اول و فتحِ دوم مستعمل ہے۔ اس لفظ کی دونوں صورتیں قابلِ قبول ہیں۔

خدیو: فارسی میں یہ کئی طرح ہے، مگر اردو میں عموماً بہ فتحِ اول و کسرِ دوم و یائے مجہول مستعمل ہے اور بہ یائے معروف بھی سننے میں آیا ہے۔

خراج: عربی میں بہ فتحِ اول ہے۔ فارسی والے بہ کسرِ اول بھی کہتے ہیں (غیاث اللغات)۔ اردو میں صرف بہ کسرِ اول مستعمل ہے۔ نور میں اردو کے اس

تصرّف کا ذکر کیا گیا ہے، مگر آصفیہ میں صرف "خَراج" لکھا ہوا ہے۔

خصم : دو لفظ ہیں : (۱) خَصْم، بہ فتحِ اول و سکونِ دوم، اِس کے معنی ہیں، دشمن، بدخواہ، حریف، مقابل وغیرہ۔ (۲) خَصَم، بہ فتحِ اول و دوم، شوہر کو کہتے ہیں۔ آخر الذکر، اردو کی ایجاد ہے، اور عورتوں کی زبان سے بھلا لگتا ہے۔ لفظ تو ایک ہی تھا، اختلافِ معانی نے دو لفظ بنا دیے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ اب لُغت میں اِن کو الگ الگ لکھا جائے۔ آصفیہ میں شوہر کے معنی میں بھی "خَصْم" لکھا گیا ہے؛ یہ ٹھیک نہیں۔ اِس معنی میں متّفقہ طور پر "خَصَم" ہے۔ ہاں مرکّبات میں جب یہ لفظ آئے گا، تو اردو کے عام قاعدے کے مطابق بہ سکونِ دوم آئے گا، جیسے، دو خصمی، خصموں پِٹی، خصموں جلی۔

خصوصیت : لُغت میں خ پر زبر بھی ہے اور پیش بھی۔ نور میں دونوں حرکات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ استعمالِ عام میں صرف بہ ضمِ اول ہے، اور اسی طرح قابلِ قبول ہے۔

خطمی : اصلاً بہ کسرِ اول ہے۔ اردو میں صرف بہ فتحِ اول ہے اور صرف یہی صورت قابلِ ذکر ہے۔ آصفیہ میں "خَطمی" لکھا ہوا ہے، یہ ٹھیک ہے، مگر اِس کو عربی بتایا گیا ہے، یہ ٹھیک نہیں۔ اِس صورت میں یہ ہند ہے۔

خفقان : اصلاً بہ فتحِ اول و دوم ہے۔ آصفیہ میں اسی طرح لکھا گیا ہے۔ بول چال میں بہ سکونِ دوم بھی آتا ہے اور بیش تر اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔ البتہ نظم میں عموماً بہ فتحتین استعمال کیا گیا ہے۔ اِس لفظ کو دونوں طرح ماننا چاہیے؛ یہی صورت "خفقانی" کی ہے۔

خلجان : نور میں اِس کو "بہ فتحِ اول و دوم" لکھا گیا ہے، آصفیہ میں بھی صرف "خَلَجان" لکھا ہوا ہے، یہ اصل کے مطابق تو ہے، مگر اردو میں چلن کے

خلاف ہے۔ گفتگو میں یہ لفظ صرف بہ سکونِ دوم آتا ہے، البتہ نظم میں صرف بہ فتحِ دوم ملتا ہے۔ اِس صراحت کے ساتھ، اِس کی دونوں صورتوں کو صحیح مان لینا چاہیے۔

خلوت : اصلاً بہ فتحِ اول ہے۔ نور میں اِسی رعایت سے لکھا گیا ہے کہ "بالفتح صحیح، بالکسر غلط"۔ مگر یہ فیصلہ غیر مناسب ہے۔ اردو میں بہ کسرِ اول بھی استعمال ہوتا ہے، اور اِس کو بھی صحیح مان لینا چاہیے۔ آصفیہ میں صرف "خِلوت" ہے۔ اِس میں دو قباحتیں ہیں، ایک تو یہ کہ مولف نے بہ کسرِ اول کو عربی لکھا ہے، یہ صحیح نہیں، یہ ہند صورت ہے۔ اور دوسرے یہ کہ صرف بہ کسرِ اول لکھا ہے، جب کہ سماعت میں بہ کسرِ اول اور بہ فتحِ اول دونوں طرح ہے۔

دجلہ : عربی میں دال مفتوح اور مکسور دونوں طرح ہے (منتخب اللغات)۔ اردو میں صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔ نور و آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔

درخشاں : فارسی میں بہ ضمِ اول و دوم ہے۔ نور میں فارسی کے مطابق "بہ ضمِ اول و دوم" لکھا گیا ہے، مگر اردو میں اِس طرح مستعمل نہیں۔ اردو میں عموماً بہ فتحِ اول و دوم (دَرَخشاں) بولا جاتا ہے۔ یہی صورت "درخشندہ" اور "درخشندگی" کی ہے۔ آصفیہ میں "دَرَخشاں" لکھا ہوا ہے۔ اُردو کے لحاظ سے یہ بالکل درست ہے، مگر اِس کو فارسی بتایا گیا ہے، یہ درست نہیں۔ یہ صراحت ضروری تھی کہ یہ اُردو کا تصرف ہے، یعنی موجودہ صورت میں یہ ہند ہے۔

دفع : اصلاً ف ساکن ہے مگر اردو کے محاورے میں یہ عموماً بہ فتحِ فا آتا ہے، جیسے، دفع کرنا، دفع ہونا۔ اِسی طرح "رفع دفع" میں بھی دونوں اجزا میں ف پر زبر آتا ہے، اور یہی صورت "دفعہ" کی ہے۔ یہ اردو کا تصرف ہے اور اِس صورت کو بھی صحیح مان لینا چاہیے۔ تراکیب میں "دفع" بہ سکونِ دوم ہی آتا ہے، جیسے،

دفعِ دخلِ مقدر۔ اِسی طرح "دفعتاً" میں حرفِ ثانی ساکن رہتا ہے۔ "دفعہ" کی جمع "دفعات" تو بہ سکونِ دوم ہی ہے۔ اصل لفظ "دَفْعہ دار" ہے، اِس کا تلفظ "دَفَعَدار" کیا جاتا ہے اور اردو کے لحاظ سے یہی فصیح ہے۔ اگر اسی طرح لکھا بھی جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا، بل کہ زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ بھی اردو کا تصرف ہوگا۔

ذبح : بہ لحاظِ لغت بہ فتحِ اول و سکونِ دوم ہے، مگر بول چال میں بہ فتحِ دوم بھی آتا ہے، بل کہ عموماً اِسی طرح بولا جاتا ہے۔ حرفِ اول کبھی مفتوح رہتا ہے اور کبھی مکسور ہو جاتا ہے۔ اِس لفظ کی یہ تینوں صورتیں قابلِ قبول ہیں، یعنی : ذَبْح، ذَبَح، ذِبَح۔ "ذبیح" اور "ذبیحہ" میں حرفِ اول ہمیشہ مفتوح رہتا ہے۔ ترکیب کی صورت میں اصل کے مطابق ہی استعمال کیا جاتا ہے، جیسے : ذَبْحِ عظیم۔

رجا : عربی میں بہ فتحِ اول ہے۔ اردو والے بہ کسرِ اول بولتے ہیں اور یہ تصرف ہے۔ لغت میں دونوں حرکات کا اندراج ضروری ہے، مگر صراحت کے ساتھ۔

رخشاں : فارسی لغات میں بہ ضمِ اول ہے۔ نور میں بھی اِسی رعایت سے بہ ضمِ اول لکھا گیا ہے، مگر اردو میں "رُخشاں" کوئی نہیں بولتا۔ سب لوگ "رَخشاں" (بہ فتحِ اول) کہتے ہیں، اور اردو میں اب اِسی صورت کو صحیح مانا جائے گا۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔

ردّ و قدح : لغت کے لحاظ سے "قدح" کی دال ساکن ہے (ردّ و قدْح)، مگر اردو والے بہ فتحِ دال "ردّ و قدَح" بولتے ہیں اور یہ اِسی طرح اچھا معلوم ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں کو درجِ لغت ہونا چاہیے۔

رفع : اصلاً بہ سکونِ دوم ہے، مگر اردو میں زبانوں پر بہ فتحِ دوم ہے۔ رفع ہونا،

رفع کرنا، رفع دفع، رفع دفع کرنا؛ اِن سب میں فَ پر ہمیشہ زبر آتا ہے، اور اردو کے لیے یہی صورت مرجّح ہے۔ تراکیب میں البتہ اصل کے مطابق بہ سکونِ دوم رہتا ہے، جیسے، رفعِ حاجات، رفعِ شر وغیرہ۔

رفعت : بہ لحاظِ لغت حرفِ اول مکسور ہے (رِفعت) نور میں اِسی رعایت سے یہ لکھا گیا ہے کہ: "بالکسر و فتحِ سوم۔ بالفتح غلط ہے"۔ مگر زبانوں پر بہ فتحِ اول بھی ہے۔ اِس لفظ کو دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے۔ آصفیہ میں بھی صرف بہ کسرِ اول لکھا ہوا ہے۔

رکاب : اصلاً بہ کسرِ اول ہے۔ نور و آصفیہ میں بھی بہ کسرِ اول لکھا گیا ہے، مگر اردو میں صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہے اور اب اِسی طرح صحیح ہے۔ "رکاب دار" بھی بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔

رکابی : یہ بھی لُغت کے لحاظ سے بہ کسرِ اول ہے، مگر اردو میں بہ فتحِ اول بولا جاتا ہے اور اب یہی صورت صحیح ہے۔ "رکابی مذہب" میں بھی رَ مفتوح رہتی ہے۔ نور میں اِس کو بھی، اصل کے مطابق، صرف بہ کسرِ اول لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں رَ پر زبر لگا ہوا ہے۔ اردو کے لحاظ سے یہ بالکل درست ہے، مگر اِس کو فارسی بتایا گیا ہے، یہ درست نہیں۔ فارسی میں بہ کسرِ اول ہے اور بہ فتحِ اول اردو کا تصرف ہے۔

رمضان : نور و آصفیہ میں اِس کو بہ فتحتین لکھا گیا ہے اور یہ اصل کے مطابق ہے، مگر زبانوں پر بہ سکونِ دوم ہے۔ مولفِ نور نے اِس سلسلے میں لکھا ہے کہ: "عوام بہ سکونِ دوم و اظہارِ نون بولتے ہیں، لیکن اس کے مرکبات یعنی رمضانی اور رمضان خاں میں فصحا کی زبان پر بھی بہ سکونِ دوم ہے"۔ آصفیہ میں "رمضانی" اور "رمضان کے نمازی" کو بھی بہ فتحِ اول و دوم ہی لکھا گیا ہے۔ صاحبِ نور

کا یہ لکھنا کہ بہ سکونِ دوم عوام بولتے ہیں، اب قابلِ قبول نہیں۔ اب عام و خاص سبھی بہ سکونِ دوم بولتے ہیں۔ نظم میں البتہ بہ فتحِ دوم آتا ہے۔
"رمضان" کو دونوں طرح (بہ فتحِ اول و دوم، اور بہ فتحِ اول و سکونِ دوم) صحیح ماننا چاہیے، اور "رمضانی" اور "رمضان" بہ طورِ نام صرف بہ سکونِ دوم استعمال میں آتے ہیں۔

رمل : (ایک علم کا نام) اس معنی میں اصلاً بہ فتحِ اول و سکونِ دوم ہے، مگر زبانوں پر بہ فتحِ دوم ہے۔ "رَمَل" ایک بحر کا نام بھی ہے اور اس معنی میں یہ اصلاً بہ فتحِ اول و دوم ہے۔ اب اردو میں صورت یہ ہے کہ دونوں معانی میں یہ لفظ بہ فتحِ اول و دوم ہی مستعمل ہے۔

رہن : اصل میں بہ فتحِ اول ہے۔ اردو والے عام طور پر بہ کسرِ اول بولتے ہیں اور اردو کے لحاظ سے یہی صورت مرجّح ہے۔

زراعت : لغت میں بہ فتحِ اول، زبانوں پر بہ کسرِ اول ہے۔ دونوں حرکات قابلِ اندراج ہیں۔

زمام : اصلاً بہ کسرِ اول ہے، نور میں بھی اصل کی رعایت سے اِس کو بہ کسرِ اول لکھا گیا ہے، مگر اردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اول ہے، اور اردو میں یہی صورت مرجّح ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔

سبقت : اصلاً بہ فتحِ اول و دوم ہے۔ اردو نظم میں اِس طرح بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اور بہ سکونِ دوم بھی نظم کیا گیا ہے۔ زبانوں پر صرف بہ سکونِ دوم ہے۔ دونوں طرح درست ہے۔

سپرد : فارسی مصدر "سپردن" کی حرکات میں اچھا خاصا اختلاف ہے، بہ ضمتین بھی ہے۔ بہ کسرِ اول و فتحِ ثانی بھی ہے۔ بہ ضمِ اول و فتحِ ثانی بھی لکھا گیا ہے (وغیرہ) تفصیل

کے لیے دیکھیے غیاث اللغات۔ نور میں "سپرد" کو بکسرِ اول و ضمِ ثانی (سِپُرد) لکھا گیا ہے۔ آصفیہ میں بھی اِسی طرح لکھا گیا ہے، مگر مولف نے قوسین میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "بہ ضمِ اول زبان زد ہے"، اور یہ بالکل صحیح ہے۔ مختصر یہ کہ اِس لفظ کو بہ ضمِ اول و دوم اور بکسرِ اول و ضمِ دوم دونوں طرح درست ماننا چاہیے۔

سرشک : فارسی میں بکسرِ اول و دوم ہے (برہانِ قاطع)۔ اردو میں بہ فتحِ اول و کسرِ دوم مستعمل ہے، اور اردو میں اِسی طرح صحیح ہے۔

سرود : اصلاً بہ ضمِ اول و دوم ہے، بہ معنی "نغمہ و سماع"۔ اردو میں اِس معنی میں بھی، اور ایک قسم کے ساز کے معنی میں بھی، بہ فتحِ اول و ضمِ دوم ہی استعمال کرتے ہیں۔ ہاں، واو مجہول رہتا ہے۔

سروش : اصلاً بہ ضمِ اول و دوم۔ اردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اول و ضمِ دوم ہے۔ واو یہاں بھی مجہول ہے۔ آصفیہ میں س پر پیش لگا ہوا ہے، البتہ نور میں "بہ فتحِ اول" لکھا ہوا ہے، مگر یہ صراحت نہیں کی گئی کہ بہ فتحِ اول اردو کا تصرف ہے۔

سطح : اصل میں بہ فتحِ اول و سکونِ دوم ہے۔ اردو میں زبانوں پر بہ فتحِ دوم بھی ہے۔ نظم میں البتہ اصل کے مطابق بہ سکونِ دوم ہی آتا ہے، اور بہ حالتِ ترکیب بھی اصل کے مطابق استعمال کیا جاتا ہے، جیسے: سطحِ گردوں۔ اِس تفصیل کے ساتھ اِس کی دونوں صورتوں کو شاملِ لغت کرنا چاہیے۔

سطر : "سطح" کی طرح "سطر" بھی اصلاً بہ سکونِ دوم ہے۔ تراکیب میں اور نظم میں اِسی طرح استعمال ہوا ہے اور ہوتا ہے، اور بول چال میں ط پر زبر آتا ہے۔ اِس کی دونوں صورتیں قابلِ تسلیم ہیں، مگر صراحت کے ساتھ۔

سفال : فارسی میں حرفِ اول مضموم بھی ہے اور مکسور بھی، اردو میں بکسرِ اول مستعمل ہے۔ آصفیہ میں س پر پیش اور زیر دونوں حرکات لگی ہوئی ہیں؛

تِشغال"۔ البتہ نور میں صراحت کردی گئی ہے کہ، "اردو میں زبانوں پر بکسرِ اول ہے"

سمت : اصلاً بہ فتحِ اول ہے، اردو والے زیادہ تر بکسرِ اول بولتے ہیں۔ دونوں حرکات قابلِ تسلیم ہیں۔ آصفیہ میں سَ کی حرکت کو ظاہر نہیں کیا گیا۔ نور میں البتہ اصل حرکات کے ساتھ یہ صراحت ملتی ہے کہ، "اردو میں بالکسر ہی زبانوں پر ہے"

شتر : اصل میں بہ ضمِ اول و دوم ہے۔ نور و آصفیہ میں اِسی طرح لکھا گیا ہے، بل کہ دونوں مولفین نے صراحت کردی ہے کہ بہ فتحِ دوم غلط ہے، مگر اردو میں زبانوں پر بہ فتحِ دوم بھی ہے۔ اِس لفظ کو دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے۔

شرح : بیان، اظہار، تفصیل و تشریح کے معانی میں اصلاً بہ فتحِ اول و سکونِ دوم ہے۔ اردو نظم میں اور تراکیب میں اسی طرح استعمال ہوتا ہے، مگر مفرد لفظ گفتگو میں بہ فتحِ دوم ہی آتا ہے، اور یہ اردو کا تصرّف ہے۔ صراحت کے ساتھ دونوں صورتوں کو شاملِ لغت کرنا چاہیے۔ نرخ، قیمت، مول، بھاؤ کے معانی میں اردو ہے اور اِن معانی میں عموماً بہ فتحِ دوم آتا ہے۔

شطرنج : فارسی میں اس کو بکسرِ اول و فتحِ اول دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ اِسی رعایت سے نور و آصفیہ میں بھی دونوں حرکات کا ذکر کیا گیا ہے، مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ اردو میں کیا صورت ہے۔ اردو میں یہ صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہے اور یہی مرجّح ہے۔

شعبدہ : عربی میں بہ فتحِ اول و سوم و چہارم ہے۔ لغات میں اس طرح بھی لکھا گیا ہے۔ مگر اردو والے اِس طرح نہیں بولتے۔ اردو میں اِس کو بہ ضمِ اول استعمال کیا جاتا ہے اور ب ساکن رہتی ہے۔ ضرورتاً ب مفتوح ہوسکتی

ہے، مگر ش پر پیش ہی رہتا ہے۔ نور و آصفیہ میں بہ ضمِ شین بھی لکھا گیا ہے۔

شعور : اصلاً بہ ضمِ اول ہے، نور میں بھی اِسی طرح لکھا گیا ہے، مگر استعمالِ عام میں بہ فتحِ اول ہے۔ آصفیہ میں بھی بہ فتحِ اول ہے۔

شکوہ : شان و شوکت، رعب داب (وغیرہ) کے معانی میں اصلاً بہ ضمِ اول و دوم ہے اور بہ کسرِ اول کے معنی ہیں "ترس و بیم"۔ اردو میں یہ امتیاز باقی نہیں رہا۔ یہاں یہ شان و شوکت (وغیرہ) کے معانی میں عموماً بہ کسرِ اول مستعمل ہے۔

شکیب : فارسی میں حرفِ اول و دوم مکسور ہے۔ نور میں بھی اِس کو اسی طرح لکھا گیا ہے اور آصفیہ میں بھی ش پر زیر لگا ہوا ہے، مگر اردو میں بہ کسرِ اول شاید ہی کوئی بولتا ہو۔ عموماً بہ فتحِ اول بولا جاتا ہے اور اِسی طرح مرجح ہے۔ یہی صورت "شکیبا" کی ہے۔

شمشاد : فارسی میں ش پر زیر بھی ہے اور زبر بھی۔ اردو میں صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔ آصفیہ میں ش پر زبر بھی لگا ہوا ہے اور زیر بھی (شِمشاد)، یہ فارسی کی تقلیدِ محض ہے۔

شمع : عربی میں موم کے معنی میں یہ بہ فتحِ اول و دوم (شَمَع) تھا (منتخب اللغات)۔ بعد کو "موم بتی" کے معنی میں بہ سکونِ دوم رائج ہو گیا، اور اِس صورت کو "مولّد" کہا گیا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ تراکیب میں اور نظم میں بہ سکونِ دوم ہی آتا ہے، مگر مفرد لفظ زبانوں پر بہ فتحِ اول و دوم ہے۔ اِسی طرح "شمع دان" میں بھی م مفتوح رہتا ہے۔

صدقہ : بہ لحاظِ اصل بہ فتحِ اول و دوم و سوم ہے۔ اردو میں بہ فتحِ اول و بہ سکونِ دوم مستعمل ہے۔

صلح : اصلاً بہ ضمِ اول و سکونِ دوم ہے۔ اردو میں نظم اور تراکیب میں تو اِسی طرح آتا ہے اور بول چال میں بہ ضمِ اول و فتحِ دوم آتا ہے۔ دونوں صورتیں قابلِ تسلیم ہیں۔

صندوق : عربی میں بہ ضمِ اول تھا، فارسی میں بہ فتحِ اول ہوا، اور اردو میں صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔ آصفیہ میں ص پر زبر اور پیش دونوں حرکات ملتی ہیں (صَنُدوق)۔ ص کے پیش کو عربی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔

صومعہ : اصلاً بہ فتحِ اول وسوم ہے۔ اردو میں زبانوں پر بہ فتحِ اول وکسرِ سوم بھی ہے۔ دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔

طغرل : اصل میں بہ ضمِ اول وکسرِ سوم ہے (طُغرِل)۔ اردو میں اسے بہ ضمِ اول وفتحِ دوم استعمال کرتے ہیں اور یہی مرجح ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں، اور نور میں اس کو اصل کے مطابق بہ کسرِ سوم ہی درج کیا گیا ہے۔

طمطراق : اصلاً بہ ضمِ اول وسوم ہے۔ نور و آصفیہ میں بھی اسی طرح ملتا ہے۔ بول چال میں بہ فتحِ اول وسوم بھی آتا ہے اور یہ صورت بھی قابلِ تسلیم ہے۔

طہارت : اصلاً بہ فتحِ اول ہے۔ زبانوں پر بہ کسرِ اول بھی ہے، اور یہ صورت بھی قابلِ تسلیم ہے۔ آصفیہ میں اس کے اعراب کی نشان دہی نہیں کی گئی اور نور میں صرف بہ فتحِ اول ملتا ہے۔

ظرافت : یہی صورت اس لفظ کی بھی ہے کہ اصلاً بہ فتحِ اول ہے اور زبانوں پر بہ کسرِ اول بھی ہے۔ اس کو بھی دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے۔

عجلت : عربی میں بہ کسرِ اول ہے۔ آصفیہ میں بھی عربی کے مطابق ع پر زیر لگا ہوا ہے۔ اردو میں اس طرح قطعاً مستعمل نہیں، اردو والے بہ ضمِ اول استعمال کرتے ہیں۔ اور اردو میں اسی طرح صحیح ماننا چاہیے۔ نور میں یہ صراحت موجود ہے۔

عرفہ : اصلاً بہ فتحِ اول ودوم ہے۔ اردو میں صرف بہ فتحِ اول وسکونِ دوم مستعمل ہے۔

عروس : بہ لحاظِ اصل ع پر زبر ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ حرکات کی صراحت کے بغیر لکھا گیا ہے۔ نور میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ بہ فتحِ اول صحیح اور بہ ضمِ اول غلط

ہے۔ اردو میں زبانوں پر بہ ضمِ اول بھی ہے، بل کہ اکثر لوگ اسی طرح بولتے ہیں۔ اِس لفظ کو دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے۔

عروض : عروس کی طرح "عروض" بھی زبانوں پر بہ ضمِ اول ہے، اور یہ صورت بھی قابلِ تسلیم ہے۔

عطارد : اصلاً بہ ضمِ اول و کسرِ چہارم (عُطارِد) ہے۔ بول چال میں بہ فتحِ چہارم آتا ہے۔ یہ صورت بھی قابلِ تسلیم ہے۔

علاوہ : آصفیہ میں بہ کسرِ اول ہے۔ یہ اصل کے مطابق ہے، مگر اردو والے صرف بہ فتحِ اول استعمال کرتے ہیں، اور اردو میں اِسی طرح صحیح مانا جائے گا۔

عملہ : آصفیہ میں بہ فتحِ اول و دوم ہے۔ یہ عربی کے مطابق ہے، مگر اردو میں بہ سکونِ دوم مستعمل ہے، اور یہی صورت مرجح ہے۔

عنایت : عربی میں "ع" مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی۔ اردو میں صرف بہ کسرِ اول ہے۔

عندلیب : اصلاً بہ فتحِ اول ہے۔ نور و آصفیہ میں بھی اِسی طرح ہے۔ زبانوں پر بہ کسرِ اول بھی ہے۔ دونوں حرکات قابلِ قبول ہیں۔

عنوان : عربی میں بہ کسرِ اول و بہ ضمِ اول دونوں طرح ہے (منتخب اللغات)۔ آصفیہ میں عربی کی رعایت سے "ع" پر زیر بھی لگایا گیا ہے اور پیش بھی۔ اردو میں صرف بہ ضمِ اول مستعمل ہے۔

غدر : اصل میں بہ فتحِ اول و سکونِ دوم ہے۔ نور و آصفیہ میں بھی اِسی طرح ہے۔ مگر اردو میں کیا خواص کیا عوام، سبھی "غَدَر" کہتے ہیں، "غَدْر" کوئی نہیں کہتا۔ یہاں نظم سے بحث نہیں۔

غلاف : لغت میں بہ کسرِ اول ہے۔ زبانوں پر بہ فتحِ اول بھی ہے۔ دونوں حرکات قابلِ قبول ہیں۔

غیاث : اصل میں "غ" مکسور ہے۔ زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اول ہے۔ دونوں صورتیں

درست مانی جائیں گی۔

فتح : اصلاً ت ساکن ہے۔ نظم اور فارسی تراکیب میں اسی طرح مستعمل ہے۔ البتہ بول چال میں بہ فتحِ دوم آتا ہے اور اس حد تک یہ صورت بھی قابلِ تسلیم ہے۔

فراواں : فارسی میں بہ کسرِ اول ہے۔ اردو لغات میں بھی اسی طرح ہے۔ زبانوں پر بہ فتحِ اول بھی ہے اور بیش تر اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی صورت "فراوانی" کی ہے، کہ یہ بھی عموماً بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔

فروزاں : فارسی میں بہ ضمِ اول و دوم ہے۔ اردو والے بہ فتحِ اول استعمال کرتے ہیں۔ یہی صورت "فروز" کی ہے، جیسے، دل فروز۔

فروغ : اصلاً بہ ضمِ اول و دوم۔ اردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اول ہے۔ دونوں حرکات قابلِ تسلیم ہیں۔

فریدوں : اردو میں صرف بہ فتحِ اول ہے۔

فوّارہ : آصفیہ و نور دونوں میں ف پر زبر ہے، مگر زبانوں پر بہ ضمِ اول ہے۔ دونوں صورتیں قابلِ قبول ہیں۔

قبول : نور و آصفیہ دونوں میں بہ فتحِ اول ہے، یہ اصل کے مطابق ہے، مگر بول چال میں عموماً بہ ضمِ اول آتا ہے۔ یہی صورت "قبولیت" کی ہے۔

قدامت : اصلاً ق مفتوح ہے۔ گفتگو میں بہ کسرِ اول بھی آتا ہے۔

قزلباش : اصل میں بہ کسرتین ہے (قِزِلباش)۔ نور و آصفیہ میں بھی اسی طرح۔ اردو والے بہ فتحِ اول و کسرِ دوم استعمال کرتے ہیں اور اردو میں یہی صورت مرجح مانی جائے گی۔

قطامہ : لغت میں بہ فتحِ اول ہے۔ اردو میں زبانوں پر بہ ضمِ اول بھی ہے۔

قطعہ : اصلاً بہ کسرِ اول ہے۔ زیادہ تر بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔ دونوں

ہے۔ اردو میں زبانوں پر بہ ضمِّ اول بھی ہے، بلکہ اکثر لوگ اِسی طرح بولتے ہیں۔ اِس لفظ کو دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے۔

عروض : عروس کی طرح "عروض" بھی زبانوں پر بہ ضمِّ اول ہے، اور یہ صورت بھی قابلِ تسلیم ہے۔

عطارد : اصلاً بہ ضمِّ اول و کسرِ چہارم (عُطارِد) ہے۔ بول چال میں بہ فتحِ چہارم آتا ہے۔ یہ صورت بھی قابلِ تسلیم ہے۔

علاوہ : آصفیہ میں بہ کسرِ اول ہے۔ یہ اصل کے مطابق ہے، مگر اردو والے صرف بہ فتحِ اول استعمال کرتے ہیں، اور اردو میں اِسی طرح صحیح مانا جائے گا۔

عملہ : آصفیہ میں بہ فتحِ اول و دوم ہے۔ یہ عربی کے مطابق ہے، مگر اردو میں بہ سکونِ دوم مستعمل ہے، اور یہی صورت مرجح ہے۔

عنایت : عربی میں ع مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی۔ اردو میں صرف بہ کسرِ اول ہے۔

عندلیب : اصلاً بہ فتحِ اول ہے۔ نور و آصفیہ میں بھی اِسی طرح ہے۔ زبانوں پر بہ کسرِ اول بھی ہے۔ دونوں حرکات قابلِ قبول ہیں۔

عنوان : عربی میں بہ کسرِ اول و بہ ضمِّ اول دونوں طرح ہے (منتخب اللغات)۔ آصفیہ میں عربی کی رعایت سے ع پر زیر بھی لگایا گیا ہے اور پیش بھی۔ اردو میں صرف بہ ضمِّ اول مستعمل ہے۔

غدر : اصل میں بہ فتحِ اول و سکونِ دوم ہے۔ نور و آصفیہ میں بھی اِسی طرح ہے۔ مگر اردو میں کیا خواص کیا عوام، سبھی "غَدَر" کہتے ہیں، "غَدْر" کوئی نہیں کہتا۔ یہاں نظم سے بحث نہیں۔

غلاف : لغت میں بکسرِ اول ہے۔ زبانوں پر بہ فتحِ اول بھی ہے۔ دونوں حرکات قابلِ قبول ہیں۔

غیاث : اصل میں غ مکسور ہے۔ زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اول ہے۔ دونوں صورتیں

درست مانی جائیں گی۔

فتح : اصلاً ت ساکن ہے۔ نظم اور فارسی تراکیب میں اسی طرح مستعمل ہے۔
البتہ بول چال میں بہ فتحِ دوم آتا ہے اور اس حد تک یہ صورت بھی قابلِ تسلیم ہے۔

فراواں : فارسی میں بہ کسرِ اول ہے۔ اردو لغات میں بھی اسی طرح ہے۔ زبانوں پر
بہ فتحِ اول بھی ہے اور بیش تر اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی صورت
"فراوانی" کی ہے، کہ یہ بھی عموماً بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔

فروزاں : فارسی میں بہ ضمِ اول و دوم ہے۔ اردو والے بہ فتحِ اول استعمال کرتے
ہیں۔ یہی صورت "فروز" کی ہے، جیسے، دل فروز۔

فروغ : اصلاً بہ ضمِ اول و دوم۔ اردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اول ہے۔
دونوں حرکات قابلِ تسلیم ہیں۔

فریدوں : اردو میں صرف بہ فتحِ اول ہے۔

فوّارہ : آصفیہ و نور دونوں میں ف پر زبر ہے، مگر زبانوں پر بہ ضمِ اول ہے۔
دونوں صورتیں قابلِ قبول ہیں۔

قبول : نور و آصفیہ دونوں میں بہ فتحِ اول ہے، یہ اصل کے مطابق ہے، مگر
بول چال میں عموماً بہ ضمِ اول آتا ہے۔ یہی صورت "قبولیت" کی ہے۔

قدامت : اصلاً ق مفتوح ہے۔ گفتگو میں بہ کسرِ اول بھی آتا ہے۔

قزلباش : اصل میں بہ کسرتین ہے (قِزِلباش)۔ نور و آصفیہ میں بھی اسی طرح۔
اردو والے بہ فتحِ اول و کسرِ دوم استعمال کرتے ہیں اور اردو میں یہی صورت
مرجح مانی جائے گی۔

قطامہ : لغت میں بہ فتحِ اول ہے۔ اردو میں زبانوں پر بہ ضمِ اول بھی ہے۔

قطعہ : اصلاً بہ کسرِ اول ہے۔ زیادہ تر بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔ دونوں

حرکات قابلِ قبول ہیں۔

قندیل : اصل میں قؔ پر کسرہ ہے۔ اردو والے عموماً بہ فتحِ اول استعمال کرتے ہیں۔

کفنی : اصلاً فؔ مفتوح ہے۔ اردو میں شعرا نے اِسی طرح باندھا ہے، مگر زبانوں پر بہ سکونِ دوم ہے۔

گرفت : آصفیہ میں بہ کسرِ اول و دوم ہے۔ یہ فارسی کے مطابق ہے۔ اردو میں بہ فتحِ دوم بھی مستعمل ہے اور یہ حرکت بھی قابلِ قبول ہے۔ "گرفتار" عام طور پر بہ فتحِ دوم ہی بولا جاتا ہے، یہی صورت "گرفتاری" کی ہے۔

گرہ : اصلاً بہ کسرِ اول و دوم ہے، اردو میں بہ کسرِ اول و بہ فتحِ دوم مستعمل ہے۔

گزاف : اردو میں بہ فتحِ اول بولا جاتا ہے۔ فارسی میں حرفِ اول مکسور بھی ہے اور مضموم بھی۔

لامحالہ : بہ لحاظِ لغت میم مفتوح ہے، مگر اردو میں زبانوں پر بہ ضمِ میم ہے۔

لغایت : اصلاً "لغایۃ" تھا (بہ کسرِ اول)، اردو میں "لَغایت" بن گیا، بہ فتحِ اوّل۔

محبت : اصلاً بہ فتحِ اول ہے۔ نور و آصفیہ میں بھی اِسی طرح ہے۔ اِس طرح استعمال میں بھی آتا ہے، مگر استعمالاً اِس کی ایک یہ صورت بھی ہے کہ مؔ مضموم ہو جاتا ہے۔ اِس صورت کو بھی مان لینا چاہیے۔

محلّہ : اصل میں بہ فتحِ اول ہے، مگر اردو میں زبانوں پر عموماً بہ ضمِ اول ہے۔ دونوں حرکات قابلِ اندراجِ لغت ہیں۔

مراعات : لغت میں بہ ضمِ اول ہے، لیکن اردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اول ہے۔

مرجان : اصلاً بہ فتحِ اول ہے۔ زبانوں پر بہ کسرِ اول بھی ہے۔ دونوں حرکات قابلِ قبول ہیں۔

مزدور : فارسی میں بضمِ اول ہے۔ اردو میں صرف بفتحِ اول ہے۔ اصل لفظ "مزد" بضمِ اول ہی مستعمل ہے۔

مژدہ : فارسی میں حرفِ اول مضموم بھی ہے اور مکسور بھی۔ اردو میں صرف بضمِ اول مستعمل ہے۔

مژگان : یہ بھی اصلاً بکسرِ اول و بضمِ اول دونوں طرح ہے۔ اِسی رعایت سے آصفیہ میں م پر پیش بھی لگا ہوا ہے اور زیر بھی (مُژِگاں)۔ مگر اردو میں صرف بکسرِ اول و سکونِ دوم مستعمل ہے۔

مسرّت : "محبت" کی طرح یہ بھی بضمِ اول گفتگو میں آتا رہتا ہے۔ اصلاً بفتحِ اول ہے۔ دونوں طرح صحیح مان لینا چاہیے۔

مشک : (پانی بھرنے کی کھال)۔ اصلاً بفتحِ اول و سکونِ دوم ہے۔ نظم میں اِسی طرح آتا ہے، مگر بول چال میں بفتحِ اول و دوم ہے، اور یہ صورت بھی قابلِ تسلیم ہے۔

مصالحت : زبانوں پر عموماً بکسرِ لام ہے، جب کہ اصلاً بفتحِ لام ہے۔ دونوں طرح قابلِ قبول ہے۔

معاہدہ : اصلاً ہ پر زبر ہے، اردو والے عموماً بکسرِ ہا بولتے ہیں۔

معائنہ : اصلاً "مُعایَنَہ" تھا۔ اردو میں "معائنہ" (بکسرِ ہمزہ) ہے۔

مقناطیس : آصفیہ میں بکسرِ اول ہے اور نور میں بفتحِ اول۔ اردو میں صرف بفتحِ اول مستعمل ہے۔

ملکہ : (مہارت، قوّت جو علم و ہنر سے انسان کو حاصل ہوتی ہے) عربی میں بفتحِ اول و دوم ہے۔ اردو والے بفتحِ اول و سکونِ دوم بولتے ہیں۔

ملکہ : (جیسے ملکۂ معظمہ) اِس معنی میں اصلاً ل پر زیر ہے۔ زبانوں پر عموماً

بہ سکونِ لام آتا ہے۔ دونوں طرح درست ہے۔

منبع : اصلاً بہ فتحۂ اول و سکونِ دوم ہے۔ بول چال میں بہ فتحۂ اول و دوم ہے اور اِس صورت میں بھی یہ صحیح و فصیح ہے۔ تراکیب میں اور نظم میں بہ سکونِ دوم ہی آتا ہے۔

مولوی : اصلاً لام پر زبر ہے۔ بول چال میں لام ساکن ہو جاتا ہے۔ دونوں صورتیں لغت کے لیے قابلِ قبول ہیں۔

مہار : اصلاً بہ کسرِ میم مرجح ہے، مگر اردو والے بہ ضمِ میم بولتے ہیں۔

مہارت : اصلاً میم پر زبر ہے، بول چال میں اکثر بہ ضمِ میم سننے میں آتا ہے۔ دونوں حرکات قابلِ قبول ہیں۔

مہوس : آصفیہ میں واو پر زبر لگا ہوا ہے۔ "مہوسی" میں بھی واو پر زبر لگایا گیا ہے، مگر بولا جاتا ہے بہ کسرِ واو اور اسی طرح لکھنا چاہیے۔

مہیب : نور میں لکھا ہے، "بہ فتحۂ اول صحیح و بہ ضمِ اول غلط۔" لغت کے لحاظ سے یہ ٹھیک ہے، مگر اردو میں استعمالاً یہ بہ ضمِ میم ہی مستعمل ہے، بہ فتحۂ میم شاید ہی کوئی بولتا ہو۔

ناگوار : آصفیہ میں 'گوار' کے گ پر پیش لگا ہوا ہے، یہ فارسی کی تقلید ہے۔ اردو میں گاف مفتوح رہتا ہے۔ نور میں حرکات کی صراحت نہیں کی گئی۔

نجاست : لغت میں بہ فتحۂ اول ہے۔ زبانوں پر بہ کسرِ اول بھی ہے۔ دونوں حرکات قابلِ تسلیم ہیں۔

نحوست : اصلاً بہ ضمِ اول ہے۔ زبانوں پر عموماً بہ فتحۂ اول ہے، اور یہ مرجح صورت ہے۔

نخوت : لغات میں بہ کسرِ اول، اور زبانوں پر بہ فتحۂ اول ہے، یہی صورت مرجح ہے۔

ندامت : اصل میں بہ فتحۂ اول ہے، بول چال میں بہ کسرِ اول بھی آتا ہے۔ دونوں حرکات قابلِ قبول ہیں۔

نزاکت : یہ فارسی نژاد لفظ بہ فتحِ اول ہے، بول چال میں بہ کسرِ اول بھی آتا ہے۔ دونوں طرح ٹھیک ہے۔

نسرین : "بالفتح و بالکسر دونوں طرح صحیح ہے" (نور)، مگر اردو میں صرف بہ فتحِ اول مستعمل ہے، اور اردو میں اِسی طرح صحیح ہے۔

نشاط : لغات میں بہ فتحِ اول ہے۔ بول چال میں بہ کسرِ اول بھی آتا ہے۔ دونوں طرح درست مان لینا چاہیے۔

نشان : نور میں ہے، "بہ کسرِ اول و نیز بہ فتح۔" اردو میں صرف بہ کسرِ اول ہے۔ یہی صورت "نشانی" اور "نشانہ" کی ہے۔

نشوونما : اصلاً نونِ ثانی پر زبر ہے (نشوونَما)۔ نور میں صراحت بھی کی گئی ہے کہ "نُما بہ ضمِ اول غلطی سے بول چال میں ہے۔" حالاں کہ سبھی "نشوونُما" (بہ ضمِ نونِ ثانی) کہتے ہیں۔ اردو میں بہ ضمِ نونِ ثانی ہی مرجح ہے۔

نشیب : نور میں ہے: "بہ کسرِ اول و دوم صحیح، و بہ فتحِ اول و کسرِ دوم غلط۔" پھر یہ بھی لکھا ہے کہ: "زبانوں پر بہ کسرِ اول و فتحِ دوم ہی ہے۔" اور یہی مرجح صورت ہے۔

نشیمن : فارسی میں بہ کسرِ اول و دوم ہے، اردو میں بہ فتحِ اول بولتے ہیں، اور اردو کے لیے یہی صورت ٹھیک ہے۔

نفاذ : اصلاً بہ فتحِ اول، بول چال میں بہ کسرِ اول بھی آتا ہے۔ دونوں صورتیں قابلِ قبول ہیں۔

نفری : (روزانہ مزدوری، اجرت وغیرہ) آصفیہ میں "نَفَری" ہے بہ فتحتین۔ نور میں "نَفْری" ہے اور اب اِسی طرح صحیح ہے۔

نفیر : اصلاً بہ کسرِ اول ہے، اردو والے صرف بہ فتحِ اول بولتے ہیں اور اردو میں اِسی طرح

صحیح ہے۔

نفع : اصل میں ف ساکن ہے۔ اردو میں فارسی تراکیب کے ساتھ اور نظم میں اسی طرح آتا ہے، مگر گفتگو میں عموماً بہ فتحِ دوم آتا ہے۔ "نفع نقصان" میں بھی ف پر زبر رہتا ہے۔ دونوں صورتیں قابلِ قبول ہیں، مگر صراحت کے ساتھ۔

نفقہ : اصلاً بہ فتحِ اول و دوم، مستعمل بہ فتحِ اول و سکونِ دوم، اور یہی صورت مرجح ہے۔

نقب : لغات میں بہ فتحِ اول و سکونِ دوم ہے۔ بول چال میں یہ بہ فتحِ دوم آتا ہے۔ دونوں طرح درست ماننا چاہیے۔

نگراں : اصلاً بہ کسرِ اول و فتحِ دوم ہے۔ نور میں بھی اسی طرح۔ یہی صورت "نگرانی" کی ہے۔ نظم میں یہ لفظ اسی طرح آئے ہیں، مگر زبانوں پر بہ سکونِ دوم ہیں۔ دونوں صورتوں کو ماننا چاہیے۔

نمرود : اصلاً بہ ضمِ اول ہے۔ نور میں صراحت بھی کی گئی ہے: "بالفتح غلط، بالضم صحیح"۔ مگر اردو میں بہ ضمِ اول شاید ہی کوئی بولتا ہو، سبھی بہ فتحِ اول کہتے ہیں، اور اسی صورت کو مرجح ماننا چاہیے۔

نمو : اصلاً بہ ضمِ اول، زبانوں پر بہ فتحِ اول ہے۔ یہی صورت "نمود" کی ہے، کہ یہ بھی اردو میں بہ فتحِ اول مستعمل ہے۔

نوالہ : آصفیہ میں ن پر زبر لگا ہوا ہے (نَوالہ) اور یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "مشہور بکسرِ اول"۔ یہاں فارسی سے بحث نہیں، اردو میں یہ لفظ صرف بہ کسرِ اول ہے۔ اور صرف اسی طرح ماننا چاہیے۔

نوشت : فارسی میں "نوشتن" کی حرکات میں اختلاف ہے۔ نور میں "نوشت" کے ذیل میں لکھا گیا ہے کہ: "بہ فتحِ اول و دوم نیز بہ فتحِ اول و کسرِ دوم"۔ اس سے

یہ مقبادر ہوتا ہے کہ اردو میں یہ لفظ اِن دو مختلف حرکات کے ساتھ مستعمل ہے۔ فارسی میں جو بھی صورت ہو، اردو میں نوشت، نوشتہ، نوشتن، سب صرف بہ فتحِ اول و کسرِ دوم مستعمل ہیں اور اردو میں اِسی طرح صحیح مانے جائیں گے۔ آصفیہ میں "نَوِشتہ" ہے، اور ٹھیک ہے، اِسی طرح "نَوِشت" کو بھی ایک ہی طرح لکھا گیا ہے۔

نوید : فارسی میں اِس کو "بہ ضمِ نون و کسرِ واو و یای مجہول" بھی بتایا گیا ہے اور "بہ فتحِ نون و یای مجہول" بھی کہا گیا ہے۔ اردو میں عموماً بہ فتحِ اول و کسرِ دوم مستعمل ہے۔ آصفیہ و نور میں بھی اِسی طرح لکھا گیا ہے، اِس فرق کے ساتھ کہ نور میں اِس کو صرف "بہ یاے مجہول" لکھا گیا ہے اور آصفیہ میں لکھا گیا ہے کہ ی مجہول بھی ہے اور معروف بھی۔ سُننے میں عموماً بہ یاے مجہول آتا ہے۔

نہنگ : (گھڑیال) فارسی میں حرفِ اول مفتوح ہے۔ اردو والے عموماً بہ کسرِ اول بولتے ہیں۔

واردات : رَ پر زیر ہے۔ خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ گفتگو میں یہ بہ سکونِ را آتا ہے، اور اِس صورت کو بھی صحیح سمجھنا چاہیے۔

واسطہ : اصلاً سؔ پر زیر ہے۔ نور میں صراحت کی گئی ہے کہ، "بہ کسرِ سوم و فتحِ چہارم زبانوں پر بہ سکونِ سین ہے۔ "واسِطہ" کوئی نہیں بولتا۔ اِس صراحت کے ساتھ، بہ سکونِ سوم کو بھی درست مان لینا چاہیے۔ اِس طرح کے بہت سے لفظ ہیں، جن میں حرفِ سوم ساکن ہو جاتا ہے، اور یہ ایک لسانی رجحان ہے؛ اِس لیے ایسے سبھی الفاظ کی اِس صورت کو بھی مان لینا چاہیے۔

وداع : نور میں صراحت کی گئی ہے کہ، "بہ کسرِ اول غلط و بہ فتحِ اول صحیح"۔ عربی کے لحاظ سے یہ قول ضرور درست ہے، مگر اردو میں اکثر لوگ بہ کسرِ اول

ہی بولتے ہیں۔ غیاث اللغات میں صراحت کی گئی ہے کہ، "بکسر خواندن، نوعے از تفریس باشد"۔ بکسرِ اول کو بھی صحیح ماننا چاہیے۔

ورع : یہ اصلاً بہ فتحِ اول و سکونِ دوم بھی ہے اور بہ فتحتین بھی (منتخب اللغات)۔ اردو میں اکثر سننے میں بہ فتحتین آتا ہے، ضرورتِ شعری سے یہاں بحث نہیں۔

وضع : نظم اور تراکیبِ اضافی و عطفی کے علاوہ، یہ لفظ عموماً بہ فتحِ اول و بہ ضمِ دوم استعمال کیا جاتا ہے۔ "وضع دار" اور "وضع داری" میں بھی (بول چال میں) حرفِ دوم مفتوح رہتا ہے۔ اِس صراحت کے ساتھ، اِس صورت کو بھی صحیح ماننا چاہیے اور درجِ لغت کرنا چاہیے۔

وقار : عربی میں حرفِ اول مفتوح ہے۔ فارسی میں بکسرِ اول بھی کہا گیا ہے۔ اردو میں بھی دونوں طرح مستعمل ہے۔ آصفیہ میں صرف بہ فتحِ اول ہے۔

ہذیان : عربی میں "ہَذَیان" ہے، بہ فتحِ اول و دوم، مگر اردو والے بہ سکونِ دوم استعمال میں لاتے ہیں۔ فارسی میں بہ سکونِ دوم بھی استعمال کیا گیا ہے (بہارِ عجم) اور اردو میں یہی مفرس صورت قابلِ قبول ہے۔ نظم میں کہیں آیا ہو تو اُس سے بحث نہیں، لغت میں اِس کی صراحت کی جائے گی۔ صاحبِ نور اللغات کے لکھنے کے مطابق، اردو میں بکسرِ اول ہے۔ لغت میں اِس کی بھی نشان دہی کی جانا چاہیے۔

ہزل : نور و آصفیہ دونوں میں صرف بہ فتحِ اول و سکونِ دوم ہے۔ یہ اصل کے مطابق ہے، مگر اردو میں زبانوں پر بہ فتحتین ہے۔ یہ صورت بھی قابلِ قبول ہے۔

ہلاکو : اصلاً بہ ضمِ اول ہے۔ اردو میں صرف بہ فتحِ اول ہے اور یہی صورت قابلِ قبول ہے۔

یثرب : اصلاً بہ فتحِ اول و بکسرِ سوم ہے۔ نور و آصفیہ میں اسی طرح ملتا ہے،

مگر زبانوں پر فتحۂ اول و سوم ہے، اور یہ بھی قابلِ قبول بل کہ مرجّح صورت ہے۔
یورش : اصلاً بہ ضمِّ اول و سوم ہے، اور واو غیر ملفوظ ہے۔ اردو میں یہ دو طرح مستعمل ہے: (۱) بہ ضمِّ اول و کسرۂ سوم و واوِ غیر ملفوظ (بروزنِ خورِش)۔ نور میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ (۲) بہ ضمِّ اول و کسرۂ سوم مع واوِ ملفوظ معروف، گفتگو میں عموماً اسی طرح آتا ہے۔ لُغت میں ان تفصیلات کے ساتھ ان سب صورتوں کا ذکر کیا جائے گا۔

ملائی — بالائی

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات کے مقدمے میں ایک جگہ لکھا ہے:

"ہر زبان کے فصحا کا قاعدہ ہے کہ اپنی زبان میں تصرفاتِ لطیف سے ایجاد کر کے نئے الفاظ اور اصطلاحیں پیدا کرتے ہیں۔ ہماری اُردو بھی اِس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔" (آبِ حیات، مفیدِ عام پریس لاہور، سالِ طبع ۱۸۹۹ء، ص ۳۶)

اِس ضمن میں اُنھوں نے مثالاً جو لفظ لکھے ہیں، اُن میں "بالائی" بھی ہے۔ اُن کے لکھنے کے مطابق، یہ لفظ نوابؔ سعادت علی خاں کی ایجاد ہے۔ اُن کی عبارت یہ ہے:

"نواب سعادت علی خاں مرحوم نے ملائی کا نام بالائی رکھا، کہ لکھنؤ میں عام اور دلّی وغیرہ میں کم رائج ہے۔ مذاقِ سلیم دونوں کے لطف میں امتیاز کر سکتا ہے۔"

(ایضاً ص ۳۷)

مولوی سیّد احمد دہلوی مؤلفِ فرہنگِ آصفیہ نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ عبارت کیے دیتی

ؔ مسند نشینی: ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء۔ وفات: ۱۱ جولائی ۱۸۱۴ء (مفتاح التواریخ)۔

ؔ متوفی ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء (مجلہ معاصر (پٹنہ) حصہ ۲)۔ مرحوم کی ایک تصنیف رسومِ دہلی کے پاکستانی اڈیشن کا مقدمہ سید یوسف بخاری دہلوی نے لکھا ہے۔ اس میں مرحوم کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ تاریخِ وفات اُس میں بھی یہی ہے۔

ا ہے کہ آزاد کا مندرجۂ بالا قول ہی اُن کی تحریر کی بنیاد ہے:

"نواب سعادت علی خاں مرحوم نے ملائی کا نام بالائی رکھا تھا چناں چہ یہ لفظ لکھنؤ میں عام اور دہلی میں کم رائج ہے۔ مذاقِ سلیم دونوں میں امتیاز کر سکتا ہے"۔ (فرہنگِ آصفیہ، جلد چہارم، ص ۴۰۰)

اِس کے بعد جو لغات مرتب ہوئے اُن میں عموماً اِسی کی تقلید کی گئی اور نواب سعادت علی خاں سے اس لفظ کی ایجاد کو منسوب کیا گیا، جیسے: نور اللغات، فرہنگِ اثر، مہذب اللغات۔ اِس کے برخلاف، مولانا عبد الحلیم شررؔ لکھنوی نے اپنی معروف تصنیف گذشتہ لکھنؤ میں لفظ "بالائی" کا موجد نواب آصف الدولہ کو بتایا ہے۔ مولانا نے "بالائی" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس کو پرانی زبان میں ملائی کہتے ہیں۔ آصف الدولہ بہادر نوابِ اودھ کو یہ اس قدر پسند تھی کہ خاص اہتمام سے ان کے لیے تیار کی جاتی تھی۔ انھوں نے اس کا نام ملائی کے عوض بالائی رکھ دیا، اس لیے کہ یہ دودھ کے اوپر کی چیز ہے"۔

(گذشتہ لکھنؤ، شائع کردہ مکتبۂ جامعہ دہلی، ص ۲۹۲)

فی الوقت یہ کہنا مشکل ہے کہ اس لفظ کی ایجاد کے سلسلے میں کون سا قول مرجح ہے۔ بہر صورت، اِن تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لفظِ "بالائی" لکھنؤ میں، نواب آصف الدولہ یا نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں معرضِ وجود میں آیا تھا۔

۱؎ متوفی ۱۷، رجب الآخر ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۶ء) (یادِ ایام، تالیف مولوی عبد الرزاق کانپوری، ص ۳۴۰)

۲؎ مسند نشینی: ۱۷۷۵ء، وفات: ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء مطابق ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ (عماد السعادت، مفتاح التواریخ)

۳؎ کلب حسین خاں نادر (تلمیذ ناسخ) نے لکھا ہے:

"اور چند الفاظ بہ عہدِ دولتِ سلاطین و نیز بہ زمانۂ غازی الدین حیدر شاہ بادشاہِ اودھ جاری ہوئے کہ بہت خوش معنی ہیں سب نے اُن کو استعمال کیا ازاں جملہ

فرہنگِ جہانگیری، فارسی کا معروف لغت ہے، جس کا سالِ تکمیل ۱۰۱۷ھ (۹-۱۶۰۸ء) ہے (مقدمۂ فرہنگِ جہانگیری)۔ یہ لغت مطبعِ ثمر ہند لکھنؤ میں "بہ تصحیح و تنقیح مولانا سید محمد صادق علی غالب لکھنوی" چھپا تھا[1]۔ اِس لغت میں لفظ "چربک" کے ذیل میں، اُس کے ہندی مرادف کی حیثیت سے "ملائی" اور "بالائی" دونوں لفظ موجود ہیں :

"چربک، با اول مفتوح ... بہ سہ معنی دارد .... سوم سرِ شیر بود، و آنرا چربہ نیز گویند، و بہ ترکی قیماغ، و بہ ہندی ملائی و بالائی نامند"۔

میں کچھ دنوں تک سخت الجھن میں رہا کہ لفظ "بالائی" جب فرہنگِ جہانگیری میں موجود ہے جس کی تدوین کا کام عہدِ اکبری میں شروع ہوا تھا اور تکمیل عہدِ جہانگیری میں ہوئی، اس صورت میں یہ کہنا کیوں کر درست ہوگا کہ یہ لفظ عہدِ آصف الدولہ میں یا اُس کے بعد عالمِ وجود میں آیا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ فرہنگِ جہانگیری کی عبارت میں فارسی لفظ "چربک" کے مرادف کی حیثیت سے اصلاً صرف "ملائی" تھا، اور "بالائی" کا لفظ بعد میں کسی نے بڑھایا ہے، اور غالباً یہ مطبع کے کسی فرد کی کارگزاری ہے۔

فرہنگِ جہانگیری کے جن خطّی نسخوں تک میری رسائی ہوسکی، وہ سب لفظ "بالائی" سے خالی ہیں۔ مخدومی قاضی عبدالودود صاحب نے مطلع فرمایا کہ خدا بخش خاں لائبریری (پٹنہ) کے خطّی نسخوں میں، اِس عبارت میں صرف "ملائی" کا لفظ ہے۔ محترمی مولانا امتیاز علی خاں

بالائی، بجائے ملائی"۔ [تلخیصِ معلّیٰ، ص ۱۲۶]

اگرچہ صراحت نہیں، مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ نادر کی رائے میں، ملائی کی جگہ بالائی، عہدِ غازی الدین حیدر کی ایجاد ہے۔

[1] غالب خیال رہے کہ فرہنگِ جہانگیری صرف اسی مطبعے میں چھپی ہے۔ میں نے متعدد حضرات سے دریافت کیا، مگر کسی دوسرے مطبعے کے چھپے ہوئے نسخے کا حال معلوم نہیں ہوا۔

عرشی کے مکتوب سے معلوم ہوا کہ رضا لائبریری (رام پور) میں اس فرہنگ کے تین خطی نسخے ہیں جن میں سے ایک نسخے پر عہدِ عالم گیری کی مہریں ثبت ہیں؛ ان نسخوں میں بھی اس عبارت میں "بالائی" موجود نہیں، صرف "ملائی" ہے۔ فرہنگِ مذکور کا ایک نسخہ راقم الحروف کے پاس ہے، جس پر سنہ کتابت ۱۱۰۳ھ لکھا ہوا ہے؛ اس کی بھی یہی صورت ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی کے کتاب خانے میں اس کا ایک خطی نسخہ موجود ہے، جس کے اول و آخر کے چند اوراق غائب ہیں، لیکن خاصا پرانا معلوم ہوتا ہے؛ اس کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ان سب نسخوں میں آخری جملہ اس طرح ہے: "و بہ ہندی ملائی نامند"۔

اس صورت میں یہ خیال کرنا کچھ بے جا نہیں معلوم ہوتا کہ لفظ "بالائی" کا اضافہ بعد کو کیا گیا ہے۔ قطعی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا، مگر خیال یہی ہے کہ یہ اضافہ اہلِ مطبع میں سے کسی نے کیا ہوگا، وہ کاتب صاحب ہوں یا تصحیح کرنے والے بزرگ ہوں۔ عرشی صاحب نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے: "جہانگیری کے مطبوعہ نسخے میں بالائی، بعد کی اصلاح ہے، جو بالیقین کاتب کی ہے" (مکتوب بہ نام راقم الحروف)۔

دوسرے قرائن بھی اس پر دلالت کرتے ہیں کہ فرہنگِ مذکور میں اصلاً "بالائی" کا لفظ نہیں تھا۔ مثلاً: فرہنگِ رشیدی کا ایک اہم ماخذ فرہنگِ جہانگیری ہے۔ رشیدی میں بہت سے مقامات پر جہانگیری کی عبارتوں کو کچھ ترمیم کے ساتھ شامل کر لیا گیا ہے۔[1] لفظ "چربک" سے

---

[1] مؤلف نے دیباچے میں خود صراحت کی ہے کہ یہ لغت فرہنگِ جہانگیری اور فرہنگِ سروری کے مندرجات کا مجموعہ ہے، ترمیمات و تصحیحات کے ساتھ۔ مؤلف کی عبارت یہ ہے:

"چوں فرہنگِ جہانگیری و فرہنگِ سروری مطالعہ افتاد، جامع ترین فرہنگہا دیدہ، اما مشتمل بودند بر امرے چند کہ احتراز و اجتناب ازاں لازم و متحتم گردید . . . . بنا بریں مقدمات، در جمع لغات ایں دو کتاب و حذف

سلسلے میں بھی جہانگیری کی طویل عبارت کو معمولی ترمیم کے ساتھ نقل کر لیا گیا ہے، اور زیرِ بحث جملہ رشیدی میں اسی طرح ہے جس طرح جہانگیری کے مذکورہ خطی نسخوں میں ہے یعنی "در ترکی قیماق و بہ ہندی ملائی گویند"۔

فرہنگِ جہانگیری سے پہلے جو لغت ہندستان میں لکھے گئے، ان میں موید الفضلا کی بھی خاص حیثیت ہے۔ اِس لغت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اِس میں ہندی مرادفات اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں، اور یہ کہ بعد کے بہت سے لغات کا یہ اہم ماخذ رہا ہے جن میں جہانگیری بھی شامل ہے۔ موید الفضلا میں لفظ "چربک" موجود ہے۔ جہانگیری اور موید کی عبارتوں کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اس لفظ کے ذیل میں جہانگیری میں تفصیل زیادہ ہے، لیکن یہ تفصیل، بظاہر موید کی عبارت پر مبنی معلوم ہوتی ہے اور کئی جملے مشترک ہیں۔ موید میں آخری جملہ اس طرح ہے "و بمعنی شیر کہ قیماغ باشد، و در ہند آنرا ملائی گویند، ہم بہ نظر آمدہ"۔

صاحبِ موید الفضلا کے شاگرد، شیخ عبدالرحیم سور بہاری کا لغت کشف اللغات بھی جہانگیری کی فہرستِ ماخذ میں شامل ہے۔ اس لغت کے پیشِ نظر نسخے میں لفظ "چربک" تو موجود نہیں، البتہ اِس کی دوسری صورت "چربہ" ملتی ہے، اور اس کا ہندی مرادف "ملائی" لکھا ہوا ہے: "چربہ، بالفتح و با جیم فارسی ... بہ ہند ملائی نامند"۔

عبارات زائدہ و اشعار بے فائدہ ... و تنقیح الفاظ و ایضاح اعراب و تحقیق معانی بقدر مقدور سعی موفور مبذول نمودہ شد" (دیباچۂ فرہنگِ رشیدی)

فرہنگِ رشیدی، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی طرف سے دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ پہلی جلد ۱۸۷۲ء میں اور دوسری ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ لغت بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ میں چھپا تھا۔ یہی اڈیشن پیشِ نظر ہے۔ مولف کے حالات کے لیے دیکھیے نزہۃ الخواطر جلد پنجم۔

لہ جامعہ ملیہ دہلی کے کتاب خانے میں اِس کا ایک خطی نسخہ موجود ہے، اسی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ مطبوعہ نسخہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

جہانگیری اور رشیدی کے بعد جو اہم لغت ہندستان میں مرتب ہوئے، ان میں سے برہانِ قاطع، بہارِ عجم، غیاث اللغات اور فرہنگِ آنند راج میں لفظ "چربک" کے ذیل میں اس کا ہندی مرادف مذکور نہیں۔ ہاں، سراج اللغۃ اور ہفت قلزم میں "چربک" کا ہندی مرادف صرف "ملاگی" ملتا ہے۔ ہفت قلزم میں لفظ "چربک" کے ذیل میں مویّد الفضلا کی عبارت کو معمولی سی ترمیم کے ساتھ نقل کر لیا گیا ہے اور ایک دو جملے جہانگیری سے لے لیے گئے ہیں؛ اس طرح ہفت قلزم میں لفظ "چربک" کے ذیل میں جو کچھ مرقوم ہے، وہ اصلاً مویّد اور جہانگیری کی عبارتوں کا مجموعہ ہے، اور اس میں بھی زیرِ بحث جملہ اس طرح ہے "و بعضی سرشیرہم آمدہ کہ تیماغ باشد و در ہند آنرا ملاگی گویند"۔ یہ بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ ہفت قلزم، لکھنؤ میں مرتب ہوا ہے اور وہیں چھپا ہے۔

لے خانِ آرزو کا یہ قابلِ قدر لغت ابھی تک طباعت سے محروم ہے۔ اس کا ایک اچھا خطی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس سے متعلق معلومات عرشی صاحب کے خط کے توسط سے حاصل ہوئی ہے۔

لے یہ لغت غازی الدین حیدر کے زمانے میں مرتب ہوا تھا۔ اس کے دیباچے میں مولوی قبول محمد نے لکھا ہے کہ یہ لغت خود غازی الدین حیدر نے "از فکرِ متین و عبارتِ رنگین بہ اتمام رسانیدند"۔ اس کو شاید ہی کوئی تسلیم کرے۔ مولوی صاحب نے مزید لکھا ہے کہ یہ کتاب بروز جمعہ ۲ محرم ۱۲۲۹ھ کو شروع کی گئی، اور غرۂ ذی الحجہ ۱۲۳۰ھ کو مکمل ہو گئی۔ اگر یہ مدّت صحیح ہے تو اس کی ترتیب میں متعدد حضرات نے حصہ لیا ہوگا۔ خاصا ضخیم لغت ہے۔ یہ سات جلدوں پر منقسم ہے۔ پہلی چھے جلدیں لغات پر مشتمل ہیں، اور ساتویں جلد میں قواعدِ زبان، اقسامِ نظم و نثر، صنائعِ لفظی و معنوی اور عروض و قافیہ کا بیان ہے۔ یہ لغت بھی دوسرے لغات کے مندرجات کا مجموعہ ہے، معمولی ترمیمات کے ساتھ۔ میرا خیال ہے کہ مولوی قبول محمد (جنھوں نے اس کا مقدمہ

اِن مباحث سے، مختلف اعتبارات سے اس بات کی پوری طرح تائید ہوتی ہے کہ فرہنگِ جہانگیری کے مطبوعہ نسخے میں لفظ "بالائی" بعد کو شامل کیا گیا ہے اور غالباً اہلِ مطبع اس کے ذمّے دار ہیں۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کیا یہ صورت دوسرے مقامات پر تو نہیں پائی جاتی ہے؟ اس خیال کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے، اور ایک اور دل چسپ "الحاق" سے اِس خیال کو مدد ملتی ہے۔ اُس کا تعلق بھی اِسی لفظ "بالائی" سے ہے۔

ابھی لکھا گیا ہے کہ خانِ آرزو کے لغت سراج اللغتہ میں لفظ "بالائی" موجود نہیں، اُس میں صرف "ملائی" ہے، مگر اُن کے دوسرے لُغت چراغِ ہدایت کے مطبوعہ نسخے میں یہ لفظ موجود ہے۔ سراج اللغتہ تو نہیں چھپ سکا، لیکن چراغِ ہدایت چھپ چکا ہے۔ اُس کے دو مطبوعہ نسخے پیشِ نظر ہیں، یہ دونوں غیاث اللغات کے حاشیے پر چھپے ہیں۔ ایک نظامی پریس کان پور کا مطبوعہ ہے اور دوسرا نول کشور پریس لکھنؤ کا۔ چراغِ ہدایت کے اِن دونوں نسخوں میں لفظ "سرشیر" کے ہندی مرادف کی حیثیت سے صرف "بالائی" ملتا ہے:

"سرشیر، بہ اضافت وشینِ معجم دیائے معروف، قیماق کہ بہ ہند بالائی گویند۔"

خانِ آرزو کا انتقال ۱۱۶۹ھ میں ہوا اور آصف الدولہ کی فرماں روائی کا زمانہ آرزو کی

نکلیہ؟ کے ساتھ کئی دیگر علما نے اس لغت کی تالیف میں حصّہ لیا ہے۔ نول کشور پریس سے بہارِ عجم کا جو نسخہ ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا تھا، اس کے آخر میں ہفت قلزم مطبوعہ نول کشور پریس کا اشتہار بھی ہے۔ اُس اشتہار کی یہ عبارت قابلِ توجہ ہے:

"اس خوبی اور اہتمام کے ساتھ تالیف کی گئی کہ سب کتابیں لغاتِ فارسی کی کتب خانۂ شاہی سے فراہم ہو کر، بہ اجتماعِ جمّ غفیر علمائے نام دار، تحقیق مثلِ مولوی اوحد الدین مرحوم بلگرامی اور مولوی اسماعیل مغفور لندنی، خاص الخاص توجہ اور نفسِ نفیس التفاتِ شاہی سے ... بصرفِ خزانۂ بے شمار نہار ال کی محنت میں ... چھپی۔"

یہ لغت پہلی بار مطبعِ سلطانی لکھنؤ سے سات جلدوں میں شائع ہوا تھا، (۱۲۳۰ھ/۲۲-۱۸۲۱ء) میں۔ میرے سامنے یہی نسخہ ہے۔

وفات کے ۱۸، ۱۹ سال بعد شروع ہوتا ہے چراغِ ہدایت میں اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے کہ اس کا سالِ تالیف کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر منوہر سہائے انور کی یہ رائے ہے کہ آرزو ۱۱۴۸ھ تک اِس کی تالیف سے فارغ ہو چکے تھے [دہلی کالج میگزین کا میر نمبر ۱۹۶۲ء] ہر صورت میں اِس لغت میں لفظ "بالائی" کا وجود میرے لیے باعثِ تعجب تھا۔ محترمی عرشی صاحب سے رجوع کیا، موصوف نے مطلع فرمایا کہ:

"سرشیر اور ملائی کے سلسلے میں چراغِ ہدایت کو دیکھا، اس میں یہ لفظ یعنی "سرشیر" سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ صرف ایک نسخے کو دیکھ کر لکھ دیا ہے، چار چار نسخے دیکھے، جن میں سے ایک ۱۱۸۳ھ کا ہے مگر کسی میں بھی سرشیر نہیں ہے" (مکتوب بنام راقم الحروف)۔

یعنی چراغِ ہدایت میں لفظ "سرشیر" بعد کا اضافہ ہے اور اس کے ذمے دار بھی بظاہر وہ لوگ معلوم ہوتے ہیں جن کی "تصحیح و تہذیب" کے ساتھ یہ کتاب چھپی ہے۔ اِس لحاظ سے چراغِ ہدایت کا مطبوعہ نسخہ بھی، فرہنگِ جہانگیری کے اُس نسخے کی طرح غیر معتبر قرار پاتا ہے۔

یہاں اِس کا اظہار ضروری ہے کہ خانِ آرزو کے اُردو لغت نوادر الالفاظ میں حرفِ میم کے تحت "ملائی" مندرج ہے، اور "بالائی" سے یہ لغت بھی کلیتاً خالی ہے۔

"ملائی" اور "بالائی" کے سلسلے میں ایک دل چسپ بحث فصیح و غیر فصیح کی بھی ہے، اور خود لکھنؤ میں یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے۔ حضراتِ دہلی نے اِس نو وارد لفظ "بالائی" کو کبھی غلط نہیں کہا، لیکن اِس کو اہلِ لکھنؤ کی ایجاد سمجھا اور خود اسی پرانے لفظ "ملائی" کو فصیح سمجھتے رہے۔ آزاد کی عبارت اوپر نقل کی جا چکی ہے، جس کو مولفِ آصفیہ نے بھی دہرایا ہے، اس سے اربابِ دہلی کے رجحان کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

آزاد کی خصوصیاتِ انشا میں سے ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جہاں چاہتے ہیں، نہایت سادگی کے ساتھ طنز کا نشتر چبھو دیتے ہیں۔ سبحان اللہ اور مرحبا کہتے کہتے

ایک جملہ ایسا بھی لکھ جائیں گے کہ ساری تحسین، تعریض میں بدل کر رہ جائے گی۔ لفظ بالائی سے متعلق جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، اُس میں بھی یہی انداز ہے۔ وہ "ملائی" کو فصیح اور اُس کے مقابلے میں "بالائی" کو غیر فصیح کہنا چاہتے ہیں، مگر صاف کہنے کے بجائے، مذاقِ سلیم کے پردے میں اِس بات کو ادا کرتے ہیں! "مذاقِ سلیم دونوں کے لطف میں امتیاز کرسکتا ہے۔"

اہلِ لکھنؤ میں سے مولانا شررؔ نے مذاقِ سلیم کے امتیاز کی نشتریت کو بری طرح محسوس کیا اور گذشتہ لکھنؤ میں جہاں "بالائی" پر گفتگو کی ہے، وہاں آزاد کی اس تعریض کا بھی جواب دیا ہے، اگرچہ وہاں پر یہ پہلو ان کے موضوع سے غیر متعلق تھا۔ مولانا شررؔ کی عبارت یہ ہے:

"اس کو پرانی زبان میں ملائی کہتے ہیں۔ آصف الدولہ بہادر نواب اودھ کو یہ اس قدر پسند تھی کہ خاص اہتمام سے ان کے لیے تیار کی جاتی تھی۔ انھوں نے اس کا نام ملائی کے عوض بالائی رکھ دیا، اس لیے کہ یہ دودھ کے اوپر کی چیز ہے۔ اہلِ لکھنؤ کو اپنے فرماں روا کا یہ تصرف بہت پسند آیا اور بالائی کا لفظ زبانوں پر اس قدر چڑھ گیا کہ اب لکھنؤ میں سواد یہاتیوں یا ہندو جہلا کے سب اسے بالائی ہی کہتے ہیں اور ملائی کا لفظ کسی مہذب شخص کی زبان پر باقی نہیں رہا۔

اس پر مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے آبِ حیات میں اعتراض کردیا اور انصاف کو ذوقِ سلیم پر محول فرمایا، جس معیار سے ان کے مذاق میں ملائی کا لفظ، بالائی سے زیادہ لطیف و فصیح ہے۔ کسی لفظ کو محض اپنے مذاق کے اعتبار سے غیر فصیح کہہ دینا میرے نزدیک ایک بے معنی سی چیز ہے، اس لیے کہ ہر جماعت کو وہی لفظ اپنے ذوق میں اچھے معلوم ہوتے ہیں جو ان

کی زبان پر چڑھے ہوں اور اُن کے لہجے اور محاورے سے مانوس ہو گئے ہوں۔
جن شہروں کے لوگ ملائی کہتے ہیں، اُن کو بے شک بالائی کا لفظ گراں گزرتا
ہو گا اور اُن کی زبان سے نا آشنا ہو گا۔ مگر جس شہر میں لوگ بالائی کہتے ہیں،
اور یہی لفظ ان کے محاورے میں شامل ہو گیا ہے، اُن کو جو فصاحت بالائی
میں نظر آتی ہے، ملائی میں ممکن نہیں۔ اُن کو ملائی، جاہلوں اور گنواروں کا
لفظ معلوم ہوتا ہے...

بہ ہر حال اگر دونوں شہر معیار مانے جائیں تو ملائی اور بالائی بجائے خود فصیح ہیں؛
ملائی اہلِ دہلی کے نزدیک اور بالائی اہلِ لکھنؤ کے نزدیک"

آزاد کے ایک لطیف جملے کے جواب میں مولانا نے کئی سطریں لکھیں، اور برہمی کے عالم میں سنجیدگی کا دامن بھی اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا کہ ملائی کو جاہلوں اور گنواروں کا پسندیدہ لفظ قرار دیا۔ یہ انتہا پسندی ہے۔ مولانا شرر نے "ملائی" کو اہلِ دہلی سے مخصوص کیا ہے، مگر لکھنؤ کے ایک مستند استاد اور زبان داں جلالؔ[1] نے اِس کے برعکس "ملائی" کو صحیح اور "بالائی" کو غلط بتایا ہے۔ جلالؔ نے اپنے لغت گلشنِ فیض[2] میں لکھا تھا۔

---

[1] متوفی ۱۹۰۹ء (تذکرۂ کاملانِ رام پور)

[2] اس کا دوسرا نام گنجینۂ زبانِ اُردو ہے۔ "گلشنِ فیض" تاریخی نام ہے جس سے مؤلف کی صراحت کے مطابق سالِ تکمیل ۱۲۹۰ھ (۷۴-۱۸۷۳ء) ہے۔ کتاب کے آخر میں جو قطعاتِ تاریخِ طبع ہیں، اُن سے سالِ طبع ۱۲۹۷ھ نکلتا ہے، مگر خاتمۃ الطبع کی عبارت میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ یہ کتاب دسمبر ۱۸۸۰ء مطابق محرم ۱۲۹۸ھ میں چھپی ہے۔ یہ کتاب نول کشور پریس لکھنؤ میں چھپی تھی۔ ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔
امیر مینائی نے اپنے ایک شاگرد مہدی حسن خاں شاداب کو لکھا تھا کہ یہ لغت دراصل

«ملاقی، پوستیکہ بر شیر بسبب جوش دادن پدید آید و پوستیکہ بر جغرات نشیند۔ ف، اسر شیر و شیر ز دک سانیکہ آنرا "بالائی" بہ موحدہ و الفِ کشیدہ گویند غلط گویند" (گلشنِ فیض، ص ۱۴۷)۔

جلالؔ کا یہ لغت ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰ء) میں چھپا تھا۔ جلالؔ کے بعض حریفوں نے اس پر کچھ اعتراض کیے، جن میں سے بعض بالکل درست تھے۔ ۱۳۰۴ھ میں ان کا لغت سرمایۂ زبانِ اردو شائع ہوا۔ یہ دراصل گلشنِ فیض کا اردو ترجمہ ہے، بہت سی ترمیموں کے ساتھ اس میں بھی انھوں نے "ملائی" کے متعلق اپنی اس رائے کو برقرار رکھا:

میرے مسودۂ لغت کا ایک ٹکڑا ہے، جس میں تصرفاتِ بے جا شامل ہیں (مکاتیبِ امیر مینائی، مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب، طبع دوم، مکتوب بنام شاداب)

لطیفہ یہ ہے کہ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے اس سے زیادہ واضح الفاظ میں امیر پر یہی الزام لگایا ہے:

"اللہ اللہ! کیا مقامِ عبرت ہے کہ حضرت امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی، جنھوں نے اِس اخیر عمر میں امیر اللغات کے دو باب صرف الفِ ممدودہ و الفِ مقصورہ کے ہو بہو ارمغانِ دہلی کا چربا اتار کر شائع فرماتے" (فرہنگِ آصفیہ، جلد اول، طبع ۱۹۰۸ء، ص ۱۴)

ان بزرگوں کے اس "مزاح المؤمنین" کو کیا کہا جائے!

جلالؔ کے لغت گلشنِ فیض کی زبان فارسی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے بعض ترمیموں کے ساتھ اس کا اردو میں ترجمہ کر کے سرمایۂ زبانِ اردو کے نام سے شائع کیا۔ ہاں جلالؔ نے اپنے استاد رشکؔ کے لغت نفس اللغۃ کی بہت سی عبارتیں بہ لفظہٖ یا معمولی ترمیم کے ساتھ گلشنِ فیض میں داخل کر لی ہیں اور کہیں حوالہ نہیں دیا ہے۔

۱؎ اس کا دوسرا نام تحفۂ سخن وراں ہے۔ جلالؔ نے سالِ ترتیب کی صراحت نہیں کی۔ (باقی آگے)

"ملائی، ہمزہ و تحتانی معروف کے ساتھ ایک چیز ہوتی ہے دودھ کی، بہت لذیذ اور عمدہ لطیف، کہ اس کو نان خورش کرتے ہیں، اور یوں بھی کھاتے ہیں۔ ف، سرشیر و شیر۔

اور یہ جو اس کو "بالائی" بائے موحدہ اور الف کے ساتھ بولتے ہیں، غلط بولتے ہیں"
(سرمایۂ زبانِ اردو، مطبوعۂ انوار المطابع لکھنؤ)

یہ بھی انتہاپسندی کی دوسری صورت ہے۔ جس طرح شرر کا یہ قول کہ "ملائی" نیچابوں اور گنواروں کا لفظ ہے، غیر مناسب ہے، اُسی طرح جلال کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ "بالائی" سرے سے غلط ہے۔ دو مثالیں اُن لوگوں کے یہاں سے پیش کی جاتی ہیں جن کا تعلق دبستانِ لکھنؤ سے ہے۔

وہ شیرِ لطیفِ ماہِ تاباں
شیرینیِ درد، کاہشِ جاں

جاں بخشیِ دردِ عالمِ عشق
بالائی اک آمدِ غمِ عشق

(محسن کاکوروی، مثنوی چراغِ کعبہ، مطبوعۂ مطبعِ شاہِ اودھ لکھنؤ، ص ۱۹)

افیون جڑھ کے زہر سے اے پیر رہ گئی
خونِ جگر مجھے یہ ملائی کی چاہ ہے — منیر

(کلیاتِ منیر، ص ۳۶۵)

مولفِ نوراللغات[1] نے ملائی اور بالائی، دونوں لفظ کسی تفریق یا امتیاز کے بغیر لکھے ہیں، اور کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کی ہے۔ یہی صحیح صورت ہے۔ "ملائی" پرانا لفظ ہے۔ ایک زمانے تک دہلی و لکھنؤ میں مستعمل رہا ہے۔ لفظ "بالائی" کی ایجاد کے بعد بھی، اہلِ دہلی "ملائی" ہی کو فصیح سمجھتے رہے[2]، اور اہلِ لکھنؤ میں سے جلال جیسے مستند لوگ بھی آئے

---

[1] یہ لغت پہلی بار ۱۳۰۳ھ (۸۷-۱۸۸۶ء) میں چھپا تھا۔ گلشنِ فیض (جس کا یہ ترجمہ ہے) ۱۲۹۸ھ میں چھپا تھا؛ اس لیے اس کی ترتیب ۱۲۹۹ھ اور ۱۳۰۳ھ کے درمیانی عرصے میں عمل میں آئی ہوگی۔

[2] مولانا احسن مارہروی، تلمیذِ داغ کی اس عبارت سے، اہلِ دہلی کی رائے کا بہت کچھ اندازہ

آخر تک صحیح اور فصیح سمجھتے رہے۔ مؤلفِ نور اللغات نے لفظ "ملائی" کے ذیل میں اس کے مرکبات ملائی پڑنا، ملائیاں کھانا، اور ملائی کی چائے بھی درج کیے ہیں اور مؤخر الذکر کی سند میں منیر کا وہی شعر لکھا ہے، جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔

حضرت اثر لکھنوی مرحوم نے اپنے لغت فرہنگِ اثر میں جلال کی تردید اور مولانا قمر کی ہم نوائی کی ہے۔ اثر صاحب نے لفظ "ملائی" کے ذیل میں سرمایۂ زبانِ اردو کی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"ملائی میں رکاکت کا پہلو نکلتا تھا، ملائی ولائی، نواب سعادت علی خاں نواب وزیر اودھ نے اس کو بالائی کہا۔ ایک صورت جواز کی یہ ہو سکتی ہے کہ اس کی تہ دودھ کے اوپر (بالا) جمتی ہے۔ اُن کی یہ اُپج اتنی مقبول ہوئی کہ لکھنؤ میں خواص، بجز بالائی کے، ملائی بولتے ہی نہیں۔ سوال صحیح یا غلط کا نہیں بل کہ فصیح و غیر فصیح کا ہے، اور اس نقطۂ نظر سے فیصلہ غالباً بالائی کے حق میں ہوگا۔"
(فرہنگِ اثر، ص ۷۹)

اثر صاحب نے اپنے زمانے کو دیکھتے ہوئے یہ لکھا کہ خواصِ لکھنؤ صرف بالائی کہتے ہیں، جلال کے زمانے میں یہ صورت نہیں تھی۔

کیا جا سکتا ہے:

"ساتھ ہی اس کے یہ بات بھی بتائی جائے کہ اہلِ لکھنؤ کے مخترعات و تصرفات دِلّی میں کس زبان داں نے اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں؟ ... اندھڑ بمعنی آندھی کے، بیٹھنا! اٹھنے کی جگہ؛ بالائی، ملائی کی جگہ... اس قسم کے الفاظ کی وقعت اہلِ زبان کی نگاہوں میں اُسی قدر ہے جس قدر دکن کی "نکو" اور بنگال کی "مہرارو" اور گجرات کی "این" کی قدر ہے۔ اس قسم کے اختراعات کی اہلِ دہلی نے ہمیشہ مخالفت کی ہے۔"

(جلوۂ داغ، مطبعِ شمسی حیدرآباد دکن، ص ۳۰)

اس کے علاوہ یہ واقعہ ہے کہ لکھنؤ کی اور بہت سی ایجادوں کی طرح، اس ایجاد نے بھی لکھنؤ سے باہر قبولِ عام کا شرف اُس طرح حاصل نہیں کیا۔ میں نے ہندستان کے مختلف خطّوں کے رہنے والوں سے اور یوپی کے متعدد مغربی و مشرقی اضلاع والوں سے دریافت کیا، معلوم ہوا کہ لوگ عموماً "ملائی" کہتے ہیں اور گنتی کے لوگ "بالائی" بھی استعمال کرتے ہیں۔ دِلّی میں شروع ہی سے "ملائی" رائج رہا ہے اور آج بھی اُسی طرح مروّج ہے۔ "ملائیاں کھانا[1] ایک پرانا محاورہ ہے، یہ آصفیہ میں بھی ہے اور نور اللغات میں بھی اور جلال کے لغت سرمایۂ زبانِ اردو میں بھی موجود ہے؛ اب اس کو بدل کر "بالائیاں کھانا" کہیے تو کیسا عجیب معلوم ہوگا؛ جن صاحب کو اب بھی اصرار ہو کہ صرف "بالائی" فصیح ہے، وہ "رس ملائی" کو "رس بالائی" کہہ کے دیکھیں، "مذاقِ سلیم" خود فیصلہ کر دے گا۔

یہاں پر یہ بات بھی سامنے رہنا چاہیے کہ لفظ "بالائی" اگرچہ حضراتِ لکھنؤ کی تحریروں میں بہت پہلے شامل ہو چکا تھا[2]، مگر لغات میں وہ ذرا بعد میں داخل ہو سکا۔ اوحدالدین بلگرامی کے لغت نفائس اللغات[3] (سالِ ترتیب: ۱۲۵۳ھ) میں "ملائی" ہے، لیکن "بالائی" موجود نہیں، جلال کے استاد رشک کے لغت نفس اللغۃ (سالِ ترتیب: ۱۲۵۶ھ) میں بھی حرف ب کے ذیل میں "بالائی" مذکور نہیں۔

---

[1] "ملائیاں کھانا: کسی دوسرے کے مال سے نفع حاصل کرنا" (نور اللغات، جلد چہارم ص ۹۲۷)۔

[2] مثلاً: "بالائی نور آئی دکان پر جب نظر آئی بے تفنّد وشکر شکر کر، نوڈ علی نور کہہ کر، چھری سے کاٹ کر کھائی"؛ (فسانۂ عجائب، مطبوعۂ مطبع میر حسن رضوی، سالِ طبع ۱۲۴۳ھ)۔

[3] یہ لغت فارسی میں ہے، مؤلف کی ساری توجہ اس پر مرکوز رہی ہے کہ اُردو الفاظ کے عربی اور فارسی مرادفات زیادہ سے زیادہ یک جا کر دیے جائیں۔ مؤلف کی صراحت کے مطابق ۷، رجب ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) کو اس کی تکمیل ہوئی (عبارتِ خاتمہ) کئی بار چھپ چکا ہے، میرے سامنے وہ نسخہ ہے جو ۱۸۹۶ء میں نول کشور پریس لکھنؤ میں "بار دوم" چھپا تھا۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اساتذۂ لکھنؤ میں سے بیشتر حضرات، متروکات اور فصیح و غیر فصیح کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، اس موضوع پر کئی رسالے بھی لکھے گئے، کئی دواوین میں بھی اس کی صراحت کی گئی، غیر فصیح اور متروک الفاظ کی لمبی چوڑی فہرستیں مرتب کی گئیں، مگر متروکات کی ان فہرستوں میں لفظ "ملائی" مذکور نہیں۔

یہ مان لینا چاہیے کہ یہ دونوں لفظ پہلے بھی فصیح تھے، اور اب بھی فصیح ہیں۔ جو صاحب چاہیں "بالائی" کہیں اور جس کا جی چاہے "ملائی" کہے۔ گفتگو اور تحریر میں بعض مقامات ایسے بھی آسکتے ہیں جہاں صرف حسنِ بیان کے لحاظ سے یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کہاں پر ان میں سے کون سا لفظ کھپایا جائے؛ اور ایسے مواقع پر دہلی و لکھنؤ کا اختلاف خود بخود درمیان سے اٹھ جائے گا۔

ترکیبِ مُہنّد

عربی فارسی الفاظ کو غیر عربی فارسی الفاظ (خاص طور پر ہندی الفاظ) کے ساتھ بہ قاعدۂ فارسی ترکیب دینا قابلِ اعتراض سمجھا گیا ہے۔ اساتذۂ متوسطین و متاخرین نے ایسی ترکیبوں کو عموماً غیر معتبر قرار دیا ہے۔ اِس مضمون میں اِسی مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔ یہ تین فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل میں لفظ "مُہنّد" اور "ترکیبِ مُہنّد" کے معانی و مفہوم پر گفتگو کی گئی ہے۔

دوسری فصل میں فارسی و اردو میں ایسے مرکبات کے متعلق مسائل زیرِ بحث آئے ہیں۔

تیسری فصل میں اردو میں مُہنّد ترکیبوں کے لیے ضروری قاعدے لکھے گئے ہیں، اور یہ بتایا گیا ہے کہ کن صورتوں میں ایسی ترکیبیں مستحسن ہیں اور کن صورتوں میں وہ ناقابلِ قبول ہو سکتی ہیں۔

ترکیبِ مُہَنّد سے مراد یہ ہے کہ مرکّب کا ایک جُز عربی یا فارسی سے تعلّق رکھتا ہو (ترکی الفاظ بھی اِس میں شامل ہیں) اور دوسرے جُز کو کسی اور زبان سے نسبت ہو۔ اکثر ہندی اور کم تر انگریزی الفاظ دوسرے جُز کے طور پر آتے ہیں، اور وہ الفاظ بھی اِسی ذیل میں آتے ہیں جو اردو میں بنے ہوں یا اردو میں تصرّفات سے دوچار ہوئے ہوں۔

نور اللغات میں لفظ "تہنید" کی جس طرح تشریح کی گئی ہے، اُس سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے کہ اردو میں "مہنّد" سے مراد کیا ہے:

"تہنید: کسی غیر زبان کے لفظ کو ہندی بنا لینا، جیسے فارسی "دہل" سے "ڈھول"، انگریزی "لارڈ" سے "لاٹ"۔ تہنید کئی طرح کی ہوتی ہے: ایک یہ کہ دوسری زبان کے لفظ کو لفظاً و معناً دونوں طرح بدلیں، جیسے "افراتفری" کہ اصل میں "افراط تفریط" تھا اور اردو میں بہ معنی "ہل چل" ہے۔ دوسرے، صرف لفظ کو بدل دینا، جیسے: "پلیٹ" سے "پلیت"۔ تیسرے، صرف معنوں کو بدلیں، جیسے: "روزگار" فارسی میں "زمانہ"، اردو میں "نوکری"۔ چوتھے، حرکات کو بھی بدل دیں اور معنوں کو بھی، جیسے "مشّاطہ" عربی مبالغے کا صیغہ؛ اردو میں "مشاطہ" بغیر تشدیدِ دوم، وہ عورت جو زنؒ مرد کی نسبت ٹھہرائے اور شادی کرائے۔ پانچویں، جمع سے واحد کے معنی لیں، جیسے "اصول"، "احوال"۔ چھٹے، دوسری زبان کے مادہ ہائے الفاظ سے ایسے صیغے بنانا جو اُس زبان میں مستعمل نہ ہوں، جیسے "عفو" اور "عتاب" سے "معاف" اور "معتوب"۔"

جو لفظ ہندی صورت اختیار کرے، اُس کو "مہنّد" کہتے ہیں" (نور اللغات)۔

غالباً پنڈت دتا تریہ کیفی مرحوم نے اردو کی رعایت سے "تہنید" کے بجائے اِس عمل کا نام "تارید" رکھا تھا اور ایسے لفظوں کو "مُورَّد" کہا تھا، اور "تارید" کی جگہ، "اُردُوانا" بھی کہا گیا تھا؛ مگر یہ نئی اصطلاحیں فروغ نہیں پا سکیں۔

عربی میں "مہنّد" ہندستانی لوہے سے بنی ہوئی تلوار کے معنی میں آتا ہے (صراح۔ المنجد) فارسی میں بھی یہی معنی برقرار رہے۔ ہندستان میں جب فارسی میں ہندی لفظوں کو بہ کثرت استعمال کیا جانے لگا اور عربی فارسی الفاظ، مختلف تصرفات سے دوچار ہونے لگے تو یہاں یہ لفظ، اصطلاحی معنوں میں استعمال ہونے لگا[1]۔ قیاس

---

[1] اُس زمانے کے فارسی لُغات میں یہ لفظ اِن اصطلاحی معنوں میں نہیں ملتا۔ غیاث اللغات میں بھی یہ معنی نہیں ملتے جو مؤخر لغات میں سے ہے۔ مگر یہ لفظ بہ طورِ اصطلاح مستعمل ضرور تھا۔ مثلاً میرزا خاں کی تالیف تحفۃ الہند میں یہ لفظ موجود ہے (یہ عہدِ عالم گیری کی تالیف ہے)

اِس کتاب سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

"ارج: بہ ضمِ اول و فتحِ را، پستان را نامند. و بہ فتحِ اول، مہنّدِ عرض باشد"

(تحفۃ الہند، عکسِ مخطوطہ باڈلین لائبریری، ورق ۷۲ ب)

سراج الدین علی خاں آرزو نے اپنے لُغت چراغِ ہدایت میں اِس لفظ کا جو اصطلاحی مفہوم لکھا ہے، وہ بہ ظاہر متعارف مفہوم سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ لفظ "انگ" کے تحت ایک ذیلی عنوان "اشتراکِ لُغات در فارسی و ہندی بچند وجہ است" کے ذیل میں اُنھوں نے لکھا ہے:

"پنجم مہنّد است، و ایں اصطلاحِ فقیر آرزو است، و آں آوردنِ الفاظِ فارسیہ است در زبانِ ہندی، چنانکہ الفاظِ فارسیہ در دفاترِ ہندی نویسند مثلِ روزنامہ و فی ضرورت وغیرہ۔"

اگر عبارت کا مفہوم سمجھنے میں مجھ سے غلطی نہیں ہوئی ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ "مہنّد" کی یہ تعریف اُس تعریف سے ذرا مختلف ہے جو اِس لفظ سے وابستہ رہی ہے۔

کے لیے اِس انداز کے دو اصطلاحی لفظ "مُعَرَّب"[1] اور "مُفَرَّس"[2] موجود ہی تھے۔

تہنید کا تعلّق الفاظ کے بدلنے اور بننے سے ہے، اور لفظ "مہنّد" ایسے ہی الفاظ کے لیے آتا ہے، اِسی طرح عطف و اضافت کے زیرِ بحث قاعدے بھی فارسی سے تعلّق رکھتے ہیں، اگر فارسی یا عربی کے کسی لفظ کو کسی مہنّد لفظ یا ہندی انگریزی (وغیرہ) کے کسی لفظ کے ساتھ بہ قاعدۂ فارسی ترکیب دی جائے، تو یہ عمل بھی تہنید کے ذیل میں آئے گا؛ اِن وجوہ سے، اگر ایسی ترکیبوں کو "تراکیبِ مہنّد" کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اِسی لیے اِس مضمون میں "ترکیبِ مہنّد" کو اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً "آب و دانہ" فارسی ترکیب ہے، لیکن "آب و دانے" کو ترکیبِ مہنّد کے دائرے میں آنا چاہیے، کیوں کہ "دانے"، "دانہ" کی مہنّد صورت ہے۔ ایک رُباعی کا پہلا شعر ہے،

اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے
ناداں! تجھے فکر آب و دانے کی ہے

اِسی طرح نشۂ بھنگ، موسمِ برسات، لیلائے سول سروس، پسِ چلمن، اخلاص و پیار جیسی ترکیبوں کو "مہنّد تراکیب" کہنا چاہیے۔ ہندستانی فارسی میں فارسی و عربی الفاظ کے ساتھ غیر فارسی عربی الفاظ کو بے تکلّف ترکیب دی جاتی رہی ہے اور اِس میں ہندستان نژاد اور ایران سے آئے ہوئے شعرا و نثار برابر کے حصّے دار ہیں، مگر ایسی ترکیبوں کو کوئی خاص نام نہیں دیا گیا تھا؛ یہ بات مناسب ہوگی کہ ایسی ترکیبوں کو، تراکیبِ مہنّد کے نام سے موسوم کیا جائے۔

---

[1] "معرب، وہ لفظ جو دراصل کسی اور زبان کا ہو، اور اُس کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ عربی بنالیا ہو، جیسے "مُشک" سے "مسک"" (نوراللغات)

[2] "مفرس، غیر زبان کا لفظ جسے فارسی زبان کا لفظ بنالیں۔" (نوراللغات)

مرکّبات، زبان کا اہم حصّہ ہوتے ہیں۔ ادب خصوصاً شاعری کو اُن کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ ادائے خیال کے لیے اُن کے اندر بہت وسعت ہوتی ہے۔ اِس میں دراصل زبان کے مزاج کو بہت دخل ہوتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ مفرد لفظوں کی کمی کو مرکّبات کی مدد سے پورا کرنا نسبتاً آسان ہے اور فارسی میں یہی ہوا ہے۔ عربی کے مقابلے میں فارسی کا ذخیرۂ مفردات کم ہے، مگر فارسی میں ترکیب کے متعدد قاعدوں کی مدد سے مرکّبات کا قابلِ قدر ذخیرہ ملتا ہے۔ مفرد یا مفرد نما لفظوں کا معرضِ وجود میں آنا، اکثر صورتوں میں نئی اشیا کے ظہور میں آنے یا نئے حقائق کے انکشاف پر منحصر ہوتا ہے، اِس لیے مفردات کے ذخیرے میں بہ تدریج اضافہ ہوتا ہے اور محدود تعداد میں۔ جب کہ مرکّبات کی تشکیل عموماً جذبات و افکار کی تصوّر تراشی یا خیالات کی پیکر تراشی کے تحت ہوتی ہے (فارسی کے خیال بند شعرا یا اُن سے قریب کی نسبت رکھنے والے شاعروں نے بڑی تعداد میں بہترین ترکیبیں تراشی ہیں) اور کبھی محض لفظی تلازموں کے نتیجے میں بھی اُن کی نمود ہوتی ہے۔ گویا ادبی زبان میں اکثر مرکّبات کا ہیولا، عالمِ خیال میں بنتا ہے، اِس لیے مفرد الفاظ کے مقابلے میں مرکّبات کی تشکیل آسان ہے اور بہت بڑی تعداد میں وہ وجود پذیر ہو سکتے ہیں۔ ادائے مفہوم اور لفظ سازی کا یہ انداز اور مرکّبات کا بہت بڑا حصّہ فارسی سے براہِ راست اردو کو ملا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان اپنے دورِ ارتقا میں "ادبی" رہی ہے۔ یعنی زبان کا ڈھانچا بنا کسی طرح ہو مگر اُس کا معیاری روپ ادبی رہا ہے، اور اُس ادبیت میں بھی شاعری کو سب سے اہم منزلت حاصل رہی ہے۔ اِس زبان کا نقش جب درست ہو رہا تھا، اُس وقت دفتری اور تہذیبی سطح پر فارسی کی حکومت تھی۔

جب فارسی کی بساط الٹ گئی تو اُس کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ یہاں جدید علوم و فنون اور صنعت و حرفت کو جتنا بھی فروغ ہوا، اُس کی ترجمانی انگریزی کے حصے میں آئی۔ اردو عموعی طور پر شعر و ادب کی زبان رہی اور اُس معیار پسندی کے سایے میں پروان چڑھتی رہی جس میں دہلی سے کہیں زیادہ حصہ لکھنؤ کی تہذیب آرائی کا تھا۔ دہلی ایک مدت سے قافلوں کی منزل گاہ اور گذرگاہ تھی اور مختلف اقوام اور مختلف علاقوں کے اثرات یہاں آویزش و آمیزش کے عمل سے دوچار ہوتے رہے تھے؛ اِن وجوہ سے یہاں کی معاشرت کے مختلف مظاہر میں کھُردرے پن کی ہلکی سی نمود ضرور تھی اور زبان بھی اِس سے مستثنا نہیں تھی؛ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی ادبی زبان پر قاعدوں کے پہرے کچھ زیادہ نہیں بیٹھ پائے۔ اِس کے برخلاف لکھنؤ کی نئی معاشرت نے اُس شعری و ادبی زبان کو ضابطوں میں زیادہ سے زیادہ اسیر کرنا ضروری سمجھا۔ وہاں کی معاشرت جس طرح ظاہر آرائی کے پھیر میں آئی تھی، اُس کا تقاضا ہی یہ تھا۔ زبان، ادب اور حکومت؛ اِن سب کے مرکزِ اول (دہلی) سے امتیاز پیدا کرنے کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش، اُس میں اضافے ہی کرتی رہتی تھی ——— گویا اردو کو وہ فضا ملی ہی نہیں جس میں صنعت و حرفت اور ایجادات و اکتشافات کی تازہ کاریاں اپنے اثرات کو تہ نشیں کرتی رہتی ہیں، جن کے اثر سے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ زبان میں وہ صلابت پیدا ہوتی ہے جس کے بل پر وہ پھیلتی ہے، اور ادبی زبان اور بول چال کی زبان کا فاصلہ کم ہوتا رہتا ہے۔ اِس کا کچھ اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب کسی نئے عنصر یا نئے انداز کے اضافے، یا کسی قاعدے کی شکست کا مرحلہ آتا ہے۔ ترکیبِ مہتند کا قاعدہ بھی اِسی ذیل میں آتا ہے۔

ترکیب کے کئی قاعدے ہیں۔ سادہ طریقہ تو یہ ہے کہ دو لفظوں کو پہلو بہ پہلو رکھ دیا جائے اور اس کی دو صورتیں یہاں قابلِ ذکر ہیں: دونوں جز اسم ہوں جیسے: گل بدن اور پن چکی۔ ایک اسم ہو اور ایک فعل، جیسے دل شکن اور ہتھ چھٹ: "پن چکی" اور "ہتھ چھٹ" جیسے مرکبات دیسی ہیں اور ان کو درست قرار دیا گیا ہے: مگر خاص خاص صورتوں کے علاوہ، عام طور پر اس کو نادرست بتایا گیا ہے کہ مرکب کا ایک جز فارسی و عربی کے بجائے کسی اور زبان کا ہو، اور ایک جز فارسی یا عربی سے تعلق رکھتا ہو مثلاً "سمجھدار" اور "سنسنی خیز" کی حیثیت بہ لحاظِ قاعدہ "غیر معتبر مرکبات" کی ہوگی۔

فارسی میں فعلِ امر سے پہلے کسی اسم کے اضافے سے اسم فاعل سماعی بنتا ہے، جیسے: دل کش، دل چسپ۔ ایسے مرکبات اردو میں بھی اسی طرح مستعمل ہیں۔ اسی طرح فارسی کے متعدد سابقوں اور لاحقوں کے اضافے سے بنے ہوئے مرکبات بھی اردو میں بہ کثرت موجود ہیں، جیسے: گل زار، مے کدہ (وغیرہ) — ترکیب کے یہ قاعدے جس قدر سادہ ہیں اسی قدر کار آمد بھی ہیں۔ اس سادگی و پُرکاری کے باعث یہ ہونا ہی تھا کہ اردو میں بھی ایسے مرکبات کی تشکیل ہو اور اس طرح کہ ان کا ایک جز فارسی یا عربی ہو اور ایک مقامی، جیسے: بھکڑ گدا، ڈاک خانہ، دھوکے باز، جگت استاد ("جگت گرو" کی دیسی ترکیب بھی پیشِ نظر ہے)، کفن کھسوٹ، عجائب گھر، چور دروازہ، ہتیار بند، لٹھ بند، امام باڑا، بسنتی پوش[1]، ڈگری یافتہ، رجسٹری شدہ، تھانے دار، دھاری دار، گاڑی بان، منہ زور وغیرہ۔ اس قبیل کے مرکبات کے متعلق اساتذہ نے کچھ بھی کہا ہو، یا کہیں، یہ زبان کا اہم جز ہیں اور عام تحریروں میں ان کو استعمال کیا گیا ہے اور استعمال کیا جاتا ہے۔

---

[1] ایک پرانا شعر یاد آگیا:

اک بسنتی پوش سے آغوش رنگیں کیجیے　　　جی میں ہے، اس مصرعِ موزوں کو تضمیں کیجیے

اِس سلسلے میں خاص بات یہ ہے کہ ایسے مرکبات نے عموماً نثر میں بار پایا ۔ اِن میں سے اکثر تھے بھی اُسی کے ڈھب کے ۔ شاعری کی زبان کے متعلق یہ کہا جا چکا ہے کہ اُس کا دائرہ شروع ہی سے محدود رہا ہے ۔ شعری زبان کا ایک رچا ہوا تصور ذہن و ذوق پر اِس طرح چھا کر رہ گیا ہے کہ اکثر صورتوں میں اُس سے قطعِ تعلق نہیں ہو پاتا ۔ ہم میں سے اکثر کا یہ حال ہے کہ اصول کے طور پر جو بھی کہیں، مگر شعر میں کوئی ایک لفظ اِدھر اُدھر کا آجائے تو تربیت یافتہ ذوق تلخ کام ہو جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اِس طرح کی بیش تر ترکیبیں نثر تک محدود رہیں ۔

ترکیب کے دو خاص قاعدے ایسے ہیں جو فارسی سے مخصوص ہیں اور وہیں سے اُردو کو ملے ہیں؛ یہ ہیں عطف اور اضافت کے قاعدے ۔ اضافی مرکبات نے (توصیفی مرکبات بھی اِس میں شامل ہیں) فارسی زبان و ادب کو بہت کچھ بخشا ہے اور اردو شاعری میں بھی بہت سی کرشمہ کاریاں اُنھی کی مرہون ہیں ۔ اِن دونوں قاعدوں نے نثر کے مقابلے میں نظم میں زیادہ جگہ بنائی، بل کہ نثر میں خاص خاص ترکیبیں، نظم ہی سے مستعار لی جاتی رہی ہیں ۔ چوں کہ اضافی ترکیبیں شروع ہی سے نظم سے کچھ زیادہ متعلق رہی ہیں، اور یوں بھی کہ یہ دونوں قاعدے، فارسی کے خاص قاعدوں میں سے ہیں؛ اِن وجوہ سے اِن میں "خالص پن" کا بہ طورِ خاص لحاظ رکھا گیا ہے، یعنی یہ کہ مرکب کے دونوں اجزا فارسی و عربی کے ہوں ۔ بس اتنی چھوٹ دی گئی کہ اسمائے خاص یا ایسے نام جن کا بدل موجود نہیں، اُن کو عطفی یا اضافی مرکبات کا جُز بنایا جا سکتا ہے، مثلاً

ہوس اندھا بنا کر، قتل کا سامان کرتی ہے
فریبِ نفس ہے، سیتا کہاں آغوشِ راون میں (آرزو لکھنوی)

حد نیز ہے کہ "چلمن" اور "محرم" کی طرح کے جو لفظ اُردو میں مستعمل ہیں اور میں میں

عربی یا فارسی کے معلوم ہوتے ہیں؛ اکثر اساتذہ کی احتیاط پسندی نے اُن کو بھی ایسی ترکیبوں سے دور رکھنے پر زور دیا۔ آتش کے اِس شعر میں؛

کسی کی محرمِ آبِ رواں وہ یاد آئی ٭ حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

"محرمِ آبِ رواں" کی ترکیب پر کئی معتبر لوگوں نے اعتراض کیا ہے۔ امیر مینائی کے ایک شاگرد کے ایک شعر میں "پسِ چلمن" آگیا تھا، امیر نے اُس کو قابلِ اعتراض قرار دیا۔ شاگرد کا مصرع تھا ؏

ہم نے نظارہ کیا ہے پسِ چلمن اُن کا

اُستاد نے اِس کو یوں بنا دیا ؏

ہم نے نظارہ کیا ڈال کے چلمن اُن کا[1]

مولانا نظم طباطبائی نے لکھا ہے؛

"وہ الفاظِ فارسی و عربی کے، جن میں معنوی تغیّر ہو گیا ہے، اہلِ زبان اُس لفظ کو اور معنی میں بولتے ہیں، اہلِ ہند اور معنی میں بولنے لگے، مثلاً "محرم" کا لفظ اردو میں چھوٹے کپڑے کے معنی پر مستعمل ہے، یا "تردّد" کا لفظ عربی میں آمد و رفت کے معنی پر ہے اور اردو میں فکر و تشویش کے معنی پر بولتے ہیں، یا جیسے لفظ "نم" فارسی میں "تری" کے معنی پر ہے اور اردو میں "ترہ" کے معنی پر بولتے ہیں، یا جیسے لفظ "خفّت" اردو میں شرمندگی کے

---

[1] امیر نے اِس اصلاح کے ذیل میں لکھا تھا۔

"چلمن، نہ فارسی ہے نہ عربی، اُس کی طرف اضافت فارسی کی ہرگز جائز نہ ہوگی۔ "جانبِ چغراء" کی نظیر اِس کے لیے سند نہیں ہے۔ "چغراء" قلم ہے، شہر کا نام ہے، اُس کا ترجمہ عربی فارسی میں کیا ہوگا؟ لہٰذا ترکیبوں کے ساتھ بے تردّد باندھا جائے گا۔"

[مکتوبِ امیر مینائی بنامِ دل شاہ جہاں پوری۔ مرقعِ ادب، جلد دوم]

معنوں پر مستعمل ہے ، اِس قسم کے جمیع الفاظ کا تتبع و تجسس کرنا چاہیے اور اُن سب الفاظ کو ہندی سمجھنا چاہیے اور ترکیب فارسی یا عربی میں جس طرح ہندی الاصل لفظوں کو لانا غلط ہے ، اِسی طرح ان الفاظ کا استعمال بھی ہر اہلِ قلم کے لیے اضافت و عطفِ فارسی وغیرہ میں ناجائز ہوگا۔ یعنی جس طرح کپڑۂ رنگیں" کہنا صحیح نہیں ، اُسی طرح " مرہم رنگیں" اور " چشم نم " کہنا بھی ناجائز ہے ، کیوں کہ کسرۂ توصیفی فارسی کے لیے مخصوص ہے ۔

اِن تین قسموں کے علاوہ ، ایسے لفظ بھی اردو میں بہت سے بولے جاتے ہیں کہ ہندیوں نے کسی عربی یا فارسی لفظ سے اُن کو اشتقاق کر لیا ہے اور اہلِ زبان اُس اشتقاق سے بے خبر ہیں ، مثلاً " تموز " تو فارسی لفظ ہے ، اُس سے ہندیوں نے " تمازت " ، " نزاکت " کے قیاس پر مصدرِ عربی بنا لیا ——— اسی طرح ملالت ، بخالت ، ذہانت ، لیاقت ، شمولیت ، یگانگت وغیرہ ہندیوں نے قیاس سے مصدر بنائے ہیں ، ایسے الفاظ کا استعمال اکثر تو ناجائز ہے ۔ اگر کوئی لفظ فصحا کی زبان پر چڑھ گیا ہے ، جیسے " بادشاہت " تو اُسے ہندی لفظ سمجھنا چاہیے ، کسرۂ اضافی یا توصیفی یا کسی اور ترکیب عربی فارسی کے ساتھ اُس کو استعمال کرنا درست نہیں ۔ مثلاً جس طرح " پیار و چاہت " بہ عطفِ فارسی کہنا جائز نہیں ، اُسی طرح " امارت و بادشاہت " کہنا بھی نادرست ہے ۔"

(معائبِ سخن ، طبع چہارم ، ص ۴۷ - ۴۸)

حسرت موہانی نے لکھا ہے ، " اردو الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت بھی سراسر معیوب اور ناجائز ہے " (ایضاً ص ۲۸) اور اِس ذیل میں بہت سی مثالیں درج کی ہیں ، اُن میں یہ اشعار بھی ہیں :

روتا ہے وہ جیس جو مری بزم سوگ میں
پھولوں میں میرے پھیلی ہوئی بو وفا کی ہے

ملازم ہیں جو دنیا میں تو ہم سرکار ساقی کے
سبو تنخواہ میں، چھٹی میں ہم کو جام ملتا ہے

سید انشا "برقا" اور "سفیل" کو صحیح سمجھتے تھے، مگر مبتذل ترکیبوں کو وہ بھی صحیح نہیں سمجھتے تھے،

"دو ہندی لفظوں یا ایک ہندی اور ایک غیر ہندی (عربی فارسی وغیرہ) کے ساتھ کسرۂ اضافت کا استعمال غلط ہے، لیکن فارسی عبارت میں، اشیا کی حقیقت کے بیان میں، دونوں صورتیں جائز ہیں۔"

(ترجمۂ دریائے لطافت ص ۲۵۹)

اسی سلسلے میں انھوں نے مزید لکھا ہے،

"موصوف کے آخر کا کسرۂ اضافت ہندی میں جائز نہیں، وہ فارسی سے خصوصیت رکھتا ہے۔ "اوسِ بسیار"، "پھولِ خوب" کہنا غلط ہے۔ لیکن کسرۂ اضافت ایسے لفظ کے آخر استعمال کر سکتے ہیں جس کے لیے فارسی میں کوئی لفظ نہ ہو۔" (ایضاً ص ۲۹۰)

شعری زبان کے اثر سے واقعتاً یہ صورت ہے کہ نظم میں عام طور پر ایسے مرکبات اجنبی لگتے ہیں اور مذاقِ سلیم پر بار معلوم ہوتے ہیں جن کا ایک جُز فارسی یا عربی سے تعلق رکھتا ہو اور ایک جز ہندی یا انگریزی کا ہو۔ ایسی ترکیبوں کو کبھی طنز کے طور پر ضرور استعمال کر لیا جاتا ہے، مزاحیہ شاعری میں بھی اُن کی کھپت ہو جاتی ہے، مگر غزل میں تو تربیت یافتہ ذوق اُن کو گوارا ہی نہیں کر پاتا، اور نظموں میں بھی محدود سطح پر بعض خاص قسم کی ترکیبیں ہی بار پا سکتی ہیں۔ زبان کا جو مزاج اب تک رہا ہے، یہ اُس کا اثر ہے۔ زبان کا مزاج بڑی چیز ہے، وہ دیر میں بدلا کرتا ہے اور اردو میں ابھی تک ایسی مزاجی تبدیلی نہیں ہو پائی ہے ——— یہ بات خاص طور پر ذہن میں رہنا چاہیے کہ معطوف

اضافت کے قاعدوں کا تعلق فارسی سے ہے اور اب تک اُن کا وہ کردار اور انداز اُسی طرح محفوظ ہے اور یہ بھی کہ اصول و قاعدہ کچھ بھی کہیے لسانیات کا جو بھی فیصلہ ہو اور اصلاح پسند طبیعتیں زبان سے کچھ بھی کہیں ؛ مگر اردو میں اب تک فارسی و عربی اور غیر فارسی و عربی الفاظ کو الگ الگ پہچانا جاتا ہے اور جب تک یہ صورت رہے گی، اُس وقت تک عطف و اضافت کے خالص فارسی قاعدوں کا عمومی تعلق، عربی و فارسی الفاظ سے یا اُن سے ملتے جُلتے مہنّد الفاظ ہی سے رہے گا۔

اِس سلسلے میں دل چسپ بات یہ ہے کہ خود فارسی میں صورتِ حال ذرا مختلف ہے۔ ایرانی فارسی میں تو ظاہر ہے کہ عام ہندی الفاظ کے شامل ہونے کا سوال کیوں پیدا ہوتا، البتہ ہندستان میں اِس کی گنجایش تھی، اور گنجایش کیا، یوں کہیے کہ ایسا ہونا لازم تھا؛ اِس بنا پر کہ یہاں فارسی زبان صرف شاعری کی زبان نہیں تھی؛ وہ دفتری زبان تھی اور سارے کام اُسی میں انجام دیے جاتے تھے، اِس لیے اُس میں ادبی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ، دوسری سطح پر اُس کھُردرے پن کی نمود بھی لازم تھی جس کا تعلق کاروباری اسالیبِ بیان سے ہوا کرتا ہے اور جس کے اثر سے زبان میں کئی سطحیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ کاروباری پن اِس کی ضمانت تھا کہ مقامی لفظوں کی کھپت اُس میں ہوتی رہے۔ جب ایک بار اجنبی لفظوں کے لیے راستہ کھُل گیا تو رفتہ رفتہ اُس میں مقامی لفظوں کا اجنبی پن کم ہوتا گیا۔ یہ اجنبیت جس قدر کم ہوتی گئی، اُسی نسبت سے بہت سے مقامی لفظ، فارسی قاعدوں کی نسبتیں حاصل کرکے، فارسی تراکیب کے سانچوں میں ڈھلتے رہے۔ مگر اِس کا اظہار ضروری ہے کہ آمیزش کا یہ عمل نثر میں فروغ پذیر نظر آتا ہے۔ نظم میں اُس کا تناسب کم ہے۔ نظم میں بھی صنفِ غزل اِس سے محفوظ رہی، البتہ مثنویوں میں اور پھر قصائد میں اُن کی نمود ہوئی۔

[یہ تحدید اِن اصناف کے مزاجی تقاضوں کی بھی آئینہ داری کرتی ہے]۔

میں اِس سلسلے میں مزید گفتگو سے پہلے '(ہندستانی) فارسی نثر سے ہندترکیبوں کی کچھ مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں، تاکہ صورتِ حال کا صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکے ۔ یہ واضح کردیا جائے کہ اِن مثالوں کی حیثیت "مشتے نمونہ از خروارے" کی سی ہے۔

ذخیرۃ الخوانین (مصنفہ شیخ فرید بھکری، جلدِ اول، طبع کراچی، ۱۹۶۱ء)

از پرگناتِ ہندوستان (ص ۱۵) برچوکھنڈیِ فیل (۲۹) بصحبتِ شراب و پاتربازی (۲۹) ایامِ برسات (۳۸) بضربِ برچھی (۴۱) صدای کوزہ (۵۵) کچھریِ بے نمک (۹۰) کوزۂ چوب (۹۲) ڈیوریِ محلِ نواب نورجہاں بیگم (۹۳) چوڈولِ آں صالحہ (۱۰۵) برگِ تنبول (۱۱۰) پھاٹکِ خانگیِ خود (۱۱۸) سکھپالِ سواری (۱۳۲) خرجِ بھٹیارہا (۱۴۵) جھروکۂ دولت (۱۴۶) چبوترۂ کوتوالی (۱۴۹) لباسِ سناسیاں (۱۵۳) درباب اکھاڑا (۲۲۹) عورتِ برہمن (۲۳۸) کٹرۂ خاص وعام[1] (۲۴۶)۔

جہانگیرنامہ (نول کشور پریس ۱۸۹۸ء)

چودھریِ پرگنہ (۱۶) فضای جھروکہ (۳۷) پھول کٹارۂ گراں بہا (۷۰)

---

[1] اِس کتاب سے عام الفاظ کی بھی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں،

برڈولی سوار شدہ (۵۵) در گدڑی (۶۲) پرگنات (۷۳) عورات (۹۰) ستی (۱۱۱) در ٹوکرہ انداختہ (۱۳۳) پاتربازی (۱۳۶) کمل (۱۳۰) چہار گھڑی (۱۵۱) اخراجات (۱۵۷) دوپٹہ (دوپٹا) (۱۵۹) پنکھہ (پنکھا) میکرد (۱۷۱) در کوٹھری نہادہ (۲۰۲) بگھار بدال میدہند (۲۲۳) درزی (۲۲۳) ساگ (۷) سالن (۷)۔

ایامِ برسات (۱۱۰) شدّتِ باد و جھکّڑ (۱۱۱) گردِ پٹو (۱۳۶) پایانِ گھاٹ (۱۵۲) زخمِ برچھا (۲۴۰)۔

وقائع نعمت خانِ عالی (نول کشور پریس، طبع چہار دہم):

کلسِ بارگاہ (۱۹) بیڑۂ پان (۳۳) سفینۂ بہی (۴۲) بیاضِ بیجک (۴۵) فیلانِ ہتیہ پول (۴۶) گولیِ افیون (۸۲) چلمِ تمباکو (۱۵۰)۔

رقعاتِ عالمگیری (مطبعِ مجیدی کانپور ۱۳۵۹ھ):

چیرۂ زعفرانی (۵) ڈالیِ انبہ (۶) جھروکۂ درشن (۶) بعدِ برآمدنِ چہار گھڑی روز (۶) مالِ بیوپاریان (۹) چند تھانِ محمودیِ زردوزی (۱۱) تھانہ جاتِ فوجداری (۱۵) ڈالیِ نذر (۳۷) چھاونیِ دزداں (۴۶) بڈیرۂ نصرت جنگ (۶۲)۔

رسائلِ طغرا (نول کشور پریس کانپور):

تالِ آب (۳۱) چیرۂ دستار (۳۵) لطافتِ پشکۂ چٹنی (۶) کنارۂ دوپٹا (۶) برگِ پان (۳۶) پالکیِ درنشان (۳۲) مہاوتِ روزگار (۶۴) جھروکۂ مشرق (۶۴) درشنیانِ با اخلاص (۶۴) بدستِ ڈاک چوکی (۶۶) کیلۂ ہلال صورت (۶۸) مہاوتانِ شمال (۷۱) ہتھنالیانِ رعد (۷۳) بدستکِ زدنِ تال (۷۴) منڈلِ عزائم خوانی (۸۱) کلاونتانِ خوش آواز (۱۴۲) حرکاتِ پاتر بازاں (۱۴۲) تنبولِ وقت (۱۵۶)۔

مغل بادشاہوں خصوصاً اکبر نے بہت سی چیزوں کے ہندی نام برقرار رکھے تھے اور یہ ناگزیر تھا اور اس طرح کے کچھ نام خود بھی رکھتے تھے۔ ایسے سب لفظ تحریر و تقریر میں بہ اضافت و بغیرِ اضافت آتے ہی رہتے ہوں گے (یہ بھی ناگزیر تھا) اور ان کے اثرات اپنا کام کرتے رہتے ہوں گے۔ میں صرف آئینِ اکبری کے ایک عنوان "آئینِ فیلخانہ" سے

ایسی کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں :

دھرنہ ، آنڈو ، بیری ، گدھ بیری ، لوہ لنگر ، چرخی ، اُجیال، دُنبش ، گگ ریلہ ، گُدوق ، پچڑہ ، چُوراسی ، پٹ کچہ ، ٹیا ، پاکھر، گج جھنپ ، میکھ ڈنبر ، رَن پیل ، گیتلی ، پاے رنجن ، آنکس ، گجباک ، گجنڈ ، جگاوٹ ، جھنڈہ ، گج موتی ، مِرگ ، بال ، پوت ، سَرہری، سینکا ڈھال ، تل جُور ، پنڈریک ، بامن ، انجن ، پھپھڑت ، سارہ بھوم، گندھرپ مزاج ، سودر مزاج ، راچھس مزاج ، بھمولا ، پھنڈرکیا ، مُودکل ۔

مختلف دفاتر میں بے شمار مقامی اصطلاحیں بھی استعمال کی جاتی تھیں ۔ زبان پر ان سب کا اثر پڑنا ناگزیر تھا ۔ امیر خسرو ، ظہوری ، طغرا ، کلیم وغیرہ کے یہاں نظم میں بھی بہت سے دیسی مفردات اور ہند مرکبات مل جائیں گے ۔ مدعا یہ ہے کہ ہندستانی فارسی میں ہندی الفاظ اور ہند مرکبات عام طور پر پائے جاتے ہیں ۔ اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہونا یہ چاہیے تھا کہ اردو میں ہند مرکبات کا وہی انداز برقرار رہتا کیوں کہ اردو، فارسی کی جانشین نہ سہی ، مگر اس کے بعد ادبی فرماں روائی اِسی کے حصے میں آئی ؛ مگر بات وہی ہے کہ جب یہ تبدیلی رونما ہوئی اُس وقت ایک تو زبان کا ابتدائی دور تھا ، دوسرے یہ کہ فارسی یا انگریزی کی طرح دفتری زبان کی حیثیت اردو کو نہیں ملی ۔ اُردو کو جو حیثیت ملی ، اُس میں ادبیت شریکِ غالب تھی ۔ اِس طرح وہ شروع ہی سے ایک دائرے میں محصور رہی ۔ پھر بھی فارسی کے اُس عام انداز کے دو اثرات کسی نہ کسی حد تک اردو میں کارفرما رہے : ایک تو یہ کہ قدیم شعرا کے یہاں ہند مرکبات اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں ۔ یہ صورتِ حال کسی نہ کسی حد تک غالب کے زمانے تک ، بل کہ ذرا بعد تک نظر آتی ہے[1]۔

---

[1] کلیاتِ اسماعیل میرٹھی سے صرف دو مثالیں (ایک اضافی اور ایک عطفی) پیش کی جاتی ہیں ،

یہ ضرور ہے کہ بہ تدریج اُن کا اوسط کم ہوتا گیا ہے۔ مگر جب دبستانِ لکھنؤ کی روایتوں نے نمود حاصل کی تو یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دہلی میں شاعری کے ضابطے کم بنے، اور اُن پر عمل اُس سے بھی کم ہو پایا؛ اس لیے عام اثرات کے لیے گنجایش نکلتی رہی۔ لکھنؤ میں شروع ہی سے زبان کو قواعد کی زنجیروں میں کسا گیا اور سخت گیری کی نگاہ پاسبانی کرتی رہی؛ اس لیے اُس طرح کی گنجایشوں کے لیے جگہ نہیں بن سکی؛ چوں کہ سیاسی حالات نے آخر میں لکھنؤ کو مرکزیت اور طاقت بخش دی تھی، اور وہاں کی ٹھپا لگی ہوئی پابندیوں کو فروغ مل گیا تھا؛ اِس لیے محدود دفتری اور نچلی سطح کے لسانی اثرات اور آزادہ روی کے لیے اِس کی گنجایش رہی ہی نہیں تھی کہ وہ نظم کی معیاری زبان میں آمیز ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ اساتذہ کے یہاں نثر میں آخر تک مہنّد ترکیبیں باریاتی رہیں اور یہ اُس طاقت ور روایت کے پایدار اثرات کا نتیجہ تھا۔ اِن اساتذہ میں امیر مینائی جیسے استاد بھی شامل ہیں جو "پس چلمن" کو غیر معتبر سمجھتے تھے۔ نوطرزِ مرصّع خاصی پرانی کتاب ہے، پہلے اُس سے دو چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ نوطرزِ مرصّع مرتبۂ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی پیشِ نظر ہے:

فرشِ چاندنی (ص ۱۰۱) شامیانۂ چاندنی (۱۰۹) بوٹا کاری و رنگ طرازی (۱۳۳) موسم برسات (۱۴۰) روشنیِ جھاڑ بندی (۱۶۵) کشتی و دلالہ (۲۳۳) خواجہ سرایانِ ڈیوڑھیِ خاص محل (۳۲۲)۔

سرسید اور حالی بعد کے لوگوں میں سے ہیں، اِن لوگوں کے یہاں اور ان کے معاصرین

دوسرا مورچہ، کالج کی نہے اعلا تعلیم
جس سے کچھ ہوتے مکشوف رموزِ نیچر (ص ۱۹۱)

نور دو سایہ کی بڑھی ہم سایگی
گو تھیا ہم رنگ ہیں لیل و نہار (ص ۲۱۳)

کے یہاں بھی ایسی ترکیبوں کی بہتات ہے۔ بدلے ہوئے حالات اور ضرورت نے اِن لوگوں کے یہاں انگریزی لفظوں کا تناسب بڑھا دیا ہے۔ مکاتیبِ سرسید، مرتبہ مشتاق حسین سے چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں :

چودھریانِ بلدور (ص ۲) ترشۂ سوسیٹی (۳۶) آمدنیِ چھاپا خانہ (۴۲) چندۂ ممبری (۴۳) زرِ چندۂ ممبری (۴۴) قواعدِ کمیٹی (۸۰) ٹرسٹیانِ کالج (۱۱۰) بذریعۂ چٹھی (۱۱۴) رپورٹِ مابعد (۱۱۶) اخراجاتِ لاٹری (۱۲۲) مستحقِ اسکالرشپ (۱۸۸) ڈگریاتِ آرٹس (۲۰۲)۔

امیر مینائی کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ وہ نظم میں "پسِ چلمن" تک کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، مکاتیبِ امیر مینائی، مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب (طبع دوم) سے بھی چند مثالیں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے :

متصلِ سڑک (ص ۳۰۹) بہ واپسیِ ڈاک (۳۴۹) کمیٹیِ انتخاب (۲۳۶) ممبرانِ کمیٹی (۳۲۸) ارکانِ اسٹاف (۲۳۸) کارڈِ اطلاعی (۱۰۹) بصیغۂ رجسٹری (۳۳۱)۔

۳

ہم کو صفائی کے ساتھ یہ مان لینا چاہیے کہ اردو میں، مختلف اعتبارات سے، عربی وفارسی اور ہندی لفظوں کی تفریق باقی رہی اور اُس کے طاقت ور اثرات چھائے ہوئے ہیں۔ زبان کا مزاج اچانک کسی ایسے مطالبے کو قبول نہیں کر سکتا جو اب تک کی ہمہ گیر روایت کے خلاف ہو۔ آپ "دردِ گھٹنا" یا "اونٹِ بے نکیل" یا "اونٹ و گھوڑا" لکھیں یا بولیں، اور لسانی اصولوں کی منطق سے اِن کو قابلِ قبول ٹھہرائیں، مگر زبان کا مزاج اِن کو قبول نہیں کر پائے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے اضافی و عطفی مرکبات کو مزاحیہ

ادب کے حوالے کر دیا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ اِسی مقصد سے بولے یا لکھے گئے ہیں[1]۔

میں نے اِس سے پہلے کئی بار یہ بات کہی ہے کہ ترکیب مہنّد بجائے خود غلط نہیں؛ ہاں اِس سلسلے میں مذاقِ سلیم کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا؛ مگر میں خود محسوس کرتا ہوں کہ یہ قول نا تمام ہے۔ تجربہ یہ ہوا ہے کہ اردو میں جو لفظ فارسی عربی لفظوں کے انداز پر بن گئے ہیں، یا وہ لفظ جن میں کچھ تصرف ہوا ہے مگر اُن کا کینڈا وہی عربی فارسی والا ہے؛ ایسے لفظ بالعموم اضافی و عطفی مہنّد مرکبات کے ایک جز یا دونوں اجزا کے طور پر کھپ جایا کرتے ہیں۔ اصطلاحی الفاظ اور خاص خاص نام کسی بھی زبان کے ہوں؛ وہ بھی اِسی ذیل میں آتے ہیں؛ مگر عام ہندی و انگریزی لفظ عموماً نہیں کھپ پاتے۔ اُکھڑے اُکھڑے، بے جوڑ اور اکثر مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔

اِسی کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رہے کہ بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے، اور یہ کہ اردو میں یہ فرق کچھ زیادہ ہے؛ اِس لیے یہ لازم نہیں کہ جو ترکیب بول چال کا جز ہو، وہ ادبی زبان میں بھی اُسی طرح کھپ سکے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو ترکیب نثر میں جگہ پا سکتی ہو، وہ نظم میں بھی اپنی جگہ بنا سکے۔ کچھ دنوں سے اُردو میں یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ نظم کی زبان کو بول چال کی زبان سے قریب تر لایا جائے، مگر آج کل یہ کوشش افراط و تفریط کے پھیر میں آگئی ہے۔ اگر ایسی کوششیں

---

[1] ایک فلم آئی تھی منورنجن، اُس میں مکالمہ نویس نے "گھنٹہ چوبیس" قسم کی بہت سی ترکیبیں استعمال کی تھیں، جو ایک جعلی نواب کی گفتگو کا جز تھیں۔ مکالمہ نویس کے سامنے یہ پہلو تھا کہ "نواب صاحب" اُس معاشرت اور زبان کے متعلق بہت کچھ سننے کے گنہگار ضرور ہیں، مگر اُن سے واقف نہیں۔ دیکھنے والوں کو یاد ہوگا کہ ایسی ترکیبوں نے اُس فلم میں مسخرگی کو کس کس طرح نمایاں کیا تھا۔

وسیع پیمانے پر بار آور ہو سکیں کہ مفرد الفاظ کی حد تک نظم کی زبان، بول چال کی زبان سے کچھ اور قریب آجائے [ابتدائی کوششیں عموماً مفرد الفاظ تک محدود رہتی ہیں] تو اس کا امکان ہے کہ دوسرا مرحلہ یہ آئے کہ ایسے کچھ مرکبات بھی نظم کی زبان میں دخل پا سکیں۔

بہر حال، اس وقت یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ بہت سی ایسی ہندی ترکیبیں جو نثر میں مناسب معلوم ہوتی ہیں، یہ ضروری نہیں کہ وہ نظم کو بھی اُسی طرح راس آسکیں۔ اردو کا تو یہ حال ہے کہ بعض ایسے فارسی لفظ جو فارسی میں مستعمل ہیں، مگر کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہندی الاصل معلوم ہوتے ہیں؛ اُردو نے اُن کو بھی ترکیب کی صورت میں قبول نہیں کیا ہے۔ مثلاً ایک لفظ ہے "جنگل" یہ فارسی میں موجود ہے (بہارِ عجم) مگر اس کی بناوٹ اس کے ہندی ہونے کا شبہہ ذہن میں پیدا کرتی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص مثلاً "خانۂ جنگل" لکھ دے تو بڑا عجیب مرکب معلوم ہوگا۔ یا جیسے ایک لفظ ہے "چوترہ"۔ یہ برہانِ قاطع میں موجود ہے، مگر "جنگل" کی طرح یہ بھی دیسی دکھائی پڑتا ہے؛ اب "چوترۂ بلند" لکھیے اور اُس پر حاشیہ بھی لکھ دیجیے، مگر ذہن و ذوق دونوں کی آنکھوں میں ناپسندیدگی کی چمک برقرار رہے گی۔

ذیل میں ترکیبِ ہندی سے متعلق ضروری قاعدوں کو لکھا جاتا ہے۔ یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ ایسے قاعدوں میں قطعیت نہیں ہو سکتی۔ بہت سے مقامات پر مذاقِ سلیم اپنے طور پر فیصلہ کیا کرتا ہے اور کچھ مقامات پر استثنا کا قاعدہ حاوی معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی ایک ضابطہ ہے۔ اس کے باوجود، قواعد کی ضرورت اور اہمیت برقرار رہتی ہے، کیوں کہ اکثر صورتوں میں اُن کے بغیر فکر و نظر کو صحیح راستہ نہیں مل پاتا اور اُن کی عدم موجودگی میں عموماً انتشار کو بڑھاوا ملتا ہے۔ مناسب قواعد، اکثر صحیح فیصلوں میں معاون ہوتے ہیں اور اُن کے لیے منطقی بنیادوں کا کام دیتے ہیں۔

غیر عطفی و اضافی مرکّبات :

غیر عطفی و اضافی مرکّبات اردو میں بہت ہیں۔ ہندی میں ترکیب کا یہ سادہ قاعدہ موجود ہے کہ دو لفظوں کو پہلو بہ پہلو رکھ دیا جائے۔ ایسے مرکّبات کبھی تو (ہندی کے انداز پر) غیر فارسی عربی اجزا پر مشتمل ہوتے ہیں، جیسے، چڑیا گھر، چور گلی، موتی چوک، کسان سبھا وغیرہ۔ اور کبھی اُن کا ایک جُز فارسی یا عربی ہوتا ہے، جیسے، توتا چشم، نکٹا گدا، عجائب گھر، امن سبھا، ڈاک خانہ، لنگر خانہ، چور دروازہ، امام باڑا، جیل خانہ، کٹھ مُلا، مُنہ زور وغیرہ۔

ایسے مرکّبات بھی اردو میں اچھی خاصی تعداد میں ہیں جو اسم اور فعل پر مشتمل ہیں اور دونوں اجزا غیر عربی فارسی ہیں، جیسے، تیس مار، لٹھ مار، مُنہ پھٹ، ہتھ چھٹ، رس بھری، من چلا، من مانی، مُنہ بولا، جانت کاٹی، آنکھ پھوڑ (وغیرہ)؛ اس لیے یہ ہونا ہی تھا کہ اِن کے انداز پر ایسے مرکّبات بھی بنیں (الف) جن کا ایک جُز یعنی فعل، اردو (یا ہندی) سے تعلق رکھتا ہو اور دوسرا جُز یعنی اسم عربی یا فارسی کا ہو۔ مختلف افعال سے مرکّب اِس قماش کے بے شمار مرکّبات اردو میں پائے جاتے ہیں، مثلاً ، دُم کٹا، دل جلا، دل لگی، کفر توڑ وغیرہ، اور (ب) ایسے مرکّبات بھی بنیں جن میں فارسی افعال بہ طور ایک جُز کے آئیں، جیسے، کھدر پوش، گیروا پوش، سنسنی خیز، تھوک فروش، گھڑی ساز، کناری باف، لٹھ بند، چال باز، لٹھ باز، پتے باز، دھوکے باز، سمجھ دار، لچک دار، پھول دار، چوٹی دار، ٹھیکے دار، بوٹے دار، ڈگری یافتہ، رجسٹری شدہ وغیرہ۔

وہ مرکّبات بھی اِسی ذیل میں آتے ہیں جن میں فارسی افعال کسی تصرّف کے ساتھ آئے ہوں، جیسے، اُٹھائی گیرا، صبح خیزیا۔ یا ایسے مرکّبات جن کے دونوں اجزا عربی

فارسی کے ہیں مگر بنے ہیں وہ اردو کے انداز پر اور یہیں کی پیداوار ہیں، جیسے، عمر قید۔ یائے نسبتی و یائے مصدری کا اضافہ بھی اسی طرح ہوا ہے، جیسے، لٹھ بازی، گھڑی سازی، تھانے داری وغیرہ۔ اور ایسے مرکبات بھی بڑی تعداد میں ہیں جو فارسی کے سابقوں یا لاحقوں کی ترکیب سے بنے ہیں، جیسے، بے ڈھب، بے کل، گاڑی بان، بے جوڑ، بے ڈھنگا، کاری گر وغیرہ۔

یہاں ترکیب کے سب قاعدوں کو گنانا مقصود نہیں، صرف اہم قاعدوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ غیر عطفی و اضافی مرکبات کا چلن اردو میں عام ہے، اور اُن میں مبتذ مرکبات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، ایسے سارے مرکبات بالکل صحیح ہیں اور زبان کا اہم جُز ہیں۔ متعدد اساتذہ نے اِس قبیل کے اکثر مبتذ مرکبات کو غیر معتبر قرار دیا ہے، "سنسنی خیز" اور "سمجھ دار" جیسے مرکبات کو اب بھی کچھ حضرات نا قابلِ قبول قرار دینے میں تکلّف یا تامّل سے کام لینا پسند نہیں کرتے؛ مگر اطمینان کی بات یہ ہے کہ ایسے فتووں کو کچھ زیادہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ بعض افراد کا جو بھی طرزِ عمل رہا ہو، اکثریت نے ایسے مرکبات کو کبھی غیر معتبر نہیں سمجھا۔ ایسے مرکبات نظم و نثر دونوں میں بہ کثرت ملتے ہیں۔ نثر میں زیادہ اور نظم میں کم، اور اس کی بیشی پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ نثر میں زیادہ وسعت ہوتی ہے اور اُسی نسبت سے مختلف عناصر کو جذب کرنے اور گوارا بنا لینے کی صلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ نظم میں بھی مثنویات و قصائد اور عام منظومات کے مقابلے میں غزلوں میں اُن کا تناسب کم ہوگا، اور اس پر بھی حیرت نہیں ہونا چاہیے۔ غزل کا ذخیرۂ الفاظ عام منظومات کے مقابلے میں شروع ہی سے محدود رہا ہے۔ یہ روایت بھی ہے اور اِس صنفِ سخن کا تقاضا بھی۔

یہ واضح کر دیا جائے کہ یہ صورت اُن مرکبات کی ہے جنھوں نے دو اسموں سے یا ایک اسم اور ایک فعل سے ترکیب پائی ہو۔ فارسی کے سابقوں یا لاحقوں سے بنے ہوئے

اکثر مرکّبات غزلوں میں بھی اُسی طرح ملیں گے جس طرح عام نظموں میں یا نثر میں ملتے ہیں۔

بہر حال قاعدہ یہ ہوگا کہ ہر طرح کے غیر عطفی و اضافی مرکبات بالکل صحیح ہیں اور اُن کو بے تکلف استعمال کیا جاسکتا ہے، نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ غزلوں میں بھی اُن کو بار ملنا چاہیے، مگر غزل کے مزاج اور انداز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُن کا انتخاب ہونا چاہیے۔ غزل کے متعلق یہ بات خاص طور پر ذہن میں رہنا چاہیے کہ جب تک اُس میں مجموعی طور پر مزاجی تبدیلی نہ ہو، اُس وقت تک اُس کی زبان میں اِس طرح کے تغیرات اپنی جگہ نہیں بنا پائیں گے۔ اردو تو خیر بڑی حد تک ادبی زبان رہی ہے؛ فارسی کو کاروباری زبان کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے اور اُس کے باوجود فارسی غزل میں مہنّد مرکّبات کا اُس طرح عمل دخل نہیں ہو پایا جس طرح فارسی نثر میں اور اُس کے بعد مثنویات اور قصائد میں اُن کی پیوندکاری ہوئی ہے۔

اضافی و عطفی مرکّبات:

ترکیبِ مہنّد میں اصل مسئلہ اضافی و عطفی مرکّبات کا ہے۔ غیر عطفی و اضافی مرکّبات کی طرح، عطفی و اضافی مرکّبات کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مطلقاً قابلِ قبول ہیں۔ خاص خاص صورتوں کے علاوہ، عام صورتوں میں ایسے اکثر مرکبات قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتے اور فی الوقت اِس پر اصرار بھی نہیں کرنا چاہیے کہ ایسے سب مرکّبات کو لازماً قابلِ قبول ہونا چاہیے۔ اِس سلسلے میں مندرجۂ ذیل قاعدوں کو پیشِ نظر رکھنا مفید ہوگا۔

(1)

بہت سے لفظ ایسے ہیں جو عربی فارسی لفظوں کے انداز پر بن گئے ہیں اور صورت شکل کے لحاظ سے عین مین عربی فارسی کے لفظ معلوم ہوتے ہیں، مگر ہیں یہیں کی پیداوار، جیسے : شکریہ، رہائش، مرغن، یگانگت، جنّات وغیرہ؛ ایسے سب

لفظوں کو عطفی و اضافی ترکیبوں کے ساتھ بے تکلف استعمال کیا جاسکتا ہے اور کس طرح کی تخصیص یا تحدید نہیں کی جاسکتی۔ (بعض اساتذہ نے ایسے الفاظ کے متعلق جو بھی کہا ہو یا کہیں، مگر ایسے سب لفظ بالکل صحیح اور فصیح ہیں) جیسے، غذائے مرغن، یوم پیدائش، شکریۂ احباب، جائے رہائش، محبت و یگانگت وغیرہ۔ مثلاً،

کس کی پریاں، شہرِ جنات کو بھی آٹھ پہر
ہے یہ حسرت کہ سگِ کوچۂ جاناں ہوتا (ناسخ)

اعتقادِ یگانگت بھی تھا اتحادِ موانست بھی تھا
(مصحفی، مثنوی بحر المحبت)

(۲)

اسی طرح بہت سے عربی فارسی لفظوں میں مختلف قسم کے تصرفات نے اپنی جگہ بنالی ہے۔ کہیں تو نئے معنی کا اضافہ ہوگیا ہے، جیسے، محرم، آبِ رواں، تکرار، عادی، راشی، شادی، مشکور وغیرہ، اور کہیں صورت میں ذرا سی ترمیم ہوگئی ہے، جیسے، غلطی، دائمی، جواہرات وغیرہ، ایسے سب لفظ بھی بالکل صحیح اور فصیح ہیں اور ان کو عربی فارسی الفاظ کی طرح عطفی و اضافی مرکبات کا جز بنایا جاسکتا ہے۔ ایسے لفظ مرکب کا ایک جز بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں اجزا اسی قبیل کے ہوں، جیسے،

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
(غالب)

ہاتھ کیوں رکھتے ہو منہ پر مرے مطلب کیا ہے باعثِ رنجش و تکرار کہوں یا نہ کہوں
(داغ)

کسی کی محرمِ آبِ رواں وہ یاد آئی حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا
(آتش)

شبِ شادی کی دھوم کی کیا بات　　　روزِ روشن تھی روشنی سے رات　(میرؔ)

(۳)

عربی فارسی کے جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہوتی ہے؛ محرف صورت میں وہ ہ، ے سے بدل جاتی ہے، جیسے "پیمانہ" اور "پیمانے میں"۔ یہ کہا گیا ہے کہ ایسے لفظوں کو محرف صورت میں یہ ترکیب اضافی و عطفی نہیں لانا چاہیے، مثلاً "آب و دانہ" تو فارسی ترکیب ہے، مگر "آب و دانے" اُس کی مہنّد صورت ہے اور اس لیے غیر معتبر ہے ——— ایسی اکثر صورتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ عطفی ترکیب تو عموماً غیر مناسب نہیں معلوم ہوتی، مثلاً یہ مصرع:

نادان! تجھے فکر آب و دانے کی ہے

اس میں "آب و دانے" کسی طرح اجنبی نہیں معلوم ہوتا، نہ صورتاً نہ سماعتاً۔ اور ایسی بہت مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، مثلاً:

سائل کو نان و حلوے کے اونٹوں کی دی قطار　(سوداؔ)

رات کو دیکھوں ہوں میں جب شمع و پروانے میں دھوم　(سوداؔ)

البتہ اضافی ترکیب عموماً غیر مناسب معلوم ہوتی ہے، جیسے:

کوسوں کیا تنگیِ زمانے کو　　　کہ نہیں جائے سر اٹھانے کو　(ذوقؔ)

اس میں "تنگیِ زمانے" اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہی صورت نثر میں پیش آتی ہے۔ اس لیے ایسے عطفی مرکبات کو تو مطلقاً درست ماننا چاہیے اور قابلِ قبول سمجھنا چاہیے، ہاں، ایسی اضافی ترکیبیں بالعموم نا قابلِ قبول ٹھہریں گی، جیسے میرؔ کا یہ مصرع: مگر بازیچہ سمجھے تیرِ عشقِ خُرد سالوں کو۔ (کلیاتِ مرتبۂ آسی ص ۳۰۸م)۔

یہ عرض کر دیا جائے کہ ایسی صورتوں میں عموماً عطفی تراکیب ہی سے سابقہ پڑتا ہے۔

(۴)

یہ کہا گیا ہے کہ ہائے مختفی پر ختم ہونے والے مفرد لفظوں میں تو قافیے کی ضرورت سے ہ کو الف سے بدل دینا درست ہے، مگر ترکیب کی صورت میں یہ تبدیلی جائز نہیں۔ یعنی "نظارہ" کو "ہمارا" اور "گوارا" کے قافیے میں "نظارا" لکھنا تو ٹھیک ہے، مگر "لطفِ نظارا" نہیں لکھا جائے گا، کیوں کہ اس صورت میں یہ مبتدا مرکب ہے۔ مگر یہ پابندی قطعاً غیر ضروری ہے، کیوں کہ "لطفِ نظارہ" اور "لطفِ نظارا" میں کچھ فرق نہیں۔ اردو میں ہائے مختفی ویسے بھی اکثر الف کی طرح تلفظ میں آتی ہے، مثلاً:

ادا سے دیکھ لو، جاتا رہے گلہ دل کا   بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

اس میں "فیصلہ" اور "گلہ" تلفظ میں "فیصلا" اور "گلا" بن جاتے ہیں اور یہ صورت عام ہے۔ بات یہ ہے کہ ہائے مختفی فارسی کی خاص چیز ہے، اردو میں اس کی جگہ اصل حرف الف ہے؛ اس لیے اکثر صورتوں میں ہائے مختفی، الف کی آواز کو قبول کر لیتی ہے۔ مختصر یہ کہ قافیے کی ضرورت سے "لطفِ نظارا" اور "کیفِ جلوا" قسم کی ترکیبوں کو بالکل صحیح ماننا چاہیے، مثلاً:

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر   اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانا ہرگز
بزمِ ماتم تو نہیں، بزمِ سخن ہے حالی   یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز
(حالی)

دیا قمری کو مصرعِ نالا   مصرعِ قدِ سرو پر بالا (ذوق)

گائیں گے ہم آزادیِ گلشن کا ترانا   بے کار ہے اے برقِ بلا، ہم کو ڈرانا
کافی ہے بہت وسعتِ صحرائے زمانا   ہم اور کہیں ڈھونڈ نکالیں گے ٹھکانا
(اقبال سہیل)

(۵)

ہندی وغیرہ کے اعلام کے ساتھ عطفی و اضافی ترکیبوں کو اساتذہ نے بھی روا رکھا ہے اور یہی ٹھیک بھی ہے۔ ہاں اِس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ عام طور پر ایسے خاص ناموں کو مرکّب کے ایک جزُ کے طور پر آنا چاہیے (مستثنیات سے بحث نہیں)، جیسے، سمتِ کاشی، صبحِ بنارس، سروِ قدانِ گوکل وغیرہ۔

ع : سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

ع : گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل

ع : قریبِ نفس ہے، سیتا کہاں آغوشِ راون میں

(۶)

ہندی و انگریزی کے ایسے لفظ جو عام طور پر استعمال میں آتے رہتے ہیں، اور اُن میں سے اکثر کے بدل موجود نہیں، جیسے، اسٹیشن، سول سروس، چندا، ممبری، کہار، ڈولی، ڈگری، سڑک وغیرہ، یا مہینوں اور موسموں کے نام، یا اسمائے جنس وغیرہ، ایسے لفظوں کو بھی اضافی و عطفی مرکّبات کا جزُ بنایا جا سکتا ہے۔ جیسے ناسخ کا یہ مصرع : بابِ امام باڑۂ سلطانِ خاص و عام — یا جیسے سودا کا یہ مصرع : کیا قصد جس دم سوئے فیلِ گاو، یا جیسے میر کا یہ مصرع ، اب جو آیا ہے موسمِ برسات ——— ہاں ایسے لفظوں کو بھی عطفی و اضافی مرکّبات کے ایک جزُ کی حیثیت سے لایا جا سکتا ہے۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ شق مـ۵ میں جن مرکّبات کا ذکر کیا گیا ہے، اُن میں اور اِن میں اصولاً تو کچھ فرق نہیں، مگر استعمالاً اِس کا خاص طور پر لحاظ رکھنا ہوگا کہ اِن مرکّبات کو نظم میں احتیاط کے ساتھ لایا جائے، یعنی مقتضائے کلام کا بطورِ خاص لحاظ رکھا جائے، اور اس احتیاط کی وجہ یہ ہے کہ ایسے مرکّبات میں شامل ہندی و انگریزی اجزا، خاص ناموں کے بجائے خاص الفاظ (اسمائے جنس وغیرہ) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ احتیاط، پابندی

سے مختلف چیز ہے۔ دونوں کے تقاضے بھی مختلف ہیں اور دائرۂ اثر بھی، محض بحث کی خاطر اِس فرق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

(۷)

ایسے لفظ بھی ہیں جو شکل صورت سے فارسی الاصل معلوم ہوتے ہیں یا یوں کہیے کہ فارسی یا عربی الفاظ جیسے لگتے ہیں؛ ایسے لفظوں کو بھی عطفی و اضافی مرکبات میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جیسے ایک لفظ ہے "چلمن"۔ اِس کی اصل جو بھی ہو، مگر یہ معلوم ہوتا ہے فارسی لفظوں جیسا؛ یہی وجہ ہے کہ "پسِ چلمن" قطعاً اجنبی نہیں لگتا۔ مستعمل بھی رہا ہے؛

نیم جلوے کو بھی وہ کہتے ہیں اب بے پردگی
جسمِ کاہیدہ یہ کس کا صرفِ چلمن ہو گیا (مومن)

یہ کاہ رُبا سے بھی ہیں کم اے کششِ دل
مذکور کچھ ایسا پسِ چلمن ہے ہمارا (")

یا جیسے لفظ "کلس"، یہ لفظ سودا کے ایک مصرعے میں اِس طرح آیا ہے کہ اُس کے غیر فارسی ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا، ع: کر رکھا ہے کلسِ گنبدِ دستار اُسے۔ یا جیسے ایک لفظ ہے "رومان" کہ بہ ظاہر عربی نژاد معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص "کیفِ رومان" لکھے تو یہ نہایت گوارا ترکیب ہوگی۔ ایسے لفظوں کو عطفی و اضافی مرکبات کے اجزا کی حیثیت سے قطعاً قابلِ قبول سمجھنا چاہیے۔ ہاں! ایسے کچھ مرکبات غزلوں میں بھی کھپ سکتے ہیں، مثلاً؛

دیکھ دستارِ بسنتی ساقیِ سرشار کی — کھل گئی ہیں آج آنکھیں نرگسِ بیمار کی
پریوں کے ہے لباسِ بسنتی کی کیا بہار — آرائشیں بسنت کی ہیں حُسنِ باغ میں
بجا ہے شعرِ سخن فہم کے لیے اشرف — وگرنہ زمزمۂ واہ واہ سے کیا کام

آج کل نظم کا انداز بدل رہا ہے اور اُس کے ساتھ زبان و بیان میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلیاں آ رہی ہیں ، موضوعات کے لحاظ سے کھُردرا پن بھی اپنی جگہ بنا رہا ہے ، اور اِس طرح فی الحال محدود پیمانے پر سہی ، مگر اس کی گنجائش نکلتی دکھائی دیتی ہے کہ کچھ اور ہندی الفاظ بھی ترکیبِ فارسی کے ساتھ پہلے کی طرح بے جوڑ معلوم نہ ہوں ۔ اِس میں شک نہیں کہ ایسے الفاظ کی تعداد ابھی کم سے کم ہے ، مگر اس کا امکان ضرور ہے کہ زبان و اسالیب کی تبدیلیاں اور نئے نئے موضوعات کے تقاضے ، اِس تعداد میں قابلِ لحاظ اضافہ کر دیں ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض الفاظ خاص خاص مقامات پر اِس طرح ترکیب کا جُز بنیں کہ وہاں خوش مذاق کو اجنبیت کا احساس ہی نہ ہو ، مثلاً ایک نئے شاعر کی ایک نظم کے پہلے دو مصرعے ہیں :

یہ کیسے روز و شب ہیں جو لہو میں تیرتے آئے
گزرتے وقت کی پہچان اک موجِ لہو ٹھہری (مخمور سعیدی)

ایسے اضافوں کو قبول کرنے کے لیے ذہن کو آمادہ رکھنا چاہیے ، البتہ بد مذاقی کو راہ نہیں ملنا چاہیے اور "سب ٹھیک ہے" اور "سب جائز ہے" جیسے گمراہ کُن تصوّرات کو ذہن پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے ۔

(۸)

قدما اور متوسطین کے یہاں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں حرفِ عطف دو جملوں یا دو ٹکڑوں کے درمیان آیا ہے ، مثلاً :

گُل گراں گوشِ و چمن صورتِ حیرانی ہے ___ کس گلستاں میں ہیں ہم حکم غزل خوانی ہے
ہم جور و جور کش تھے کہاں آگے عشق میں ___ تجھ سے جفا و میرؔ سے رسمِ وفا چلی
سینے میں ہوا نالہ و پہلو میں دل آتش ___ دھڑکے ہے پڑا اول کہ نہ ہو مشتعل آتش

ع : دل مدّعی و دیدہ بنا مدّعا علیہ ۔

ایسے بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا، اس لیے عطف کی اس صورت کو قابلِ قبول تو سمجھنا چاہیے، مگر اب اس کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ ناگوار صورت پیدا نہ ہو، مثلاً :

چوں ابر بے کسانہ روتے اٹھے ہیں گھر سے ۔۔۔ برسے ہے عشق اپنے دیوار سے و در سے
اپنے کوچے میں، فغاں جس کی سنو ہو دن رات ۔۔۔ رہ جگر سوختہ و سینہ جلا میں ہی ہوں

دونوں شعروں میں نہایت ناگوار صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کو قابلِ قبول نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے زیادہ ناگوار صورت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب وَ کے بجائے اور آجائے، جیسے :

اب ہمارا آپ کا ہے تذکرہ ۔۔۔ ذکرِ مجنوں اور لیلا ہو گیا

(۹)

ایسے عطفی مرکبات بھی دیکھنے میں آئے ہیں جن کا ایک جُز غیر عربی فارسی ہوتا ہے۔ ایسے بہت سے مرکبات قابلِ قبول ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اضافت کے مقابلے میں عطف کے اندر تہنید کو قبول کرنے کی صلاحیت کچھ زیادہ ہوتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اکثر عطفی مرکبات، بے جوڑ اجزا کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتے، مثلاً :

ع : لگیں اُس کو نہ جب تک راج و مزدور
ع : کوئی رہ گیا موش و مینڈک کا زور
ع : چھٹیں گر لاکھ اُس پر چرخی و بان

ایسے عطفی مرکبات میں ہندی اجزا عموماً ایک جز کے طور پر قابلِ قبول معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہندی کے بعض اجزا یا انگریزی کے کچھ لفظ ایسے ہوں جو مرکب کے دونوں اجزا کے طور پر آسکیں، مگر یہ خاص صورت ہوگی، عام طور پر ایسا کم ہوگا۔ قواعد کی بنا مستثنیات پر نہیں رکھی جاتی اور قواعد بنانے کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا

کو مستثنیات سے انکار کر دیا جائے۔

ہاں، یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ غیر عربی فارسی الفاظ کے ٹکڑے اکثر واوِ عطف کے بغیر آتے ہیں اور فصاحتِ کلام کا عموماً تقاضا بھی یہی ہوا کرتا ہے، جیسے: پھول پھل، ڈاک تار، خط پتر، ہاتھ پیر، دانہ پانی، دن رات وغیرہ۔ ایسے بے شمار ٹکڑے ملیں گے اور یہ اسی طرح آتے ہیں۔ اگر ان کے درمیان عطف کا واو لایا جائے، یعنی "پھول و پھل" یا "دن و رات" یا "ڈاک و تار" کہا جائے یا لکھا جائے تو فصاحتِ کلام پر حرف آجائے گا۔

یہ وضاحت پہلے کی جا چکی ہے اور اب اس کی تکرار کی جاتی ہے کہ اب تک زبان کا جو انداز رہا ہے، اس میں اس کی گنجائش تو ہے کہ ہندی یا انگریزی کے خاص خاص لفظوں کو اضافی ترکیبوں کے ایک جز کے طور پر لایا جا سکے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض مرکبات ایسے ہی دونوں اجزا پر مشتمل ہوں، جیسے، ممبرانِ پارلیمنٹ، اجراے ڈگری، کاغذاتِ اپیل، ارکانِ کمیٹی، بہ ذریعۂ رجسٹری، انتظامِ جیل (نادر کاکوروی کا مصرع یاد آیا، کہ اس نظم و نسق سے انتظامِ جیل اچھا ہے) وغیرہ؛ مگر ایسے مرکبات کا دائرہ محدود رہے گا۔ خاص خاص لفظوں کے علاوہ، عام لفظوں کی یہ صورت نہیں ہوگی، یعنی گوشتِ بھینس، دودھِ بکری، انجنِ ریل، دردِ گھٹنا، اونٹِ بے نکیل جیسے مرکبات قابلِ قبول نہیں ٹھہریں گے۔ البتہ ظرافت یا تمسخر کی ضرورتوں کے کام آسکتے ہیں۔

madbib.org

سقوطِ حروفِ علّت

لفظ کے آخر سے، خواہ وہ کسی زبان کا ہو، حروفِ علّت کا دبنا یا گرنا، اساتذۂ متقدمین کے نزدیک مطلقاً معیوب نہیں تھا۔ بیشتر اساتذۂ متوسطین کا بھی یہی مسلک تھا۔ یہ صراحت ضروری ہے کہ حروفِ علّت میں سے ی کا دبنا، عام تھا۔ اسم، فعل، حرف؛ ہر لفظ کے آخر سے حسبِ ضرورت اِس کا سقوط روا رکھا جاتا تھا۔ حروفِ مغیرہ، حروفِ ربط اور ضمیروں کے آخر سے الف اور واو کو بھی بلا تکلف گرا دیتے تھے۔ البتہ مفرد اسموں کے آخر سے واو اور فعلوں کے آخر سے الف کا گرانا اِس قدر عام نہیں تھا، اِس میں کچھ احتیاط کی جاتی تھی، اگرچہ مثالیں ملتی ہیں اور اچھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں، مگر اس کو معیوب بھی سمجھا گیا ہے۔

نظم میں، گفتگو کی طرح، حروفِ علّت کا دب کر نکلنا عام بات ہے۔ اِس کو زبان کا خاصّہ سمجھنا چاہیے۔ حروفِ علّت کا کردار، حروفِ صحیح سے مختلف ہوتا ہے، اور وہ اِس طرح کہ آوازوں کو مختلف سطح پر اور مختلف انداز سے کھینچنا، بڑھانا، گھٹانا اور گرانا اٹھانا، اِن کا خاص عمل ہے؛ اور اِس طرح یہ لازم ہے کہ مختلف مقامات پر، آہنگ کے لحاظ سے، آواز کی کشش میں گراد یا تقلیل نمایاں ہو۔ ضرورتِ شعری کا اور شعری آہنگ کے

تقاضوں کا اِس میں اضافہ کر لیجیے۔ اِس طرح یہ ضروری ہے کہ گفتگو میں حروفِ علّت کی کشش میں کہیں کمی ہو، کہیں بیشی اور کہیں حرفِ علّت کی آواز کسی دوسری آواز میں اِس طرح جذب ہو جائے کہ وہاں پر اُس کا وجود ہی مخلوط ہو کر رہ جائے۔ جہاں تک شعری آہنگ کا تعلق ہے، تو حروفِ علّت کا دبنا، کبھی تو شعر کی روانی پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتا اور یہ وہ مقامات ہوتے ہیں جہاں گفتگو میں بھی وہی کیفیت نمایاں رہتی ہے۔ یعنی عام بول چال میں، جن الفاظ کے اجزا یا آخری جُز، دب کر نکلتے ہیں؛ شعر میں بھی وہ اُسی طرح اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ جن مقامات پر شعری ضرورتیں، آواز کو معمول کے مقابلے میں کم کشش دار رکھنے پر مجبور ہوتی ہیں، وہاں روانیِ کلام ضرور مجروح ہو جاتی ہے، کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ غالب نے صفیر بلگرامی کو ایک خط میں لکھا تھا:

"ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

کیوں حضرت! "ابھی کچھ" کی تحتانی کا دبنا غیر فصیح نہیں؟ "کچھ ابھی بات کر نہیں آتی"

کیا اس کا نعم البدل نہیں؟" (غالب کی نادر تحریریں، ص ۵۶)

اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صاحبِ نظر، حروفِ علّت کے اِس طرح دبنے کو جس سے فصاحتِ کلام پر حرف آجائے، کچھ اچھا نہیں سمجھتے تھے، اور اس ضمن میں عربی، فارسی، ہندی الفاظ کی تفریق اُن کے پیشِ نظر نہیں رہتی تھی۔ غالب کے کلام میں عربی و فارسی الفاظ کے آخر سے یائے معروف کے سقوط کی مثالیں موجود ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ حروفِ علّت کے دبنے کو مطلقاً غلط نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اصل مقصد فصاحتِ کلام کا باقی رہنا تھا۔ جہاں اُس پر اثر پڑے، اُس کو محلِ نظر خیال کیا جاتا تھا۔ اِس سے اتفاق کیا جائے گا کہ صحیح و غلط یا یوں کہیے کہ مناسب و غیر مناسب کا یہ معیار نہایت صحیح تھا۔

یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ زبان میں لہجے کی بہت اہمیت ہے اور اُس

کے تقاضوں کے تحت، آواز کے اُتار چڑھاو کی لہریں پیچ و تاب کھاتی رہتی ہیں۔ شعر میں لہجے کی کچھ زیادہ اہمیت ہے۔ لفظوں کی صحیح ترتیب اُس کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اُس صحیح ترتیبِ الفاظ کو، پڑھتے وقت اگر صحیح لہجے کی رفاقت نصیب ہو جائے؛ تو خواندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اُس تکمیل کی مدد سے، معنوی رنگ کے عکس، مناسب طور پر اور مناسب مقامات پر چمک اٹھتے ہیں۔ آواز کا اُتار چڑھاو بہت سے مقامات پر حروفِ علّت کی کشش دار اور کشش آفریں لہروں کا سہارا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعر میں حروفِ علّت کہیں پر تو پوری طرح آواز کا ساتھ دیتے ہیں اور کہیں پر کم اور کہیں پر کم تر۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ شعر میں حروفِ علّت کا نمایاں ہونا اور دبنا، دونوں صورتیں لازم ہیں، اور اِس لیے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی کہ مثلاً عربی و فارسی لفظوں کے آخر سے یائے معروف ساقط نہیں ہو سکتی، مگر دوسری زبانوں کے لفظوں کے آخر سے ساقط ہو سکتی ہے۔ یہ غیر اصولی ہی نہیں، ناقابلِ عمل پابندی ہو گی۔

لکھنؤ کے اساتذۂ متاخرین نے جو بہت سی غیر ضروری پابندیاں نافذ کی تھیں، اُن میں سے ایک پابندی یہ بھی تھی کہ عربی فارسی الفاظ کے آخر سے حروفِ علّت، خاص طور پر یائے معروف کو گرانا، غلط ہے۔ ہاں ہندی الفاظ اس پابندی سے مستثنا ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کے رسالے معائبِ سخن کا ایک اقتباس پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا:

> "شیخ ناسخ کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے تلامذہ کو اخیر زمانے میں جو ہدایتیں کی تھیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کلمے کے آخر سے الف، واو، یے کو بے تکلف گرا دینا اچھا نہیں۔ مگر بہ قولِ مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی، شیخ کی اِس وصیت پر کسی سے عمل نہ ہو سکا۔ لفظوں کی

ہڈیاں پسلیاں توڑ کر مصرعے میں بھر دینا، اردو شاعری میں رواج پا گیا! شیخ کا متنبہ کرنا اس بنا پر تھا کہ فارسی میں کہیں ایسا نہیں دیکھا کہ "میکنی" و "میروی" میں سے ی کو گرا دیں۔ یا "گفتگو" و "شست وشو" میں سے واو یا "دریا" یا "گویا" کا الف ساقط ہو جانے دیں۔" (معائب سخن، ص ۱۷)

شیخ ناسخ کی جس وصیت کا ذکر کیا گیا ہے، اُس کی حیثیت تو بہ ظاہر مفروضے کی معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ ناسخ کی ایسی کوئی تحریر موجود نہیں۔ اس کے برخلاف، اُن کے کلام میں عربی و فارسی الفاظ کے آخر سے یائے معروف کا سقوط ملتا ہے۔ ہاں اُن کے شاگرد کلب حسین خاں نادر نے اِس قاعدے کو لکھا ہے:

"حروف علت جو آخر الفاظ عربی فارسی میں آتے ہیں، ان کا خوب واضح ہونا تلفظ میں چاہیے، تنگی کے ساتھ دب کر زبان پر نہ آئیں، مگر الفاظ ہندی میں خصوصاً (بہ) مقام جمع مضائقہ نہیں ہے۔" (تلخیص معلیٰ، ص ۲۱)

اصل میں ایسے اکثر قاعدوں کے واضع رشک (تلمیذ ناسخ) تھے۔ اُن کے بعد سے اساتذۂ لکھنؤ نے ہمیشہ ایک قاعدے کی حیثیت سے اِس پر زور دیا کہ عربی فارسی الفاظ کے آخر سے حروف علت، خصوصاً یائے معروف کو ساقط نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ داغ نے بھی اِس قاعدے کی پابندی کو آخر آخر میں ضروری قرار دیا تھا، جب کہ دہلوی اساتذہ عموماً ایسی پابندیوں کے قائل کبھی نہیں رہے تھے۔ مولانا احسن مارہروی کی فرمائش پر، داغ نے معائب شاعری سے متعلق ایک طویل قطعہ لکھا، اُس قطعے میں اِس کا بھی ذکر ہے:

"عربی فارسی الفاظ جو اردو میں کہیں
حرف علت کا بُرا اُن میں ہے گرنا، دبنا

الف وصل اگر آئے تو کچھ عیب نہیں
لیکن الفاظ میں اردو کے، یہ گرنا ہے روا"

(یادگار داغ، ص ۱۹۵)

قواعد سازی کے پھیر میں اور اُس زمانے کے زبان و ادب کے خاص تصورات کے تحت، سب سے بڑی غلطی یہی ہوئی کہ ایک عام قاعدے کو، عربی و فارسی الفاظ سے متعلق کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ غیر مناسب پابندی تھی اور ہر طرح کی منطق سے آزاد تھی؛ اِس لیے یہ لازم تھا کہ اس قاعدے کی پابندی پوری طرح نہ کی جاسکے، بل کہ یہ لہجے کا تقاضا تھا، جس کا کچھ ذکر اوپر آچکا ہے۔ اور ایسا ہوا۔ جن لوگوں نے اِس قاعدے کی تبلیغ کی، اُن سے بھی پوری طرح اِس کی پابندی نہیں ہو سکی۔ اچھے اچھے اساتذہ کے یہاں اِس کی مثالیں موجود ہیں، اور اچھی خاصی تعداد میں۔ خاص طور پر جن شاعروں نے غزل کے علاوہ، اور اصناف (مرثیہ، مثنوی وغیرہ) پر بھی طبع آزمائی کی ہے، اُن میں سے بیش تر اس (غیر مناسب، بل کہ غیر معقول) پابندی کو نہیں نبھا سکے۔ وجہ وہی ہے کہ یہ پابندی تھی ہی بے اصولی۔ حروفِ علّت کے دبنے سے کلام میں جہاں ناہمواری نمایاں ہوتی ہے، وہ عام ہے، پھر اُس کو عربی یا فارسی الفاظ سے مخصوص کیسے کیا جاسکتا ہے؟ مثلاً درجِ ذیل مصرعوں میں خط کشیدہ الفاظ کو دیکھیے؛ اِن میں ایسے حروفِ علّت ساقط ہوئے ہیں، جن کا گرانا، از روے قاعدہ جائز ہے، مگر فصاحتِ کلام ہوا ہو گئی ہے:

ع: عمر اپنی کٹی دنیا کے ستمگاروں میں (تسلیم)

ع: دنیاے عشق میں بڑے نام امتحاں کے ہیں (〃)

ع: لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے (داغ)

ع: کرتا بیمارِ محبت کا مسیحا جو علاج (ذوق)

ع: مجھے تو اجل کی ہے آرزو، اُسے وہم ہے کہ یہ مر گیا (نظم طباطبائی)

ع: ہمہ تن محو رہا گو کہ تو خود بینی میں (عزیز لکھنوی)

ع: صحرا میں جب ہوئی مجھے خوش چشموں کی تلاش (امیر مینائی)

ع : بال کھولے پریاں پھرتی تھیں سرِ دیوار پر (امیر مینائی)

بات وہی ہے کہ اِن سب مقامات پر حروفِ علّت اُس طرح دبے ہیں جس طرح گفتگو میں نہیں دبتے، اور اِس لیے آواز کو جھٹکا لگتا ہے اور روانی کی سانس ٹوٹ جاتی ہے۔ اِس سے صاف طور پر معلوم ہو سکتا ہے کہ حروفِ علّت کا ساقط ہونا اگر عیب ہے، تو اُس کا تعلق محلِ استعمال سے ہے؛ جہاں بھی روانیِ کلام پر اثر پڑے، بس وہاں عیب ہے، اِس کی تخصیص عربی یا فارسی یا کسی اور زبان کے الفاظ سے نہیں کی جا سکتی۔ اِسی تخصیص نے، اِس قاعدے کو غیر مناسب، ناقابلِ قبول اور ناقابلِ عمل بنا کر رکھ دیا۔

بہت سے مقامات پر (آخرِ لفظ سے) حروفِ علّت کا سقوط ہی مناسب بل کہ فصیح ہوتا ہے۔ حروفِ مغیرہ، یعنی کا، کو، کے، نا، نی، نے، را، ری، رے، اور جو، سو، تھا، میں، سا میں یہ صورت اکثر سامنے آتی ہے۔ مثلاً:

ع : تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار

ع : مُنہ اُس نے چڑایا تو ہنسی آ گئی مجھ کو

ع : تنگ ہے خانہ تھا میں، ساقی نے یہ کیا کر دیا

ع : ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں، لیکن

ع : دنیا کا ورق، بینشِ اربابِ نظر میں

لیکن یہ قاعدۂ کلّیہ نہیں؛ اِس کا تعلق اِس بات سے ہے کہ کہاں پر لہجے کا تقاضا کیا ہے۔ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ لہجے کی تہ میں، معنویت کی لہریں پنہاں ہوتی ہیں، اور اُنھی کے تحرّک سے، لہجے کی سطح پر کششوں کے نقش اُبھرتے اور دبتے ہیں۔ اردو کی جمعیں (یں، ئیں، وں، ؤں کے ساتھ) یا ایسے افعال جن کے آخر میں یہ حروف یک جا ہوں، جیسے: تصویریں، دنیائیں، دیکھیں، دیکھوں وغیرہ؛ اُن

میں بہت سے مقامات پر حروفِ علت کا سقوط بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ اردو کی جمع کے بعد اگر کوئی لاحقہ آجائے، جیسے: گیسوؤں والا؛ اِس صورت میں عموماً حرفِ علت کا دبنا ہی اچھا معلوم ہوگا، جیسے ع: گل ہیں چراغ گیسوؤں والوں کے سامنے _____ مفرد الفاظ کے آخر سے بھی کبھی کبھی واو کا دب کر نکلنا اچھا معلوم ہوتا ہے، جیسے: دعوا زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے۔ غالب کا مصرع ہے، لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی۔ اِس میں واو کا اظہار کچھ بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ نواب مرزا شوق کے اِس مصرعے میں: گیسو رخ پر ہوا سے ہلتے ہیں، "گیسو" میں واو کا دب کر نکلنا اچھا نہیں معلوم ہوتا، لیکن "گیسوؤں والے" میں یہ صورت نہیں پائی جاتی۔ بات وہی ہے کہ گفتگو میں عام طور پر کن لفظوں کو کس طرح بولا جاتا ہے اور یہ کہ کہاں پر لہجے کا تقاضا کیا ہو۔

بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے:

دلاور ہیں، بہادر ہیں ظفر جو رستم میداں وہ اعدا کی سدا شمشیرِ دو دستی پہ ہنستے ہیں

اِس شعر میں "دو دستی" میں واو کا اظہار اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

افعال کے آخر سے عموماً اور بہت سے اسما کے آخر سے الف کا گرنا کچھ اچھا نہیں ہوتا، مثلاً:

چلا جاتا ہے کاروانِ نفس دبانگِ درا ہے، نہ صوتِ جرس ہے

ہجومِ شوق کا بھی قصہ مختصر یہ ہے کہ جو میں چاہتا ہوں، وہ کہا نہیں جاتا

جلیل مانک پوری نے ایک خط میں لکھا ہے:

"کیا اور دیا اور دی وغیرہ، جو افعالِ متصرفہ ہیں؛ اُن میں حرفِ علت کا گرنا معیوب ہے۔" (نقوش، خطوط نمبر، جلد ۲، ص ۳۵۰)

جہاں تک یائے معروف کا تعلق ہے، اُس کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اسما کے آخر میں واقع یائے معروف کی بھی یہی صورت ہے۔ مثلاً اِن مصرعوں کو دیکھیے:

ع : الٰہی خیر! کہ اب آگ پاس آن لگی

ع : در بہ در ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے

ع : آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

اِن میں سقوطِ یا ناگوارِ سماعت نہیں معلوم ہوتا۔ مگر درج ذیل مصرعوں میں سقوطِ یا، قطعاً مخلِ فصاحت ہے:

ع : سر سے شعلے اٹھتے ہیں، آنکھوں سے دریا جاری ہے

ع : مجھ کو تو یار سے ہے ہم آغوشی کا خیال

ع : کچھ نازکی قاتل کی، کچھ اپنی گراں جانی

ایسے مرکبات، جن میں پہلے لفظ کے آخر میں ی ہو؛ گفتگو میں عموماً یہ ی دب کر نکلتی ہے۔ نظم میں بھی اِس ی کے دبنے سے اکثر مقامات پر حُسنِ گفتگو باقی رہ جاتا ہے، جیسے یونانی علاج، ہوائی جہاز، ویرانی سی ویرانی وغیرہ:

ع : پیاری پیاری کلائیاں اُس کی

ع : کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

اِس سلسلے میں آرزو لکھنوی مرحوم کے ایک خط کا اقتباس، افادیت سے خالی نہیں ہوگا:

" الف، واو اور ی؛ عربی کے لیے حروفِ علت ہیں، مگر اردو کے لیے حروفِ اتمام حرکات ہیں..... تلفظ میں دبتے ہوئے آئیں، لہٰذا کتابت میں ان کا آنا، صرف اظہارِ حرکت کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے تمام حروف کا اسقاط جائز ہے، چاہے وہ عربی و فارسی کے کیوں نہ ہوں۔ مثلاً "نفسی نفسی" میں پہلی یِ بولتے وقت دبتی ہے، لہٰذا اس کا اسقاط ہی فصیح ہے۔ فارسی میں ہائے مختفیہ کا اسقاط ہی فصیح سمجھا جاتا ہے۔ "تو" اور "چو" کا واو بھی ظاہر ہو تو غیر فصیح

ہے.... جو لوگ ہندی کے الفاظ میں بھی ناجائز سمجھتے ہیں، وہ اپنی سمجھ کے مالک ہیں۔ ہمیں دوسروں کے مسلک سے کیا واسطہ؟"

(ہماری زبان (علی گڑھ) یکم فروری ۱۹۶۲ء)

اِس خط کے حاشیے میں آرزو صاحب کا یہ شعر بھی لکھا ہوا ہے، جس میں نفسی نفسی دو بار آیا ہے، اور پہلے لفظ کی "ی" ساقط ہو گئی ہے:

پڑی ہے ہر اک کو اپنی اپنی، ہے جا بجا میں بھی نفسی نفسی
تمھیں کو اک رٹ ہے اُمّتی کی، شفیعِ روزِ جزا تمھیں ہو

آرزو صاحب نے جس نکتے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے، یعنی ایسے مقامات پر حروفِ علّت کی حیثیت کے باب میں، وہ خاص طور پر توجہ طلب ہے اور یہ اہم بات ہے۔ مختصر یہ کہ لفظ کے آخر سے حروفِ علّت کا دبنا، قابلِ قبول بھی ہو سکتا ہے اور ناقابلِ قبول بھی۔ اِس کا انحصار محلِ استعمال پر ہوگا۔ نہ اس میں عربی و فارسی اور غیر عربی و فارسی الفاظ کی تفریق کی جا سکتی ہے، اور نہ کوئی قاعدۂ کلیہ بنایا جا سکتا ہے۔ اصل معیار یہ ہے کہ جہاں بھی حرفِ علّت کے دبنے سے، مصرعے کی روانی متاثر ہو، وہاں غیر مناسب ہے۔ اور جہاں یہ صورت نہ ہو، وہاں مناسب ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ مسئلہ مناسب اور غیر مناسب کا ہے، غلط اور صحیح کا نہیں۔

۲

ذیل میں عہدِ ناسخ اور اُس کے بعد کے چند اساتذہ کے یہاں سے ایسی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جن میں عربی و فارسی الفاظ کے آخر سے یائے معروف کا سقوط نمایاں ہے۔ یائے معروف کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ اس بحث کا مرکز خاص طور پر یائے معروف کو قرار دیا گیا ہے اور اُسی کا ذکر بار بار کیا گیا ہے۔ اساتذہ نے جب بھی سقوطِ حروفِ علّت کے قاعدے پر کچھ کہا تو یائے معروف کا بطورِ خاص ذکر کیا۔ اِن مثالوں سے

جو محض مشتے نمونہ از خروارے کا حکم رکھتی ہیں، اِس غلط فہمی کا ازالہ کیا جا سکے گا کہ اساتذہ کے یہاں سقوطِ یائے معروف نہیں پایا جاتا۔ یہ صراحت ضروری ہے کہ ناسخ، آتش، اور بیش تر تلامذۂ آتش کے یہاں اِس قاعدے کی مطلق پابندی نظر نہیں آتی۔ یہی حال مرثیہ گویوں کا ہے، اُن کے کلام میں بھی اِس کا التزام نہیں ملتا۔ اصل میں امیر و جلال کے زمانے میں یہ لہر تیزی سے اُبھری تھی۔ امیر نے اپنے خطوں میں کئی جگہ اِس کو عیب بتایا ہے، مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ اُن کے کلام میں سقوطِ یائے معروف کی مثالیں ملتی ہیں۔ شعرائے دہلی میں سے، بہ استثنائے داغ، کسی نے اِس کو عیب نہیں مانا۔ اور داغ بھی دربارِ رام پور میں جب اساتذۂ لکھنؤ کے دنگل میں اُترے، تب اُن کے یہاں غیر ضروری قواعد پسندی کا رجحان فروغ پذیر ہوا۔ اُن کے کلام میں بھی اِس کی مثالیں موجود ہیں۔

ع: وحشی ہوں آدمی کے جنگل کا — ناسخ (کلیاتِ طبعِ اول، ص ۳۴)

ع: کام خوں ریزی ہے اُس یوسفِ بازاری کا — " (" ص ۱۱)

ع: کہ نہریں جاری ہوئیں، موسمِ بہار آیا — " (" ص ۵)

ع: چھوڑوں کیا پیری میں شیریں دہنوں کی صحبت — " (" ص ۲۹)

ع: کیا ہو بغیر پستی کے، آبِ رواں بلند — " (" ص ۱۰۵)

ع: چھین عریانی کا کفن میں نہیں — " (" ص ۱۴۵)

ع: آج اے جان، خود آرائی کا سامان کرو — " (" ص ۲۰۸)

شعر:
ہیں یہ بے تابی کے مضموں، کہ کسی رنگ کا ہو
نامے کے بندھتے ہی، سیمابی کبوتر ہو جائے — " (" ص ۲۶۷)

ع: کہیں الٰہی، مری آہ کو اثر مل جائے — " (" ص ۲۸۲)

ع: جو چھپتے ہیں پیشانی پر آبِ افشاں — " (" ص ۲۸۸)

مصرع : خوں خواری کی عادت جو ہے لے یار، نہ چھوٹی ‏ ‏" " ص ۳۰۷

مصرع : خالی رہنا گھر کا ہوتا ہے بُرا ‏ ‏" " ص ۳۰۸

مصرع : پیری میں رونا جوانی سے جنوں کا جوش ہے ‏ ‏" " ص ۳۱۱

مصرع : مشکل کے وقت حامی ہوا تو خلیل کا ‏ ‏آتش (کلیات نول کشور پریس ص ۲)

مصرع : ناقص ہے دوستداری میں کامل نہیں ہے تو ‏ ‏" " ص ۸

مصرع : آزادی سے زیادہ اسیری میں لطف ہے ‏ ‏" " ص ۸

مصرع : فتنہ پردازی جسے کہتے ہیں فن ہے کس کا ‏ ‏" " ص ۱۸

مصرع : مُنہ کتابی، قلمی ہے۔ خط، حاشیہ ہے میر کا ‏ ‏" " ص ۲۱

مصرع : زائچہ بھی نقل ہے پیشانی کی تحریر کا ‏ ‏" " ص ۲۶

مصرع : عزلت گزینی کا جو میں نے کیا ارادہ ‏ ‏" " ص ۴۴

مصرع : موجد اس کی ہے سیہ روزی ہماری آتش ‏ ‏" " ص ۴۸

مصرع : گمان ساقی پہ صیاد کا ہوا مجھ کو ‏ ‏" " ص ۵۴

مصرع : وہی دیوانگی میری ہے بہار آنے دو ‏ ‏" " ص ۶۶

صرف الف کی ردیف سے ابھی اتنی ہی مثالیں اور مل سکتی ہیں۔

مصرع : دل کی بے تابی نے پیار سے مجھے ناچار کیا ‏ ‏امانت لکھنوی (واسوخت)

مصرع : آبروریزی سے شاید تو نہیں ڈرتا ہے ‏ ‏"

مصرع : دل کی بے تابی سے، گودی میں اٹھایا اس کو ‏ ‏"

مصرع : کردی اک تفرقہ اندازی کی صورت باہم ‏ ‏"

مصرع : جب کہ عیاری میں کامل ہوا دہ ماہِ تمام ‏ ‏"

مصرع : میں نے اس گل کو جو یک رنگی میں کامل پایا ‏ ‏"

ع : میں بھی تو آدمی کی جان ہوں، حیوان نہیں ؎

ع : کبھی کہتا ہوں پریشانی میں شامِ ہجراں ؎

ع : آگے اُس مینی کے، خود بینی تری ہے بے کار ؎

ع : وصل سے شادی ہوئی، کھل گئے عقدے دل کے ؎

ع : پاک دامانی میں تیری نہیں پڑنے کا خلل — رندؔ دیوان مطبوعہ نول کشور پریس ص ۱،

ع : الٰہی دیکھیے، واماندگی کہاں پہنچائے — ؍ ؍ ص ۴

ع : مے خواری کی تکلیف نہ دے روزوں میں ساقی — ؍ ؍ ص ۱۱

ع : ایماے ملاقات تھی خاموشی ہماری — ؍ ؍ ص ۱۱

ع : دم میں دم باقی ہے جب تک، نہ اٹھا یار سے ہاتھ — ؍ ؍ ص ۱۱

ع : پاک دامانی کا دعوا نہ کرے اس رو سے — ؍ ؍ ص ۱۳

ع : پھر راتیں کاٹنے لگے اختر شماری میں — ؍ ؍ ص ۱۴

ع : جوہر وہ خاکساری نے پیدا کیا مری — ؍ ؍ ص ۱۵

دیوانِ رندؔ ۲۱۶ صفحات پر حاوی ہے؛ مندرجۂ بالا مثالیں شروع کے صرف ۱۵ صفحات سے ماخوذ ہیں۔

دکھلایا ناتوانی نے گھر یار کا مجھے — (صباؔ: غنچۂ آرزو ص ۱۶)

خود بینی کا رواج کبھی پیشتر نہ تھا — ؍ ص ۳۵

سودائی کس قدر ہے شبِ تار کا مزاج — ؍ ص ۴۷

خالی کر دیجیے قاتل کا نمک داں کیوں کر — ؍ ص ۶۵

جو گل نشانی کی جا ہے تگرگ بار چراغ — ؍ ص ۶۲

ع : درازدستی پہ کس بے ادب نے کی دمِ قتل — مومنؔ (دیوان مرتبہ ضیا احمد، ص ۱۳)
ع : یہ بے حجابی مجری، گو مجھی کو حجاب کو تم — 〃 〃ص ۱۴۷
ع : غزل سرائی کی مومنؔ نے کیا کر رشک سے آج — 〃 〃ص ۱۳۸
ع : مری تسلّی کو روزِ جزا کے آنے کی — 〃 〃ص ۱۹۳
ع : در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے — 〃 〃ص ۲۲۸
ع : بیزارِ زندگانی کا جینا محال تھا — 〃 〃ص ۲۳۶
ع : سر سے شعلے اٹھتے ہیں، آنکھوں سے دریا جاری ہے — 〃 〃ص ۱۸

ع : آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو — غالبؔ (دیوان مرتبہ عرشی صاحب، ص ۳۰۱)
ع : کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — 〃 〃ص ۱۵۲
ع : خاموشی ہی سے نکلے ہے، جو بات چاہیے — 〃 〃ص ۲۱۹
ع : پنبۂ مینائی ہی رکھ لو تم اپنے کان میں — 〃 〃ص ۱۰۳
ع : سینۂ بے تابی سے ملتا ہے بہ تیغِ کہسار — 〃 〃ص ۲
ع : بیضۂ قمری کے آئینے میں پنہاں صیقل — 〃 〃ص ۴
ع : ناخن کو جگر کاوی میں بے رنگ نکالوں — 〃 〃ص ۹۰

ع : الٰہی جلوہ ہے کس بت کا آج مسجد میں — ذوقؔ (دیوان مرتبہ آزاد، ص ۴۳)
ع : کہ سینہ کاوی میں یاں نامور کو دیکھتے ہیں — 〃 〃ص ۱۴۷
ع : نہیں وہ آدمی، لیکن سب آدمی کے ڈھنگ — 〃 〃ص ۳۹۸
ع : نقشِ سجدے کا ہے پیشانی کا ٹیکا ہم کو — 〃 〃ص ۱۹۷
ع : الٰہی خیر ہو، مانندِ شعلہ سرکشی — 〃 〃ص ۱۱۸

ع : حنائی پنجہ ہوں تاک و چنار و بید انجیر ‏٭ ٭ ص ۲۶۳

ع : سچ ہے، محبوب جو لاثانی ہے، وہ یکتا ہے ‏محسن کاکوروی (کلیاتِ نعتِ محسن ص ۳۴)

ع : عرش پر کرسی بچھائے ہے مرا ذہنِ رسا ‏٭ ٭ ص ۳۸

ع : اک رگِ مخفی ہے مابینِ دو ابروئے سیاہ ‏٭ ٭ ص ۴۰

ع : اُمّی ہونے میں بھلا آپ کے شبہہ کیا ہے ‏٭ ٭ ص ۴۲

ع : ہے خوں ریزی کا نقشہ دماغِ کج کلاہاں میں ‏٭ ٭ ص ۴۳

ع : سبک رُوحی یاروں کو دکھلاؤں میں ‏٭ ٭ ص ۸۸

ع : کیسی افسردگی، کیا بات ہے مرجھانے کی ‏٭ ٭ ص ۱۰۹

ع : تاریکی میں نور یا الٰہی ‏٭ ٭ ص ۱۲۵

ع : باقی جو کچھ کہ ہے، وہ فانی ہے ‏نواب مرزا شوق (مثنوی زہرِ عشق)

ع : سختی ساری بتوں کے دل کو دی ‏٭

ع : ثانی رکھتی نہ تھی وہ صورت میں ‏٭

ع : میری رسوائی کا خیال رہے ‏٭

ع : چھپ کے تنہائی میں اغیار سے رویا ہوگا ‏امیر مینائی (صنم خانۂ عشق مجتبائی پریس حیدرآباد دکن)

ع : تیری بے دردی ہی اچھی تھی ترس کھانے سے ‏٭ ص ۲۸۰

ع : پاسِ یکتائی کا اُس شوخ کو ایسا ہے امیر ‏٭ ص ۳۳۸

ع : طرفۃ العین میں وہ روشنی پہنچی جو قریب ‏٭ مراۃ الغیب ص ۱۲۵

ع : بستیاں ہوتی ہیں آبادی سے اکثر باہر ‏٭ ص ۲۰۰

ع : یہ شیخ سعدی ہے، جس نے کہ چشم روشن کو 〃 〃 ص ۳۴
ع : نہ بے وفائی کا غم تھا، نہ ڈر جدائی کا 〃 〃 ص ۸۴

ع : الٰہی تو نے ہمیں کس بلا میں ڈال دیا داغ (گلزارِ داغ، مطبع تیغ بہادر، ص ۱۳)
ع : وہ بُت کرے خدائی کی باتیں، خدا کی شان 〃 〃 ص ۱۹
ع : کیا جانے وہ خدائی کا مارا کہاں ہے اب 〃 〃 ص ۴۲
ع : الٰہی شیخ بھی مے خوار ہو، مغاں کی طرح 〃 〃 ص ۸۲
ع : الٰہی قاصد کی خیر گزرے کہ آج کوچے سے فتنہ گر کے 〃 〃 ص ۱۰۰
ع : الٰہی دم مری آنکھوں میں پھیر کھا کے نہ آئے 〃 〃 ص ۱۰۸
ع : مثالِ عارض صفائی رکھنا، بہ رنگِ کاکل کجی نہ کرنا 〃 〃 ص ۱۴
ع : الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا 〃 〃 ص ۱۵۲

ع : گھر میں جو سپیدی چار سو تھی شوق قدوائی (مثنوی ترانۂ شوق)
ع : دانتوں سے کبودی لب پہ آئی 〃
ع : چاندی کی رگڑ سیاہی لائی 〃
ع : دانائی تھی ختم اُس پری پر 〃
ع : آزادی کو مشتری نے کھویا 〃
ع : تقدیر کی نارسائی کب تک 〃

ع : تنہائی میں رنجِ شبِ یلدا ہے قیامت حسرت موہانی (دیوانِ ششم)
ع : رعنائی بھی آفت ہیں ترے لب پہ تبسم 〃 〃

ع : اب بھی کیا ہم تری یکتائی کا دعوا نہ کریں ۔ ۔ (دیوانِ چہارم)

ع : یعنی جب یہ ہے تو فکرِ بے نوائی پھر کہاں ۔

ع : پھر بھی ہے تم کو مسیحائی کا دعوا، دیکھو ۔

ع : یعنی ہم نے کس لیے غلطی جتائی آپ کی ۔ (دیوانِ ششم)

ع : پیے کھائے، یا کوئی قربانی دے — اثر لکھنوی (نغمۂ جاوید)

ع : وہ اندھے ہیں دانائی سے کوسوں دور ۔ ۔

ع : خوشی سے صفا کوشی مضبوط ہے ۔ ۔

ع : ہستی ہوتی ہے اتنی ہی مبہم ۔ (نوبہاراں ص ۱۷۱)

ع : راستی وہ جو ہم سخن تجھ سے ہوئی ہو برملا ۔ ۔ (ص ۱۱۵)

بہت بڑے ذخیرے کے یہ صرف چند اجزا ہیں اور ان مثالوں ہی سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فارسی عربی الفاظ کے آخر سے یاے معروف کس بے تکلفی کے ساتھ ساقط ہوتی رہی ہے اور یہ کہ جن لوگوں نے اِس سقوط کو غلط بتایا، وہ خود بھی اِس کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اِس سے ثابت ہو گیا ہوگا کہ حروفِ علّت کا سقوط ضروری ہے اور یہ کہ اس میں زبانوں کی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ اساتذہ کے یہاں ہر طرح کے مناسب و غیر مناسب سقوطِ حروفِ علّت کی ہزار در ہزار مثالیں بکھری ہوئی ہیں اور اس میں معتبر و غیر معتبر کی کچھ تخصیص نہیں۔ پُرانے ذخیرے کا جائزہ لینا مقصود نہیں، مقصود یہ ہے کہ ایک قاعدے کی حیثیت سے، سقوطِ حروفِ علّت کو جو غلط طور پر "صحیح و غلط" کے خانوں میں بانٹا گیا، اور فارسی و عربی کی جس طرح تخصیص کی گئی؛ اُس پر گفتگو کی جائے، اور جو شعرا فصاحتِ کلام پر نظر رکھنا چاہتے ہیں، اُن کی توجہ کو صحیح انداز نظر

اور طریقۂ کار کی طرف مبذول کرایا جائے۔ اور اس پر زور دیا جائے کہ الفاظ کے آخر سے حروفِ علت کا دبنا اور نہ دبنا، غلط اور صحیح کے عنوانات کے تحت نہیں آتا؛ اِس کو مناسب اور غیر مناسب کے نام سے موسوم ہونا چاہیے۔ اشعار میں، گفتگو کی طرح، حروفِ علت کا ساقط ہونا لازم ہے؛ مگر اس سلسلے میں گفتگو کے اسلوب اور لہجے کے تقاضوں پر ضرور نظر رہنا چاہیے۔ مکمل پابندی تو شاید ہی کسی چیز کی ہو سکے، البتہ یہ مناسب بھی ہے اور ضروری بھی کہ یہ پہلو ذہن میں رہے اور توجہ اِس کی طرف منعطف ہوتی رہے۔

اعلانِ نون

عربی فارسی کے وہ لفظ جن کے آخر میں نون ہو، اور اُس سے پہلے الف، واو، یا یا میں سے کوئی حرف ساکن ہو، جیسے: جان، ایمان، خون، جنون، دین، تحسین وغیرہ؛ تو ایسے لفظوں کو شعر میں کس طرح لایا جائے، اعلانِ نون کے ساتھ، یعنی جان، بروزنِ مال؛ یا اخفائے نون کے ساتھ، یعنی جاں، بروزنِ پا؟ اور اگر ایسے لفظ مرکبِ اضافی، توصیفی یا عطفی کا جزوِ آخر ہوں، جیسے دشمنِ ایماں، جوشِ جنوں، وسعتِ بے پایاں، دین وایماں وغیرہ؛ اِس صورت میں کیا نون کا اعلان کیا جائے گا؟

اِس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہونا چاہیے کہ جہاں نون کا اعلان مناسب ہو، وہاں اعلان کیا جائے اور جہاں اخفا کا محل ہو، وہاں ایسے لفظوں کو بہ اخفائے نون نظم کیا جائے۔ اور اس کا اصل معیار ذوقِ سلیم ہوگا۔ مصرعے کی روانی اور اُس کا آہنگ اگر اخفا کا متقاضی ہو تو وہی صحیح ہے، اور اگر اعلان کا طالب ہو، تو وہی درست ہے۔ لفظ مفرد ہو یا مرکب، اِس سے کچھ فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ لیکن قواعدِ شاعری کی شریعت میں اِس آزادہ روی کو قابلِ قبول نہیں سمجھا گیا، بل کہ مفرد اور مرکب الفاظ کو الگ الگ قاعدوں کے پھندوں میں کسا گیا۔ مرکبات کے متعلق تو قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کیا گیا کہ اُن میں نون کا اعلان کسی صورت میں بھی روا نہیں، ہر مرکب کو (عطفی،

اضافی، توصیفی) لازماً بہ اخفائے نون نظم کرنا چاہیے۔ اس قاعدے کی رو سے "دشمنِ جاں" صحیح ہے اور "شرمندۂ احسان" غلط ہے ——— اور مفرد الفاظ کے متعلق کچھ لفظوں کو مستثنا کرکے یہ کہا گیا کہ اُن کو اعلانِ نون کے ساتھ نظم کرنا چاہیے۔ مولانا حسرت موہانی نے لکھا ہے:

"فارسی کے جو الفاظ اردو زبان میں عام طور پر رائج ہیں، اُن کے متعلق دستور یہ ہے کہ اگر وہ بلا اضافت ہوں، تو رواجِ اہلِ زبان کے خلاف، اُن میں نون کا اعلان کیا جائے۔ لیکن ترکیبِ فارسی میں اعلانِ نون جائز نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً صرف "مکان" یا "جان" کہنا ہوگا تو "مکان" اور "جان" اعلانِ نون کے ساتھ بولیں گے، جس کی کتابت کے لیے ن کے پیٹ میں نقطہ دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر "آفتِ جاں" یا "رگِ جاں" کہنا ہوگا تو "آفتِ جاں" اور "رگِ جاں" میں ترکیبِ فارسی کی موجودگی کے باعث، اعلانِ نون جائز نہ ہوگا، اور کتابت میں نون بے نقطہ لکھا جائے گا۔"

[نکاتِ سخن، اشاعتِ ششم، انتظامی پریس حیدرآباد، ص ۹۱]

بہ حالتِ ترکیب اعلانِ نون کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ:

"جب ترکیبِ فارسی ہو، تو اعلان، جیسا کہ ذوق دہلوی کے کلام میں جابہ جا ہے، جائز نہیں۔ جب فارسی ترکیب ہو، تو فارسیوں کا اتباع چاہیے، اور وہ اس قسم کے الفاظ، اعلان کے ساتھ نہیں باندھتے۔ اور ایک آدھ جگہ جو اُن کے کلام میں اعلان پایا جاتا ہے، تو یا تو وہاں سہوِ کاتب ہے، یا من قبیلِ شاذ۔" [شوق نیموی۔ رسالۂ اصلاح، ص ۱۸]

اس سلسلے میں تین اہم باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا، جس کی وجہ سے مفرد و مرکب کی تفریق اور اعلان و اخفا کی قید غیر مناسب احکام کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔ پہلی بات تو یہ کہ بول چال

میں کچھ لفظ عموماً اعلانِ نون کے ساتھ آتے ہیں، جیسے: "خونؔ" اور "دینؔ"۔ اور کچھ لفظ عموماً اخفائے نون کے ساتھ بولے جاتے ہیں، جیسے: "گریاں" اور "خنداں"۔ اِن سب لفظوں کی صورت یہ ہے کہ ان میں سے کچھ لفظ تو ایسے ہیں کہ وہ مفرد ہوں یا مرکب، اور نظم میں ہوں یا نثر میں؛ اُن کو اگر اعلانِ نون کے ساتھ استعمال کیا جائے گا تو ہمیشہ ناگوار معلوم ہوں گے، خواہ اساتذہ کے بنائے ہوئے قاعدے کے مطابق، اعلان جائز ہو۔ اور کچھ ایسے لفظ ہیں کہ وہ دونوں طرح استعمال میں آسکتے ہیں، اُن میں صوتی سطح پر ناگوار کیفیت نمایاں نہیں ہو پاتی۔ ظاہر ہے کہ اسی اعتبار سے ایسے الفاظ کے متعلق فیصلہ بھی کیا جانا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بہت سے مرکبات اِس طرح کے ہیں جو گفتگو میں عام طور پر اعلانِ نون کے ساتھ آتے ہیں۔ نثری تحریروں میں بھی جب یہ جگہ پاتے ہیں تو قاری اُن کو با اعلانِ نون ہی پڑھتا ہے۔ یہ ایسے مرکبات ہیں کہ اگر اُن کو، قاعدے کی پابندی کے خیال سے، بالجبر با اخفائے نون بولا جائے تو ناگوار صوتی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ مثلاً اِسی "اعلانِ نون" کو لیجیے؛ اِس کو "اعلانِ نوں" کہہ کر دیکھیے، واضح طور پر یہ محسوس ہوگا کہ تلفظ میں بھدا پن در آیا ہے، اگرچہ از روے قاعدہ اِسی طرح صحیح ہے۔ مشہور قول ہے: "الشعراء تلامیذ الرحمٰن"۔ اِس میں نون کا اعلان ہے۔ اب حالی کے اِس شعر کو دیکھیے:

دعویِ فضل و براعت اس کو زیبا ہے یہاں
جو کوئی تلمیذِ رحماں تم میں ہو، میرے سوا

اِس میں "تلمیذِ رحماں" زبان سے ادا تو ہو جاتا ہے، جمتا نہیں، اجنبی سا لگتا ہے؛ حالاں کہ قاعدے کی رو سے یہ بالکل صحیح ہے۔ ایک اور مثال:

راکبِ حزم ترا : ناقۂ صالح تہِ راں   مومن

رائضِ عزم ترا : دوشِ ملائک پہ سوار [کلیاتِ طبعِ لاہور، ص ۴۹]

پہلے مصرعے میں بہ لحاظِ قاعدہ "تہِ راں" صحیح ہے، لیکن پڑھنے میں کس قدر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے!

اِس سلسلے میں یہ بات بھی اہم تھی کہ بہت سے مرکبات ایسے بھی ہیں، جو بہ اخفائے نون اور بہ اعلانِ نون، دونوں طرح بولے جا سکتے ہیں اور نظم بھی کیے جا سکتے ہیں اور بہت سے مقامات پر دونوں صورتوں میں بدنمائی اُن سے دور رہتی ہے۔ مثال کے طور پر غالب کے اِس شعر میں "بلائے جاں" کی ترکیب بہ اخفائے نون آئی ہے، اور بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے:

بلائے جاں ہے غالب اُس کی ہر بات   عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

[دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، ص ۱۵۸]

یہی ترکیب ذیل کے شعر میں بہ اعلانِ نون نظم کی گئی ہے، اور اِس صورت میں بھی بُری نہیں معلوم ہوتی:

ہے بلائے جان یہ افعی بہ نخلِ یاسمن

یا کہ ہے یہ دام، بہرِ عاشقانِ خستہ تن

تصوّر لکھنوی [تذکرۂ مجمع الانتخاب]

گویا سارا کھیل محلِّ استعمال اور اندازِ استعمال کا ہے۔ بہ خوبی ممکن ہے کہ یہی ترکیب کسی دوسری جگہ بہ اخفائے نون ناگوار معلوم ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شعر میں بندش ایسی ہو کہ بہ اعلانِ نون ناگوار تر لگے۔

تیسری بات جو سب سے زیادہ اہم تھی، اور جس کو نظر انداز کیا گیا، یہ تھی کہ اساتذۂ دہلی کے یہاں ذوق و غالب، بل کہ حالی کے زمانے تک، اخفا و اعلانِ نون کی یہ

پابندی ہرگز نہیں تھی۔ وہ لوگ مرکبات کو بے تکلف بہ اعلانِ نون نظم کیا کرتے تھے۔ داغ کے ابتدائی کلام میں بھی اِس کی مثال ملتی ہے۔ البتہ بعد کو انھوں نے سختی کے ساتھ اِس کی پابندی کی، اور یہ اثر تھا درحقیقت اُن کے قیامِ رام پور کا، جہاں لکھنوی شعرا کے جمگھٹے میں وہ بہت سی پابندیوں کو ماننے پر مجبور ہوئے۔ اِن دہلوی شعرا کے یہاں بے شمار اشعار میں بہ صورتِ ترکیب نون کا اعلان ملتا ہے، اور ان میں نہ معلوم کتنے اشعار ایسے ہیں جن میں یہ اعلان، کسی طرح بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بات قابلِ توجہ بھی کہ ایک مدت تک نون کے اخفا یا اعلان کو کوئی اہم مسئلہ نہیں سمجھا گیا، قاعدے کی زنجیر میں پابند ہونے کے بجائے، ضرورت اور آسانی کی روشنی میں اس کو دیکھا گیا؛ تو اس کے اثرات زبان اور شاعری میں تہ نشیں ہوئے ہوں گے؛ اور ان اثرات کے باعث، بہت سے ایسے مفرد و مرکب لفظ سامنے آئے ہوں گے، جن میں اخفا یا اعلان، محلِ استعمال کے تابع رہا ہوگا، کسی قاعدے کا اسیر نہیں بنا ہوگا؛ طویل مدت تک شاعری کی زبان میں بہت سے مرکبات کو بہ اعلانِ نون نظم کیا جاتا رہا؛ اس پیہم عمل سے، کیا یہ مرکبات چلن کے سانچے میں نہیں ڈھل گئے ہوں گے، اور شاعری کی زبان سے اچھی طرح روشناس نہیں ہوگئے ہوں گے؟

اِن امور کو نظر انداز کر دینے سے، اور محض ایک جامد قاعدہ بنا دینے سے، سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ جن مرکبات کو بہ اعلانِ نون نظم کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا، اُن کو بھی متاخرین نے مجبوراً اسی طرح نظم کیا اور حُسنِ کلام کی پروا نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قاعدہ، کہ بہ صورتِ ترکیب ایسے الفاظ کو لازماً بہ اخفاے نون نظم کرنا چاہیے؛ آج مفروضہ معلوم ہوتا ہے ——— میں ذیل میں کچھ ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے یہ معلوم ہوگا کہ محلِ استعمال اور سلیقۂ استعمال کا لحاظ رکھا جائے، تو بہت سے مقامات پر، مرکبات میں بھی اعلانِ نون اُسی طرح گوارا بن جائے گا جس طرح وہ بہ اخفاے نون گوارا معلوم

ہوتے ہیں، اور دوسری طرف اِن مثالوں سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اساتذہ نے مرکبات کو با اعلانِ نون بہ کثرت نظم کیا ہے؛ اِسی لیے مثالیہ اشعار کی تعداد کچھ زیادہ ہے، مگر ان کی حیثیت "مشتے نمونہ از خروارے" سے زیادہ نہیں، البتہ اثباتِ مدعا کے لیے یہ کافی ہیں؛

در پے جان ہے قراولِ مرگ
کسو کے تو شکار ہم بھی ہیں   میر (کلیاتِ میر مرتبہ آسی ص ۱۰۱)

لوٹے ہے خاک و خون میں غیروں کے ساتھ میر
ایسے تو نیم کشتے کو ان میں نہ سانیے   (۔ ص ۱۹۶)

غنچہ ہی وہ دہان ہے گویا
ہونٹ پر رنگِ پان ہے گویا   (۔ ص ۲۲۵)

مر گیا جو اسیرِ قیدِ حیات
تنگنائے جہان سے نکلا   (۔ ص ۱۷)

خوب رو سب کی جان ہوتے ہیں
آبروے جہان ہوتے ہیں
غمزۂ چشمِ خوش قدانِ زمیں
فتنۂ آسمان ہوتے ہیں   (۔ ص ۱۱۰)

ہم نے کون و مکان دیکھ لیا
پل میں سارا جہان دیکھ لیا
آرزو تھی عدم میں دنیا کی   میر سوز، اردوے معلیٰ (دہلی)
ہے یہ وہم و گمان دیکھ لیا   میر سوز نمبر، ص ۷۷)

بسایا غم نے آکر اس دلِ ویران کو ہے ہے
وگرنہ رفتہ رفتہ حُسن سے آباد میں کرتا   (۔ ص ۱۳۵)

اور بھی چاہیے سو کہیے، اگر
دلِ نامہرباں میں کچھ ہے
میر درد (دیوانِ درد، مکتبہ جامعہ، ص ۸۷)

شہرِ عدم کو قافلے لاکھوں گئے، ولے
چل چل کے نت میں بے سروساماں رہ گیا
مصحفی (انتخابِ سخن، مرتبہ حسرت موہانی، ص ۱۲)

کب کا اک عرصے جھگڑا تھا دل و جاں کے بیچ
کام دونوں کا کیا یار نے اک آن کے بیچ
مصحفی (ص ۳۱)

ازبس کہ مرے دیدۂ حیراں میں کچھ ہے
اک آن میں دل کچھ ہے، تو اک آن میں کچھ ہے
(ص ۶۶)

گیا ہے چھوڑ کر جس کو تو اے آبادیٔ عالم
وہ مضطر، کیا درونِ خانۂ ویراں لوٹتے ہے
جرأت (انتخابِ سخن، ص ۶۸)

کیا لڑکپن کا ہے عالم اس بتِ ناداں کا
بھولی بھالی صورت اور تس پر وہ بالا کان کا
جرأت (ص ۱۴)

ل مجھ سے لے پری، تجھے قرآں کی قسم
دیتا ہوں تجھ کو تختِ سلیماں کی قسم
ملت میں جس کی ہے تو، اسی کی قسم تجھے
اور اپنے دین و مذہب و ایماں کی قسم
انشا (کلامِ انشا، ص ۱۲۶)

گر ہاتھ لگاؤں، خطرِ جان مجھے ہے
کھیلے وہ تری زلف سے، جو کالے کو کھیلے
انشا (ص ۱۹۹)

کب وہ آزاد بھلا موردِ تحسین ہوئے
بھول جو سب کو گئے، دین سے بے دین ہوئے
قمری و بلبلِ نالاں میں پڑے جو جھگڑے
سو دلِ غم زدہ کے موجبِ تسکین ہوئے
انشا (ص ۲۵۱)

ہے یہ اُس مہ جبین کی تصویر — یا کسی حورِ عین کی تصویر
نظر آتی ہے اشکِ انشا میں — جبرئیلِ امین کی تصویر

انشا (کلامِ انشا، ص ۹۱)

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر — فعلِ بد تو خود کریں، لعنت کریں شیطان پر

انشا (ص ۹۶)

جھوٹ ہی جانوں کلام اُس رہ زنِ ایمان کا
پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا

ذوق (دیوانِ ذوق، مرتبہ آزاد محبوب المطابع، ص ۶۵)

جو دلِ پُر آرزو سے نکلا نالۂ عشق میں — ایک پُتلا تھا سراپا حسرت و ارمان کا

ذوق (ص ۶۵)

نفسِ بے مقدور کو تھوڑی سی بھی فرصت ہو گر — دیکھ پھر ساماں، اس فرعونِ بے سامان کا

ذوق (ص ۶۶)

مصحفِ رخ پہ ترے، رنگ سنہرا تیرا — واہ کیا خوب ہے سونا ہے قرآں چڑھا

ذوق (ص ۷۱)

شرم، آئینہ تراشِ جبہۂ طوفاں ہے — آب گردیدن روا، لیکن چکیدن منع ہے

غالب (دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ص ۱۱۲)

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں — مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا

غالب (ص ۱۳۹)

مشکیں لباسِ کعبہ، علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے

غالب (ص ۲۰۵)

بٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں — فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

(دیوانِ غالب ، ص ۲۰۳)

شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

(دیوانِ غالب (ص ۲۴۲)

وہ شوخ بے سبب آزار و بے گنہ خوں ریز — کہ جرمِ قاتلِ عثمان کا نہ ہو قائل

مومن (کلیات مرتبہ کلب علی خاں فائق ، ص ۳۶)

شرطِ ایمان ہے، پیمانِ خلافت اس کا
وہ مسلمان ہے کیا، جس کو ہو اس میں انکار (ص ۴۷)

سیف و قلم ہیں دونوں ستون کاخ دین کے
حیراں ہوں، بابِ علم کہوں، یا جہانِ تیغ (ص ۵۶)

صاف طوفان اس کو جان گئے — دشمنِ جان اس کو جان گئے

(ص ۱۵۲)

چرخ مینو مضطرب آن آن میں — خضر ڈوبے چشمۂ حیوان میں

(ص ۳۴۱)

اب قید سے امیدِ رہائی نہیں رہی — ہمدردِ پاسبان ہیں زندانیوں میں ہم

مومن (دیوان مرتبہ ضیا احمد، ص ۱۲۳)

مرچا ہوں روزِ جزا داد، یہ ستم دیکھو
کب آزماتے ہیں، جب وقتِ امتحان نہیں (ص ۱۵۲)

تابندہ و جوان تو بختِ رقیب تھے — ہم تیرہ روز کیوں غمِ ہجراں کو بھا گئے

(ص ۲۳۶)

کچھ آنکھ بند ہوتے ہی، آنکھیں سی کھل گئیں — جی اک بلائے جان تھا، اچھا ہوا گیا
(ص ۳۹)

ع : جنّ و انسان کی حیات ہے تو حالیؔ (مجموعۂ نظم حالی، ص ۲۲)
ع : قتلِ انساں ہمیشہ سے ہے عادت تیری (" ص ۳۳)
ع : حکم و قانون کسی گھر میں مقید نہ رہا (" ص ۳۷)
ع : جسے احباب اک قصرِ رفیع الشان سمجھے ہیں (" ص ۱۰۱)
ع : اب دیر گیا ہے، دور کرامن و امان کو میر مہدی مجروحؔ (دیوان ص ۱۸۹)
ع : شکرِ احسان مگر فطرتِ انسانی ہے شبلیؔ (کلیاتِ نظم اردو، ص ۸۳)

ع : ہیں لٹکے ہوئے سقفِ ایوان سے اسماعیل میرٹھیؔ (کلیات ص ۲)
ع : ہر اک جنس کا ساز و سامان بھی (" ص ۵)
ع : دامانِ زمین کو کترتی (" ص ۶)
ع : براقِ سنگین سے تھی آنکھ جھپکتی (" ص ۱۳۰)
ع : امورِ دین میں ظاہر حیائے عثمانی (" ص ۲۲۵)

میر انیس کے کلام میں بھی اعلانِ نون کی مثالیں موجود ہیں۔ مولانا احسن مارہروی مرحوم نے، میر انیس کے کچھ ایسے اشعار نقل کر کے لکھا تھا:

"اہلِ لکھنؤ قدیم سے اس کے پابند ہیں کہ ایسے ترکیبی نون کو بالاعلان نہیں کہتے اور ذوق و غالب تک دہلی والے ایسے نون کا اعلان بے تکلف کیا کرتے تھے، اور اب بھی بعض اہلِ دہلی عموماً اور نیچرل شعرا خصوصاً اخفا کی قید کے پابند نہیں" (رسالہ فصیح الملک، جنوری ۱۹۰۵ء)

خط کشیدہ عبارت خاص طور پر قابلِ توجہ ہے اور ان مثالوں سے اور اس قول سے مکمل طور پر یہ ثابت ہے کہ بہت سے شعرا نے اس قاعدے کو التزامی صورت میں کبھی

قبول نہیں کیا کہ بہ صورتِ ترکیبِ اضافی وغیرہ، ایسے الفاظ میں اخفاے نون ضروری ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ قواعدِ شاعری کے سلسلے میں بھی (جن میں متروکات بھی شامل ہیں) ساری غیر ضروری پابندیاں لکھنؤ میں وضع کی گئیں اور وہاں یہ ایک طرح کا فیشن بن گیا تھا۔ نام دہلوی شعرا نے اور اُن سے متاثر ہونے والوں نے ایسے التزامات کو کچھ زیادہ اہمیت کا مستحق نہیں سمجھا۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، داغ نے اعلان و اخفاے نون کے اِس قاعدے کی طرف بہ طورِ خاص توجہ کی، مگر آغاز میں جب کہ وہ دہلی کے اثرات سے باہر نہیں نکل پائے تھے، ان کے یہاں اعلانِ نون اور آخرِ کلمہ سے سقوطِ یاے معروف جیسے ضابطوں کی لازمی پابندی نہیں ملتی۔ دربارِ رام پور میں لکھنوی شعرا کے ہجوم نے اور وہاں کے اُس خاص ادبی ماحول نے اُن کی توجہ کو اس طرف منعطف کیا۔ نواب کلب علی خاں کو متروکات وغیرہ کا بڑا لحاظ رہتا تھا اور اُن کے دربار میں زبان و قواعد کی ایسی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ اور ذرائع کے علاوہ، نواب صاحب کے دواوین کے آخر میں متروکات کی جو فہرستیں ہیں، اُن سے بھی اِس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ فرماں روا کے اس رجحان نے قواعدِ شاعری و قواعدِ زبان کی بحثوں کو، اور اُن کی سخت گیر پابندیوں کو، لازمۂ استادی بنا دیا تھا۔ اعتبار کے لیے ایسے قواعد کی پابندی ضروری تھی، بہ صورتِ دیگر اعتبار و استناد پر حرف آ سکتا تھا۔ ایسے حالات میں، داغ کے یہاں روشِ دہلی کے خلاف، قواعد پسندی اور ضابطہ پرستی کا پیدا ہونا اور فروغ پانا ضروری تھا۔

اِس کی ایک اور دل چسپ مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ اوپر بہ صورتِ ترکیب اعلانِ نون کے ذیل میں جو اشعار بہ طورِ مثال نقل کیے گئے ہیں، اُن میں انشا کے بھی چند شعر ہیں، اور ان اشعار کی موجودگی میں، یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ انشا، بہ صورتِ ترکیب اعلانِ نون کے قائل نہیں تھے؛ مگر دریاے لطافت میں اُنھوں نے اِس کو عیب بتایا ہے:

"ہندی شعر میں صفت اور مضاف الیہ میں اگر مضاف اور موصوف مذکور ہوں، تو

نون کا اعلان غلط ہے۔ جیسے "دیدۂ گریاں" اور "سروِ گلستاں" میں نون کا اعلان غلط ہے۔"
(ترجمۂ دریائے لطافت، ص ۳۵۹)

اب اس کے سوا اور کیا کہا جائے گا کہ یہ تضاد، دو دبستانوں کی آئینہ داری کر رہا ہے۔ یہ خیال رہے کہ یہ کتاب لکھنؤ میں مکمل ہوئی تھی اور اُن کی شاعری نے ابتداءً فروغ دہلی میں پایا تھا۔ یہ جملہ معترضہ تھا، جو یہاں پر ختم ہوا، اب اصل بحث پھر شروع ہو جاتی ہے۔

اِس زمانے کے بعض شعرا کی مثالیں بھی اِس سلسلے میں دل چسپی کے ساتھ دیکھی جائیں گی اور ان سے مزید اس بات کا اندازہ کیا جا سکے گا کہ ترکیب کی صورت میں بھی نون کا اعلان، تناسب کی حدود میں رہ سکتا ہے۔ بہ طورِ مثال محض دو چار مثالیں پیش کی جائیں گی،

توقع دوستوں سے کیوں وفاداری کی ہے تجھ کو
کسی کا کون اب شرمندۂ احسان ہوتا ہے
احسان دانش

اجالا ہے شرق کے ایوان میں
سحر ہو گئی شام و یونان میں
سردار جعفری

شکستہ دوش پہ دیوارِ چین کو لادے
سروں پہ مصر کے اہرام کو اٹھائے ہوئے
سردار جعفری

دست و پا شل ہیں، کنارے سے لگا بیٹھا ہوں
لیکن اس شورشِ طوفان سے ہارا تو نہیں
(وامق)

مولانا محمد علی مرحوم کے یہ دو شعر بھی دیکھیے؛

عالم میں آج دھوم ہے فتحِ مبین کی
سن لی خدا نے قیدیِ گوشہ نشین کی
بہرِ خدا، یہود و نصارا کو دو نکال
یہ ہے وصیت اُس کے رسولِ امین کی

اِن مثالوں سے (جن میں بہت کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے) مولانا احسن مارہروی کے اُس قول کی بھی تائید ہوتی ہے کہ "نیچرل شعرا خصوصاً اخفا کی قید کے پابند نہیں لہٰذا ان

ساری مثالوں میں نون کا اعلان گراں نہیں گزرتا۔ اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کی روشنی میں یہ مان لینا چاہیے کہ ترکیب کی صورت میں نون کا اعلان لازماً غلط، غیر مناسب یا بارِ سماعت نہیں ہو سکتا۔ وہ مناسب بھی ہو سکتا ہے اور غیر مناسب بھی، اور اس کا تعلق صرف محلِ استعمال اور اندازِ استعمال سے ہوگا۔ جہاں سلیقے سے ایسے الفاظ آئیں گے اور اُن الفاظ میں بجائے خود بھی اخفا یا اعلان سے کوئی خاص مناسبت ہوگی، وہاں اس طرح کی صورت پیدا ہوگی۔ مناسب اعلانِ نون کی مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں؛ ذیل میں چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن میں ترکیب کی صورت میں، نون کا اعلان نہایت ناگوار معلوم ہوتا ہے:

ع : ہو ابر خجل دیدۂ گریان کے آگے (جرأت)

ع : دم مارے نہ دل اس دلِ نالان کے آگے (جرأت)

ع : میں طرفہ تماشا شبِ ہجران میں دیکھا (مصحفی)

اِن مقامات پر نون کا استعمال بارِ سماعت ہی نہیں، مخلِّ فصاحت بھی معلوم ہوتا ہے، اور اس طرح کی مثالیں بھی بہت پیش کی جا سکتی ہیں۔ بات وہی ہے کہ یہ سب لفظ وہ ہیں جو گفتگو میں بھی بہ اخفائے نون آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایسے الفاظ میں نون کا اعلان ہمیشہ بُرا معلوم ہوگا۔

مختصر یہ کہ، ترکیب کی صورت میں نون کا اعلان مطلقاً غلط یا ناقابلِ قبول نہیں، اور یہ کہ اس کو کسی قاعدے کا اسیر نہیں بنایا جا سکتا۔ یعنی مسئلہ غلط اور صحیح کا نہیں، مناسب اور غیر مناسب کا ہے؛ اور مناسب و غیر مناسب کا فیصلہ محض محلِ استعمال کی بنا پر کیا جائے گا اور بس۔ اِس بیان کو ایک دل چسپ مثال پر ختم کیا جاتا ہے، مثنوی زہرِ عشق کا معروف شعر ہے:

صبح کو طائرانِ خوش الحان پڑھتے ہیں، کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَان

دوسرے مصرعے کا آخری ٹکڑا، ایک آیت کا جزو ہے اور اُس میں آخری لفظ "فان" ہے، جس کو اصولاً بہ اعلانِ نون "فان" پڑھنا چاہیے، کیوں کہ عربی میں اعلان واخفا کا یہ جھگڑا نہیں، اور یوں بھی کہ اس کو اگر "فاں" پڑھا جائے تو یہ ایک طرح کی تحریف ہوگی۔ اگر اس کو "فان" پڑھا جائے (اور پڑھنا بھی اسی طرح چاہیے) تو پہلے مصرعے میں طائرانِ خوش الحان" پڑھنا پڑے گا، یعنی بہ صورتِ ترکیب ن کا اعلان کرنا ہوگا۔ قاعدہ یہ کہے گا کہ اس کو "خوش الحاں" پڑھا جائے، مگر خوش مذاقی کا تقاضا یہ ہوگا کہ اس کو "خوش الحان" کہا جائے اور دوسرے مصرعے میں "فان" پڑھا جائے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ اخفا و اعلان کا مسئلہ کسی قاعدے کا اسیر نہیں، بلکہ محض محلِ استعمال سے خوب و ناخوب کا فیصلہ کیا جائے گا؛ اس صورت میں کوئی جھگڑا باقی نہیں رہے گا۔ یہ خیال رہے کہ قدیم اساتذہ (خصوصاً اساتذۂ دہلی) کا طرزِ عمل یہی تھا۔ درمیان میں جب شاعری اور زبان کو بہت سے غیر ضروری قاعدوں کے حصار میں مقید کرنے کا رجحان فروغ پذیر ہوگیا تھا؛ اُس زمانے میں اعلانِ نون کا یہ غیر ضروری اور قطعاً غیر مناسب قاعدہ بنا لیا گیا تھا اور اس کو آیت و حدیث والی اہمیت بخش دی گئی تھی۔ وہ زمانہ ختم ہوگیا، وہ حالات بھی ختم ہوگئے جب شعر گوئی پر، شعر سازی نے غلبہ پالیا تھا اور شعریت کے مقابلے میں بے روح صنعت گری نے اہمیت حاصل کرلی تھی؛ اس لیے اُس زمانے کی ایسی غیر مناسب پابندیوں کو بھی ختم ہوجانا چاہیے: اور قدیم اساتذہ کے مناسب طرزِ عمل کو اُس کی جگہ ملنا چاہیے۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا، اُس کا تعلق مرکبات سے ہے۔ مفرد الفاظ کے سلسلے میں اساتذہ نے یہ قاعدہ بنایا تھا کہ کچھ لفظوں کے علاوہ، جو گفتگو میں بالعموم بہ اخفائے نون بولے جاتے ہیں، باقی سب مفرد الفاظ کو بہ اعلانِ نون ہی نظم کیا جائے گا۔ کلبِ حسین خاں نادر نے

لکھا ہے:

"جو نؔ آخرِ الفاظِ عربی فارسی میں آتا ہے، اگر وہ بے کسی ترکیب کے ہو، تو بہ اعلان موزوں کیا جائے، جیسا کہ اس مصرعے میں: کپڑے اُتارتے ہیں بلا کر مکانؔ میں.... غرض یہ ہے کہ جس طرح سے الفاظ روزمرّہ گفتگو میں بولے جاتے ہیں، اُسی طرح سے موزوں بھی ہوا کریں، مگر چند الفاظ ایسے بھی ہیں کہ جن میں یہ قاعدہ قائم نہیں رہتا، مثلاً گراں، اور خزاں، اور رواں، اور دواں، اور طپاں، اور عیاں، اور نہاں، وغیر ذالک؛ ان میں اعلان نہیں چاہیے، اس لیے کہ روزمرّہ گفتگو میں فصحا بہ اعلان نہیں بولتے ہیں، اس سبب سے اِن کا اعلان جائز نہیں۔" (تلخیصِ معلّی، ص ۲۹، ۳۰)

بعض اساتذہ نے، پابندیاں عائد کرنے کے شوق میں، یہ طے کر لیا کہ مفرد لفظوں کے نوؔن کا اعلان لازماً کیا جائے گا۔ اِن میں منیرؔ شکوہ آبادی اور شمشادؔ لکھنوی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لزومِ مالایلزم والی بات تھی۔ یہ مسرّت کی بات ہے کہ عام شعرا نے کبھی اس کی پابندی نہیں کی کہ ایسے مفرد الفاظ کو لازماً بہ اعلانِ نوؔن نظم کیا جائے۔ مفرد الفاظ کو دونوں طرح نظم کیا گیا ہے اور یہی صحیح طرزِ عمل تھا۔ اثرؔ لکھنوی مرحوم نے منیرؔ کے اس التزام کے سلسلے میں کہ مفرد لفظوں کو لازماً بہ اعلانِ نوؔن نظم کیا جائے، ایک دل چسپ روایت لکھی تھی:

"منیرؔ شکوہ آبادی، شاگردِ ناسخؔ نے ایک مطلع کہا۔ ہاتھ ملتے تھے اور کہتے تھے، ہائے کیا خوب مطلع ہے، مگر دیوان میں نہیں رکھ سکتا، کیوں کہ "آسمان" بے عطف و اضافت نظم ہوا ہے، تاہم اعلانِ نوؔن نہیں ہوتا:

گنبدِ قبرِ دوستاں ٹوٹے   اے زمیں تجھ پہ آسمان ٹوٹے"

(رسالہ الحمرا (لاہور) مارچ ۱۹۵۵ء)

یہی منیر ایک جگہ نہایت مجبوری کے عالم میں کہتے ہیں:

منیرؔ افسردہ ہوں پابندیِ عطف و اضافت سے
وگرنہ لطف دکھلاتا مضامینِ گریباں کا

(کلیاتِ منیر، ص ۲۲۶)

شمشاد لکھنوی کے متعلق، اُن کے شاگرد شوق نیموی نے لکھا ہے:

"وہ لوگ جن کو اعلان پر بہت اصرار ہے، ان کے دیوان میں بھی بعض جگہ بہ نونِ غنہ مستعمل ہے۔ چنانچہ استاذی شمشاد لکھنوی، جن کو متروکات سے نہایت ہی احتیاط ہے، اور اعلان کے باب میں بڑی کد رہتی ہے؛ ان کے دیوان خزانۂ خیال میں یہ اشعار موجود ہیں" (ایضاح، حاشیہ اصلاح، ص ۱۸)

اور دو شعر لکھے ہیں جن میں "عنوان" اور "جنون" بہ اخفائے نون نظم ہوئے ہیں۔ شوق نے اسی سلسلے میں مزید لکھا ہے کہ "مولّف بھی وجوباً اعلانِ نون کا پابند نہیں" —— مفرد الفاظ میں اعلانِ نون کے سلسلے میں اربابِ لکھنؤ میں، سب سے زیادہ متوازن رائے خورشید لکھنوی کی تھی۔ انھوں نے "خون" اور "جان" کے ذیل میں لکھا ہے:

"گو بعض اساتذہ کل الفاظِ فارسی کو، جس میں نون بعد حرفِ مد واقع ہے، بہ اخفائے نون بغیر ترکیبِ فارسی ترک کر چکے ہیں، بہ استثنا ان الفاظ کے جن میں اخفائے نون واجب ہے، مثلاً نہاں، عیاں، زیاں وغیرہ کے؛ مگر میں نے ان دونوں لفظوں کو تو بلاشک ترک کر دیا ہے، کیوں کہ خاص ان دو لفظوں کو بہ اخفائے نون بے ترکیبِ فارسی لانا، زبان پر بہت ہی برا معلوم ہوتا ہے، اور چنداں اِن کی پابندی میں دقت اور خوف بے مزگیِ کلام بھی نہیں ہے، برخلاف اور جملہ الفاظ کے، کہ اِن میں دونوں باتیں ہیں، یعنی زبان پر بُرا بھی نہیں معلوم ہوتا اور پابندی میں خوفِ بے مزگیِ کلام و دقت بھی بہت ہے؛ لہٰذا اور سب کو جائز رکھا ہے، ترک نہیں کیا ہے، مثل زبان، جہان، آسمان وغیرہ کے۔" (افادات، ص ۳۲)

اصل بات یہی ہے کہ "دقت" اور "بے مزگی کلام" صحیح معیار ہے اعلانِ نون کے مناسب وغیر مناسب ہونے کا۔ جہاں کلام میں بے مزگی پیدا ہو، وہاں غلط ہے اور یہ بے مزگی، کہیں اخفا سے بھی ہو سکتی ہے اور کہیں اعلان سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں بنایا جا سکتا جس کے تحت قطعیت کے ساتھ یہ کہا جا سکے کہ نون کا اعلان یا اخفا، بجائے خود صحیح ہے یا غلط۔ اس سلسلے میں مفرد اور مرکب الفاظ یک ساں حیثیت رکھتے ہیں، ان میں کسی طرح کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ اس ضروری بات کی تکرار کی جاتی ہے کہ حروفِ علت کے بعد آخرِ لفظ میں واقع نون کے اعلان یا اخفا کے مسئلے کو کسی قاعدے کا اسیر نہیں بنایا جا سکتا۔ یعنی یہاں یہ سوال سرے سے نہیں پیدا ہوتا کہ نون کا اعلان غلط ہے یا صحیح، بل کہ مسئلہ مناسب وغیر مناسب کا ہے؛ اور مناسب وغیر مناسب کا فیصلہ، قاعدے کی رو سے نہیں، حُسنِ کلام کی رو سے کیا جائے گا، جہاں جیسی صورت ہو۔

مختاراتِ امیر مینائی

ادبی خطوطِ غالب کے مولف مرزا محمد عسکری صاحب نے (خدا اُن کی قبر کو ٹھنڈا رکھے) مولانا غلام رسول مہر مرحوم کو ایک خط میں لکھا تھا:

"حضرت! خود ستائی بہت بُری چیز ہے، مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ادبی خطوطِ غالب، مطبوعہ ۱۹۲۹ء، مولفہ خاکسار نے وہ کام کیا جو ہوا آگ کے ساتھ کرتی ہے۔ یعنی اُن لوگوں کے دلوں میں، جن میں غالب پر ریسرچ کرنے کا مادّہ گویا دبا ہوا تھا، اُس کو بہت زور سے اُبھار دیا" (نقوش، مکاتیب نمبر، ص ۴۳۶ء)۔

مرزا صاحب مرحوم کی اس تالیف کو پڑھ کر، مجھے غالب پر تو ریسرچ کرنے کی جرات ہوئی نہیں، یہ بھاری پتھر تھا، چوم کے بغیر ہی چھوڑ دیا۔ ہاں، یہ خیال ضرور آیا کہ جس طرح انھوں نے غالب کے خطوں کے اقتباسات کو ایک خاص انداز سے یک جا کر دیا ہے، اسی سے ملتا جلتا ایک سلسلہ شروع کیا جائے، جس میں مشہور اساتذۂ اردو کے خطوں میں سے ایسی عبارتوں کو منتخب کیا جائے جن میں کسی ادبی مسئلے پر رائے ظاہر کی گئی ہو، کسی کتاب پر اظہارِ خیال کیا گیا ہو، زبان و بیان سے متعلق کسی استفسار کا جواب دیا گیا ہو، یا اصلاحِ شعر کے ضمن میں کسی نکتے کی وضاحت کی گئی ہو؛ اور اُن پر توضیحی حواشی لکھے جائیں۔ یہ مضمون

جو اس سلسلے کی پہل کرتی ہے، اُسی خیال کا نتیجہ ہے۔

اُردو شاعری کا وہ دور جو ناسخ سے شروع ہو کر امیر و جلال پر ختم ہوتا ہے؛ زبان و بیان کے لحاظ سے اہم حیثیت رکھتا ہے۔ بہت سے قاعدے اُسی زمانے میں وضع کیے گئے۔ شاعری کو نئی نئی پابندیوں میں مقید کرنے کا رجحان اُسی عہد کی پیداوار ہے۔ متروکات کی ساری غیر ضروری بحثیں اُسی دور میں اٹھیں۔ تذکیر و تانیث، تلفظ اور غلط و صحیح کے دبستانی معیار کے ہنگامے بھی اُسی عرصے میں صف آرا ہوئے۔ خاندانِ ناسخ کے شاعروں نے اور اُن کے زیرِ اثر دوسروں نے، اُن قاعدوں کی پابندی کو فرضِ عین قرار دیا جن کو تلامذۂ ناسخ نے اور خاص طور پر رشک نے، آیت و حدیث کا درجہ بخش دیا تھا۔ یہی نہیں، رفتہ رفتہ یہ رجحان بھی فروغ پانے لگا کہ اُن پابندیوں کے ساتھ نئے نئے التزامات کو بھی شامل کیا جائے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ متعدد اساتذہ کے مختارات و متروکات کی فہرستیں الگ الگ مرتب ہو گئیں، جن کی پابندی اُن کے حلقہ بگوشوں کے لیے لازم تھی۔ اِس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہونا چاہیے تھا کہ معمولی سے اختلاف پر، غیر معمولی بحثیں شروع ہو جائیں جن میں اثباتِ حق سے زیادہ، اپنی بات کے برحق ہونے پر زور دیا جائے۔ اور یہ ہوا۔

دہلی و لکھنؤ کا اختلاف، پرانی داستان ہے۔ سید انشا کی دریائے لطافت میں اس کی ابتدائی تفصیلات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ امیر و جلال کے ابتدائی زمانے تک یہ اختلاف، بہت سے مرحلے طے کر چکا تھا اور اُن کے آخری زمانے تک، یہ معراجِ کمال پر پہنچ چکا تھا۔ داغ کے ابتدائی دورِ شاعری تک، اساتذۂ دہلی کے یہاں قواعدِ زبان و بیان کے سلسلے میں، اساتذۂ لکھنؤ کی طرح سخت گیری نہیں تھی اور نہ التزام کا وہ عالم تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ شاعری کے سارے غیر ضروری ضابطے لکھنؤ ہی میں وضع کیے گئے اور اُن کی لازمی پابندی پر بھی وہیں زور دیا گیا۔ اساتذۂ دہلی کے یہاں یہ رجحان تقریباً مفقود تھا۔ اخفا و اعلانِ نون، سقوطِ حروفِ علت، تراکیبِ مہند جیسے قاعدوں کو اساتذۂ دہلی نے قابلِ التفات ہی

نہیں سمجھا سمجھا۔ اور متروکات کی فہرستیں بھی یہاں نہیں بنائی گئی تھیں۔ داغ نے البتہ اِن ضوابط کی طرف باقاعدہ توجہ کی اور اپنے شاگردوں کے لیے اِن پابندیوں کو ضروری قرار دیا۔ وہ تنہا اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ لیکن یہ بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ داغ کے یہاں اِس رجحان کے فروغ پانے کی اصل وجہ، دربارِ رام پور سے اُن کی وابستگی تھی۔

رام پور میں نواب کلب علی خاں کے زمانے میں، اساتذۂ اُردو کا جو بے مثال اجتماع ہوگیا تھا؛ اُس میں اکثریت اساتذۂ لکھنؤ کی تھی۔ دہلی کی نمایندگی کرنے والوں میں نمایاں شخصیت داغ کی تھی۔ نواب کلب علی خاں کو متروکات، تذکیر و تانیث اور اس قسم کے دوسرے مسائل سے خاص دل چسپی تھی، جس کے اثر سے مصاحب منزل کے جلسوں میں ایسی بحثیں برابر ہوتی رہتی تھیں۔ اس صورتِ حال کا یہ نتیجہ ہونا ہی چاہیے تھا کہ داغ کی توجہ ان مسائل کی طرف منعطف ہو۔ یہ وہی صورتِ حال تھی جو مصحفی کو لکھنؤ میں پیش آئی تھی اور جس کا ذکر انھوں نے اپنے دیوانِ ششم کے دیباچے میں کیا ہے۔ مصحفی جیسے شاعر اور اُستاد کو، لکھنؤ کے مشاعروں میں کام یاب ہونے کے لیے، ناسخ کے انداز کو اپنانا پڑا تھا۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے مقدمۂ انتخابِ ناسخ، شائع کردہ مکتبۂ جامعہ دہلی)۔

لکھنؤ میں جس تہذیب کی آب یاری ہوئی، اُس میں ظاہر آرائی پر بہت زور تھا۔ دہلی سے متمایز رہنے کے احساس نے، جذبۂ رقابت کو فروغ بخشا۔ کوشش کی جانے لگی کہ زندگی کے مختلف مظاہر میں نئے پن کی نمود اس طرح ہو کہ امتیاز برقرار رہے۔ ایسے حالات میں بے روح ظاہر آرائی کو فروغ ہوتا ہے اور سطحی باتوں کو بنیادی حیثیت مل جاتی ہے۔ شاعری میں بھی اِسی کی نمود ہوئی۔ لکھنؤ کی زبان اور انداز کو امتیاز کا شرف بخشنے کے لیے، اور عناصر کے علاوہ، مختلف قسم کی پابندیوں کو نافذ کرنے کا رجحان بھی اِسی کی دین ہے۔ دلّی میں یہ صورتِ حال تھی ہی نہیں۔ وہاں کسی نئی معاشرت کا نقش درست نہیں ہو رہا تھا، وہاں کی تہذیبی روایتوں کو کسی طرح کے مقابلے کا احساس تھا،

جس کے لیے غیر ضروری التزامات کی ضرورت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں قواعدِ شاعری کی تفصیلات اِس طرح مرتب نہیں ہوئیں۔ داغ کے شروع کے کلام میں قواعدِ شاعری اور متروکات کے لحاظ سے ایسی کئی چیزیں ملتی ہیں جن کو انھوں نے بعد میں ترک کر دیا۔
یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ قواعدِ شاعری، متروکات وغیرہ کی بہت سی بحثیں اُسی زمانے میں اٹھی تھیں، جن کی تہ میں دہلی و لکھنؤ کی دبستانی کش مکش کا رفرما تھی، اور اس طرح دبستانی اختلافات زیادہ وسعت اور شدت کے ساتھ معرضِ بحث میں آئے، جس کے اثرات بہت دنوں تک فضا میں صدائے بازگشت پیدا کرتے رہے۔
یہ دور ایک اور لحاظ سے بھی اہم ہے۔ اُردو کے کئی مشہور لُغت اسی زمانے میں مرتب ہوئے، جیسے: نفس اللغتہ، فرہنگِ آصفیہ، امیر اللغات، گلشنِ فیض (وغیرہ)۔ فرہنگِ آصفیہ کو کچھ لوگوں نے دہلی و لکھنؤ کے دبستانی اختلافات کی روشنی میں دیکھا اور جلالؔ کے لُغت کو اُن کے بعض مخالفوں نے اعتراضات کی کسوٹی پر کسا۔ اِس طرح بھی بہت سی بحثیں اٹھیں، جو دنوں تک اخبار و رسائل کے صفحات پر دل چسپی کے گل کھلاتی رہیں ـــــ اسی دور میں زبان و بیان کے عام مباحث، متروکات اور تذکیر و تانیث پر بھی کئی رسالے لکھے گئے، جیسے کلبِ حسین خاں نادر کی کتاب تلخیصِ معلّٰی، صفیر بلگرامی کی رشحاتِ صفیر، جلالؔ کے رسالے مفید الشعرا اور قواعد المنتخب، شوق نیموی کے رسالے اصلاح اور ازاحۃ الاغلاط، کمال خلفِ جلالؔ کا رسالہ دستور الفصحا وغیرہ۔ یہ سب اُس زمانے کی بہت سی بحثوں کی دستاویزیں ہیں۔ اِن رسالوں کے اثر سے بھی ضروری اور غیر ضروری بحثوں میں اضافہ ہوتا رہا۔
غرض یہ زمانہ معرکے کی بحثوں کا ہے۔ ان بحثوں کے کچھ اجزا مختلف کتابوں میں محفوظ ہیں اور کچھ اساتذہ کے مکاتیب میں۔ اُس زمانے میں شاگردی و استادی کا رشتہ بہت اُستوار ہوتا تھا۔ اساتذہ کی یہ کوشش رہتی تھی کہ زبان و بیان کے مسائل، خاص طور

پر اخلاقی امور کو تلامذہ کے ذہن نشین کرایا جائے اور اُن کی پابندی کرائی جائے۔ یہ فریضہ جوابِ استفسارات کے علاوہ، اصلاحِ کلام کے ذیل میں مفید حواشی کے واسطے سے بھی ادا کیا جاتا تھا۔ دوسرے لوگ بھی زبان و بیان سے متعلق سوالات پوچھتے رہتے تھے، اور یہ لوگ فراخ دلی کے ساتھ جواب دیتے تھے۔ اساتذہ کے ایسے خطوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن میں قابلِ قدر معلومات محفوظ ہیں اور ان خطوں کا مطالعہ، بہت سی باتوں کو مختلف انداز سے سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

متعدد اساتذہ کے خطوں کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ جن لوگوں کے مجموعے نہیں چھپے ہیں، اُن کے بہت سے خط دوسرے مجموعوں میں محفوظ ہیں۔ صفدر مرزا پوری نے مرقعِ ادب کے نام سے دو جلدوں میں خطوں کا ایک نہایت دل چسپ اور قابلِ قدر مجموعہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ اُن کی ایک دوسری تالیف مشاطۂ سخن میں متعدد اساتذہ کی اصلاحیں اور ضروری تشریحات یک جا ملتی ہیں۔ مجلۂ نقوش (لاہور) کے مکاتیب نمبر کی دو ضخیم جلدیں بے شمار خطوں کی امین ہیں اور خطوط نمبر کی تین جلدیں اب سے چند سال پہلے آئی ہیں، جو نہایت اہم خطوط کا مجموعہ ہیں۔ فنِ اصلاح پر لکھی گئی کتابوں میں، خصوصاً مشاطۂ سخن کی دو جلدوں میں، اصلاحات کے ذیل میں، خطوں کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔ مختلف رسائل میں بہت سے خط چھپے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ زبان و بیان پر کام کرنے والوں کے لیے اِن سب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

. . . .

اِس سلسلے کی پہلی قسط مکاتیبِ امیر مینائی پر مشتمل ہے۔ امیر احمد امیر مینائی، تلمیذ اسیر، اپنے زمانے کے معروف و مستند اُستاد تھے۔ ولادت ۲۱؍ شعبان ۱۲۴۳ھ۔ وفات: ۱۸؍ جمادی الثانی ۱۳۱۸ھ (سوانحِ امیر مرتبہ جلیل مانک پوری)۔ اُس زمانے میں امیر و داغ سے زیادہ شاگرد شاید ہی کسی کو نصیب ہوئے ہوں۔ امیر مینائی کے خطوں کے مطالعے سے

نیز اُن کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وسیع الاخلاق انسان اور شفیق اُستاد تھے، اور نکاتِ زبان و بیان بتانے میں فراخ دل۔ اُن کے شاگرد احسن اللہ خاں ثاقب نے مکاتیبِ امیر کی ترتیب کے سلسلے میں، اُن کے بعض تلامذہ و اخلاف کے عدم تعاون کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "اس بے پروائی کے ساتھ جب جناب مرحوم کا خلق اور محبت یاد آتی ہے تو زمانہ آنکھوں میں تیرہ و تار ہو جاتا ہے۔ ایسا کوئی عریضہ میں نے استاد کی خدمت میں نہیں بھیجا کہ جس کا جواب نہ دیا گیا ہو اور کوئی ایسا مسئلہ فنِ شعر کے متعلق دریافت نہیں کیا کہ جس کی جانب توجہ نہ فرمائی ہو" (دیباچہ مکاتیبِ امیر)۔ یہی وجہ ہے کہ امیر کے خطوں میں مختلف مسائل بکھرے ہوئے ہیں۔ امیر اللغات کے مؤلف کی حیثیت سے بھی اُن کو بہت سے استفسارات کا جواب دینا پڑتا ہوگا۔

امیر کے سب خط شائع نہیں ہو سکے۔ بہت سے خط جو اُن کے کسی شاگرد نے جمع کیے تھے، گم ہو گئے۔ انھوں نے اپنے شاگرد زاہد سہارن پوری کو ایک خط میں لکھا تھا:

"خطوط جب میں فکر سے اچھے لکھتا تھا، وہ ذخیرہ ایک سو کئی جزو کا میرے ایک شاگرد نے جمع کیا تھا۔ سولہ برس ہوئے کہ وہ بے چارہ مر گیا اور اُس ذخیرے کا پتا نہ لگا۔ تین چار شاگردوں نے کبھی کبھی کچھ خطوں کی نقلیں اپنی پسند کے موافق لکھ لیں، وہ جا بجا ہیں۔ بعض تحریروں کی نقلیں لڑکوں نے کر لی ہیں۔ اور جب سے دفترِ امیر اللغات کھولا گیا ہے، محرّرانِ دفتر بعض مکاتیب لکھ لیتے ہیں۔ یہ سب بھی جمع ہوں، تو ایک مجموعہ ہو سکتا ہے۔"

(مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۱۶۴۔ مکتوبہ ۲۷ اپریل ۱۸۹۱ء)۔

احسن اللہ خاں ثاقب نے بہت کوشش کی، لیکن مجموعہ مکاتیبِ امیر کے دوسرے اڈیشن میں وہ ۲۲۳ سے زیادہ خط جمع نہیں کر سکے۔ ان کے لکھنے کے مطابق، امیر کے بعض تلامذہ اور اخلاف نے بالکل تعاون نہیں کیا۔ امیر کے شاگردوں کے پاس یقیناً خطوں کا

اچھا خاصا ذخیرہ تھا، مگر مختلف وجوہ سے، وہ سب خط سامنے نہیں آسکے۔ زاہد سہارنپوری نے ایک خط میں ثاقب کو لکھا تھا:

"عرصہ ہوا، میرا وہ بکس جس میں ضروری کاغذات رہا کرتے تھے، چوری گیا تھا۔ اس میں ۱۸۸۷ء کے قبل کے اکثر خطوط تھے۔۔۔ بعض خطوط اس لیے نقل نہیں کرسکا کہ جنابِ مرحوم نے ان کو نظرِ اغیار سے محفوظ رکھنے اور کسی کو نہ دکھلانے کی تاکیدِ اکید کردی تھی۔ ما بقی ارسالِ خدمتِ شریف ہیں۔" (مکاتیبِ امیر مینائی ص ۱۵۳)

اسی خط میں آگے چل کر زاہد نے لکھا ہے: "جنابِ مرحوم کے خطوط اگر زیادہ مطلوب ہوں تو اخوی منشی محمد احمد صاحب قمر سے رام پور میں، اور محبی حافظ جلیل حسن صاحب سے حیدر آباد دکن میں، اور مشفقی ممتاز علی صاحب آہ۔۔۔ سے ضرور خط و کتابت کیجیے؛ جن میں سے آخر الذکر کے پاس یقیناً پورا ذخیرہ جمع ہوگا، کیوں کہ انھوں نے بھی کچھ دن ہوئے ایسا ہی قصد کیا تھا، جو اب تک بعض وجوہ سے انجام کو نہیں پہنچا۔" لیکن ان لوگوں میں سے کسی نے خط ثاقب کے حوالے نہیں کیے۔ آہ نے جو امیر کی سوانح عمری لکھی ہے، اس میں صرف آٹھ خط درج کیے ہیں۔ اس مقالے میں مکاتیبِ امیر کے اقتباسات کے لیے درجِ ذیل ماخذ پیشِ نظر رہے ہیں:

(۱) مکاتیبِ امیر مینائی: امیر کے شاگرد مولوی احسن اللہ خاں ثاقب نے ۱۹۰۳ء میں اُن کے خطوں کو جمع کرنے کی طرف توجہ کی۔ ۱۹۱۰ء میں یہ مجموعہ مکمل ہوا (دیباچہ)۔ مجھے یہ پہلا اڈیشن نہیں مل سکا۔ دوسرے اڈیشن کے آخر میں جو قطعاتِ تاریخِ طبع ہیں، اُن میں ایک قطعہ وحشت کلکتوی کا بھی ہے، جس کا آخری شعر یہ ہے: فکرِ تاریخ داشتم وحشت: گفت ہاتف "بلیغ مکتوبات"۔ اس سے سالِ طبع ۱۹۱۱ء نکلتا ہے۔ اس کا تاریخی نام "خطوطِ منشی امیر احمد" ہے۔ اس کا دوسرا اڈیشن نظرِ ثانی اور اضافے کے ساتھ، ۱۹۲۴ء میں مطبعِ ادبیہ

ماڈش روڈ لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہی اڈیشن پیش نظر ہے۔ اس مجموعے میں کُل ۲۳۳ خط ہیں۔ شروع میں ایک مفصل مقدمہ ہے، جس میں امیر کی سوانح، تصانیف اور تلامذہ کے مختصر تذکرے کے ساتھ ساتھ، امیر و داغ کی شاعری کا تقابل بھی کیا گیا ہے۔ اشاعتِ اوّل پر جو تبصرے ہوئے تھے، وہ بھی آخر میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ خطوں کے بیشتر اقتباسات اِسی مجموعے سے لیے گئے ہیں۔

(۲) مرقعِ ادب: صفدر مرزا پوری نے اساتذہ کے خطوں کا ایک مجموعہ، دو جلدوں میں مرتب کیا تھا۔ اس کی پہلی جلد میں امیر کے ۲۳ خط ہیں۔ ثاقب نے مکاتیبِ امیر مینائی کے دوسرے اڈیشن میں ان خطوں کو شامل کر لیا ہے۔ اس کی دوسری جلد میں امیر کے دس خط ہیں۔ یہ دسوں خط دل شاہ جہاں پوری کے نام ہیں۔ ان میں سے تین خطوں کے اقتباسات اس مقالے میں شامل کیے گئے ہیں، ان کے نمبر ہیں: ۵۵، ۵۹، ۶۰۔

(۳) نقوش: اس کے مکاتیب نمبر میں امیر کے چودہ خط ہیں۔ ان میں سے چھے خط تو وافقتاً پہلی بار شائع ہوئے ہیں (دو خط بہ نام وسیم خیرآبادی، ایک خط بہ نام داغ، دو خط بہ نام راز رام پوری، ایک خط بہ نام احسن مارہروی) باقی آٹھ خط جو بہ نام دل شاہ جہاں پوری ہیں، وہی ہیں جو مرقعِ ادب کی دوسری جلد میں شامل ہیں۔ ان میں سے سات خط تو مکمل ہیں، اور ایک خط (۱۱) نامکمل ہے۔ یہ مرقعِ ادب میں مکمل صورت میں موجود ہے۔ اوّل الذکر چھے خطوں کا کوئی اقتباس اس مقالے میں شامل نہیں۔

(۴) سوانحِ امیر: امیر کے شاگرد اور عزیز، شاہ محمد ممتاز علی آہ نے امیر کی سوانح عمری لکھی تھی، جو ان کے انتقال کے بعد، ادبی پریس لکھنؤ سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کا تاریخی نام "سیرتِ امیر احمد مینائی" ہے۔ آہ کا انتقال ۱۵ رمضان ۱۳۵۴ھ کو ہوا تھا (دیباچہ سوانحِ امیر) اس کتاب میں امیر کے آٹھ خط ہیں۔ یہ آٹھوں خط آہ کے نام ہیں۔ ان میں بھی زبان و بیان سے متعلق کوئی خاص بات نہیں۔ ان خطوں سے بھی کوئی

اقتباس نہیں لیا گیا۔

صہبائے مینائی : یہ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی کی تصنیف ہے جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں اُردو اور فارسی کے استاد تھے۔ اس پر سنہ اشاعت موجود نہیں۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کا مقدمہ شاملِ کتاب ہے، جس کے آخر میں "یکم دسمبر ۱۹۵۸ء" لکھا ہوا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں امیر کے آٹھ خط ہیں۔ ان میں سے تین خط بہ نام دلؔ شاہ جہاں پوری ہیں اور یہ تینوں خط مرقعِ ادب میں موجود ہیں۔ ان میں سے خط ۳ نامکمل ہے۔ یہ وہی خط ہے جو نقوش میں بھی نامکمل شائع ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی صاحب نے ایک بار وہ ناتمام خط مدیر نقوش کے حوالے کردیا اور دوسری بار مولفِ کتاب کو دے دیا اور انھوں نے بغیر تحقیق درج کتاب کردیا۔ اس کتاب میں تین خط کسی نامعلوم مکتوب الیہ کے نام ہیں۔ ان میں سے ایک خط دراصل روشن بدایونی (تلمیذ امیر) کے نام ہے۔ اتفاق سے اصل خط جناب عبرت صدیقی بریلوی (تلمیذ دلؔ شاہ جہاں پوری) کے پاس محفوظ ہے۔ صہبائے مینائی میں یہ خط نامکمل ہے۔ عبرت صاحب نے میری درخواست پر، اصل خط سے استفادے کی اجازت دی۔ میں نے اصل خط سے باقی ماندہ عبارت نقل کی ہے۔ اِس مقالے میں صہبائے مینائی سے تین خطوں کے اقتباسات شامل کیے گئے ہیں۔ مذکورہ بالا خط بھی ان میں شامل ہے۔ ان کے نمبر ہیں: ۵۸، ۵۹، ۶۰۔ ہاں، مصنف نے یہ کہیں نہیں بتایا ہے کہ امیر کے یہ آٹھ خط اُن کو کہاں سے ملے ہیں۔ میں نے دو وجہوں سے ان خطوط سے استفادہ کرنا غیر مناسب نہیں سمجھا: ایک تو یہ کہ اُن آٹھ خطوں میں سے تین خط دوسری جگہ بھی امیر کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور یہ خط ہر طرح کے شبہے سے بری ہیں اور ایک خط (بہ نام روشن بدایونی) کی اصل خود میں نے دیکھی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان باقی ماندہ خطوں میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ملتی کہ اُن پر ضرور شک کیا جائے۔ میری رائے میں یہ امیر ہی کے خط ہیں اور اس انتساب پر شک کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔

نہ خارجی طور پر، نہ داخلی سطح پر۔

مشاطۂ سخن: صفدر مرزاپوری نے اساتذہ کی اصلاحوں کو دو جلدوں میں جمع کیا ہے۔ اس میں امیر کی اصلاحات کے ذیل میں متعدد خطوں کی مختصر عبارتیں بھی درج ہیں ان میں سے تین عبارتیں ایسے خطوں کی ہیں جو مجموعۂ مکاتیب مرتبۂ ثاقب میں موجود نہیں، کہیں اور ملتے ہیں۔ ان عبارتوں کو بھی بہ ذیلِ مکاتیب شامل کر لیا گیا ہے۔ حاشیے میں نشان دہی کر دی گئی ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مشاطۂ سخن میں ان مذکورہ عبارتوں کے علاوہ، امیر کے کچھ ان خطوں کی بھی عبارتیں مع اصلاحات منقول ہیں جو ثاقب کے مرتبہ مجموعے میں شامل ہیں، متعدد مقامات پر مشاطۂ سخن اور مجموعۂ مکاتیب کی عبارتوں میں اختلاف ملتا ہے۔ میں نے ایسی عبارتوں کو عموماً مشاطۂ سخن کے مطابق لکھا ہے اور بالعموم اس کی صراحت بھی کر دی ہے۔ اگر کہیں اس کے خلاف کیا ہے تو اس کی بھی نشان دہی کر دی ہے ـــــــ کئی جگہ یہ صورت ہے کہ مشاطۂ سخن میں امیر کے مکتوب کی جو عبارت منقول ہے، اس عبارت کا کچھ حصہ مشاطۂ سخن میں تو ہے، مگر مجموعۂ مکاتیب میں موجود نہیں، ایسی عبارتوں کو قوسین میں لکھا گیا ہے اور حاشیے میں اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

سوانحِ امیر مینائی: جلیل مانک پوری (جانشینِ امیر) نے امیر کی مختصر سی سوانح عمری اور طویل انتخابِ کلام پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی تھی، جو مطبعِ سیدی دارالشفا حیدرآباد سے ۱۳۲۷ھ میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں امیر کا کوئی خط یا کسی خط کی عبارت تو موجود نہیں، البتہ لفظ "سدا" سے متعلق امیر کا ایک قول درج ہے۔ چوں کہ اس لفظ کے متعلق امیر نے کہیں اور رائے ظاہر نہیں کی ہے اور بجائے خود یہ رائے بہت اہم ہے، خصوصاً بحثِ متروکات کے سلسلے میں، اس لیے اس قول کو بھی اس مقالے میں شامل کر لیا گیا ہے، اس کا نمبر ہے ۹۱۔

ہماری زبان: رسالۂ اصلاحِ سخن (لاہور) میں امیر کے تین خط شائع ہوئے تھے۔ ہماری زبان (علی گڑھ) کے شمارۂ یکم نومبر ۱۹۶۲ء میں سلطان اشرف صاحب نے اُن خطوں کو اصلاحِ سخن سے نقل کرکے شائع کرایا ہے، مگر انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ یہ خط اس رسالے کے کس شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ یہ تینوں خط حفیظ جون پوری (تلمیذِ امیر) کے نام ہیں۔ ان خطوں سے بھی کوئی اقتباس نہیں لیا گیا ہے۔ ہاں، رسالۂ اصلاحِ سخن کے اڈیٹر، داغ کے معروف شاگرد وجاہت جھنجھانوی تھے، جن کی کتاب اختلاف اللسان دہلی و لکھنؤ کی دبستانی کش مکش کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

نقوش: نقوش کے خطوط نمبر کی پہلی جلد میں امیر کے سات خط چھپے ہیں مگر ان میں سے اکثر خط مطبوعہ ہیں۔ صرف ایک خط سے ایک اقتباس اس مضمون میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کا نمبر ہے ۶۲۔

تاریخِ نثرِ اردو: تالیف مولانا احسن مارہروی، متوفی: ۳۰ اگست ۱۹۴۰ء (جلوۂ احسن، ص ۶۷)، اس میں امیر کا ایک خط ہے۔ اس خط کو اس مضمون میں شامل کیا گیا ہے۔ (۶۳) مولف کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب دو جلدوں پر منقسم کی گئی تھی، پہلی جلد ۱۹۳۰ء میں، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں چھپی تھی۔ دوسری جلد کے متعلق یہ لکھا گیا تھا کہ "زیرِ طبع ہے"، مگر یہ دوسری جلد شائع نہیں ہو سکی۔ مولانا کے صاحب زادے رفیق احسن مارہروی نے اپنی کتاب جلوۂ احسن میں لکھا ہے، "افسوس اس کتاب کی دوسری جلد مولانا مرحوم ترتیب نہ دے سکے، حالاں کہ مواد سب موجود تھا۔ وہ مواد میری دسترس سے دور ہے، ورنہ تاریخِ نثرِ اردو کی دوسری جلد ضرور طبع اور شائع ہوتی۔" (جلوۂ احسن، ص ۷۷)، معلوم نہیں صحیح صورتِ حال کیا تھی۔

جناب ابو محمد سحر نے اپنی کتاب مطالعۂ امیر میں لکھا ہے کہ "سوانحِ اسلاف مولفۂ ولایت علی خاں عزیز صفی پوری" اور رسالۂ نیرنگ (دہلی) کے امیر نمبر میں بھی امیر کے بعض

مخطاہیں اور دو خط رضا لائبریری رام پور میں ہیں۔ میں ان خطوں کو نہیں دیکھ سکا۔ ممکن ہے ان میں کوئی خط ایسا ہو جس میں کوئی ادبی مسئلہ زیرِ بحث آیا ہو۔

امیر کے خط کئی جگہ چھپے ہیں، عبارتوں کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ بعض جملوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف لوگوں نے خطوں کی نقلیں تیار کیں۔ اغلاطِ کتابت مزید برآں۔ مثلاً لفظ "پارسل" ایک خط مشمولہ مجموعۂ مکاتیب میں مونث ملتا ہے: "پارسل دیوان کی روانہ کرتا ہوں" (مکاتیبِ امیر مینائی، مرتبہ ثاقب، ص ۲۴۱)۔ مرقعِ ادب کے دوسرے حصے میں ص ۳۱ پر امیر کا ایک خط بنام دل شاہ جہاں پوری ہے، اس میں یہ لفظ مذکر ہے: "آپ کا پارسل آیا ہوا ہے"۔ لفظ "دمّل" مجموعۂ مکاتیب میں ایک جگہ مونث ہے: "ایک دُمّل نکل آئی تھی" (ص ۲۵۲) اسی مجموعے کے ایک دوسرے خط میں یہ مذکر ہے: "میری ران میں ایک دمّل نکل آیا ہے" (ص ۳۴۴)، یہ خط مرقعِ ادب حصۂ اول سے ماخوذ ہے، اور وہاں بھی مذکر لکھا ہوا ہے۔ ایسی اور مثالیں بھی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ پہلو بھی نظر میں رہنا چاہیے۔ ہاں، یہ عرض کر دوں کہ امیر نے "پارسل" کو مذکر ہی لکھا ہے۔ نقوش کے خطوط نمبر کی پہلی جلد میں امیر کے خط کا عکس چھپا ہے، اس میں "آپ کا پارسل آیا ہوا رکھا ہے" ملتا ہے۔

امیر کی یہ تحریریں اس لحاظ سے بھی دیدنی ہیں کہ قواعدِ زبان و بیان پر کام کرنے والوں کو ان میں بہت مسالا ملے گا۔ بہت سے جملوں کی بناوٹ، ترکیبیں وغیرہ قابلِ توجہ ہیں۔ بعض امور کی طرف اشارے کیے جاتے ہیں۔ قوسین میں مکاتیبِ امیر مینائی مرتبہ ثاقب کے صفحات نمبر ہیں۔

(۱) عبارتوں میں تراکیبِ مہند کا استعمال بے تکلفی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جیسے:
لوچ دار (۱۸۷)، متصلِ سڑک (۳۰۹)، جھگ آشنا (۳۵۷)، بہ واپسیِ ڈاک (۳۴۹) کمیٹیِ انتخاب (۲۳۶)، مزے دار (۱۸۷)، ممبرانِ کمیٹی (۲۲۸)، ارکانِ اشاعت (۲۳۸) وغیرہ۔

(۳) بعض الفاظ کا استعمال۔ مثلاً امیر نے ہر جگہ "سرسری" کے بجائے "سراسری" لکھا ہے یا جیسے "لغت میں 'مصروفی' اور محنت کی بہت حاجت ہے۔"

(۴) بعض صفتیں جیسے، خوب صورت نیا تخلّص (۲۹۵) بعض محاورے جیسے: خیر بھائی، تمھاری ہی آنکھ اونچی رہے (۲۰۶) "آنکھ اونچی رہنا" نہ تو فرہنگِ آصفیہ میں ہے نہ نوراللغات میں۔ امیراللغات بھی اس سے خالی ہے۔

کئی خطوں میں امیراللغات کا ذکر ہے اور اس کے واسطے سے کچھ ایسی بھی باتیں آگئی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لغت نویسی کے سلسلے میں امیر کا اندازِ فکر کیا تھا۔ اور یہ کہ صحت پسندی اور فصاحت کے معیار کے سلسلے میں اُن کے سوچنے کا کیا ڈھنگ تھا۔ مثلاً انھوں نے ایک خط میں لکھا ہے کہ کلامِ نظیر اکبرآبادی نے ایک لفظ کا فائدہ نہیں دیا۔ اس سے یہ اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ لغت نویسی کا محدود تصور اور معیار پسندی کا مسلّم انداز اُن کے بھی راستے کا پتھر تھا۔ ایسی ہی بعض اور باتیں۔ آج کے کام کرنے والوں کے سامنے یہ سارے مسائل و معاملات رہنا چاہییں اور اس لحاظ سے ان خطوں کی بھی اہمیت ہے۔ متروکات، بعض قواعد اور متعدد الفاظ کے سلسلے میں جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں، آج زبان و بیان پر کام کرنے والوں کو اُن سے بھی واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

ان خطوں میں بہت سے مختلف فیہ مسائل کا تذکرہ ہے اور امیر کی کچھ رائیں، موجودہ معلومات کی روشنی میں، نظرِ ثانی کی طلب گار نظر آتی ہیں؛ حواشی میں ان امور کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ امیر کے خطوں میں جن کتابوں کے نام آئے ہیں، ان میں سے بیش تر کے متعلق ضروری معلومات کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ خطوں میں جو اشعار سند آئے ہیں، شعرا کے دواوین سے اُن کا مقابلہ کر لیا گیا ہے اور دواوین کے صفحات نمبر بھی لکھ دیے گئے ہیں۔ خطوں میں سے اُنھی عبارتوں کو لیا گیا ہے جن میں زبان و بیان سے متعلق یا کسی کتاب کے متعلق یا کسی اہم فرد کے متعلق کچھ ملتا ہے۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے خط کا

اقتباس درج کیا گیا ہے، پھر اُس سے متعلق حاشیے کی عبارت لکھی گئی ہے۔ جن خطوں میں تاریخیں موجود ہیں، ان کے اقتباسات کے آخر میں اُن تاریخوں کو بھی لازماً لکھا گیا ہے۔ یہی صورت مکتوب الیہ کے نام کی ہے۔ اس مقالے میں بیشتر اقتباسات مکاتیبِ امیر مینائی، مرتبۂ ثاقب سے لیے گئے ہیں اور ان اقتباسات کے ذیل میں ماخذ کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ جو اقتباسات دوسری جگہوں سے لیے گئے ہیں، ماخذ کے ذیل میں اُن کا ذکر آچکا ہے۔ ہر اقتباس کے اوپر نمبر شمار ڈالا گیا ہے۔ خطوں کی جو عبارتیں منتخب کی گئی ہیں، ان کو صفحے پر اسی طرح لکھا گیا ہے جس طرح اقتباسات کو لکھا جاتا ہے، اور اس کے بعد تحشیے کی عبارت، نسبتاً خفی قلم سے لکھی گئی ہے۔

اقتباسات میں جو مباحث آگئے ہیں، یا جن کتابوں کے نام آئے ہیں اور ان پر حواشی لکھے گئے ہیں، اُن کی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ اس سے مطلوبہ بحث کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر لفظ کے سامنے خط کا نمبر شمار بھی لکھ دیا گیا ہے:

متروکات

ابر کی بوند	ع ۳۲، ع ۳۳	ساکھا	ع ۴۵
انکھڑیاں	ع ۱۳	سدا	ع ۶۱
باٹ دیکھنا	ع ۳۳	مہیں (میں ہی)	ع ۱۳
سہانا	ع ۱۳، ع ۳۸	واں	ع ۳۶
پرے	ع ۳۰	ویا	ع ۳۰
پہ (پر)	ع ۳۰	ہووے بہ ہوئے	ع ۱۹
ڈھونڈھے ہے	ع ۲۰	یاں	ع ۳۶
رکھیں	ع ۳۴		

تذکیر و تانیث

ایجاد — ص۱۴
برس — ص۵۳
تو — ص۲۹
دشنام — ص۱۴
دولت سرا — ص۶۰
م — ص۵۰
مردمِ دیدہ — ص۵۰
مشتری — ص۴۴

الفاظ، محاورات، تلمیحات

آری — ص۱
آستین نکلنا — ص۵۶
آنچل اور دامن — ص۵۲
اچھا اچھا — ص۱۳
ایک تنکے کا شرمندہ نہ ہونا — ص۱۳
اویر سویر — ص۱۳
باٹے — ص۲۶
باگی — ص۷
باہم دگر — ص۴۰
سہاشا، سہاکا — ص۴۵
بلعم باعور — ص۴۵، ص۴۶
بعدیں — ص۱۹
پھدنا — ص۱۴
پیار — ص۴۰
پیراک، تیراک — ص۴۹
تیروں کا تھان ہو کر بیٹھنا — ص۵۵
جامے سے باہر ہونا — ص۵۸
جرس کھڑکنا — ص۲۳
چپقلش — ص۱۸
چلمن — ص۵۶
چھچھڑے — ص۱۱
خنجر کا دونا ہونا — ص۱۶
خورد و نوش — ص۲۰
دامن جھٹکنا — ص۵۶
دنبل، دمل — ص۳۱، ص۳۲، ص۳۳
زکریا — ص۳۷، ص۳۸
سن (سنہ) — ص۵۰
شگفانند — ص۸، ص۹
شہنوا — ص۹، ص۱۰
قدس — ص۲۵

قرار ۳۹
قرن ۳
کسبر ۵۴
کشش اور جذبہ ۶۰
کعبے کا گھر ۱۵
گریباں نکلنا ۵۶
گھائل ۶۳
گھڑنا، گڑھنا ۱۱
مدفن ۱۵
مسالا ۱
مایقرأ ۳
موتی کی لڑی ۱۱
نشہ ۳۹
تاریخ گوئی ۵۱
تسبیغ ۳
تعقید ۱۷
تعدادِ اشعار ۲۸
تضمین ۳۰
تلامذہ کی تعداد ۶۲
سقوطِ حرفِ علت ۱۷، ۲۳، ۳۹
سنگلاخ زمینیں ۲۸
سہ حرفی الفاظ میں حرفِ ساکن کو متحرک کرنا ۲۵
شترگربہ ۳
گلدستوں سے متعلق رائے ۱۸
مجموعۂ مکاتیب ۱۹

قواعد، عروض، دیگر امور

اخفائے نون ۵۹
اعلانِ نون ۳۹
اضافتِ مہند ۵۷
ایطا ۵۲
آسیر لکھنوی ۶۲
بعض ناگوار تشبیہیں ۲۵
مصحفی کے استاد کا نام ۶۲
ہدایات متعلق شاعری ۶
استفتا اور بحث کے متعلق رائے ۴۴

کتابیں، رسالے، اخبار

افادۂ تاریخ گوئی	۱۵	شحنۂ ہند	۹
امیر اللغات	۱۲، ۱۳، ۱۹، ۲۱،	شرحِ قصیدۂ خمریہ	۶
	۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۸، ۳۱، ۳۳، ۳۴	صنم خانۂ عشق	۲
انتخابِ یادگار	۳، ۵	فرہنگِ فرنگ	۲۱
برہانِ قاطع	۳۳	گلشنِ فیض	۱، ۱۲، ۵۸
بہارِ ہند	۲۱، ۵۸	گوہرِ انتخاب	۲۷
خزینۃ الامثال	۳۲	مخزن المحاورات	۱۲، ۳۳
دامنِ گل چیں	۱۸	مرآۃ الغیب	۲
رسالۂ تذکیر و تانیثِ رشک	۵۰	معیار الاشعار	۳، ۶
رسالۂ عروض و قافیہ	۶	نجم الامثال	۲۲
(یوسفیہ فی علم العروض والقافیہ)	۱	نفس اللغۃ	۱
سرمۂ بصیرت (معیار الاغلاط)	۲۷		

(۱) آری (عاری)۔ مسالا:

"آری، میرے نزدیک ہندی ہے، اس لیے کہ "عاری" زیچ و تنگ و عاجز کے معنوں میں فارسی عربی میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ہندی میں تو عین سے لکھنا خلافِ اصول ہے۔ ہندی میں[۱] عین کہاں!

۱؎ عاری [illegible] عربی کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: برہنہ (منتخب اللغات)۔ عربی میں یہ زیچ و تنگ و عاجز کے معنی میں مستعمل نہیں، یہ معانی، اردو کا اضافہ ہیں۔ اردو میں عربی کے ایسے بہت سے لفظ

مثلاً، معلوم ہوتا ہے کہ "مصالح" کا مفرد ہے، جو عربی میں مصلحت کی جمع ہے، اور

ہیں جن کے معنی کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں، لیکن اس تبدیلی سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسے ہر لفظ کا املا بھی بدل جائے۔ ایسے اکثر الفاظ میں املائی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ لفظ "عاری" بھی اسی فہرست میں شامل ہے، اس میں املائی تبدیلی کو لازم قرار دینا کچھ ضروری نہیں۔ یہ لفظ بالعموم ع ہی سے لکھا جاتا ہے، اور یہ استعمالِ عام قطعی طور پر اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس لفظ میں معنوی تبدیلی کی بنا پر، املائی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ امیر نے امیر اللغات میں اور ان کی تقلید میں صاحبِ نور اللغات نے اس لفظ کو حرفِ الف کے ذیل میں درج کیا ہے (آری)، لیکن کسی اور تحریر میں اس لفظ کا یہ املا نظر سے نہیں گزرا۔ مستند ینِ لکھنؤ کے لغات میں (ان دو لغات کے علاوہ) میر علی اوسط رشک شاگردِ ناسخ کا لغت نفس اللغۃ، ان کے شاگرد جلال کا لغت سرمایۂ زبانِ اردو، اور مرزا مچھو بیگ عاشق کا لغت بہارِ ہند قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے سرمایۂ زبانِ اردو میں تو لفظ "عاری" یا "آری" موجود ہی نہیں باقی دونوں لغتوں میں "آری" ہے، مگر اس کو "آرے" کا مصغر لکھا گیا ہے، لفظ "عاری" کے معانی کو اس سے متعلق نہیں کیا گیا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "عاری" اور اس کے جملہ مرکبات عین سے لکھے ہوتے ہیں۔ اس سے اہلِ دہلی کی رائے کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اِس لفظ کو الف سے (آری) لکھنا، امیر کی ایجاد تھی۔ یہ املا اُن کے لُغت تک، اور اِس خط کے زیرِ اثر نور اللغات تک محدود رہا۔ اُردو میں "آری" ایک جداگانہ لفظ ہے، "آرے" کا مصغر، اِس امتیاز کے لحاظ سے بھی "عاری" کو عین سے لکھنا انسب ہے۔ امیر کا یہ لکھنا کہ "آری" میرے نزدیک ہندی ہے، محلِ نظر ہے۔ ہندی میں یہ لفظ "زچ و تنگ و عاجز" کے معنی میں نہیں ہے۔ ان معانی کے لحاظ سے "عاری" کو مہند کہا جائے گا۔ بہ ہر صورت امیر کی اس رائے کو، اور اس لفظ سے متعلق امیر اللغات و نور اللغات کے اندراجات کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ عاری ہونا، عاری آ جانا، تنگ آ جانے اور تھک جانے کے معنوں میں عام طور پر اسی طرح لکھے جاتے ہیں۔ آرزو لکھنوی مرحوم

فارسی والے ہر چیز کی تیاری کے لوازم اور ضروریات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اور یہی عمل استعمال ہندیوں کے یہاں بھی ہے، جیسے، عمارت کے لیے چونا سرخی وغیرہ۔ تالیف کے لیے وہ کتابیں وغیرہ جن سے اس تالیف میں مدد مل سکے۔ کپڑوں کی رونق اور چمک دمک کے لیے گوٹا، پٹھا، بنت، کناری۔ کھانے کے لیے لونگ، الائچی، دھنیا، مرچ۔ بال دھونے کا مسالا۔ محرم کا مسالا۔ مسالے کا تیل۔

دلی والے اصل کی طرف جاتے ہیں۔ مگر چوں کہ زبانوں پر "مصالح" نہیں ہے،

کا شعر یاد آیا:

وقتِ آخر چلتے چلتے، سانس بھی ماری ہوئی   ساتھ دے مرنے کا، استادِ مستقادم ساز میں

(جہانِ آرزو، ص ۱۰۳)

۲؎ فرہنگِ آصفیہ میں "مصالح" ہے۔ اس کے مرکبات کی بھی یہی صورت ہے، یعنی گرم مصالح، مصالح بنانا، مصالح ٹانکنا، مصالح دار، مصالح رگڑنا، مصالح کا تیل، مصالح کی بیل۔ نیز "میم مع سین" کی فصل میں "مسالا" لکھ کر، لکھا گیا ہے کہ صحیح لفظ "مصالح" ہے۔ اہلِ دہلی اس لفظ کو اسی طرح صحیح سمجھتے تھے۔ دہلی والوں کی تحریروں میں یہی املا ملتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے مقدمۂ آبِ حیات میں وضاحت بھی کی ہے۔ انھوں نے اس عنوان کے تحت "بہت سے الفاظ ہیں کہ عربی فارسی نے اردو کو دیے، اردو نے کہیں تو لفظوں میں کچھ تصرف کیا، معنی وہی رکھے، کہیں لفظوں کو سلامت رکھا، معنی کچھ سے کچھ کر لیے" "مصالح" کا بھی ذکر کیا ہے: "مصالح جمع مصلحت یا" مافیہ" کا مخفف ہے۔ اردو میں گرم مصالح وغیرہ، اور سامانِ عمارت کو بھی مصالح کہتے ہیں"۔ اس سے بہ خوبی معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ دلی اس لفظ کا شمار ان (عربی) الفاظ میں کرتے تھے، جن کی صورت نہیں بدلی ہے، معنی بدل گئے ہیں۔

یعنی یہ کوئی نہیں بولتا کہ گوشت کا مصالح پیس لیا، گرم مصالح ہو گیا، کُرتی میں مصالح کم پڑا، اب کے محرم کا مصالح ہم کو نہیں دیا، اس لیے میری راے ہے کہ اُردو میں جو بولیں، وہی لکھیں۔ جس طرح "مسالا" بولتے ہیں، اسی طرح لکھا بھی جائے۔ اور یہی مشرب متوسطین و متاخرین شعراے لکھنؤ کا ہے، جیسا رشک نے اپنے لغت[1] میں لکھا ہے: "مسالا، میم مفتوح و سین مہملہ و لام بہ الف کشیدہ، ضروریات ہر چیز باشد کہ بداں ضروریات، رونق و لذت آں چیز شود۔ ظاہراً ایں لغت از

آج کل اس لفظ کا املا بدل گیا ہے اور عام طور پر لوگ "مسالا" لکھتے ہیں۔ اب یہی املا مرجح ہے، مگر دہلی والوں کی پرانی تحریروں میں پرانا املا "مصالح" ہی باقی رکھا جائے گا۔

جلال نے سرمایۂ زبانِ اردو میں "مسالا" لکھا ہے، لیکن اس کا عربی مرادف "مصالح" بتایا ہے۔ یہ بجائے خود درست نہیں۔ عربی میں مصالح جمع ہے "مصلحت" کی۔ اُردو کے اِن معانی سے اس کو کچھ علاقہ نہیں۔ یہ صراحت کرنا چاہیے تھی کہ عربی کے لفظ "مصالح" میں لفظی اور معنوی تغیر ہوا ہے، اور "مسالا" اُردو میں ایک نیا لفظ بن گیا ہے۔ جلال نے دہلی و لکھنؤ کے املائی اختلاف کا بھی ذکر نہیں کیا۔ یہ بھی ضروری بات تھی۔

ریاض خیرآبادی نے ایک خط میں لکھا ہے: "مسالا، س، ہ، سے صحیح اُردو ہے" (مکتوب بنام صفدر مرزا پوری۔ مرقعِ ادب، جلدِ دوم، ص ۱۶۲)۔ صحیح لفظ "مسالا" مع الف ہے، جیسا کہ امیر نے لکھا ہے۔

[1] میر علی اوسط رشک لکھنوی، تلمیذ ناسخ، متوفی ۱۲۸۴ھ (مقدمۂ نفس اللغۃ)۔ کے لغت کا نام نفس اللغۃ ہے۔ یہ تاریخی نام ہے (۱۲۵۶ھ)۔ اس کا صرف حصۂ اول، جو حرف ت تک ہے، اُن کی وفات کے بعد نیر پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ باقی حصوں کا پتا نہیں چلتا۔ امیر نے جو اقتباس پیش کیا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغت دکم از کم حرف میم تک، مکمل ہو

"مصالح" "ناشد"۔" اور اسی کی تقلید جلال نے بھی اپنے لغت گلشنِ فیض میں
کی ہے۔ منیر مرحوم نے بھی یہی مشرب اختیار کیا ہے:

نمک چھڑکنے کو مانگے جراحتِ دل پر — جو دیکھے آپ کے موباف کا مسالا سانپ[ھ]

"کالا سانپ" اور "پالا سانپ" زمین ہے۔ جان صاحب کے ایک شعر سے یہ بھی
پتا چلتا ہے کہ محلات لکھنؤ میں بھی یہی بول چال تھی:

اے جان، ایسا چھاتی سے لپٹایا بھینچ کر — انگیا کا میری سارا مسالا مسل گیا[ھ]"

چکا تھا اور اس کا خطی نسخہ ان کی نظر سے گزرا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ ان کے پاس ہی ہو۔
جلال، رشک کے شاگرد تھے، انھوں نے اپنے لغت گلشنِ فیض میں، نفس اللغۃ کی بہت سی عبارتوں کو بہ لفظہٖ یا معمولی سی ترمیم کے ساتھ نقل کر لیا ہے، اور کہیں حوالہ نہیں دیا۔ اس سلسلے میں مزید دیکھیے حواشی مکاتیب ۱۲، ۵۸۔

[۴] کلیاتِ منیر، مطبوعہ مطبعِ ثمر ہند لکھنؤ، ص ۳۹۔ منیر کی ایک رباعی میں بھی یہ لفظ بہ طورِ قافیہ آیا ہے:

ہے قحط میں مشکل اک نوالا کھانا — رکھتا ہے دگنی دیگچہ مسالا، کھانا
ہر لقمۂ خشک، حلق میں پھنستا ہے — تیّار رہا ہے کیا اُبالا کھانا

(کلیات، ص ۷۵ ۳)

[۵] دیوانِ جان صاحب، مرتبہ مبین نقوی، ص ۱۰۱۔ صاحبِ نور اللغات نے لفظ "مسک" کے ذیل میں لکھا ہے:
"مسک جانا، کپڑے کا خفیف سا پھٹ جانا، دبا دیا زور پڑنے سے کپڑا مسک جاتا ہے

اے جان، ایسا چھاتی سے لپٹایا بھینچ کر — انگیا کا میری سارا مسالا مسک گیا"

قطعِ نظر اس سے کہ "کپڑا مسک جانا" کو "مسالا مسک گیا" سے کیا تعلق ہے، یہ شعر غلط طور پر نقل ہوا ہے، جب کہ لفظ "مسالا" کے ذیل میں یہ شعر صحیح صورت میں ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔

[بہ نام نور الحسن نیر کاکوروی (مولف نور اللغات)، ۸ر اگست ۱۸۹۱ء]

(۲) صنم خانۂ عشق:

"صنم خانۂ عشق کو نظرِ ثانی سے میں نے مکمل و مہذب[1] کر لیا ہے، کچھ کسر باقی ہے۔ بعض احباب سخت مصر ہیں کہ چھپے۔ امید ہے کہ اب کے ایسا ہی ہوگا۔ اتنا تم سے کہتا ہوں کہ یہ دیوان، دیوانِ اوّل[2] سے بہ درجہا اولیٰ ہے، بہ اعتبار زبان اور مزے کے، اور بہ اعتبار بلاغت[3] کے بھی۔"

[بہ نام حکیم برہم۔ ۲۲ر نومبر ۱۸۹۵ء]

---

[1] مکتوب الیہ نے اپنے لغت نور اللغات میں، لفظ "مسالا" کے ذیل میں امیر کے اس خط کی مکمل متعلقہ عبارت بہ تبدیل بعض الفاظ درج کی ہے، لیکن حوالہ نہیں دیا۔ اس خط میں امیر نے جہاں "میری رائے میں" لکھا تھا، مولف نے وہاں "مولف کی رائے میں" لکھ دیا ہے۔

[1] صنم خانۂ عشق پہلی بار ۱۳۱۳ھ میں مطبع مفید عام آگرہ میں چھپا تھا۔ اس کے آخر میں گوہرِ انتخاب اور جوہرِ انتخاب، دونوں مجموعے شامل ہیں۔ ص ۲۹۹ تک دیوان ہے، ص ۳۰۱ سے گوہرِ انتخاب شروع ہوتا ہے، اور ص ۳۴۵ سے جوہرِ انتخاب کا آغاز ہوتا ہے۔ آخر کے چھے صفحوں میں قطعاتِ تاریخ طبع ہیں۔

[2] مراد ہے مرآۃ الغیب سے۔ اس کا نام تاریخی ہے۔ اس کی پہلی اشاعت میری نظر سے نہیں گزری۔

[3] شاد عظیم آبادی نے، بہ سلسلۂ تبصرۂ مکاتیبِ امیر مینائی، صنم خانۂ عشق کے متعلق لکھا تھا: "دبی زبان سے اتنا عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت امیر کا پہلا دیوان جس قدر ان کی پختہ کلامی و استادی و باکمالی پر روشنی ڈالتا ہے، اس قدر جدید روش کا دیوان روشنی نہیں ڈالتا۔" (مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۳۷۰)۔

مولانا حسرت موہانی نے، بہ سلسلۂ تبصرۂ مکاتیبِ امیر، اس سے مختلف رائے کا اظہار کیا تھا:

(۳) تسبیغ۔ قرن۔ ما یقرا بشتر گربہ:

"بحر متقارب کی تخصیص نہیں، ہر بحر سالم میں تسبیغ[1] کراہت سے خالی نہیں۔ محقق

"صنم خانۂ عشق کی غزلوں میں ہر رنگ کے اشعار موجود ہیں، یہ بات امیر کی قادر الکلامی پر دلالت کرتی ہے" (ایضاً ص ۳۹۶)۔ یہ دونوں تبصرے مکاتیب امیر مینائی کے آخر میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ امیر نے خود بھی ایک مقطعے میں اس دیوان کے متعلق اظہار خیال کیا ہے جو قابل توجہ ہے:

پچھلا کلام بھی ہے جو اس میں شریک امیر　　دیواں میں اب کا رنگ کہیں ہے کہیں نہیں

(صنم خانۂ عشق، ص ۱۳۴)

[1] تسبیغ، معروف زحاف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رکن کے آخر میں جو سبب خفیف (دو حرفی جز) ہو اس کے حرف ساکن و متحرک کے درمیان الف بڑھا دیا جاتا ہے۔ جیسے: فعولن سے فعولان۔ محقق نے تو اس کو اس لیے مکروہ بتایا ہے کہ وزن، دائرہ عروضی سے نکل جاتا ہے۔ رہ ضابطے کی بات ہے، میں عرض کروں کہ سالم بحر میں ایسا شعر یا مصرع اکثر ناگوار سماعت بھی ہوتا ہے جیسے یہ مصرع: مرے پاس محفل میں بیٹھے ہیں کیوں آپ۔ اس میں آخری جز "آپ" کس قدر بار سماعت ہے! اس کے باوجود، اساتذۂ فارسی و اردو نے اس کی پابندی نہیں کی۔ بحر سالم میں تسبیغ کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ امیر نے "اذالہ" کا ذکر نہیں کیا لیکن اصولاً رکن مسبغ و مذال، ایک ہی قاعدے کے ذیل میں آتے ہیں۔ ذیل میں ایسی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن میں بحر سالم میں رکن مسبغ و مذال آتے ہیں:

دعا قانیم گر ہمی عزم تحویل　　مصمم از این کلبۂ غم ندارم
دعا مات گفتم، بہ خیرات بپذیر　　اگرچہ دعا ہای مقسم ندارم　　خاقانی
(کلیات، طبع تہران، ص ۲۳۶)

ج: ز ریگ روی و فرد راستہ ام بے منت امروز　　عرفی　　(دیوان، نول کشور پریس ص ۷۷)

ج: ایلۂ تیز ہی الماس و سرخی از لب یاقوت　　صائب　　(کلیات، شائع کردہ کتاب خانۂ خیام، طہران، ص ۸۶۶)

نصیرالدین طوسی نے معیار الاشعار میں اس کی تصریح کی ہے، اور یہی مثمن بحر متقارب میں یہ شعر:

بہ بالا نگارا چو آزادہ سروی ولیکن برخسار مانند گلنار

دارا محمد شاہ راد، آں قیصر کسرا نژاد
آں کز رسوم عدل وداد، آئین یزداں پرورد
ایں نظم را ناگفتہ گیر، ایں مدح را نشنفتہ گیر
ایں بندہ را آشفتہ گیر، ایں کہ نزداں پرورد قاآنی

(کلیات مطبوعہ تہران، ص ۱۵۲)

القصہ با صد پیچ و تاب، از جای جستم با شتاب
از خجلتم جاں در عذاب، از حسرتم خوں در جگر قاآنی

(کلیات مطبوعہ تہران، ص ۲۶۳)

انوارِ عرفاں سے ترا سینہ ہوا ایسا ہے صاف
جس کی پہنچتی روشنی ہے، قاف سے لے تا بہ قاف
خورشید و مہ کو روبرو تیرے کہاں مقدورِ لاف
کرتے ہیں دونوں روز و شب اگر ترے در کا طواف ذوق۔

(قصائدِ ذوق، مرتبہ سرشاہ سلیمان، ص ۹۸)

ع: مومن سے اچھی ہو غزل، سنتا اس لیے یہ زور شور مومن (دیوان مرتبہ ضیا احمد بدایونی ص ۸۳)

بحر سالم میں اذالے کی مثال خود میر کے یہاں موجود ہے، صنم خانۂ عشق میں ص ۹۶ پر ایک دو غزلہ ہے جس میں یہ صورت پائی جاتی ہے۔ مطلعے لکھے جاتے ہیں:

واں چشم و ابرو ہم نشیں اور یاں جگر ہے دل کے پاس
قاتل وہ قاتل کے قریب بسمل ہے یہ بسمل کے پاس

لکھ کر لکھتے ہیں: "واین ناپسندیدہ است چہ حرفِ آخر از دائرہ بیرون است"[1] اور متقارب مزاحف میں اہلِ فارس اور اہلِ اردو نے تسبیغ کا استعمال کیا ہے اور اس کو کسی نے مکروہ نہیں جانا۔ حافظ:

ٹھہر گیا کب تیرے اے ترک میرے دل کے پاس
خنجر بھی تڑپا دیر تک، آیا جو مجھ بسمل کے پاس

اور یہ مصرع: پیری میں اے زاہد نہیں یہ تیرے گیسوے سفید —— حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں اس قسم کی پابندیاں ٹوٹ پھوٹ جایا کرتی ہیں۔ شاعری کو زیادہ قیدیں راس آ ہی نہیں سکتیں یہی وجہ ہے کہ بہت سے قاعدے کتابوں میں موجود ہیں مگر ان کی مکمل پابندی نہیں کی جا سکی۔ سالم بحر میں رکنِ مسبغ و مذال، بارہا ساعت ہوتے ہیں، مگر ان کا استعمال عام ہے اور اب ان پر معترض نہیں ہونا چاہیے۔

[2] برٹش میوزیم (لندن) کے فارسی مخطوطات کے فہرست نگار ریو نے، فہرست مخطوطات کی دوسری جلد میں، معیار الاشعار کے ذیل میں لکھا ہے کہ مفتی سعد اللہ نے اس کی شرح میزان الافکار میں اس کو کسی ثبوت کے بغیر، محقق طوسی کی تصنیف بتایا ہے (ص ۵۲۵) قزوینی مرحوم نے المعجم فی معاییر اشعار العجم کے مقدمے میں، ریو کے اسی قول کی بنا پر، اور اس کا حوالہ دے کر لکھا ہے: "کتاب مرغوب معیار الاشعار است در علمِ عروض و قوافی کہ در ۶۴۹ھ تالیف شدہ، و مصنفِ آن معلوم نیست، و مفتی محمد سعد اللہ مرادآبادی این کتاب را شرحِ نفیس ممتازی نمودہ موسوم بہ میزان الافکار فی شرح معیار الاشعار . . . . و ی تالیفِ این کتاب را بہ خواجہ نصیر الدین طوسی معروف، متوفی در ۶۷۲ھ نمودہ، و لی معلوم نیست از روی چہ ماخذی۔"

ان دو فاضل حضرات کی تحریروں سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ سب سے پہلے مفتی سعد اللہ صاحب نے اس کو محقق طوسی کی تصنیف بتایا ہے، حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہوگا۔ شیرانی صاحب کے طویل،

گر تیغ بارد در کوی آں ماہ — گردن نہادیم الحکم للہ

مقالے "تنقید شعر العجم" کی پہلی قسط اکتوبر ۱۹۲۲ء کے رسالہ اردو میں شائع ہوئی تھی (دیباچہ تنقید شعر العجم) اس میں انھوں نے رباعی کی بحث کے سلسلے میں "معیار الاشعار مولفہ محقق طوسی" کا حوالہ دیا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب خیام (مطبوعہ ۱۹۳۳ء) میں اس پر اعتراض کیا کہ "تنقید شعر العجم کے فاضل مولف پروفیسر شیرانی نے . . . اس کو کسی تذبذب کے بغیر محقق طوسی کی تالیف بتایا ہے، معلوم نہیں ان کے سامنے اس کی کیا سند ہے، دراں حالیکہ مشرق و مغرب کے فضلا اس نسبت کے قبول کرنے میں تامل کرتے ہیں" (خیام، ص ۲۲۱)، اور حوالہ ریو اور فردینی کے مذکورہ بالا اقوال کا دیا تھا۔ شیرانی صاحب کا یہ مقالہ ۱۹۴۲ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا، اس وقت انھوں نے اس کے آخر میں ایک ضمیمہ شامل کیا، جس میں سید صاحب کے اس اعتراض کا بھی مفصل جواب دیا۔ شیرانی صاحب نے ایسی تیرہ کتابوں کے نام لکھے ہیں، جن میں اس کتاب کو محقق طوسی سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان میں دو حوالے اُن مصنفین کے بھی ہیں جن کا سالِ وفات ۷۶۴ھ ہے۔ گویا کم از کم آٹھویں صدی ہجری سے معیار الاشعار کو محقق کی تصنیف بتایا گیا ہے۔

معیار الاشعار میں ایسی کوئی صراحت نہیں جس سے اس کے مصنف کے متعلق قطعی طور پر کچھ کہا جا سکے۔ محقق کی فہرستِ تصانیف میں ایک رسالۂ عروض کا ذکر ملتا ہے، جس کا نام کسی نے نہیں لکھا۔ بہ خوبی ممکن بل کہ قریب بہ یقین ہے کہ وہ رسالہ یہی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے خیام کے آخر میں "استدراک و اضافہ" کے تحت لکھا ہے کہ قوافی کی بحث میں ایک جگہ مصنف معیار الاشعار نے کمال اسماعیل اصفہانی کے ایک قصیدے کا اس طرح ذکر کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدے کی تصنیف کے زمانے میں یہ رسالہ لکھا گیا ہے۔ کمال کا یہ قصیدہ قاضی رکن الدین ابو العلا مسعود صاعدی اصفہانی کی مدح میں ہے۔ قاضی رکن الدین

تقطیعِ مصرعِ اوّل: فعلن فعولن فعلن فعولان۔ تقطیعِ مصرعِ ثانی: فعلن فعولان فعلن فعولان۔ میرؔ:

اب حال اپنا اس کے ہے دل خواہ — کیا پوچھتے ہو، الحمدللہ[۱]

مشقت کو، محنت کو جو عار سمجھیں — ہنر اور پیشے کو جو خوار سمجھیں[۲]

کا زمانہ ۶۱۵ھ سے ۶۲۲ھ تک معلوم ہے۔ اس سے کم از کم یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا زمانۂ تصنیف، محقق طوسی کا زمانۂ حیات ہے۔

امیر مینائی کے شاگرد جلیل مانک پوری نے اپنی کتاب سوانح امیر مینائی میں معیار الاشعار کو مفتی سعد اللہ صاحب کی تصنیف بتایا ہے۔ مفتی سعد اللہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے: "عروض میں مفتی صاحب کی تصنیف معیار مشہور ہے، جس کی شرح زرِ کامل عیار، حضرت اسیرؔ نے لکھی ہے" (ص ۳۷)۔ دونوں باتیں صحیح نہیں۔ اسیرؔ نے دراصل معیار الاشعار کا ترجمہ کیا ہے۔ عبارت فارسی کے ترجمے کے بعد جو تشریحات ہیں، وہ اسیرؔ کی نہیں، اور اس کا اظہار اسیرؔ نے مقدمۂ کتاب میں کر دیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ امیر مینائی نے بھی تذکرۂ انتخاب یادگار میں اسیرؔ کے ذکر میں "زرِ کامل عیار شرح معیار الاشعار" لکھا ہے۔ شیرانی صاحب نے تنقیدِ شعر العجم میں کئی جگہ زرِ کامل عیار کا ذکر کیا ہے اور ہر جگہ "زرِ کامل عیار ترجمۂ معیار الاشعار" لکھا ہے۔ اسیرؔ نے دیباچۂ کتاب میں بھی اس کو ترجمہ کہا ہے۔

[۳] مصرعے کی صحیح صورت یہ ہے: گردن نہادیم الحکم للہ۔ (دیوانِ حافظ، مرتبۂ قزوینی و ڈاکٹر غنی، طبع تہران)

[۴] کلیاتِ میرؔ، مرتبۂ مولانا عبدالباری آسی، ص ۱۳۷۔

[۵] مسدس حالی، شائع کردہ انجمن الفرض، علی گڑھ، ص ۴۲۔

میری رائے میں یہ سالم ہے، نہ مستیغ۔
قرن، بہ فتحتین صحیح ہے[1]۔ انوری:

دو قرن از کرمت بردہ جہاں برگ و نوا
تو چہ دانی کہ جہاں بے تو چہ بے برگ و نواست

---

[1] امیر نے انوری کے اس شعر کی بنا پر "قرن" کو بہ فتحتین بھی صحیح کہا، مگر انوری کے شعر میں حقیقتاً یہ بہ سکون دوم ہی نظم ہوا ہے اور اس لیے یہ قول محلِ نظر قرار پاتا ہے۔ اصل میں ٹیک چند بہار نے بہارِ عجم میں اس شعر کو بہ فتحتین کی سند میں لکھا ہے، نیز اپنے رسالے ابطالِ ضرورت میں بھی اسے بہ فتحتین کی سند میں لکھا ہے۔ امیر کا ماخذ (غالباً) بہارِ عجم ہے۔

غالب بہت پہلے بہار کی پیش کی ہوئی اس سند پر اعتراض کر چکے تھے۔ غالب نے وارستہ، خانِ آرزو اور بہار کی کتابوں پر بھی اختلافی حواشی لکھے ہیں۔ یہ کتابیں، جن کے حاشیوں پر غالب کی یہ تحریریں موجود ہیں، رضا لائبریری رام پور کے لوہارو کلکشن میں محفوظ ہیں۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے غالب کی ایسی فارسی تحریروں کو ایک مقالے کی صورت میں مرتب کیا ہے جو دہلی یونی ورسٹی کے شش ماہی رسالے اردوئے معلیٰ کے غالب نمبر حصۂ اول میں شائع ہوا ہے۔ ذیل میں اس مقالے کی متعلقہ عبارت نقل کی جاتی ہے۔ بہار کے رسالے ابطالِ ضرورت کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

["قرن۔ بہ فتحتین۔ مدتِ سی سال یا ہشتاد سال یا یک صد و بیست سال، و ایں اصح است۔۔۔ انوری:

دو قرن از کرمت بردہ جہاں برگ و نوا۔
تو چہ دانی کہ جہاں بے تو چہ بے برگ و نواست"

• غالب نے لفظ قرن پر ۲ کا ہندسہ بہ طورِ علامت لکھ کر حاشیے میں لکھا ہے:

مایقرأ کا استعمال خط و کتابت کے ساتھ ہے، جیسے کہیں: فلاں شخص کا خط مایقرأ ہے، خوش نویس نہیں۔ اور کسی چیز کے ساتھ استعمال میں؎ نے نہیں سنا۔ بحر؎ نے جو ایک شعر میں:

۱؎ "استغفراللہ! حرفِ ہمارا فرو خوردن؛ آوازہ در افگندن کہ انوری قرن را بجز تو رائے قرشت آوردہ است، حال آنکہ بے لفظ "اے" لطفِ بیان نمی ماند؛ اے دو قرن از کرمت بردہ جہاں برگ و نوا ۱۲ غالب ۱۲"
غالب کا یہ اعتراض درست ہے۔ اول تو کلیاتِ انوری (مطبع کارخانۂ ملا صالح، تبریز، ۱۲۲۶ھ، ص ۲۷) میں مصرعے کا آغاز غالب کی تجویز کے مطابق ہوا ہے۔ اور رضا لائبریری کے نسخہ ہائے قلمی نوشتہ ۱۰۰۲ھ اور ۱۰۶۳ھ اور تیسرے غیر مورخ مگر قدیم میں "اے" کی جگہ "وے" ملتا ہے، جو معناً ایک ہے۔ دوسرے کسی لغت میں کوئی شعر ایسا نہ ملا جس میں "قرن" کو بہ فتح را باندھا گیا ہو۔"]
لفظ "قرن" بہ سکونِ دوم ہی استعمال کیا گیا ہے۔ بہار نے انوری کا جو شعر بہ "تحقیقین" کی سند میں پیش کیا تھا، وہ قابلِ قبول نہیں۔ امیر نے خود تحقیق کرنے کے بجائے نقلِ قول پر بھروسا کیا۔ چوں کہ ماخذ کا حوالہ نہیں دیا، اس لیے بہار کی ذمے داری، اُن کے حصے میں آجاتی ہے۔

؎ "مایقرأ (ع) صفت۔ ایسی تحریر جس کو آدمی وقت سے پڑھ سکے۔ اس کا استعمال خط و کتابت کے ساتھ ہے اور کسی چیز کے ساتھ نہیں" (نوراللغات)۔ یہ لفظ آج کل بہت کم استعمال میں آتا ہے، کبھی کبھار کسی خاص آدمی کی عبارت میں دکھائی دے جاتا ہے۔ ایک مثال اس وقت یادداشت میں محفوظ ہے: "لیکن بجز چند مقامات کے، جہاں عبارت مایقرأ نہیں، مطالعہ کرنے والے کو کوئی خاص دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔" (جناب سید حسن عسکری، رسالہ معاصر شمارہ ۱)۔

؎ شیخ امداد علی بحر لکھنوی، خلف شیخ امام بخش، تلمیذ ناسخ (انتخابِ یادگار) متوفی ۱۲۹۵ھ (تاریخ

اب مجھ سے التیام کی باتیں نہ کیجیے
دل تم سے پھٹ گیا، جگر انگار ہو گیا[9]

مصرع اولیٰ میں "کیجیے" کے ساتھ خطاب کیا ہے اور دوسرے مصرع میں "تم" سے، یہ تجر پر موقوف نہیں، بلکہ اُس زمانے تک اکثر معاصرین تجر جن کا شمار اساتذہ میں ہے، اِس کے تارک نہ تھے۔ اُن کے بعد متاخرین نے اس اختلافِ خطاب[10] سے احتراز کیا۔ میں بھی انھی تارکین میں ہوں۔[11]"

[بہ نام حکیم برہم، ۳ر اکتوبر ۱۹۰۰ء]

(۴) انتخاب یادگار:

"تذکرۂ انتخاب یادگار[12]، حسب فرمایش سرکار مرتب ہوا اور چھپ کر سرکار میں

لطیف (قلمی) رضا لائبریری رام پور)۔

[9] اِس شعر کی ردیف غلط ہے۔ صحیح مصرع یہ ہے، دل تم سے پھٹ گیا، جگر انگار ہو چکا
(ریاض البحر، ص ۱۸)

[10] امیر کے خطوں میں ایسے "خطابات" کی مثالیں موجود ہیں اور خاصی تعداد میں۔ صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

"یہ لوکاٹ اعلیٰ قسم کے نہ تھے جیسا کہ سہارن پور کے لوکاٹ مشہور ہیں اور تم بھیجا کرتے ہو تاہم آپ کے خلوص و محبت کے ساتھ تہدیے کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔"
(مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۶۶)

[12] یہ تذکرہ دو طبقوں میں منقسم ہے: طبقۂ اول میں "والیان ملک کا ذکر خیر بہ ترتیب زمانۂ حکومت ریاست" ہے، اور دوسرے طبقے میں ریاست کے متوسل و متوطن شعرا کا ذکر ہے۔ مولف کی صراحت کے مطابق، یہ ایک سال میں مرتب ہو گیا تھا: "انتخاب یادگار" تاریخی نام ہے جس سے سال تکمیل

داخل ہوا میں اپنی تالیفات کو اس قابل نہیں جانتا کہ ہدیۂ احباب کروں۔

۱۲۹۰ھ نکلتا ہے۔ آغا علی نقی قمی (تلمیذ منیر) نے اس کی تقریظ لکھی تھی جو تذکرے کے آخر میں شامل ہے، اس میں انھوں نے لکھا ہے: "ہنگام تالیف، چار سو دس شعرا کے نام تھے، مگر چھپنے میں تاخیر ہوئی، آفتاب الدولہ قلق، لالا گوبند لال صبا، شیخ امیر اللہ تسلیم وغیرہ ملازمین میں شامل ہوئے لہٰذا چھپنے کے وقت تک، چار سو پندرہ شعرائے نازک خیال کے نام اس تذکرے میں داخل ہوئے۔"

یہ تذکرہ ۱۲۹۰ھ میں مطبع تاج المطابع رام پور میں چھپا تھا۔ تذکرے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ شعرا کے علاوہ، بعض اور اضافے بھی ۱۲۹۰ھ کے بعد کیے گئے ہیں، مثلاً منیر کا ایک قصیدہ ان کے نمونۂ کلام کے ذیل میں ملتا ہے، جس کا آخری شعر یہ ہے:

ہے یہ تاریخ اس قصیدے کی   "وصف پاک خدیو دیں پرور"

مصرع آخر سے ۱۲۹۱ھ نکلتا ہے۔ گویا یہ اضافہ ۱۲۹۱ھ میں یا اس کے بعد ہوا ہے۔ کل صفحات ۵۰۸۔ بعض اعتبارات سے یہ تذکرہ بہت کارآمد ہے۔ اس کی خصوصیات کی طرف امیر نے بھی اشارہ کیا ہے: "ہر شاعر کے استاد کا نام اور مقدار عمر اور ولدیت اور در صورت متوفی ہونے کے تاریخ و ماہ و سال رحلت لکھنے کا اس تذکرے میں التزام کیا ہے" (دیباچہ، ص ۸)۔ اس التزام نے اس تذکرے کو بہت کارآمد بنا دیا ہے۔ امیر نے شعرا کی عمر لکھ دی ہے، اس سے ان کے سنہ ولادت کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ ایسے کئی شاعر ہیں، جن کے سنہ ولادت کا تعین کسی اور ذریعے سے نہیں ہو سکا۔ مثلاً بحر کے قصائد کے چند شعر جو اس تذکرے میں موجود ہیں، وہ ان کے مطبوعہ دیوان ریاض البحر میں موجود نہیں، اور ان اشعار سے بحر کے تعلق دربار رام پور کے زمانے کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ یا مثلاً حسین علی خاں شاداں کے فارسی شعر وغیرہ۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اپنے تحقیقی مقالے لکھنؤ کا دبستانِ شاعری میں کئی جگہ لکھا ہے کہ ملاحظہ ہو تذکرہ کاملانِ رام پور، مرتبہ امیر مینائی۔ تذکرہ کاملانِ رام پور بھی ایک تذکرہ ہے لیکن

علی الخصوص یہ تذکرہ جس میں مجھ کو حالاتِ تاریخی اور انتخابِ اشعار میں ایسی مداخلت ہے جیسی قلم کو دستِ کاتب میں؛ مگر اب جو آپ نے یاد فرمایا تو ضرور ہوا کہ ایک نسخہ بھیجوں"۔

[بہ نام احسن اللہ خاں ثاقب ۱۹ نومبر ۱۸۸۱ء]

(۵) انتخابِ یادگار

"بندہ پرور! اس تذکرے میں اگر کچھ محاسن ہوں تو ان کو آپ سے ہنر بیں جانیں اور جو اس میں بہ مجبوری قبائح ہیں، قرار واقعی ان کو میرا دل جانتا ہے۔ مگر کیا کروں مامور تھا، معذور تھا۔ دیباچے میں اس کا اشارہ بھی کیا ہے۔ آپ غور سے پڑھیے گا تو سمجھ جائیے گا کہ مؤلف[1] مجبور تھا"۔

[بہ نام ثاقب۔ یکم ربیع الاوّل ۱۲۹۹ھ]

اس کے مؤلف امیر مینائی نہیں۔ اس کتاب کی دوسری اشاعت میں بھی یہ غلطی بدستور موجود ہے۔

[1] دیباچے کی متعلقہ عبارت یہ ہے:

"ایک دن بندگانِ حضور کو خیال آیا کہ ایک تذکرہ شعراے ماضی وحال کا ایسا تیار ہو کہ اس سے خاص اس دارالریاست کے متوطن اور متوسّل شاعروں کی مختصر کیفیت، سخن گوئی کی حقیقت نقشِ صفحۂ روزگار ہو۔ اس ضمن میں اعزاز اس ہیچ مداں کا بھی منظور ہوا، لہٰذا یہ ہیچ میرز اس خدمت پر مامور ہوا۔ اور محض بہ اقتضاے عطوفتِ خسروانی، آغاز سے انجام تک حضور نے التفات فرمایا، تب یہ تذکرہ تمامی پر آیا۔ اگر ناخنِ امدادِ حضور گرہ کشائی نہ فرماتا ممکن نہ تھا ایسا تذکرہ جامع .... ترتیب پاتا۔ اس مہم کا سرانجام ہونا محض نتیجۂ توجہِ سرکار ابد قرار ہے۔ اس بے حقیقت کی سعی، مانند حرکتِ خامہ بدستِ نامہ نگار ہے۔ حق یہ

(۶) ہدایات متعلق شاعری کتبِ عروضِ عربی:

"ہدایات متعلقہ شاعری جو آپ مجھ سے پوچھتے ہیں ع: ما خویشتن گم کردہ ایم کرا رہبری کنیم۔ ایک عمر گزر گئی مگر آج تک وہ باتیں پیش آتی ہیں کہ خود تحیر[1] رہتا ہے۔ آپ سے ذہن اور جوہرِ قابل کے واسطے کچھ ہدایت نامہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ شعر کہیے، ابتدا میں کسی استاد سے اصلاح لیجیے، اُس کے محو و اثبات سے چند روز میں خود راہِ راست پر آجائیے گا۔ رہا منزلِ مقصود پر پہنچنا، یہ بہت مشکل ہے۔ اسباب سب فراہم ہوں، تب بھی ع: عمرے باید کہ یار آید بہ کنار۔ عروضِ عربی کے رسائل بہت ہیں۔ بعضے چھپ بھی گئے ہیں۔ معیار الاشعار[2] محقق نصیر الدین طوسی، جامع عروضِ عربی و پارسی ہے۔ اور اگر عروضِ عربی، زبانِ عربی میں مقصود ہو تو شرح قصیدۂ خزرجیہ[3] دیکھیے۔ اور مولوی محمد سعد اللہ

ہے کہ بندگانِ عالی نے صدہا امواتِ بے نام و نشاں کو زندہ فرمایا ہے؛ درحقیقت اعجازِ مسیحائی دکھایا ہے۔"

[1] شعرا و ادبا خصوصاً نو رسیدہ حضرات کو ایک واقفِ رسم و راہِ منزل کی یہ تحریر غور سے پڑھنا چاہیے۔

[2] معیار الاشعار کے لیے دیکھیے حاشیہ مکتوب ۳

[3] یہ قصیدہ، علامہ ضیاء الدین ابی محمد عبداللہ بن محمد خزرجی مالکی اندلسی کی تصنیف ہے۔ یہ عروض و قافیہ کے بیان پر حاوی ہے۔ اس کی دو شرحیں ہیں ایک ہی جلد میں: ایک حوض میں دوسری حاشیے پر۔ حوض میں جو شرح ہے، وہ مفصل ہے۔ یہ شرح علامہ بدر الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر مخزومی کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے پہلے ایک مختصر سی شرح اس قصیدے کی لکھی تھی، پھر بعض اندلسی طلبہ نے مجھے اس کی ایک شرح دکھائی، جو غرناطہ کے قاضی امام علامہ "السید الشریف

مرحوم نے عروض باقافیہ [۱] ایک متن مع شرح لکھا ہے، وہ چھپ گیا ہے۔ وہاں نہ ملے تو میں تلاش کر کے بھیج دوں۔"

[بہ نام ثاقب۔ ۳؍مارچ ۱۸۸۲ء]

ابی عبداللہ محمد بن احمد الحسینی السبتی" کی لکھی ہوئی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ میں اب ایک اور شرح لکھوں جو نسبتاً مفصل ہو "فوق الوجیز دون البسیط"۔ میں نے اس کا نام "عیون الغامزة علی خبایا الرامزة" رکھا۔

حاشیے والی شرح شیخ الاسلام زکریا انصاری کی ہے، جس کا نام "فتح البریة بشرح القصیدة الخزرجیة" ہے۔ میرے سامنے جو نسخہ ہے وہ ۱۳۲۲ھ میں مطبع الخیریۃ مصر میں چھپا تھا۔ بڑے سائز کے ۱۰۲ صفحات پر مشتمل ہے

[۱] اس کا نام "یوسفیہ فی علم العروض والقافیہ" ہے۔ یہ عربی میں ہے۔ "عروض باقافیہ" فارسی کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۷۵ھ نکلتا ہے۔ یہ رسالہ مشتمل ہے دو فنون پر: فنِ اول مشتمل ہے ایک مقدمے اور پانچ فصلوں پر اور فنِ دوم میں ایک مقدمہ اور تین فصلیں ہیں۔ حاشیے پر فارسی میں ضروری تشریحات بھی ہیں۔ یہ متن مع شرح ہے۔ اصل متن علاحدہ بھی چھپا ہے دو اور مختصر رسالوں کے ساتھ۔ اس مجموعۂ رسائل میں پہلا رسالہ تو یہی متن عربی ہے۔ دوسرا رسالہ فارسی میں ہے، اس کا نام جواہر عروض ہے اور تیسرا رسالہ بھی فارسی میں ہے، اس کا نام ہے: کیفیتِ ایجادِ رباعی۔ یہ دونوں رسالے بھی مفتی صاحب مرحوم کے ہیں۔ یہ مجموعۂ رسائل، نظامی پریس کان پور میں ۱۲۹۴ء میں چھپا ہے۔ اول الذکر متن مع شرح، نولکشور پریس میں چھپا تھا۔

مفتی سعد اللہ صاحب اپنے زمانے کے جید عالم تھے، امیر مینائی نے ان سے معقولات کی کتابیں پڑھی تھیں (سوانح امیر، مرتبہ جلیل مانک پوری، ص ۴۳)۔ تذکرۂ علمائے ہند میں مفتی صاحب کی اکتیس [۳۱] تصنیفات کی فہرست موجود ہے۔ آخر میں رام پور میں "عہدۂ قضا، افتا اور مرافعہ" پر

(۷) بانگی:

"بانگی، بمعنی خوردہ کو، آپ نے دو جگہ "باندگی" باضافۂ دالِ مہملہ بعدِ نون لکھا ہے، حالاں کہ دال اس میں نہیں ہے۔ اُمید ہے کہ یہ اطلاع، طبعِ نازک پر گراں نہ ہو۔"

[بہ نام ثاقب۔ ۱۷ اپریل ۱۸۸۹ء]

(۸) شگفانند:

"غنچہ ارا بچمن ہمہ جا ہی شگفانند" میں گاف کا سکون بے تکلف جائز، بلکہ فصیح ہے۔ البتہ مثال اس وقت یاد نہیں، پھر بھیج دوں گا۔ [بہ نام ثاقب]

(۹) شگفانند، شنوا:

"پوسٹ کارڈ کے جواب میں تاخیر اس وجہ سے ہوئی ہو کہ "شگفانند" بہ سکونِ کاف فارسی کی سند تلاش کرنے کا خیال رہا، مگر ہنوز نہ ملی تھی کہ شحنۂ ہند[1] آیا اور بدلا ہوا مصرع پایا۔ آپ نے بہت ہی خوب کیا کہ مصرع بدل دیا۔ خدا جانے

سرفراز ہوئے اور وہیں ۲۴، رمضان ۱۲۹۳ھ کو وفات پائی (تذکرۂ علمائے ہند)۔

[1] یہ ہفتے وار اخبار تھا۔ مالک و مدیر تھے مولوی احمد حسن شوکت میرٹھی، جو خود کو "مجددِ السنۂ شرقیہ" کہتے تھے اور اپنے زمانے میں مرکزِ ہنگامہ تھے۔ یہ اخبار محلہ احمد روڈ، میرٹھ (یوپی) سے شائع ہوتا تھا۔ تاریخِ اجرا: ۲۰ جنوری ۱۸۸۳ء۔ مقاصدِ اخبار میں سے چند یہ تھے، جن سے مجدد صاحب کے تیوروں کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے:

"دیسی زبان کی انشا پردازی کی اصلاح کرے گا اور بتائے گا کہ مہذب و فصیح و بلیغ انشا پردازی اس کو کہتے ہیں . . . مدبرانہ و مصلحانہ و حکیمانہ و شاعرانہ و عالمانہ و فاضلانہ، غرض کہ ہر قسم کے خیالات شائع کرے گا، فن اڈیٹری

سند ملتی نہ ملتی۔ تحقیق کامل کی فرصت نہیں ہے۔ میں نے دیکھا ضرور ہے، مگر یاد نہیں کہاں دیکھا ہے۔ خیراب وہ قصہ ہی مٹا۔ احتیاط ہمیشہ اچھی ہوتی ہے۔ شبہے کی بات سے، جہاں تک ممکن ہو، بچنا ہی چاہیے۔

"شنوا" بہ سکونِ نون کہاں ہے؟ یہ تو میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ بہ حرکتِ نون ہی چاہیے"۔[1]

[بہ نام ثاقب، ۷، فروری ۱۸۹۱ء]

(۱۰) شنوا:

"شنوا، بہ سکونِ نون، اگر کلام میں ہو تو بدل دیجیے"۔

[بہ نام ثاقب]

(۱۱) گھڑنا۔ چھڑے۔ موتی کی لڑی:

"گھڑنا اور گڑھنا، دونوں صحیح ہیں۔ مگر "گڑھنا" شعرا کے کلام میں نہیں پایا۔ فصحائے لکھنؤ "گھڑنا" کو ترجیح دیتے ہیں۔ رشک مرحوم نے جب "گھڑے نہیں، چھڑے

وقائع نگاری کے اصول بتائے گا، اور دیسی اخبارات جو کچھ غلطیاں کریں گے یا کر رہے ہیں، ان پر تستیح کرے گا۔ الغرض اپنے کو اسم با مسمّٰی کر دکھائے گا"۔

مندرجہ بالا تفصیلات اور عبارت، اخترِ شہنشاہی سے ماخوذ ہے۔

[1] فارسی کے متعلق تو فی الوقت میں کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ اردو میں بہ سکونِ نون کی مثال میں قائم چاند پوری کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے:

گوشِ شنوا جب بہم پہنچا نہ کوئی یاں تو آہ
لے گئے ہم ساتھ اپنے وہ جو دل میں بات تھی

(دیوانِ قائم، عکسی نسخہ، انڈیا آفس، لندن)

نہیں" طرح کی تھی، تو مجھے یاد آتا ہے کہ شعرا نے "گھڑنے" نہیں "بھی انھی معنوں میں کہا تھا۔[1] رشک مرحوم کا شعر یہ ہے:

---

[1] صاحبِ نور اللغات نے اس کے برخلاف لکھا ہے کہ "لکھنؤ میں زبانوں پر "گڑھنا" اور دہلی میں "گھڑنا" ہے۔ لفظ "گڑھنا" کے ذیل میں انھوں نے لکھا ہے: "گھڑنا اور گڑھنا دونوں صحیح ہیں۔ شعرا کے کلام میں گڑھنا کہیں نہیں ملا۔ لکھنؤ میں زبانوں پر گڑھنا اور دہلی میں گھڑنا ہے۔" پھر لفظ "گھڑنا" کے ذیل میں انھوں نے ایک بار پھر وضاحت کی ہے کہ یہ دہلی سے متعلق ہے۔ اور سند میں داغ کا یہ شعر لکھا ہے:

"اِدھر وحشت لیے جاتی ہے مجھ کو ادھر جلاد نے بیڑی گھڑی ہے"

"پڑی، دھڑی قافیہ"۔ اس کے بعد رشک کا وہ شعر لکھا ہے، جس کو امیر نے بھی اپنے خط میں لکھا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں "گڑھنا" موجود نہیں، اُس میں صرف "گھڑنا" ہے۔ داغ کے شعر سے اور آصفیہ کے اندراج سے، مولفِ نور اللغات کے اِس قول کی پوری طرح تائید ہوتی ہے کہ "دہلی میں "گھڑنا" ہے۔" رشک کے مذکورہ شعر اور لُغات کے اندراجات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ میں "گڑھنا" اور "گھڑنا" دونوں صورتیں ہیں۔ مگر یہاں پر یہ کہنا ضرور ہے کہ لکھنؤ میں "گڑھنا" اکثر اور "گھڑنا" کم تر ہے۔ "گھڑنا" کی سند میں رشک کے اِسی ایک شعر کو پیش کیا گیا ہے۔ جلال نے سرمایۂ زبانِ اردو میں دونوں لفظ اپنی اپنی جگہ پر لکھے ہیں اور "گھڑنا" کے ذیل میں رشک کے اِسی شعر کو پیش کیا ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں "گھڑوانا" کے متعلق لکھا ہے کہ "لکھنؤ میں "گڑھوانا" کہتے ہیں۔ اس کی وہی صورت ہے جو "پہنانا" اور "پنھانا" کی ہے" (فرہنگِ اثر، ص ۵۰۶)۔ جلال، مولفِ نور اللغات اور صاحبِ فرہنگِ اثر کی تحریروں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں مستعمل عام لفظ "گڑھنا" ہے۔ اور "گھڑنا" کی حیثیت ثانوی کی ہے اور دہلی میں "گھڑنا" اصل لفظ ہے۔

ڈھالے ہوئے ہیں سانچے میں یہ بھی بدن کی طرح
ہر گو سنار نے ترے زیور گھڑے نہیں

چھڑے، بہ معنی تنہا، البتہ میں نے لکھنؤ میں فصحا سے نہیں سنا، اور کلام میں بھی نہیں دیکھا۔

اس دبستانی اختلاف سے قطع نظر کرکے، اب یہ دونوں مصدر (گڑھنا، گھڑنا) یکساں حیثیت رکھتے ہیں، جس کو جو لفظ پسند ہو، وہ اُسے استعمال کر سکتا ہے، دبستانی اختلاف کے جھگڑے کا خیال کیے بغیر۔

۲۔ مجموعۂ دواوینِ رشک، ص ۲۲۹۔

۳۔ فرہنگِ آصفیہ، سرمایۂ زبانِ اردو اور نور اللغات میں "چھڑا" موجود ہے۔ "چھڑا عورتوں کے پانو کا ایک زیور ہوتا ہے۔ اور کنایہ ہے مرد یکہ و تنہا سے بھی" (سرمایۂ زبانِ اردو) آصفیہ میں میر کا یہ شعر سنداً لکھا ہوا ہے:

"فرہاد و قیس ساتھ تھے سب کب کے چل بسے
دیکھیں نباہ کیوں کے ہو اب ہم چھڑے رہے"

(کلیاتِ میر، مرتبۂ آسی، ص ۱۷۳)

نور میں بھی یہی شعر منقول ہے۔ البتہ مولفِ نور نے یہ صراحت کر دی ہے کہ "اب قلیل الاستعمال ہے"۔

اسی سے ایک مرکب "چھڑی سواری" بھی ہے۔ یہ آصفیہ و نور میں ہے۔ آصفیہ میں بحر لکھنوی کی یہ رباعی سنداً درج ہے:

جس وقت چلی یہ جان پیاری اپنی — یاروں کو ہوئی دریغ یاری اپنی
دو گام دیا نہ چوبِ دستی نے بھی ساتھ — دنیا سے چلی چھڑی سواری اپنی

(ریاض البحر، ص ۲۸۲)

"موتی کی لڑی" کی سند آپ نے ایسی دی ہے کہ اب میں اس میں کچھ کلام نہیں کرسکتا۔ جنھوں نے مجھ کو منع کیا تھا، جب انھی کے یہاں ... ہے تو مجھے کیا تامل ہو سکتا ہے۔"

[بنام کوثر خیرآبادی، ۲۹ راکتوبر ۱۸۹۲ء]

(۱۲) مخزن المحاورات۔ گلشنِ فیض:

"محاورات ولغات کی تحقیق کے واسطے مخزن المحاورات[1] اور گلشنِ فیض[2]

آصفیہ میں اس رباعی کا متن قدرے مختلف ہے انھیں نے اس کو بحر کے دیوان کے مطابق لکھا ہے۔

[3] غالباً آسیر کی طرف اشارہ ہے۔ سرمایۂ زبانِ اردو اور آصفیہ میں "موتی کی لڑی" موجود ہے۔ نور میں ناسخ کا یہ شعر سند آ لکھا ہوا ہے:

"اپنی تری موتی کی لڑی سے جو لڑی آنکھ
توڑے گی اب اے جان نہ اشکوں کی جھڑی آنکھ
[کلیاتِ ناسخ، طبع دوم، ص ۲۲۵]

اور مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں، مثلاً:

دانتوں کی صفا، کیا کہوں، موتی کی لڑی ہے
لب، لعل کے ٹکڑے
مسّی ہے بلا، تس پہ رکھے پان کا لاکھا
سو شوخی کی رنگت (جرأت)
(تذکرۂ مجمع الانتخاب)

"موتی کی لڑیاں" بھی کہا گیا ہے:

کبھو ٹوٹا نہ مژگاں سے مری آنسو کا زنجیرا
نہ جانے اشک کے قطرے تھے یا موتی کی یہ لڑیاں
(وقائع چاند پوری)

[1] یہ منشی چرنجی لال دہلوی کی تالیف ہے۔ منشی صاحب، بہ سلسلۂ لغت، مولوی سید احمد دہلوی

کسی قدر مفید ضرور ہیں، مگر غیر محقق کو دھوکا دینے میں بھی یہ کتابیں استاد ہیں۔ دعا کیجیے کہ امیر اللغات مکمل ہو جائے تو خدا سے اُمید ہے کہ وہ ان سب سے مستغنی کر دے گا۔"

[بہ نام کوثر خیرآبادی۔ ۱۰ر فروری ۱۸۹۴ء]

(مولف فرہنگِ آصفیہ) کی طرح فیلن کے معاون تھے۔ فیلن نے اپنے لُغت کے دیباچے میں اُن کا نام بھی فہرستِ معاونین میں لکھا ہے۔ اس کتاب میں "ہندی اور اردو کے ہر قسم کے محاورے اور اصطلاحیں دس ہزار کے قریب بڑی تلاش اور جستجو سے جمع کر کے، درج کی گئی ہیں۔ ان کے ثبوت میں ناظمانِ بے مثال و ناثرانِ باکمال کا کلام اور روزمرہ کے معنی خیز فقرے اور ضرب الامثال پیش کی گئی ہیں۔ اکثر محاوروں کی وجہِ تسمیہ اور شانِ نزول بھی حتی الوسع بڑی تحقیق اور تدقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے" (عبارتِ سرورق)۔ یہ کتاب ۱۸۸۶ء میں مطبع محبِّ ہند، فیض بازار دہلی میں چھپی تھی اور غالباً اس کے بعد دوبارہ نہیں چھپ سکی۔ امیر نے اس کتاب کے متعلق ایک اور خط میں یہ لکھا ہے: "مخزن المحاوراتِ چرنجی لال کا کیا اعتبار! اس میں ہزاروں محاورے گنواروں کے لکھے ہیں" (مکتوب بہ نام زاہد سہارن پوری) امیر کی یہ رائے، فنِ لغت کے نقطۂ نظر سے، نہایت غیر مناسب اندازِ بیان کا مجموعہ ہے۔ ہزاروں کا مبالغہ مزید برآں۔ یہ بالکل ضروری نہیں کہ جو محاورہ یا لفظ آج مستعمل نہیں یا ایک خاص علاقے میں مستعمل نہیں، وہ گنواروں کی زبان کا جز ہو۔ یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ اس کتاب میں غلطیاں ہوں، مگر وہ کہاں نہیں! اصل میں اس طرح کی رائیں، لُغت نویسی اور تصورِ زبان اور معیارِ فصاحت کے قدیم اور محدود تصور کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ اس تصور نے لُغت نویسی کو بہت نقصان پہنچایا کہ آج نہ معلوم کتنے پرانے لفظ ہیں جن کا حال احوال معلوم کرنا مشکل ہو کر رہ گیا ہے، کیوں کہ وہ معیاری لغات میں جگہ نہیں پا سکے۔ پھر مخزن المحاورات

(۱۳) بہ سلسلۂ امیر اللغات:

"آپ نے جو امیر اللغات کو شروع سے آخر تک دیکھا اور اس کی بعض

کے مولف نے تو خود ہی صراحت کر دی ہے کہ اس میں "ہندی اور اردو کے ہر قسم کے محاورے اور اصطلاحیں" ہیں۔ ہارڈنگ لائبریری دہلی میں اس لغت کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

۲ ۔ گلشنِ فیض، جلال کے لغت کا نام ہے۔ جلال نے فارسی میں، اردو کا ایک لغت لکھا تھا جس کا نام "گنجینۂ زبانِ اردو" رکھا تھا۔ "گلشنِ فیض" اسی کا تاریخی نام ہے جس سے مولف کی صراحت کے مطابق، سالِ اختتامِ تالیف ۱۲۹۰ھ نکلتا ہے۔ یہ لغت نول کشور پریس لکھنؤ میں ۱۲۹۸ھ میں چھپا تھا۔ آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

جلال کا اردو لغت "سرمایۂ زبانِ اردو" کچھ ترمیمات کے ساتھ اسی کا ترجمہ ہے۔ گلشنِ فیض پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیے تھے۔ سرمایۂ زبانِ اردو اور گلشنِ فیض کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جلال نے لوگوں کے اعتراضوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کچھ الفاظ کو خارج کر دیا ہے یا عبارت میں ضروری ترمیم کر لی ہے۔ میں ایک مثال پر اکتفا کروں گا: "گلشنِ فیض" میں لفظ "سن" کے ذیل میں لکھا تھا: "سن سینِ مہملہ مفتوح بہ نون، بمعنی سال آید۔ جاسنہ بہ فتحتین و در آخر ہائے موقوفہ۔ و بضمِ سینِ مہملہ، عضو یکہ بے حس و حرکت شدہ باشد، و امر بود از شنیدن" (ص ۲۸) سرمایۂ زبانِ اردو میں صرف یہ عبارت ہے: "سن بے حس و حرکت عضو، اور خاموش و حیران آدمی"۔

یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جلال کے استاد رشک کے لغت نفس اللغۃ کا اگر گلشنِ فیض سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جلال نے رشک کے لغت کی بہت سی عبارتیں بلفظہٖ یا معمولی لفظی ترمیم کے ساتھ، اپنے لغت میں درج کر لی ہیں اور کہیں حوالہ نہیں دیا، نہ کہیں ذکر کیا ہے۔ ــــ امیر نے مہدی حسن خاں شاداب رسول پوری کو ایک خط میں گلشنِ فیض کے متعلق

فروگذاشتوں سے مجھ کو مطلع کیا، میں اس کا شکر گزار ہوں۔ بے شک
کاتب نے غلطی کی اور تصحیح کرنے والے بھی چوک گئے، جو بحر کے شعر میں "پچھوا" ہے۱

لکھا ہے کہ یہ لغت درحقیقت میرے مسودۂ لغت کا ایک ٹکڑا ہے، جس میں تصرفاتِ بے جا بھی شامل ہیں۔ دیکھیے مکتوب ۵۸۔

۱ امیر اللغات کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ غلطی دوسری جلد کے ص ۲۷۳ پر لفظ "انوٹھا" کے ذیل میں ہوئی ہے۔ بحر کا شعر دراصل یوں ہے:

پیٹ سے پاؤں نکلے ہیں کچھ اب تو تم نے   چھو لیا ہم نے جو انوٹ کو تو پچھوا کھینچا

(ریاض البحر ص ۳۵)

امیر اللغات میں "پہنچا کھینچا" چھپا ہوا ہے۔

ایک بات اور، امیر اللغات میں "انوٹ" کے صرف ایک معنی لکھے ہوتے ہیں: "ایک زیور ہوتا ہے جسے ہندو عورتیں پانو کے انگوٹھے میں پہنتی ہیں"۔ فرہنگِ آصفیہ میں بہ معنی زیور لکھ کر مزید لکھا گیا ہے: "آن کی تصغیر، چھب، انداز، ادا"۔ لیکن کوئی سند مذکور نہیں۔ البتہ نور اللغات میں داغ کا یہ شعر سنداً ملتا ہے:

"وہ حسن، وہ انداز، وہ بچپن اس کا   بجل بل ہے قیامت کی تو انوٹ ہے غضب کی"

نور اللغات میں اس معنی میں اس لفظ کو دلی سے مخصوص بتایا گیا ہے۔ امیر اللغات کی طرح سرمایۂ زبانِ اردو اور نفس اللغۃ میں بھی "انوٹ" کے صرف ایک معنی (زیور) لکھے ہوتے ہیں۔ اس سے صاحبِ نور اللغات کے اس اندراج کی تائید ہوتی ہے کہ "انوٹ" بہ معنی "انداز و ادا" دلی سے متعلق ہے اور لکھنؤ میں اس کے صرف ایک معنی تھے، یعنی پانو کے انگوٹھے میں پہننے والا زیور۔ امیر اللغات اور نور اللغات میں "انوٹ" بہ معنی زیور کو مذکر لکھا گیا ہے اور نور اللغات میں "انوٹ" کو ناز و ادا کے معنی میں مونث لکھا گیا ہے۔ داغ کا شعر اس پر دلالت کرتا ہے۔ اور آصفیہ میں اسے

کی جگہ "پہنچا"[1] چھپ گیا۔

اچھا اچھا، کی مثال میں تجلی کا شعر بے شک بہت مناسب اور اچھا تھا، مگر اول تو تجلی[2] مستند استادوں میں نہیں ہیں، دوسرے آج تک ان کا کلام لغت میں دیا نہیں گیا۔

"ایک تنکے کا شرمندہ نہ ہونا" میں منیر کا شعر[3] ضرور دیا جاتا، اگر پہلے ملتا۔ اتفاق کی بات ہے کہ استقرا سے یہ شعر رہ گیا۔

دونوں معانی میں مونث لکھا ہے۔ یہ ایک اور اختلاف ہوا کہ ایک معنی کے لحاظ سے تو لکھنؤ میں مذکر ہے اور دلی میں (دونوں معانی میں) مونث۔

[1] مکاتیبِ امیر مینائی میں "پہونچا" لکھا ہوا ہے، لیکن امیر اللغات میں "پہنچا" ہے اور صحیح املا بھی یہی ہے۔

[2] تجلی تخلص کے کئی شاعر ہوئے ہیں، جن میں سے تین قابلِ ذکر ہیں: (۱) سید پرورش علی تجلی، متوطنِ کڑا، ضلع الٰہ آباد، متوفی ۱۲۹۳ھ۔ ان کے دو دیوان مطبوعہ ہیں (خمخانۂ جاوید) (۲) سید محسن حسین امروہوی، برادرِ مصحفی امروہوی۔ (۳) سید محمد جعفر حسین خاں عرف ننھے مرزا لکھنوی، تلمیذِ عشق لکھنوی (خمخانۂ جاوید)۔ میرا خیال ہے کہ امیر کی مراد اول الذکر تجلی سے ہے۔

[3] منیر کا شعر یہ ہے:

بھولے سے پھانس نکالی نہ ہمارے دل کی
ایک تنکے کے بھی شرمندہ تمہارے نہ ہوئے

(کلیاتِ منیر، ص ۲۵۷)

امیر اللغات میں اس محاورے کے ذیل میں ایک فقرہ بہ طورِ مثال لکھا ہوا ہے۔

اور یہ سویرا، فصل الف مع الواو میں لکھا گیا ہے، آپ کی نظر اس پر نہیں پڑی۔ اب ملاحظہ کر لیجیے ــــ حصہ سوم کی ترتیب ہو رہی ہے، قصد ہے کہ ب کا حرف اسی حصے میں تمام کر دیا جائے۔ اگرچہ اس حرف میں بھی بڑی وسعت معلوم ہوتی ہے، مگر یہاں حتی الامکان اختصار پر نظر ہے۔"

[بنام کوثر۔ ۹ راگست ۱۸۹۳ء]

(۱۴) بھانا۔ مہیں۔ انکھڑیاں۔ بھدنا۔

ایجاد۔ دشنام؛

"بھانا، پسند آنا کے معنی میں، اگلی زبان ہے۔ اب میرے نزدیک بھی مستحسن[1] الترک ہے۔

---

[1] اس لفظ کو مستحسن الترک کہنا، زبان پر ظلم کرنا ہے۔ اردو کے بہت کم شاعر ایسے ہوں گے جنھوں نے اس لفظ کو استعمال نہ کیا ہو (یا استعمال نہ کرتے ہوں)۔ دو چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں: بھا گئی کون سی وہ بات بتوں کی ورنہ (ناسخ۔ کلیات، مطبع مولائی، ص ۱۸۸)، نہ بھاتی انھیں خوں فشانی کسی کی (دبیر۔ کلیات، ص ۳۹۰)، کوئی کھانا اسے نہ بھاتا تھا (ایضاً، ص ۵۷۶)، مجھ کو بھاتے ہیں وہ الفاظ جو ہوں پہلو دار (رشک۔ مجموعۂ دواوین، ص ۱۰۵)، اور کوئی نہیں بھاتی مجھے برسات میں بات (ایضاً ص ۱۰۴)، جو چلا تیرا مجھے بھاتا نہیں (زند۔ دیوان، نول کشور پریس، ص ۱۰۲)، روتے میں ہنسا ایس جو ادا بھا گئی مجھ کو (شوق قدوائی۔ فیضانِ شوق، ص ۱۱۸)۔

"بھانا سے جو مفہوم ادا ہوتا ہے، وہ اس کے مرادف الفاظ سے اس طرح ادا نہیں ہوتا۔ مثلاً مثنوی میر حسن کے اس شعر میں "میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں، نہ یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں" یہ لفظ جس مفہوم کو جس انداز سے ادا کر رہا ہے، اس کا کچھ بدل نہیں ہو سکتا ــــ اس سلسلے میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ امیر نے خود بھی اس لفظ کو استعمال کیا ہے،

موہیں، میں ہی کی جگہ، بول چال میں جا ہے آجاتا ہو مگر کسی معتبر کلام میں

داورِ محشر کو بھائی میری اس کی چھیڑ چھاڑ　　　　چھیڑ کو پوچھا عزیز کیا ہوا، کیوں کر بھا

(مرآۃ الغیب، ص ۶۲)

شوق قدوائی (متوفی ۱۹۲۵ء) نے ایک خط میں لکھا ہے:

"آپ نے مجھ سے "بھانا" کے لفظ کو پوچھا ہے۔ میں نے حضرت امیر مرحوم کے اس خط کو دیکھا ہے جس میں اس لفظ کو وہ متروک تحریر فرما گئے ہیں۔ میرے خیال میں ان سے سہو ہوا۔ وہ خود بھی اپنے کلام میں اس لفظ کا استعمال کر چکے ہیں۔ اس کے معنی ہیں: پسند آنا۔ یہ لفظ اب بھی استعمال میں ہے اور اس کے ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"

[بہ نام صفدر مرزا پوری، مرقع ادب، اول، ص ۸۵]

صاحب نور اللغات نے جلد اول میں بہ ذیلِ متروکات، اس لفظ کے متعلق لکھا ہے:
"لکھنؤ میں صرف عورتوں کی زبان پر ہے"۔ مندرجۂ بالا مثالوں سے اس کی تردید خود بہ خود ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اثر لکھنوی مرحوم کی یہ تحریر بھی قابلِ توجہ ہے:

"بھانا، کو متروک سمجھنا ہی غلط ہے۔ ایک تقریب میں، جس میں میں بھی موجود تھا، پیارے صاحب رشید مرحوم نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا تھا، جو مجھے اب تک یاد ہے:

یہ آپس کی شادی مجھے دل سے بھائی　　　　کہ سمدھی کے سمدھی ہیں، بھائی کے بھائی"

(فرہنگِ اثر، ص ۸۸)

جلال نے سرمایۂ زبانِ اردو میں (رسالِ طبع: ۱۳۰۴ھ = ۸۷-۱۸۸۶ء) اس لفظ کے متعلق لکھا ہے: "بعض فصحائے متاخرین کے نزدیک متروک الاستعمال ہے"۔ ان کی اس عبارت

اب تک نظر سے نہیں گزرا۔ حکم اس کو (اس کے ؟) استعمال کا نہیں دیا جا سکتا۔

سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اُس وقت تک اِس کو متروک نہیں سمجھتے تھے۔ اِس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنے تیسرے دیوان "مضمون ہاے دل کش" میں (سالِ طبع، ۱۳۰۶ھ) اپنے متروکات کی جو فہرست شامل کی ہے، اُس میں یہ لفظ موجود نہیں۔ البتہ اُن کے صاحبزادے حکیم سید مہدی کمال نے اپنے رسالے دستور الفصحا میں (سالِ طبع، ۱۳۱۵ھ) اس لفظ کو متروک لکھا ہے مگر خورشید لکھنوی نے اپنے رسالے افادات میں "بھانا" کو متروکات کے ذیل میں شامل نہیں کیا۔

امیر نے اپنے ایک شاگرد زاہد سہارن پوری کے نام ایک خط میں اس لفظ سے متعلق ایک تیز فقرہ لکھا ہے:

"بھانا پسند آنا کے معنی میں، فصحاے لکھنؤ نہ بولتے ہیں نہ لکھتے ہیں۔ اگر اہلِ دہلی بولتے ہیں تو آپ ضرور لکھیے۔ توسیعِ زبان کا بھی آپ کو بہت خیال ہے۔"

[مشاطۂ سخن، بہ ذیلِ اصلاحاتِ امیر مینائی]

مندرجۂ بالا تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کے متعلق امیر کی راے قرینِ صواب نہیں۔ نہ اُن کا یہ لکھنا صحیح ہے کہ "فصحاے لکھنؤ نہ بولتے ہیں نہ لکھتے ہیں"۔ زاہد کے نام امیر کا جو خط ہے جس کا اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کے سلسلے میں دراصل دبستانی چشمک امیر کے ذہن پر حاوی تھی۔ بہ ہر حال، جیسا کہ شوق قدوائی نے لکھا ہے، اس مقام پر امیر کو سہو ہوا۔ ہاں، پہلے کی طرح آج بھی یہ مصدر اور اس کے مشتقات عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

ہر منظرِ خوب و زشت بھاتا ہے مجھے | ہر ذرہ، نئی جھلک دکھاتا ہے مجھے
پھولوں میں بھی امتیاز کرتا تھا کبھی | کانٹوں پہ بھی اب تو پیار آتا ہے مجھے

حضرت اسیر مرحوم کی نظر سے آپ کے شعر میں نہیں معلوم کیوں کر رہ گیا اور میں نے بھی اُسے دیکھا ہے تو سوا اپنے سہو نظر کے اور کیا کہا جائے۔ انکھڑیاں، چشم معشوق کے لیے مخصوص ہے اور یہ لفظ مجھے پسند نہیں ہے۔[1]

جوش ملیح آبادی (جنون و حکمت، طبع بمبئی، ص ۲۰۲)

۲؎ جلاؔل نے سرمایۂ زبانِ اردو میں "مہیں" کو صحیح اور "میں ہی" کو غلط لکھا ہے۔ اُن کی عبارت یہ ہے:

"مہیں، تحتانی معروف و اخفاے نون کے ساتھ، ایک کلمہ ہے کہ فائدہ اپنی ذات کے حصر کے معنی کا دیتا ہے۔ اور جو اس لفظ کو "میں ہی" پڑھتے ہیں یا لکھتے ہیں، مو قعب ہیچ مداں کے عندیے میں غلط ہے۔"

جلاؔل کے اِس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے، وجاہت جھنجھانوی (تلمیذِ داغ)، نے اپنے رسالے اختلاف اللسان (رسالہ طبع: ۱۹۰۶ء) میں لکھا ہے:

"جناب جلاؔل کا یہ اجتہاد با قاعدہ ضرور ہے۔ کیوں کہ جب "تم ہی" "ہم ہی" کو "تمھیں" اور "ہمیں" کہتے ہیں تو اس قیاس پر "میں ہی" کو "مہیں" کہنا چاہیے۔ مگر تمھیں اور "ہمیں" کے مقابلے میں یہ لفظ نہایت غیر فصیح معلوم ہوتا ہے، شاید اجنبیت کی وجہ سے۔ اور سچ پوچھیے تو یہ اجتہاد ایسا ہی ہے جیسے کوئی "یہاں" "وہاں" کے قیاس پر کہ ان کا مخفف "یاں" اور "واں" آتا ہے، "کہاں" کا مخفف "کاں" کرنا چاہے۔ شعراے دہلی و لکھنؤ میں سے اور کوئی اس کا عامل نہیں پایا جاتا، صرف جناب جلاؔل اور اُن کے شاگرد لکھتے ہیں۔"

۳؎ اؔمیر نے خود اس لفظ کو استعمال کیا ہے:

کاجل یہ نہیں ہے انکھڑیوں میں اُٹھا ہے دھواں تری مسی کا

[1] (صنم خانۂ عشق، ص ۹۰۔ د) (بقیہ اگلے صفحے پر)

نیز امیر اللغات میں اس لفظ کو درج کیا ہے اور ناپسندیدگی یا ترک کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔ اُن کی عبارت یہ ہے: "انکھڑیاں، آنکھ کی جمع، بہ پیار سے معشوق کی آنکھوں کو کہتے ہیں"۔ اور سند میں سودا، آتش، اور قلق کا ایک ایک شعر لکھا ہے۔

امیر کے شاگرد حکیم برہم نے ایک طویل خط میں، اصلاحِ زبانِ اردو، مؤلفہ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی پر تبصرہ کرتے ہوئے، اس کی تردید کی ہے کہ "انکھڑیاں" متروک ہے۔ مولفِ اصلاحِ زبانِ اردو نے لکھا تھا: "انکھڑیاں اب بول چال میں نہیں"۔ برہم نے اس کی تردید کی ہے اور امیر اللغات و گلشنِ فیض کا حوالہ دیا ہے (مرقعِ ادب، اردو، ص ۷۰)

شوق نیموی نے رسالہ اصلاح میں اور مولفِ نور اللغات نے اس لفظ کو متروکات کے ذیل میں درج کیا ہے: "انکھڑیاں، آنکھوں کے معنی میں۔۔۔ اکثر فصحائے حال استعمال نہیں کرتے" (اصلاح، ص ۱۲)۔ اس کے برخلاف، خورشید لکھنوی نے لکھا ہے:

"انکھڑیاں، اس لفظ کو گو بعض فصحائے حال، بہ قولِ بعض، ترک کر چکے ہیں، مگر میں متفق ان سے نہیں ہوں۔ منشی منیر مرحوم سے محقق کہ جنھوں نے اس قدر متروکات کی پابندی کی ہے کہ دوسرے نے کم کی ہوگی، وہ فرماتے ہیں:

نشیلی انکھڑیاں، نیچی نگاہیں پھنسا لینے کی، بہکانے کی راہیں

اور گھوڑے وغیرہ کی آنکھوں کی تعریف میں جس کی نظم کی ضرورت مرثیوں میں اکثر پڑتی ہے، تو "انکھڑیاں" ہی "آنکھوں" سے فصیح تر ہیں" (افادات، ص ۳۹)

اور "بحثِ متروکات مندرجہ نور اللغات" کے ذیل میں اثر لکھنوی مرحوم نے لکھا ہے:

"انکھڑیاں۔ آنکھیں۔ دونوں کے محلِ استعمال میں فرق ہے۔ "آنکھیں" عام لفظ ہے۔ "انکھڑیاں" معشوق کی خوب صورت آنکھوں کو کہتے ہیں۔ میرا شعر ہے:

اُن انکھڑیوں کی اُف نیم خوابی ڈورے پڑے تھے جن میں گلابی

انکھڑیوں میں جو بانکپن ہے، وہ آنکھوں میں کہاں!" (فرہنگِ اثر، ص ۷۰)

نواب عزیز جنگ ولا نے (۱۳۱۹ھ) اپنی تصنیف "معیارِ فصاحت" میں یہ بات کہی ہے:
"آنکھوں میں انکھڑیوں والی تخصیص معنوی کا لطف زباں سے ہے، محاورے سے متعلق ہے" (معیارِ فصاحت، ص ۲۴۳)۔

نواب کلب علی خاں (والیِ رام پور، تلمیذِ امیر) کو متروکات کا بہت لحاظ رہتا تھا۔ نواب صاحب کے دوسرے دیوان "دستنبوے خاقانی" (مطبوعہ ۱۲۹۵ھ) کے آخر میں اُن کے متروکات کی ایک فہرست ہے، اس میں یہ لفظ بھی موجود ہے۔ لیکن جلال نے اپنے تیسرے دیوان "مضمون ہائے دل کش" (مطبوعہ ۱۳۰۶ھ) میں اپنے متروکات کی جو فہرست شامل کی ہے، اُس میں "انکھڑیاں" موجود نہیں۔ انھوں نے آخر تک اِس کو متروک نہیں سمجھا، کیوں کہ اُن کے چوتھے دیوان "نظم نگاریں" میں یہ لفظ موجود ہے:

اپنی شوخ انکھڑیوں میں کچھ تو حجاب آنے دو
راہ پر آئیں جو یہ خانہ خراب آنے دو (ص ۱۰۶)

اِس بات پر بیش تر حضرات نے زور دیا ہے کہ "انکھڑیاں" چشمِ معشوق کے لیے آتا ہے، مگر مطلق آنکھوں کے لیے بھی اس کو استعمال کیا گیا ہے، جیسے میر سوز کا یہ شعر:

جب تلک آنکھیں کھلی ہیں ڈکھ پہ دیکھیں گے یار
مُند گئیں جب انکھڑیاں، اے سوز سب آنند ہیں

(دیوانِ سوز، خطّی، رضا لائبریری رام پور)

اور یہ قولِ خورشید لکھنوی "گھوڑے وغیرہ کی آنکھوں کی تعریف میں، جس کی نظم کی ضرورت مرثیوں میں اکثر پڑتی ہے" یہ لفظ آتا ہے ــــــ مختصر یہ کہ اس لفظ کو متروک قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

اِس بحث کے بعد، اس لفظ "انکھڑیاں" کے سلسلے میں امیر کی اس تحریر کے متعلق ایک بات اور کہنا ہے: امیر کے خط کی عبارت، جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "یہ لفظ مجھے پسند نہیں ہے"؛

سمجھنا، لفظ نہیں ہے، "بدھنا" ہے اور سرایت کرنے کے معنی میں مستعمل

مکاتیبِ امیر مینائی مرتبۂ ثاقب (طبعِ دوم) میں اسی طرح ہے، اور یہی میرا ماخذ ہے۔ ریاض خیر آبادی (تلمیذِ امیر) کے شاگرد عبدالحکیم حکمت عظیم آبادی نے، دبدبۂ امیری کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جس میں بہت سی عبارتیں بلفظہٖ یا معمولی تغیر کے ساتھ، طرۂ امیر مرتبۂ امیر احمد علوی سے منقول ہیں۔ اس کتاب میں مکاتیبِ امیر کے کچھ اقتباسات بھی جمع کیے گئے ہیں۔ حکمت نے یہ صراحت نہیں کی کہ یہ اقتباسات، مکاتیبِ امیر مینائی کے پہلے اڈیشن سے لیے گئے ہیں یا دوسرے اڈیشن سے۔ دبدبۂ امیری میں منقول عبارتوں میں اور مکاتیبِ امیر مینائی مرتبۂ ثاقب (طبعِ دوم) کی عبارتوں میں کئی جگہ کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ امیر کے زیرِ بحث خط کے اقتباس کی بھی یہی صورت ہے کہ دبدبۂ امیری میں آخری جملہ اس طرح ملتا ہے: "یہ لفظ مجھے پسند ہے۔" مکاتیبِ امیر مینائی کا پہلا اڈیشن مجھے یہاں باوصفِ تلاش نہیں مل سکا کہ اُس سے تقابل کیا جاتا۔ اگر دبدبۂ امیری والا جملہ صحیح ہے تو پھر صورتِ حال بدل جاتی ہے۔

سے سرمایہ میں جلال نے اس معنی میں "سجھنا" لکھا ہے: "سجھنا، پسی ہوئی مرچ یا نمک وغیرہ کا کسی چیز میں سرایت کر جانا۔" رشک نے بھی نفس اللغۃ میں اسی کو مانا ہے: "سجھا، ماضی، سرایت کردنِ نمک باشد در چیزے۔" اس کے بعد متعدی مصدر "سجھانا" لکھا ہے: "نمک در چیزے سرایت کنانیدن بود۔" یہی بول چال میں ہے۔ امیر نے صبا کے شعر میں اس لفظ کی مکتوبی صورت پر اعتماد کیا ہے، حالاں کہ اس سے فائدۂ استناد حاصل نہیں ہو سکتا۔ فائدۂ استناد اُس وقت حاصل ہو سکتا تھا جب یہ لفظ شعر میں اس طرح دبطورِ قافیہ) آتے کہ لازماً اس کو "بدھنا" پڑھنا پڑے۔ اور صبا کے زیرِ بحث شعر میں یہ صورت نہیں پائی جاتی؛ اِس لیے اُس کو سنداً پیش نہیں کیا جا سکتا۔

نور میں اِس معنی میں "بدھنا" کو صحیح بتایا گیا ہے (یہ گویا امیر کے قول کی تائید ہوئی) عبارت

ہے۔ صبا:[۵۰]

یہ ہے: "بھدنا... پسے ہوئے نمک مرچ یا کسی اور سفوف کا کسی دوسری چیز میں مل جانا، سرایت کر جانا، کسی چیز میں بو بس جانا۔ جان صاحب: سوئی ہے تو لپٹ کے کل شب کو اے زلیخا، بو تیری بھد گئی ہے یوسف کے پیرہن میں۔ اس جگہ "بدھنا" صحیح ہے۔" اور "بدھنا" کے ذیل میں صبا کا یہی شعر سنداً لکھا ہے، جس کو امیر نے اپنے خط میں درج کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ صاحبِ نور نے "بدھنا" کو محض امیر کے اس خط کی عبارتِ زیرِ بحث کی بنیاد پر مرجح قرار دیا ہے، اور کوئی وجہ نہیں، نہ کوئی سند ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے صاحبِ نور کے اس قول پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "کوئی وجہ نہیں بیان کی کہ "بھدنا" کیوں غلط اور "بدھنا" کیوں صحیح ہے۔ لکھنؤ میں اس موقع پر "بھدنا" ہی کہتے ہیں۔ بو کا بس جانا یا سرایت کر جانا، جیسا خود حضرت مؤلف نے لکھا ہے، "بھدنا" ہے۔ سوراخ کرنا، "بدھنا" ہے۔ مثلاً: بدھا موتی۔"
> (فرہنگِ اثر، ص ۲۱۰)

یہی صحیح صورت ہے کہ "بدھنا" یا "بندھنا" سوراخ ہونا کے معنی دیتا ہے اور سرایت کرنے کے معنی میں "بھدنا" ہے۔

آصفیہ میں نور سے زیادہ ابہام آفریں صورت ہے۔ اُس میں نہ "بدھنا" ہے، نہ "بھدنا"، بل کہ ایک مصدر "بندھنا" ہے اور "بھدنا" اور "بندھنا" دونوں کے معانی، اُسی ایک مصدر سے منسوب کیے گئے ہیں ـــــ صحیح بات وہی ہے جس کو اوپر لکھا گیا ہے یعنی سرایت کرنے کے معنی میں "بھدنا" ہے اور (موتی وغیرہ) میں سوراخ ہونے کے معنی میں "بدھنا" اور "بندھنا" ہیں۔

۵۰ میر وزیر علی صبا لکھنوی خلفِ میر بندہ علی، تلمیذِ آتش، متوفی: ۱۲۷۱ھ قطعاتِ تاریخِ وفات شاملِ دیوانِ صبا موسوم بہ غنچۂ آرزو، مطبوعہ مطبعِ محمدی لکھنؤ، سالِ طبع ۱۲۷۲ھ۔

شور جس کا ہے، وہ ہے عشقِ جنوں زا دل میں   بڑھ گیا ہے نمکیں حسن کا سودا دل میں[6]

ایجاد، مذکر ہے۔ سند کے شعر ذیل میں دیکھیے۔ آج کل اس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوتی ہے۔ اخباروں میں مضامین دیکھے جاتے ہیں، اور جا بجا سے میرے پاس استفتے آتے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغ[7] کا قول ہے کہ دلّی میں مؤنث ہے۔ مگر کلام میں کہیں مؤنث کا پتا نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مؤنث کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے۔ اور بغیر کلام میں آتے ہوئے کہیں کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں ہے۔

نسیم[8] دہلوی:

قبر پر آیا ہے، دینے کو مبارک بادِ مرگ   یہ نیا ایجاد ہے میرے ستم ایجاد کا[9]

میر:

یہ تازہ لگا ہونے ایجاد گلستاں میں   تا قوں کو لگا رہنے صیاد گلستاں میں[10]

---

[6] غنچۂ آرزو، ص ۱۱۱۔

[7] اس لفظ سے متعلق مفصّل بحث اِس کتاب میں شامل مضمون "مشترک الفاظ" میں کی گئی ہے۔ یہاں پر صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ داغ کے متعلق یہ روایت قطعاً درست نہیں کہ وہ لفظ "ایجاد" کو مؤنث کہتے تھے۔ اِس کے برخلاف، داغ بھی اِس لفظ کو مذکر ہی مانتے تھے۔

[8] اصغر علی خاں نسیم دہلوی، تلمیذِ مومن۔ متوفی: ۳۰؍ رمضان ۱۲۸۲ھ، دیباچۂ دیوانِ نسیم، موسوم بہ دفترِ شگرف، نوشتۂ امیر اللہ تسلیم (تلمیذِ نسیم)۔

[9] دفترِ شگرف، مطبوعہ مطبعِ مصطفائی لکھنؤ (سالِ طبع: ۱۲۸۵ھ)، ص ۳۳۔

[10] یہ شعر میر کا نہیں۔ کلیاتِ مرتبۂ آسی اِس سے خالی ہے اور مخدومی قاضی عبد الودود صاحب کی

اگرچہ اس شعر میں "ایجاد" کا لفظ جس صورت میں آیا ہے، وہ سند کے لیے پورے طور سے کافی نہیں ہو سکتا، مگر دیوان میں اسی طرح چھپا ہے اور ثقات کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے۔

غافل لکھنوی[11]:

اتنی بینائی کہاں، دیکھیں جو سیرِ جزو و کل
عالم ایجاد میں تو سیکڑوں ایجاد ہیں[12]

دشنام، زیادہ مونث ہے، مگر ظفر نے ایک جگہ مذکر کہا ہے، فلہذا مختلف فیہ کہا جا سکتا ہے۔

ناسخ[13]:

کسی نے جو حیدر کو دشنام دی تو گویا پیمبر کو دشنام دی

تحقیق کے مطابق یہ شعر تنہا، شاگردِ مصحفی کا ہے۔ قاضی صاحب کی عبارت یہ ہے:

[اب اور رنگ ہوئے ایجاد گلستاں میں راتوں کو جگا رہنے صیاد گلستاں میں
شیفتہ ص ۵۸ و تتاسخ ص ۷۶، اور خم خانہ ۳ ص ۳۲۹ میں بہ نام راسخ عظیم آبادی لیکن اُن کے دیوان کے کسی نسخے میں نہیں۔ اور انتخاب دیوان تنہا، شاگردِ مصحفی، مرتّبہ حسرت موہانی میں، بہ تبدیلِ بعض الفاظ موجود ہے۔ بلکہ اس میں اس زمین کے اور اشعار بھی ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ تنہا کا نتیجۂ فکر ہے۔]

(آوارہ گرد اشعار۔ نقوش (لاہور) جون ۱۹۵۶ء)

11 منوّر خاں غافل لکھنوی، خلفِ صلابت خاں، تلمیذِ مصحفی (سخن شعرا)۔

12 دیوانِ غافل، اشاعتِ ثانی، نول کشور پریس کانپور، ص ۵۶۔ سالِ طبع: ۱۸۹۷ء۔

13 کلیاتِ ناسخ، مطبع مولائی ص ۳۰۲ (سالِ طبع: ۱۲۶۲ھ)۔

ناسخ :

بارہا میں گیا ہوں نزدِ امام　　　کبھی مجھ کو نہ دی کوئی دشنام[۲۴۴]

ظفر :

ہم کو پوشیدہ ہیں پیغام کسو کے آتے　　　خط پہ خط روز ہیں بے نام کسو کے آتے

ہوس بوسہ اگر کھینچ نہ لاتی ہم کو　　　کاہے کو سننے کو دشنام کسو کے آتے[۲۴۵]"

[بہ نام کوثر۔ ۸، مارچ ۱۸۹۸ء]

---

[۲۴۴] مثنوی ناسخ، مرتبہ حبیب اللہ غضنفر، شائع کردہ کتابستان الٰہ آباد، ص ۷۲۔
(سالِ طبع: ۱۹۳۱ء۔

[۲۴۵] کلیاتِ ظفر، نول کشور پریس ص ۱۴۴ ـــــــ مولفِ معین الشعرا نے ظفر کے اسی شعر کی بنا پر "دشنام" کے متعلق لکھا ہے کہ: "دہلی میں مذکر اور لکھنؤ میں مونث بولتے ہیں" مگر یہ درست نہیں۔ یہ لفظ عمومی سطح پر دونوں جگہ مونث ہے۔ آصفیہ میں بھی اس کو صرف مونث لکھا گیا ہے۔ ظفر کا شعر از قسیمِ شواذ ہے۔ نیز میرا خیال ہے کہ امیر نے سند کے جو شعر لکھے ہیں، یہ رشحاتِ صفیر سے ماخوذ ہیں، محض اختلافِ ترتیب کے ساتھ۔ رشحات میں ظفر کے شعر پہلے ہیں اور ناسخ کے شعر اُن کے بعد۔

رشحات اِس خط سے پہلے شائع ہو چکی تھی۔ نور میں بھی یہی لکھا گیا ہے: "دشنام... مونث۔ دہلی میں مذکر ہے۔" اور سند میں ناسخ و ظفر کا ایک ایک شعر لکھا گیا ہے۔ یہ وہی شعر ہیں جو امیر کے خط میں درج ہیں۔ یہ بھی محض نقلِ قول ہے۔ صاحبِ نور نے امیر کے مکاتیب سے اکثر استفادہ کیا ہے؛ اِس بنا پر میرا خیال ہے کہ اس لفظ کے ذیل میں جو مثالیہ اشعار درج کیے گئے ہیں، وہ امیر کے اِسی خط سے ماخوذ ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ امیر نے قطعیت کے ساتھ یہ نہیں لکھا تھا کہ دہلی میں مونث ہے، مولفِ نور نے اِس کا اضافہ کر دیا۔

(۱۵) مدفن ۔ چپقلش ۔ کعبے کا گھر :

"مدفن، بہ کسرِ فا، لغتہً صحیح، پھر موزوں کرنے کو کون منع کرتا ہے۔ اچھا نہ معلوم ہو، نہ کہیے۔ میں نے بھی کبھی نہیں کہا۔ خلد آشیاں[1] نے موزوں کیا تھا، بہت چرچا رہا، مگر جیت انھی کی تھی کہ لفظ صحیح[2] ہے۔

چپقلش، بہ معنیِ جنگِ شمشیر، غیاث میں بہ فتحِ لام ہے۔ اور اُردو میں بہ کسرِ لام، انبوہ[3] کے معنی میں ہے۔

---

[1] مراد ہے نواب کلبِ علی خاں نوّاب، خلفِ نواب یوسف علی خاں ناظم، والیِ رام پور سے۔ ولادت: ۱۲۵۰ھ۔ تخت نشینی: ۱۲۸۱ھ، وفات: ۱۳۰۴ھ۔ (حواشیِ مکاتیبِ غالب، مرتبہ عرشی صاحب) نواب صاحب کے پانچ مطبوعہ دیوان ہیں (۱) نشیدِ خسروانی، مطبوعہ ۱۲۹۳ھ (۲) دستنبوے خاقانی، مطبوعہ ۱۲۹۵ھ (۳) درۃ الانتخاب، مطبوعہ ۱۲۹۵ھ (۴) توقیعِ سخن، مطبوعہ ۱۲۹۷ھ (۵) مضامینِ رفیع، مطبوعہ ۱۳۰۳ھ۔ نواب صاحب کو صحتِ الفاظ کے ساتھ ساتھ، متروکات کا بہت خیال رہتا تھا۔ دیوانِ دوم کے آخر میں انھوں نے اپنے متروکات کی فہرست شامل کی ہے۔ مصاحب منزل میں اساتذہ کا مجمع رہتا تھا اور اس اجتماع میں زبان و قواعد کے مختلف مسائل خاص طور پر موضوعِ بحث بنتے تھے۔ نواب صاحب ایسی بحثوں میں بہ طورِ خاص دل چسپی لیا کرتے تھے۔ دیگر اساتذۂ دہلی کے برخلاف، داغ کے یہاں جو اساتذۂ لکھنؤ کی طرح، قواعد پسندی کا رجحان شدت کے ساتھ کار فرما ہوا، اس میں رام پور کے اِس ماحولِ شعر و سخن کو بہت کچھ دخل تھا۔

[2] لغت کا نوشتہ سر آنکھوں پر، مگر یہ لفظ بہ کسرِ فا، اردو کے لحاظ سے قطعاً غیر فصیح ہے۔ بہ کسرِ فا کو عربی سے منصوص سمجھنا چاہیے اور اردو میں صرف بہ فتحِ فا کو جگہ دینا چاہیے۔

[3] اصلاً یہ لفظ "چخچقلش" ہے، بہ فتحِ اول و ضمِ سوم و فتحِ چہارم اور اس کے معنی ہیں، جنگِ شمشیر

خانۂ کعبہ کا ترجمہ "کعبے کا گھر" بالکل مستعمل نہیں، اور نہایت بُرا معلوم ہوتا ہے۔
وجہ یہ ہے کہ "خانۂ کعبہ" ترکیبِ اضافی نہیں ہے، ترکیبِ توصیفی یا بدل مبدل
منہ ہے، پھر "کعبے کا گھر" کیوں کر درست ہوگا۔ آپ کسی سے تو لڑیے نہیں،
اور سمجھیے کہ غلط ہے، ہاں معتبرین کے کلام میں نکلے تو خیر! اگر کوئی آپ سے پوچھتا
ہے تو سمجھا دیجیے کہ میرا تو یہ خیال ہے۔ پھر وہ تاویلات کرے تو چُپ ہو رہیے۔"

[بہ نام کوثر خیرآبادی]

(غیاث اللغات)۔ اردو میں حرکات کے لحاظ سے یہ تصرف ہوا کہ قؔ کا پیش زبر سے بدل گیا،
اور لؔ مفتوح اور مکسور دونوں طرح رہا۔ اور معنی بھی بدل گئے۔ نوراللغات کی عبارت ہے:
"چپقلش، ت۔ بالفتح وضم سوم وفتح چہارم: انبوہ، ہجوم، تلوار کی لڑائی۔ مونث: لڑائی،
جھگڑا، تکرار، جگہ کی تنگی، انبوہ، بھیڑ۔
داغ:
ہوئی لوگوں میں چپقلش کیا کیا　　　رہی آپس میں کشمکش کیا کیا
. . . اردو میں بالفتح وفتح سوم وکسرِ چہارم بھی زبانوں پر ہے۔"
قائم کی ایک غزل ہے: کششِ دل، اور نیشِ دل، اس میں "چپقلشِ دل" بھی آیا ہے:
کس طرح کوئی گزرے تری رہ سے کہ پیارے
ہر گام پہ اس کوچے میں ہے چپقلشِ دل
چوں کہ اس غزل میں حرفِ ماقبلِ شین کی حرکت کی پابندی ہر شعر میں کی گئی ہے، اس
لیے اس شعر کو، بہ کسرِ لؔ کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ بہ فتحِ چہارم کی مثال میں اوپر
داغ کا شعر آچکا ہے۔ آصفیہ میں حرکات کی صراحت نہیں کی گئی، البتہ قؔ پر زبر اور لؔ پر کسرہ
لگا ہوا ہے۔ بول چال میں بہ فتحِ چہارم اور بہ کسرِ چہارم (چپقَلش، چپقِلش) دونوں طرح آتا ہے۔

(۱۶) خنجر کا دونا ہونا :

"خنجر کا دونا ہونا، صحیح ہے۔[1]"

[بنام کوثر خیرآبادی۔ ۱۴ مئی ۹۳ء]

(۱۷) تعقید۔ سقوط یاے معروف :

"جو شبہات آپ نے لکھے ہیں، اُن میں سے بعض تو میں رفع کیے دیتا ہوں،
اور بعض اِس پر موقوف ہیں کہ پورا شعر اپنا اور اصلاح میری لکھیے۔
واضح ہو کہ "کھائے پھرتے ادھار ہم بھی ہیں" محاورہ فصحا کا نہیں ہے اور
بندش بھی تعقید سے خالی نہیں۔ "کھائے پھرتے" اِدھر اور "ہیں" اُدھر،
اور بیچ میں "اُدھار ہم بھی" خوش نما نہیں۔ چاہو، رہنے دو۔

ق پر بہر صورت زبر رہتا ہے۔

اُردو میں اصل معنی یعنی "تلوار کی لڑائی" تو ختم ہو گئے۔ اُس کے بجائے، جگہ کی تنگی، جھگڑا، بھیڑ کے معنوں میں مستعمل رہا ہے۔ آسیؔ کی یہ تحدید کہ "اُردو میں بہ کسرِ لام ہے اور صرف "انبوہ" کے معنی میں ہے، صحیح نہیں۔ داغؔ کے مندرجۂ بالا شعر سے اس قطعیت کی خود بہ خود نفی ہو جاتی ہے۔ داغؔ کے شعر میں بہ فتحِ لام، اور بہ معنی "تکرار" نظم ہوا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے یہ لفظ اردو میں بہ فتحِ لام اور بہ کسرِ لام، دونوں طرح مستعمل ہے اور تکرار، جھگڑا، انبوہ، جگہ کی تنگی کے معنوں میں آتا ہے، اور قاف ہر صورت میں مفتوح رہتا ہے۔

[1] "دونا ہونا" یا "خنجر کا دونا"، نہ تو آصفیہ میں ہے نہ نور میں۔ البتہ دونوں میں "دونا ہو جانا" موجود ہے۔ نور کی عبارت یہ ہے: "دونا ہو جانا (کنایۃً) تلوار یا نیمچے کا دہرا ہو جانا، خمیدہ ہو جانا۔

صبا : جانِ شیریں ہم نے کس سختی سے دی   نیمچہ قاتل کا، دونا ہو گیا"

مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ صاحبِ نور نے ذرا سی ترمیم کے ساتھ، آصفیہ کی عبارت کو

"سیہ بختی ہیں عدیم المثل": "سیہ بختی" میں یائے تحتانی کا اسقاط نہ چاہیے، ترکیب فارسی[1] ہے۔ اگرچہ بعض اساتذۂ اردو کے کلام میں سند ملتی ہے، مگر کیا ضرور ہے۔

"نہ باشد جز بتوائے شوخ عیار": اس میں اگر "جز بتو" پسند نہیں تو "فیر تو" رکھیے، کچھ مضائقہ نہیں"۔

[بنام کوثر خیر آبادی]

نقل کر لیا ہے۔ بہ ہر صورت "دونا ہونا" اور "دونا ہو جانا" میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔

[1] ترکیب فارسی کی شرط نہیں، ترکیب ہو یا نہ ہو، ہر صورت میں عربی و فارسی الفاظ کے آخر سے ی کے سقوط کو غلط بتایا گیا ہے؛ مگر یہ اس قدر بے اصول پابندی تھی کہ پوری طرح نباہی نہیں جا سکی، اور "بعض اساتذہ" نہیں، اکثر اساتذہ کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس کتاب کے ایک دوسرے مضمون میں اس پر مفصل گفتگو کی گئی ہے جو اسی موضوع پر ہے؛ اُس کو دیکھا جائے۔ یہاں پر صرف امیر مینائی کے یہاں سے سقوطِ یائے معروف کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، اور ان کو دیکھ کر اس بات کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب امیر خود اس "لزوم مالا یلزم" کو نہیں نباہ سکے، تو دوسروں کو کیا کہا جائے گا!

پاس یکتائی کا اس شوخ کو ایسا ہے امیر (صنم خانۂ عشق، محبوب پریس حیدر آباد، ص ۳۳۸)

تیری بے دردی ہی اچھی تھی ترس کھانے سے (ایضاً، ص ۲۸۰)

چھپ کے تنہائی میں اغیار سے رویا ہوگا (ایضاً، ص ۱۳)

تنہائی میں نہ رونے دگانے کا لطف ہے (ایضاً، ص ۳۱۲)

رسائی کچھ نہیں دشوار بام تک اُس کے (ایضاً، ص ۲)

یہ شیخ سعدی سے جس نے کہ چشم روشن کو (مرآۃ الغیب، ص ۲۷)

(۱۸) گل دستوں کے متعلق رائے، گل دستۂ دامنِ گل چیں :

"سلام نیاز کے بعد مدعا نگار ہوں کہ نورِ چشم محمد احمد کے چھوٹے بھائی، برخوردار لطیف احمد کی طبیعت شعر سے بہت مناسب واقع ہوئی ہے، اس زمانے میں بسبب بے شغلی کے، اُن کو خیال پیدا ہوا کہ دامنِ گل چیں کے قالب بے جاں میں پھر نئے سرے سے روح پھونکی جائے۔ مجھ سے اصرار کیا کہ اس گل دستے کی نگرانی پر شلِ سابق پھر توجہ کی جائے۔ اگرچہ میں اپنے آلام و اسقام کی وجہ سے نکما ہو رہا ہوں، مگر اُن کی خاطر سے منظور کرنا پڑا۔

گل دستوں کی کثرت ایسی ہے کہ اب یہ مشغلہ بھی ابتذال سے خالی نہیں، اور زیادہ تر اسی ابتذال کی وجہ سے طبیعت گریز کرتی ہے۔ اور پرچے کو رونق بھی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ موجودہ گل دستوں سے فروغ کی صورت اگر ہے تو یہی کہ محاسنِ معنوی میں کوشش کی جائے۔ اس کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ معدودے چند عمدہ نامور شعرائے خوش فکر و خوش مذاق کا کلام ہمیشہ اس میں چھپے۔

آپ کی ذاتِ سراپا صفات اس طبقۂ نامور کی افسر ہے، اور رعایتِ مشاقی سے اب غزل کہہ دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے؛ لہٰذا خواست گار ہوں کہ اپنی طبیعتِ نازک پر جبر کر کے، بالالتزام غزل دینے کا وعدہ کیجیے۔ مگر یہ پہلے سے کہہ رکھتا ہوں کہ غزل ایسی کہا کیجیے گا کہ ہم سے غریبوں کو بھی

طرفۃ العین میں وہ روشنی پہنچی جو قریب (ایضاً ص ۳۵)

نہ بے وفائی کا غم تھا، نہ ڈر جدائی کا (ایضاً ص ۴۸)

بھٹیاں ہوتی ہیں آبادی سے اکثر باہر (ایضاً ص ۱۲۶)

کہنے کی گنجائش رہے یہ نہ ہو کہ پہلے ہی سے دنیا بھر کے قلم توڑ دیے جائیں۔
پرچہ ابتدائے[1] جنوری میں نکلے گا۔ مصرعِ طرح بابت جنوری ۱۸۹۹ء: گیسو
پیچاں کی گلیاں ہیں مری چھائی ہوئی ——— ردیف چھائی، قافیہ"
[بہ نام داغ دہلوی، ۳۱ر نومبر ۱۸۹۸ء]

(۱۹) بہ سلسلۂ مکاتیب و امیر اللغات۔

بعد میں، ہو وے، ہوتے:

"تم نے میری انشا پردازی کی ستایش کر کے، اور مجھے شرمندہ کیا۔ شرمندگی کے ساتھ، تمھاری قدر دانی کا (جو محض محبت سے ہے) شکرگزار ہوں۔ خطوط جہاں تک مجھے اچھے لکھتا تھا، وہ ذخیرہ ایک سو کئی جز کا میرے ایک شاگرد نے جمع کیا تھا۔ سولہ برس ہوئے کہ وہ بے چارہ مر گیا اور اس ذخیرے کا پتا نہ لگا۔ پھر کسی نے جمع نہیں کیا۔ تین چار شاگردوں نے کبھی کبھی کچھ خطوں کی نقلیں اپنی پسند کے موافق لکھ لیں؛ وہ جا بہ جا ہیں۔ بعض تحریروں کی نقلیں لڑکوں نے کر لی ہیں۔ اور جب سے دفترِ امیر اللغات کھولا گیا ہے، محرّرانِ دفتر بعض مکاتیب لکھ لیتے ہیں۔ یہ سب بھی جمع ہوں تو ایک مجموعہ ہو سکتا ہے، مگر یہ کام کون کرے۔ اس قدر ضرور ہے کہ کوئی خوش سلیقہ فہمیدہ و سنجیدہ آدمی ترتیب دے کر ان کو یک جا لکھ دے اور میں ایک نظر دیکھ کر جو مطلب شائع کرنے کے نہ ہوں، ان کو نکال ڈالوں، تو بنے۔ مگر اس کی

---

[1] اسی سلسلے میں امیر نے اپنے شاگرد آزاد سہارن پوری کو بھی لکھا تھا: "گل دستۂ داغ کل جنوری سے بہ اہتمام نورِ چشم لطیف احمد اختر پھر نکلے گا۔ یہ وہی پرچہ ہے جو ۱۸۸۵ء میں میری نگرانی میں نکل کر مقبولِ عام ہو چکا ہے" (مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۲۳۳)۔

فرصت ہی نہیں ہے۔ کروں کیا "یک انار صد بیمار" کا مصداق ہوں۔ کاہشوں سے نجات نہیں ہوتی۔

یہ لُغت اردو کا، جس کو لکھ رہا ہوں، اس نے کسی کام کرلینے کا وقت نہیں چھوڑا ہے اور پھر وہ بھی جلد نہیں ہوتا ہے۔ اور ہو کیوں کر، روپیا پیسا بہت چاہیے اور یہاں اب تھوڑا سا بھی نہیں ہے۔ اگر یہ کام ہو گیا تو عجب عمدہ کام ہوگا۔ ایسا پورا لُغت اردو کا اب تک کوئی نہیں، اور آیندہ بھی اُمید نہیں، اس لیے کہ اب زمانہ اس زبان کو مٹاتا جاتا ہے۔

"بعد" کے ساتھ لفظ "میں" کا لانا، خلافِ فصاحت ہے۔ اور "ہو" کی جگہ "ہووے" یا "ہوئے" اگلی زبان ہے[1]۔"

[بہ نام تراب۔ ۱۷ اپریل ۱۸۹۱ء]

---

[1] جلال نے اپنے رسالے قواعد المنتخب میں لکھا ہے:

"یہ جو آئے، جائے، پائے، کھائے، لاتے وغیرہ یا روتے، دھوتے، سوتے وغیرہ میں کبھی بجائے ہمزہ، واو بھی بولتے ہیں اور لکھتے ہیں یعنی آوے، جاوے، پاوے، رووے، سووے، دھووے؛ مولف کے عندیے میں نہایت غیر فصیح بل کہ غیر صحیح ہے۔ اور "ہو" جو "باش" یا "باشد" کا ترجمہ ہے، اس کے بعد تو واو اور یے دونوں کے لانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے، کہ فقط "ہو" پر مدعا تمام ہو جاتا ہے، اور واو اور یے زائد ٹھہرتے ہیں، جیسے اِس شعر میں کسی کے:

گُل وہ کھاؤں کہ چمن محوِ تماشا ہووے دیکھنے کا اسے کچھ ذوق تو پیدا ہووے

یہاں "ہو" کے آخر میں واو اور یے کے بڑھانے کی کچھ حاجت نہ تھی مطلب "ہو" ہی پر تمام ہو گیا تھا۔ پس یہی وجہ ہے کہ "ہووے" کو متاخرین نے ترک کیا

(۲۰) ڈھونڈھے ہے۔ خورونوش:

"ڈھونڈھتا ہے" کی جگہ "ڈھونڈھے ہے"، اب زبان نہیں ہے۔ قدما کہتے ہیں، متاخرین نے ترک کردیا ہے[1]۔

ہے۔ ہرگز اپنے کلام میں "ہووے" نہیں لاتے ہیں۔

اور یہ جو "ہو" کے آخر میں کبھی ہمزہ اور ی بڑھا کر "ہوئے" بولتے ہیں، بل کہ شعرا روئے، سوئے، دھوئے وغیرہ کا قافیہ بھی گردانتے ہیں، یہ مولف کے نزدیک زوائد میں کیسا، محض غلط ہے" (ص ۱۴)۔

[1] ایسے افعال کو متروک قرار دینا، زبان اور حسنِ بیان، دونوں کی جان پر ستم کرنا ہے۔ شکر ہے کہ اُس زمانے میں بھی سب نے اِس غیر مناسب فیصلے کو تسلیم نہیں کیا تھا، اور آج تو اکثر لوگ اِس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ فراق نے اپنی کتاب اردو کی عشقیہ شاعری میں اِس سلسلے میں ایک نہایت عمدہ بات لکھی ہے:

"ہندی یا اُردو فعل کی ایک قدیم صورت ایسی تھی جو مذکر و مونث دونوں کے لیے آتی تھی، جیسے، آئے ہے، یا آوے ہے۔۔۔ وغیرہ، جن کی جگہ پر اب "آتی ہے" یا "آتا ہے"۔۔۔ وغیرہ کہتے ہیں۔ اُس قدیم شکل میں واحد و جمع بھی صرف "ہے" کو "ہیں" کر دینے سے بن جاتا تھا۔ یہ شکل وہ لطیف، نازک، رنگین ابہام پیدا کر دیتا تھا، جس کا ذکر میں فارسی تغزل کے سلسلے میں، ابھی کر چکا ہوں۔ ولی دکنی کا یہ شعر سنیے، جس پر مہذب دنیا کی مہذب سے مہذب شاعری وجد کرے گی، اور جس میں محبوب کے بارے میں یہ کھلتا ہی نہیں کہ وہ مرد ہے یا عورت: ولی اُس گوہر کانِ حیا کا واہ کیا کہنا

مرے گھر اس طرح آوے ہے جیوں سینے میں راز آتے" (ص ۵۰)

(حاشیۂ گذشتہ)

فراقؔ نے اردو کے انداز بیان کی ایک خوبی کی طرف جو اشارہ کیا ہے، وہ بہت اہم ہے۔ اِس ابہام رنگیں کے علاوہ، ایسے افعال عام صورتوں میں بھی کہیں کہیں بہت لطف دے جاتے ہیں۔ اُردو کے اہم شعرائے برابر ایسے افعال کو استعمال کیا ہے (یہاں پر خاص قسم کے اساتذہ سے بحث نہیں)، اور ایسے مصرعے یا شعر، کسی طرح کی عدم فصاحت سے گراں بار نہیں معلوم ہوتے۔ اس کے برعکس، حُسنِ بیان کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جیسے: آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ (غالبؔ)، ڈھونڈھے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی (غالبؔ)۔ آج کل تو ایسے افعال کو بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے، خصوصاً ردیف یا قافیے کے طور پر۔ خود فراقؔ نے ایسے افعال کو نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے، جیسے اُن کی وہ غزل، جس کا ایک سادہ و تہ دار شعر یہ ہے:

جو بے خواب رکھے ہے تا زندگی ۔۔۔۔۔۔ وہی غم کسی دن سُلا جائے ہے

یہاں پر اس نکتے کی طرف توجہ دلانا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ ایسے بہت سے مقامات آتے ہیں، مصرعے کے درمیان میں یا قافیے کے محل پر، جہاں "آتا ہے"، "جاتا ہے" جیسے افعال اگر لائے جائیں تو "آتا" اور "جاتا" وغیرہ کا الف دب جاتا ہے اور نہایت درجہ ناگوار صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں صرف ایک مثال سے اپنی بات کو واضح کرنا چاہوں گا: داغؔ کی ایک غزل ہے، جس کا ایک مصرع یہ ہے، ع: میں نے وہ رنج اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے (انشائے داغؔ، ص ۱۴۳)، قافیہ کس قدر مخلِ فصاحت اور بارِ سماعت ہے! اگر دیگر اساتذۂ دہلی (ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ وغیرہ) کی طرح داغؔ یہاں پر "جی جانے ہے" لکھتے تو وہ خرابی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، آج کل، اساتذۂ متوسطین کی طرح، ایسے افعال کو بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے اور وہ واقعی لطف دے جاتے ہیں۔ مثلاً اِس زمانے کی ایک ممتاز غزل گو خاتون کی ایک غزل کے یہ دو شعر دیکھیے:

کیا قیامت ہے کہ راہِ عشق میں ہر گام پر ۔۔۔۔۔۔ منزلوں کا فاصلہ کچھ اور بڑھتا جائے ہے

(حاشیۂ گذشتہ)

اِس شبِ تاریک میں تنہا ہوں اپنی تنہا ہوں میں   کوئی جگنو، کوئی تارا، جی بہت گھبراتے ہے

(خانم ممتاز مرزا)

اصل بحث کے بعد ایک ضمنی بات کہنا چاہتا ہوں: فراقؔ نے ولیؔ کے جس شعر کو پیش کیا ہے، وہ اس طرح صحیح نہیں۔ کلیاتِ ولی، مرتبہ مولانا احسن مارہروی نیز کلیات مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی میں یہ شعر اس طرح ہے:

"ولیؔ اُس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے"

رضا لائبریری رام پور کے ایک مخطوطۂ دیوانِ ولیؔ میں، دوسرے مصرعے میں "آتا ہے" کی جگہ "آوتا ہے" ہے، یعنی: "مرے گھر اس طرح آوتا ہے، جیوں سینے میں راز آوے"۔ بہر حال، یہ شعر تحقیقِ مزید کا محتاج ہے۔ مگر اس اختلافِ متن سے فراقؔ کی بات پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ فراقؔ کی بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے اور مثلاً اس ایک شعر کی جگہ اور بیسیوں شعر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

مولانا حسرتؔ موہانی نے اپنے رسالے نکاتِ سخن میں، اس سلسلے میں اساتذۂ متقدمین و متاخرین کے یہاں سے بہت سی مثالیں پیش کی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ افعال کی یہ صورت کس قدر مروج رہی ہے اور کس قدر برمحل استعمال ہوا ہے اِن کا۔ میں یہاں پر مولانا مرحوم کی مکمل عبارت اور کچھ مثالیہ اشعار نقل کرتا ہوں:

["آتے ہے" اور "جاتا ہو" نواحِ دہلی مثلِ میرٹھ، بلند شہر، علی گڑھ میں آج تک عوام کی زبان پر جاری ہے مگر تحریر نثر و نظم میں اب لکھنؤ کے مانند دہلی میں بھی یہ الفاظ بالاتفاق متروک سمجھتے ہیں۔ راقمِ حروف کے نزدیک بھی اس قسم کے الفاظ کا ترک جائز ہے لیکن ضرورتِ شاعری کے خاص موقعوں پر، بہ شرطِ مشاقیِ کامل، ان کے استعمال میں بھی کچھ مضائقہ نہ ہونا چاہیے۔ مثلاً مرزا نسیمؔ دہلوی کا ایک مصرع ہے "رحم آجاتا ہے دشمن کی گرفتاری پر" مرزا صاحب

(حاشیہ گذشتہ)

اگر زبانِ لکھنؤ کی پابندی سے آزاد ہو کر "رحم آجاتا ہے" کی جگہ "رحم آجائے ہے" لکھتے تو کچھ حرج نہ ہوتا بل کہ غالباً بہتر ہوتا۔ یہی حال بیخود دہلوی، شاگردِ داغ کے اس مطلع کا ہے:

کوئی چل جاتا ہے جب تیرِ نظر، تیر کے ساتھ
خود تڑپ جاتا ہے صیاد بھی، نخچیر کے ساتھ

اب متقدمین سے لے کر متوسطین و متاخرین و شعرائے دورِ حاضر کے کلام سے اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

پل مارتے کرے ہے اشاروں سے متہم
ٹک اس ستم ظریف کا بہتان دیکھیو (قائم)

دل لے گیا ہے میرا وہ سیمیں تن چُرا کر
شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چُرا کر (مصحفی)

کون آتے ہے کہ سینے میں بیدار ہو گئی
صد آرزوئے خفتہ، صدائے قدم کے ساتھ (ممنون)

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے (غالب)

اب یہ حالت ہے کہ تجھ سا بے درد
میرے بچنے کی دعا مانگے ہے (تسکین)

برسے ہے لہو، جنبشِ ابرو کی ادا میں
خنجر کو ڈبو دیجیے خونِ شہدا میں (بنواری لال شعلہ)

دوزخ، کفِ خاکستر و جنت، ثمرِ خام
ڈھونڈے ہے ٹھکانا دلِ بے بال و پر اپنا (شاکی میرٹھی)

"خوردونوش" زیادہ مستعمل ہے۔ فقط "نوش" اِس محل پر زبان نہیں، اور کوئی عیب بھی نہیں ہے۔ مضمون اچھا ہے اور معناً درست ہے، لہٰذا رہنے دیجیے۔ اصلاح سے زیادہ ہر جگہ وجوہِ اصلاح لکھنا دشوار ہے۔ اور اکثر وجوہ وجدانی ہوتے ہیں، جن کو طبعِ سلیم سمجھ لیتی ہے۔"

[بنام زاہد سہارن پوری، ۲۶ جولائی ۱۸۹۱ء]

(۴۷) بہارِ ہند۔ انگریزی الفاظ۔ فرہنگِ فرنگ:

"میرے پاس بھی الف سے ی تک مسلسل معنی وشل کے ساتھ لغت موجود ہے۔

کام یابِ عشقِ بے حد ہے دلِ عشرت نصیب
آرزو کے سر سے گزرا جائے ہے آبِ نشاط [حسرت موہانی]

(نکاتِ سخن، انتظامی پریس حیدرآباد ص ۳۲-۳۳)

لہ زاہد کا شعر یہ تھا:

"روزی گرے پڑوں کو پہنچتی ہے آن کے گھر ہے میرے لبوں کا لہو، نوشِ نقشِ پا"

(مشاطۂ سخن، اوّل، ص ۵۹)

مشاطۂ سخن میں اس شعر کی اصلاح کے ذیل میں امیر کے خط کا اِس سے متعلق اقتباس بھی ہے۔ مجموعۂ مکاتیب اور اس میں بعض الفاظ کا فرق ہے۔ میں نے "خوردونوش" سے متعلق عبارت مشاطۂ سخن کے مطابق رکھی ہے۔

جمیل سہوانی نے صفدر مرزاپوری (مؤلفِ مشاطۂ سخن) کے نام ایک خط میں زاہد کا یہی شعر نقل کر کے لکھا ہے:

"منشی صاحب نے اِس شعر کی تعریف فرمائی اور کچھ اصلاح نہ دی، لیکن میرا خیال ہے کہ لبوں میں لہو نہیں ہوتا، پانی ہوتا ہے۔ معلوم نہیں جناب منشی صاحب کی

جس کا نام میں نے بہارِ ہند[1] رکھا تھا، مگر وہ فارسی عبارت میں گلشنِ فیض کی قطع کا ہے۔ اب جہاں تک ممکن ہو، اُس سے بڑھانا مقصود ہے امیر اللغات اُس سے کئی حصّے زیادہ ہوگا۔

انگریزی الفاظ سے مجھے کوئی مناسبت نہیں، اس لیے اس کا ایسا ذخیرہ نہ میرے سینے میں ہے نہ سفینے میں، جس سے یہ معلوم ہو کہ اتنے الفاظ اردو نے قبول کر لیے ہیں۔ کتابیں بھی ایسی اب تک بہت کم ملک میں تالیف ہوئی ہیں۔ صرف فرہنگِ فرنگ[2] اور بعض اخبار کے اوراق، جن میں ایسے لفظ جمع کیے گئے ہیں، دفتر میں موجود ہیں؛ اس لیے میں تم کو ایسے الفاظ کے جمع کرنے کی ضرور تکلیف دوں گا۔

سے کیوں کر رہ گیا۔ اس کو سوائے سہوِ نظر کے اور کیا کہوں" (مرقعِ ادب، دوم، ص ۸۲)

[1] اِس لغت کا پتا نہیں چلتا، امیر کے سوانح نگاروں نے دو تین سطروں میں اس کا ذکر کیا ہے جس میں محض نقلِ قول ہے کسی نے اس کو دیکھا نہیں امیر نے اپنے خطوں میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ میں نے کتاب خانہ رام پور میں اور بعض دوسرے مقامات پر اس کو تلاش کیا، لیکن کچھ پتا نشان نہیں ملا۔ میرا خیال ہے کہ یہ کتاب جو امیر اللغات کا نقشِ اول تھی چھپی نہیں اور امیر اللغات جیسے وسیع الذیل لغت کے سامنے، اس کی قدر و قیمت خود مولّف کی نگاہوں میں ختم ہو کر رہ گئی۔

ہاں، "بہارِ ہند" نام کا ایک اور لغت ہے جس کے مولّف ہیں مرزا محمد مرتضا عرف مچھو بیگ عاشق لکھنوی "خلف الرشید مرزا چھو بیگ صاحب ہائے خویشِ محمد مصطفیٰ خاں مطبع مصطفائی، شاگردِ مرزا اصغر علی خاں نسیم" (شعلۂ جوالہ، متوفی: ۱۸۹۳ء، ۱۳۱۱ھ (تاریخِ لطیف، قلمی، رضا لائبریری رامپور) یہ لغت جون ۱۸۸۹ء میں مطبعِ شوکتِ جعفری لکھنؤ میں چھپا تھا۔ صرف حرفِ الف پر مشتمل ہے۔ باقی حصے نہیں چھپ سکے، یہ بھی نہیں معلوم کہ مرتب ہوئے تھے یا نہیں اس کا ایک نسخہ دلی یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے

[2] اِس کتاب کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ امیر کی تحریر سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انگریزی

تم نے جو انگریزی الفاظ امیر اللغات میں کم پائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کمیٹی میں بہ اتفاق یہ رائے قرار پائی کہ امیر اللغات میں وہی الفاظ انگریزی کے داخل کیے جائیں، جن کی جگہ اردو میں کوئی فصیح، مختصر اور ٹھیک انھی معنوں میں لفظ موجود نہیں ہیں۔ آفس، آنھر، آڈر وغیرہ لکھے لکھائے مسودے سے خارج کر دیے گئے، کیوں کہ "آفس" کی جگہ کچہری اور دفتر اور "آنھر" کی جگہ مصنف "آرڈر" کی جگہ حکم موجود ہے۔ آنر، آنریبل، آنریری وغیرہ لکھے گئے ہیں۔"

[بنام تنا، ۲۶ ستمبر ۱۸۹۱ء]

(۲۲) نجم الامثال خزینۃ الامثال :

"امیر اللغات میں مدد دینے سے ہاتھ نہ روکو، یعنی جو کچھ ہو سکے وہ لکھا کرو اور ممنون و مشکور کیا کرو۔ اگر نجم الامثال[1] کے سوا کوئی ذخیرہ مثلوں اور

الفاظ پر مشتمل کوئی کتاب ہو گی، مگر مؤلف فرہنگِ آنند راج (سالِ ترتیب: ۱۳۰۶ھ) نے اس کو اپنے مآخذ میں گنایا ہے اور لفظ "باہم" کے ذیل میں اس کا حوالہ دیا ہے؛ اِس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ کسی مستشرق کا لغت ہو گا۔ لغت نامۂ دہخدا کے چالیسویں حصے میں، لغاتِ فارسی سے متعلق جو مقالہ ہے، اُس میں مقالہ نگار نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے فرہنگ آنند راج کے مآخذ کا ذکر کرتے ہوئے، فرہنگِ فرنگ کے متعلق لکھا ہے: "مقصودش از فرہنگ فرنگ درست معلوم نہ شد۔ گویا کتاب لغتِ جانسن یا استینگس است کہ ہر دو لغتِ عربی و فارسی با انگلیسی است۔" (ص ۲۳۰)۔

[1] یہ کتاب مولوی محمد نجم الدین دہلوی کی تالیف ہے۔ مؤلف اینگلو سنسکرت اسکول دہلی میں "مدرسِ اوّل فارسی و ریاضی" تھے۔ یہ پہلی بار مطبع مجتبائی دہلی میں ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ میں

شانِ امثال کا ملے تو بڑا کام نکلے۔ مثلیں تو خزینۃ الامثال میں ملتی ہیں، مگر
شانِ امثال نہیں ملتی۔"

[بہ نام زاہد، ۱۳ر جنوری ۱۸۹۲ء]

چھپی تھی (قطعاتِ تاریخِ طباعت، شاملِ کتاب)، یہ اڈیشن کم یاب ہے۔ رضا لائبریری رام پور میں اس اڈیشن کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اس کا تیسرا اڈیشن مولّف کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا جس میں مولّف نے (دیباچۂ کتاب کی صراحت کے مطابق) خاصی ترمیم و تنسیخ کی تھی۔ یہ اڈیشن میری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ اس کا چوتھا اڈیشن پیشِ نظر ہے، جس کو کارخانہ پیسہ اخبار (لاہور) نے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا ہے۔ مولّف کی صراحت کے مطابق یہ کتاب پانچ حصّوں پر مشتمل تھی، باقی چار حصّے غالباً شائع نہیں ہو سکے۔ مولّف نے اس کتاب کے حصّوں کی جو تفصیل درج کی ہے، اس کی بنا پر یہ مطبوعہ جلد حصّۂ پنجم ہے، اور اس پانچویں حصّے میں "کئی ہزار ضرب الامثال یعنی کہاوتیں مع ان کے محلِ استعمال اور قصص کے بہت ایجاز اور اختصار کے ساتھ، سلیس اردو میں بیان ہوئی ہیں۔" یہ اڈیشن، نہایت خراب بادامی کاغذ پر چھپا ہے اور ۳۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلا اڈیشن صرف ۱۲۸ صفحات پر حاوی تھا۔ موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب ایسی دوسری کتابوں سے زیادہ جامع اور مفصّل ہے، بل کہ بعد میں شائع ہونے والی کتابوں کا ماخذ رہی ہے۔

۲؎ اس کے مولّف ہیں سید حسین شاہ حقیقت۔ یہ عربی، فارسی، اردو، تینوں زبانوں کی ضرب الامثال پر مشتمل ہے۔ ہر حرف کے ذیل میں پہلے عربی امثال ہیں، پھر فارسی، پھر اردو۔ عربی امثال کا بین السطور ترجمہ بھی ہے اور حواشی پر مزید تشریح بھی کی گئی ہے۔ یہ ترجمہ اور حواشی، مولوی تراب علی صاحب کے ہیں، جو انھوں نے عبدالرحمان خاں ابن حاجی محمد روشن خاں (برادرِ محمد مصطفیٰ خاں، مالکِ مطبعِ مصطفائی) کی فرمایش پر لکھے تھے۔ مولّف کی صراحت کے

(۲۳) بہ سلسلۂ امیر اللغات۔ سقوطِ الف۔ جرس کھڑکنا:

"امیر اللغات کی جلدِ ثانی غالباً الفِ مقصورہ ہی پر تمام ہو، یا شاید بائے موحدہ کا بھی کوئی ٹکڑا شریک ہو جائے۔ تم سے اگر ممکن ہو تو زبان کی اصلیت، کہ ابتدا کہاں سے یہ زبان پیدا ہوئی اور کن کن تغیرات کے بعد اس حد کو پہنچی، وغیرہ وغیرہ لکھو۔ تذکرۂ آبِ حیات میں آزاد نے اور جلوۂ خضر میں صفیر نے

مطابق، یہ کتاب ۱۲۱۵ھ میں مرتب ہوئی۔ اس میں صرف امثال ہیں، شانِ مثل یا سند مذکور نہیں۔ ۱۲۰۷ھ میں مصطفائی پریس کانپور میں چھپی تھی۔ کل ۲۲۴ صفحات ہیں۔ تذکرۂ سراپا سخن کے مولف محسن، انھی حقیقت کے صاحب زادے تھے۔ اس کا ایک نسخہ دہلی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ہارڈنگ لائبریری دلی میں بھی ایک نسخہ ہے۔

خزینۃ الامثال نام کی ایک اور چھوٹی سی کتاب بھی ہے جس کے مرتب ہمارے زمانے کے کئی نصابی کتابوں کے مرتب حافظ جلال الدین احمد جعفری ہیں۔ اس میں ۲۳۰۰ امثال ہیں چھوٹے سائز کی کتاب ہے جو ۲۰ صفحات پر حاوی ہے۔ مطبعِ انوارِ احمدی میں چھپی ہے سنہ طباعت درج نہیں، طلبہ کے مطلب کی کتاب ہے۔

امثال کی قدیم کتابوں میں ایک اور کتاب بھی قابلِ ذکر ہے: بابو کالی چرن (ہیڈ کلرک سررشتۂ تعلیم) نے دو حصوں پر مشتمل ایک مجموعۂ امثال مرتب کیا تھا۔ پہلے حصے میں، جو ۱۲۵ صفحات پر مشتمل ہے، فارسی امثال ہیں، اور دوسرے حصے میں کہ یہ بھی ۱۲۵ صفحات پر حاوی ہے، اردو امثال ہیں۔ اس مجموعے میں صرف مثلیں لکھی گئی ہیں، نہ معانی ہیں نہ محلِ استعمال کا ذکر ہے۔ حصۂ اول کا نام "فارسی امثال" ہے اور حصۂ دوم کا "اردو امثال"۔ یہ کتاب مطبعِ "سوسائٹی بریلی" میں ۱۸۶۸ء میں چھپی تھی۔ نہ مقدمہ ہے نہ خاتمہ۔ دونوں حصے ایک جلد میں ہیں۔ اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے۔

اور گلستانِ سخن میں مرزا صابر بخش شاہزادۂ دہلی نے کچھ کچھ اس بحث کو لکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ امیر اللغات میں یہ بحث ان سے الگ اور نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھی جائے۔ مگر اس کے مادّے کا پتا نہیں لگتا کہ کہاں سے اخذ کیا جائے۔ تم کہیں سے ٹٹولو گا، تو میں بھی فکر میں ہوں۔ جو کچھ آزاد و صفیر وغیرہ نے لکھا ہے، امیر اللغات میں اس کی نقل کر دینے کو تو جی نہیں چاہتا۔ نئی باتیں بھی پیدا ہوں اور ان کے ضمن میں یہ باتیں بھی سب آجائیں۔

الف کا گرنا جائز نہیں۔ ہندی کا الف جو آخر میں ہو، وہ گرتا ہے۔ بعض شعرائے جو ایسا کہا ہے، وہ قابلِ استناد نہیں، کیوں کہ اساتذہ کی طرف سے وہ ہمیشہ موردِ ایرادات رہے ہیں۔

مطلعے میں میں نے دخل دیا ہے:

ہاتھ تک اس کے جو ہو دسترسِ جامِ شراب
کیوں نہ اس ہاتھ سے ہو پھر ہوسِ جامِ شراب

دوسرے مصرعے میں "اس ہاتھ سے" کی جگہ "مے خواروں کو" بنا دیا ہے، کیوں کہ لطف اسی قدر مضمون میں ہے کہ جب جامِ شراب کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُس کے ہاتھ تک پہنچتا[1] ہے، تو ایسے جامِ شراب کی ہوس بے خواروں کو کیوں نہ ہو۔ جب "اس ہاتھ سے" کہیے گا تو جامِ شراب کے اس ہاتھ تک پہنچنے کا فائدہ کچھ نہ رہے گا۔

"جرس کا کھڑکنا"[2] فصحا نہیں کہتے [اس لیے بدلا گیا] [بنامِ زاہد، ۲۴ رجون ۱۸۹۲]

---

[1] مجموعۂ مکاتیب میں یہ جملہ غلط چھپا ہے۔ مشاطۂ سخن (اول) میں اصلاحاتِ امیر کے ذیل میں اس خط کا اقتباس بھی ہے، اس جملے کی تصحیح وہیں سے کی گئی ہے۔

[2] زاہد کا شعر یہ تھا:

(۲۴) بہ سلسلۂ امیر اللغات :

"میں استقرائے کلام اور لغات سے عوام اور خواص کے وہی الفاظ لیتا ہوں جو اردوئے لغت کی شان پر پھبتے ہیں۔ آپ کے رسالہ الفاظ میں بھی جو لفظ ایسے ملیں گے، داخلِ لغت کیے جائیں گے۔ میں نے بہت دنوں ملک کی رائے پر کام کرنا چاہا، مگر باہم رایوں کا اختلاف اس قدر ہوا کہ میں عاجز آگیا۔ چند نازک خیال اور عالی دماغ احباب نے یہی رائے دی کہ ان جھگڑوں میں لغت تالیف سے رہ جائے گا، صرف اپنی رائے کو دخل دینا چاہیے[1]۔ ناچار میں اب اپنی ہی رائے سے کام لیتا ہوں، اور جو عزیز یا دوست میری مدد کرتا ہے، اور اپنی کوئی صائب رائے ظاہر کرتا ہے، اس کا شکر گزار ہوتا ہوں، اور اس کی رائے ماننے نہ ماننے میں ہٹ دھرمی نہیں کرتا۔

قافلے ہوش کے رخصت ہوئے مے خواروں سے

شب جو مے خانے میں کھڑکا جرسِ جامِ شراب

امیر نے دوسرے مصرع کو یوں بنایا: مع: صحن کے مے خانے میں شورِ جرسِ جامِ شراب

(مشاطۂ سخن، اول، ص ۲۰)۔ قوسین کے الفاظ بھی مشاطۂ سخن سے منقول ہیں۔

[1] ممتاز علی آہ امیر اللغات کے دفتر میں پانچ چھے سال کام کرتے رہے تھے، انھوں نے امیر کے سوانح پر ایک کتاب لکھی ہے، اس میں لکھتے ہیں:

"اصولِ تالیف میں ملک کے نامور قابل اصحاب سے رائے لی گئی اور ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کے ممبر مولوی حفیظ اللہ، مدرسۂ عالیہ عربی کے پروفیسر، مولوی فصیح الزماں خاں صاحب فصیح، منشی عبدالرحمان صاحب بسمل، منشی محمد احمد صاحب صریر، حکیم نعیم الزماں خاں صاحب نعیم، حافظ محمود علی صاحب فدا

آزردگی، آسودگی، آشفتگی، آوارگی، یہ سب قاعدے کی بنا پر چھوڑ دیے گئے۔ اور آزادہ رو، آفس، آفیسر، آوارہ مزاج، آنچل ڈھلنا، بے شک امیر اللغات میں[1] نہیں ہیں۔ بعض تو اختلافِ رائے کی وجہ سے عاجز ہو کر چھوڑ دیے۔ مثلاً "آفس" کہ اس کی جگہ کچہری اور دفتر کا لفظ موجود ہے۔ جو آدھی انگریزی اور آدھی اردو بولتے ہیں، زیادہ انھی کی زبانوں پر یہ لفظ ہے۔ اور "آفیسر" لکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی، "افسر" موجود ہے، اور اس دوسرے حصّے میں لکھا گیا ہے۔ اور بعض نقصِ استقرا سے رہ گئے۔ یہ الزام بے جا ہے۔ اس کا دعوا کبھی نہیں کیا گیا کہ امیر اللغات میں کوئی لفظ چھوٹ نہ جائے گا، کیوں کہ یہ محال ہے۔ بڑے بڑے فارسی اور عربی کے لغات موجود ہیں جن میں روزمرّہ کے صدہا الفاظ نہیں ملتے۔ صراح وغیرہ پر دس ہزار لغات صاحبِ قاموس نے بڑھائے۔ صاحبِ غیاث اللغات نے کیا کچھ کوشش نہیں کی، مگر پھر بھی صدہا الفاظ نہیں ملتے۔ اردو میں اس وقت جتنے لغت

تھے، اور حضرت امیر مینائی صدر۔ تجویز یہ قرار پائی تھی کہ دن میں جس قدر تالیف ہو، شب کو اُسے کمیٹی سن لیا کرے۔ دو مہینے تک روزانہ شب کو یہ کمیٹی کام کرتی رہی، مگر بحث و مباحثہ نہ رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ "آ" کا لفظ بھی ختم نہ ہوا۔ آخرکار یہ رائے قرار پائی کہ مولّف اپنے ہی اجتہاد سے کام لے، تب جاکے کام چل نکلا۔"

(سوانحِ امیر، ص ۱۱۳)

[1] امیر اللغات کا حصّہ اول ۱۸۹۱ء میں مطبعِ مفیدِ عام آگرہ میں چھپا تھا، اس پر جو اہم تبصرے ہوئے وہ جلدِ دوم کے شروع میں شامل کر دیے گئے، جو اسی پریس میں ۱۸۹۲ء میں چھپی تھی۔ ان میں ایک تبصرہ منشی محمد یاسین مستحق وکیل گورکھپور کا ہے جس میں مندرجہ مکتوب الفاظ کے چھوٹ جانے کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے۔

لکھے گئے ہیں، اُن کا یہی حال ہے کہ پہلے میں دس لغت ہیں تو دوسرے میں بیس. تیسرے میں پچاس ہیں تو چوتھے میں سو- ہاں میں نے یہ قصد کر لیا ہے کہ جو لغات، حصۂ چھپنے کے بعد چھوٹے ہوئے معلوم ہوں گے، وہ سب ایک جگہ جمع ہوتے جائیں گے اور ختمِ کتاب کے بعد ایک ضمیمہ اُن کا لگا دیا جائے گا، جیسا کہ صاحبِ برہانِ قاطع نے کیا ہے[۳]۔"

[بنام تفتہ۔ ۲۷ر ستمبر ۱۸۹۲ء]

---

[۳] برہانِ قاطع کا ضمیمہ، صاحبِ برہان کا مرتّب کیا ہوا نہیں۔ اس کا پہلا اڈیشن ٹامس روبک نے ۱۸۱۸ء میں شائع کیا تھا۔ برہان کے قلمی نسخوں میں مختلف مقامات پر جو حواشی لکھے ہوئے تھے ان کو روبک نے بطورِ ملحقات، آخرِ کتاب میں درج کر دیا اور بہ قولِ قاضی عبدالودود صاحب، خود بھی اُس میں اضافہ کیا۔

برہانِ قاطع، مطبوعۂ تہران کے مرتّب ڈاکٹر محمد معین نے جو یہ لکھا ہے کہ:

"ملحقات برہان قاطع، تالیف عبدالمجید قائم مقام قاضی القضاۃ بہاری و مولوی بدیع الدین و مولوی عبداللہ و مولوی مجیب الرحمان و حکیم عبداللہ و عبدالصمد و عبدالماجد، مشتمل بر لغات و کنایاتیکہ در متن برہان نیامدہ اند و آں بعنوان (تتمہ) ضمیمہ برہان قاطع چھاپ کلکتہ سال ۱۲۵۰ قمری (۱۸۳۴م) و نیز چاپ کلکتہ ۱۲۴۷ قمری (۱۸۵۸م) بطبع رسیدہ است" (مقدمہ)۔

یہ درست نہیں، کیوں کہ عبدالمجید والا اڈیشن جس کا ذکر ڈاکٹر معین نے کیا ہے، نسخۂ روبک کی نقل ہے، جو اس سے ۱۶، ۱۷ برس پہلے ۱۸۱۸ء میں شائع ہو چکا تھا۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے گراں قدر مقالے "غالب بہ حیثیتِ محقق" میں اس پر مفصّل بحث کی ہے۔ قاضی صاحب کی عبارت کا ایک اقتباس:

"تیرھویں صدی میں اس کی مقبولیت کو دیکھ کر روبک کو اس کے طبع کرانے کا

(۲۵) بہ سلسلۂ امیر اللغات۔ سہ حرفی الفاظ میں ساکن کو متحرک کرنا۔ قدس:

"شانِ امثال میں میں نے یہ رائے قرار دی ہے کہ جس حکایت میں خلافِ عقل و عادت کوئی بات نہ ہو، وہ ضرور لکھی جائے۔ میرا گمان ہے کہ مانعین بھی وہی لوگ اکثر ہیں، جو نیچر کے خلاف اُمور پر معترض ہیں:

الفاظِ مثلثہ میں ساکن کو متحرک کرنے کا قاعدہ عام نہیں ہے، بلکہ جس قدر اساتذہ نے تصرف کر لیا، اُسی قدر جائز ہے۔

اور خواجہ نصیر[1] مرحوم کا کلام استناد کے لیے کافی نہیں ہے۔ قادر سخنان فارسی

خیال آیا اور اس نے اس کی تصحیح میں متعدد ہندستانی فارسی دانوں کے علاوہ دو ایرانیوں سے بھی مدد لی۔ نسخۂ روبک کا انگریزی مقدمہ خود روبک اور فارسی سید کرم حسین بلگرامی کا لکھا ہوا ہے۔ حواشی روبک کے تحریر کردہ ہیں، مگر جیسا کہ اس نے خود اعتراف کیا ہے، تاریخی چرن متر نے اسے مدد دی تھی۔ ملحقات کو جو خاص خاص نسخوں کے حواشی میں تھے، روبک نے کتاب کے آخر میں درج کیا اور خود بھی ان میں بہت سے لغات کا اضافہ کیا اور موخر الذکر و مقدم الذکر میں تمیز کے لیے، رموز استعمال کیے۔ روبک کا نسخہ ۱۸۱۸ء میں چھپا تھا۔ اس کے چار برس بعد یہ کتاب پھر طبع ہوئی اور تیسری بار ۱۸۳۴ء میں چھپی۔ طبع ثالث کے ناشر حکیم عبد المجید تھے اور اس کے سرورق پر صراحتاً مرقوم ہے کہ یہ نسخۂ روبک کی نقل ہے۔ حواشی اور ملحقات مع اضافات اس میں اسی طرح ہیں جس طرح نسخۂ روبک میں ہیں، مگر حکیم صاحب نے دونوں دیباچے حذف کر دیے ہیں۔" (نقدِ غالب، ص ۳۶۶)

برہانِ قاطع ۱۰۶۲ھ میں مکمل ہوئی تھی (دیباچہ برہان)، ڈاکٹر محمد معین استادِ دانش گاہِ تہران نے اس کو چار جلدوں میں مرتب کیا تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس اڈیشن میں ملحقات کو شامل نہیں کیا گیا۔

[1] ابتدا تو مجھے دھوکا ہوا تھا کہ شاہ نصیر دہلوی کو امیر نے "خواجہ نصیر" لکھ دیا ہے۔ محب (باقی آگے)

نے کہا ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ معہذا، خواجہ نصیر نے "قدس" بمعنی پاک نہیں کہا ہے بلکہ "قدس" ایک شہر کا نام تھا، وہاں کے دشت کو کہا ہے، ع: اور وحشی نے ترے دشتِ قدس کی تیلیاں۔

مستوں کی چشمِ مست کی مژہ کو عکسِ جامِ شراب سے تشبیہ دے سکتے ہیں؛

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے شاہ نصیر کا کلیات مرتّب کیا ہے، موصوف نے میرے استفسار کے جواب میں لکھا کہ: "آپ نے جو مصرع لکھا ہے، یہ شاہ نصیر کے یہاں ہے ہی نہیں"۔ اور اس سلسلے میں مزید لکھا کہ: "یہ صاحب جن کو خواجہ نصیر کہا گیا ہے، وہ شاہ نصیر عرف میاں کلّو نہیں ہیں، خواجہ غلام حسین نصیر ہیں جن کا ذکر تذکروں میں مل جاتا ہے اور بعض دکنی بیاضوں میں ان کا کلام بھرا پڑا ہے۔ ایک بیاض سے میں نے بیسیوں صفحے نقل کروا کے منگاتے تھے، بعد میں پتا چلا کہ نصیر نام سے دھوکا ہو گیا، یہ تو شاہ نصیر کے بجائے خواجہ نصیر ہیں"۔

ے قُدس (بہ ضمّ اول و سکونِ دوم)، یروشلم کو کہیں گے اور قُدُس (بہ ضمّ اول و ضمّ دوم)، کے معنی ہیں: قدح صغیر (المنجد)۔ شاعر نے اگر اس کو اول الذکر معنی میں نفس و قفس کا ہم قافیہ کیا ہے، تو اس کو شاعرانہ تصرّف یا شاعرانہ مجبوری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہو گی جیسے مومن نے ایک جگہ ثمر (بہ سکونِ دوم)، کو "ثمَر" بہ فتحِ دوم نظم کیا ہے۔ ایسے استعمالات سے یہ لازم نہیں آتا کہ لفظ کی اصل حرکات بدل ہی جائیں، جیسا مومن کے استعمال کرنے کے باوجود لفظ ثمر کی حرکات میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہی صورت "قدس" کی ہے۔ ہاں بعض الفاظ میں اختلافِ حرکت رونما بھی ہو جایا کرتا ہے، جیسے: اخضر۔

ے عکسِ مژہ چشم کو خسِ جامِ شراب سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، دی بھی گئی ہے، جیسے: ذوق کا یہ شعر:

بادۂ صاف میں آیا ہے کہاں سے تنکا ۔۔۔ عکسِ مژگاں ترا سے کش! ہے خسِ جامِ شراب

(دیوانِ ذوق، مرتبہ آزاد، ص ۱۰۲)

مژہ کو عکسِ جامِ شراب قرار دینا، میری نظر سے کہیں نہیں گزرا۔

لیکن ایسی تشبیہات میرے نزدیک کراہت سے خالی نہیں۔ شعرا نے خال کو مگس سے تشبیہ دی ہے، اور بحرؔ نے بہ اعتبار نیش کے، زنبور کے ساتھ تشبیہ دے لی ہے۔"

[بہ نام زاہدؔ، ۱۲ر فروری ۱۸۹۳ء]

(۲۶) باٹ:

"اردو میں "راہ باٹ" تو کوئی بولتا بھی ہے، فقط "باٹ" بمعنی انتظار تو ذرا بھی مستعمل نہیں ہے۔"

[بہ نام زاہدؔ، ۱۹ر مئی ۱۸۹۳ء]

(۲۷) گوہرِ انتخاب۔ سرمۂ بصیرت:

"گوہرِ انتخاب میں بہت سے اشعار وہی ہیں جو مجھے وقتاً فوقتاً تلف شدہ دیوان کے یاد آتے گئے۔ یہ دیوان غدر میں تلف[۱] ہو گیا۔

---

[۱] ذوقؔ کا شعر ہے:

لب تک اُس کے جو ہوئی دسترسِ جامِ شراب ۔۔۔ بن گیا خالِ لبِ اُس کا، مگسِ جامِ شراب

(دیوان، ص ۱۰۱)

[۲] جلیلؔ مانک پوری نے سوانحِ امیر مینائی میں لکھا ہے:

"غدر کے زمانے میں اُن کا بہت سا کلام تلف ہو گیا۔ اُس ہنگامے کے بعد رام پور جانے اور اطمینان ہونے پر اُن کو خیال ہوا کہ تلف شدہ کلام کے کچھ اشعار اگر یاد آ جائیں تو لکھ لینا چاہیے۔ چنانچہ غور کرنے سے جو جو شعر یاد آتے گئے، وہ سب قلم بند کر لیے گئے؛ اس طرح ایک چھوٹا سا مجموعۂ مفردات ہو گیا جس کا نام "گوہرِ انتخاب" رکھا گیا۔ مرآۃ الغیب کے بعد لکھنؤ میں یہ مختصر مجموعہ

سرمۂ بصیرت، چھپی نہیں، قلمی ہے۔"

[بنام زاہد۔ ۲۴ رجون ۱۸۹۳ء]

چھپ گیا تھا۔ بعد کو جب اس کی کاپیاں باقی نہیں رہیں تو ضمِ خانۂ عشق کے ساتھ مکرر چھپوا کر آخر میں لگا دیا گیا ہے"۔ (ص ۵۸)

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ امیر نے اس مجموعے میں میر و درد کے اندازِ سخن کی پیروی کی ہے امیر کا درجِ مکتوب قول اور جلیل کی مندرجۂ بالا عبارت اس خیال کی تردید کے لیے کافی ہیں۔

"گوہرِ انتخاب" میں جلیل کے قول کے مطابق ۱۱۹ شعر ہیں، جن میں اکثریت مطلعوں کی ہے۔ داغ کے اِس قطعے سے جو شاملِ مجموعہ ہے، اس کی تاریخِ ترتیب و طبع معلوم ہوتی ہے:

وقتِ ترتیب امیر نے لکھا	"گوہرِ انتخاب" ہے تاریخ	(۱۲۸۵ھ)
داغ ہنگامِ طبع بول اٹھا	"دلِ بر انتخاب" ہے تاریخ	(۱۲۹۰ھ)

یہ پہلی بار مطبعِ حسینی رام پور میں چھپا تھا۔ کُل صفحات ۸۸، مسطر گیارہ سطری ہے۔

۲۔ امیر نے کئی خطوں میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے لیکن مجھے باوصفِ تلاش، اِس نام کی کوئی کتاب نہیں ملی۔ ہاں، کتاب خانۂ رام پور میں امیر کا ایک غیر مطبوعہ لغت ضرور ہے، جس کا نام معیار الاغلاط ہے۔ یہ مخطوط مہدی علی خاں مرحوم (سابق تحویل دارِ کتب خانۂ رام پور) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ جو امیر کے خاص شاگرد تھے۔ میرا خیال ہے کہ امیر نے آخر میں "سرمۂ بصیرت" کے بجائے اس کا نام معیار الاغلاط رکھ دیا تھا۔ معیار الاغلاط میں عربی، فارسی کے ایسے الفاظ کو جمع کیا گیا ہے جن کا تلفظ دورج لغت حرکات سے مختلف طور پر کیا جاتا ہے۔ اُن کو غلطی سے مہند سمجھا جاتا ہے۔

اِس موضوع پر قاضی محمد صادق اختر نے ایک رسالہ لکھا تھا، جس کا نام لوامع النور ہے۔ کتاب خانۂ رام پور اس کا مخطوط موجود ہے۔ دونوں کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ امیر نے بہت سے مقامات پر حوالے کے بغیر لوامع النور کی عبارتوں کو نقل کر لیا ہے۔

(۲۸) بہ سلسلۂ امیر اللغات ۔ تعدادِ اشعار ۔ سنگلاخ زمینیں :

"لُغت کی خوب صورتی بڑھانے اور کسی قدر اختصار کی راہ میں نے یہ نکالی ہے کہ اب صرف وہی مفردات اور مرکبات وغیرہ لکھے جائیں جو زبانوں پر رات دن کی بول چال میں ہوں، جن میں نظم و نثر کی تخصیص ہے، وہ چھوڑ دیے جائیں۔

تم نے تو "فرسِ جامِ شراب" اور "قفسِ جامِ شراب" میں دریا بہا دیے۔ اب ذرا طبعِ رواں کو روکو۔ ہر زمین میں اشعار کی تعداد غزل سے ڈیڑھ جانا چاہیے۔ ہر زمین کا ایک پیمانہ ہوا کرتا ہے[1] جہاں اس سے بڑھ جاتی ہے بدنمائی آجاتی ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ سنگلاخ زمینوں میں لاکھ کوشش کی جائے مگر مزے دار شعر ایسے نہیں ہوتے ہیں کہ سُننے والے چٹخارے بھرنے لگیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمھارا سا مزے دار شاعر اپنا وقت ایسی شورو لا حاصل

اسی موضوع پر جلال نے بھی ایک کتاب لکھی تھی: تنقیح اللغات، جو اُس زمانے میں شوق نیموی وغیرہ کے اعتراضات کا ہدف بنی تھی۔ شوق نیموی نے اس سلسلے میں کئی رسالے لکھے تھے، جن میں سے ایک رسالہ ازاحۃ الاغلاط واقعتاً قابلِ ذکر ہے۔ امیر کے کسی شاگرد نے بھی تنقیح اللغات کا رد لکھا تھا جس کا مخطوطہ کتاب خانۂ رام پور میں محفوظ ہے۔ اس رسالے میں کہیں یہ صراحت نہیں ملتی کہ اس کا مولف کون ہے۔ فہرستِ کتب خانہ میں مولف کے خانے میں "یکے از شاگردانِ امیر" لکھا ہوا ہے جو بعض قرائن کی بنا پر صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[1] امیر نے ایک مقطعے میں بھی اس خیال کو ظاہر کیا ہے :

سیر کہنا تو غزل کچھ نہیں دشوار امیرؔ ــــ خوف یہ ہے کہ نکل جائے نہ پیمانے سے

(صنم خانۂ عشق ص ۲۸۲)

زمینوں میں ذہ صرف کرے۔ لوچ دار زمین اختیار کرو، تو دیکھو کیا مزہ آتا ہے۔
اب اس زمین کو بھی چھوڑ دو، اور ہمیشہ کے لیے ایسی زمینوں کو ترک کرو۔"

[بنام تراب، ۳۰ جون ۱۸۹۳ء]

لیکن اس کی پابندی نہیں کی، جن زمینوں میں، جو غزلے پنچ غزلے کہے ہیں، اُن میں اشعار کی تعداد، قصیدے کی تعدادِ اشعار کی حریف ہو گئی ہے۔ مثلاً مراۃ الغیب میں ایک غزل بے ردیف اور قوافی ہیں "عید کا" "دید کا"، اس زمین میں امیر نے پنچ غزلہ کہا ہے، کُل تعدادِ اشعار اکھتر ہے۔ ایسی مثالیں ان کے یہاں خاصی تعداد میں مل سکتی ہیں۔

ے قدما کے زمانے میں سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنا لازمۂ استادی ہو کر رہ گیا تھا، خصوصاً وہ لوگ اس مرض میں بُری طرح مبتلا تھے جو شعر کہنے کے بجائے، شعر بنانے کا فن اچھی طرح جانتے تھے، لیکن تعجب اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے زمانے کے بہت سے جدید تر شعرا بھی اس کج خرامی کے امانت دار ہیں اور لطیفہ یہ ہے کہ وہ اس کو جدت کی نمائش بلکہ اس کا اعلان نامہ سمجھتے ہیں۔ رسائل میں عجیب الخلقت زمینیں دیکھنے میں آتی ہیں، جیسے اڑیل ٹو کے، چراغ کی اوٹ، بہار کے گھونٹ وغیرہ۔ اس رجعتِ قہقری کو کیا کہا جائے۔ جہادِ کم نظری کے اِن اسیروں کو یہ معلوم نہیں کہ یہ کاروبار اب سے بہت پہلے، بہت بڑے پیمانے پر ہو چکا ہے اور اپنے مسموم اثرات کو ظاہر کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، ان غریبوں کو نہ ردیف کے چسپاں ہونے کا اندازہ ہوتا ہے اور نہ اس کا کہ لفظوں کو کن پہلوؤں سے بٹھایا جاتا ہے۔ نہ چستیِ بندش سے آشنا ہوتے ہیں، نہ مرادف الفاظ کے فرق سے اور ستم بالائے ستم یہ کہ قدرتِ کلام سے تہی داماں ہوتے ہیں، نتیجے کے طور پر ایسی غزلیں، بے سرو پا لطائف کا مجموعہ معلوم ہوتی ہیں۔ ایسے حضرات کے لیے امیر کی یہ رائے قابلِ توجہ ہے یہ اُس شخص کی رائے ہے جس کو شور زمینوں کو سرسبز کرنے کا فن آتا تھا اور قدرتِ کلام جس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی۔

(۲۹) "تو" کی تذکیر و تانیث :

"تو" کی تذکیر و تانیث ہی کیا، مگر جس محلِ استعمال کی رو سے آپ پوچھتے ہیں اُس جگہ تو یہی کہیں گے کہ: "اس نے مجھے تو کہا" لیکن اِس سے تذکیر و تانیث "تو" کی نہیں پیدا ہوتی، بل کہ اس جگہ لفظِ "لفظ" مقدّر ہوتا ہے، جیسے: "اس نے مجھے عورت کہا" دیکھیے، "عورت" تو قطعی مونث ہے۔ وقس علیٰ ہٰذا۔"

[بہ نام زاہد۔ ۹ر دسمبر ۱۸۹۳ء]

(۳۰) تضمین :

"آگ لگی" والی غزل پر مصرعے لگانے کے واسطے تم نے مجھ دل جلے کو تجویز کیا، یہ بھی تمہاری طبیعت کی گرما گرمی کا ایک نتیجہ ہے۔ غزل کے گرم ہونے میں کوئی شبہہ نہیں، مگر بہ نظر اپنے تجربات کے میں جب ایسے بدمّمن شعر دیکھتا ہوں تو میرا دل دھڑکتا ہے۔ "وطن میں آگ لگی"[1] اور "انجمن میں آگ لگی" وقس علیٰ ہٰذا، ایسے شعروں پر میں ہرگز مصرعے لگانے کی جرأت نہیں کرتا۔ کوئی اور مختصر سی اچھی غزل میرے واسطے تجویز کر کے بھیجو تو تضمین کا ارادہ کروں۔ میں اب شاعر نہیں رہا۔ شاعری کے واسطے طبیعت میں امنگ شرط ہے، وہ جوانی کے ساتھ سدھاری، بڑھاپے میں جوش کہاں! کبھی کسی دوست کی فرمائش سے مجبور ہو کر کچھ کہہ لیتا ہوں تو ہڑے ہی جبر سے، پھر اس میں مزہ کہاں سے آئے اور جب اپنا کلام آپ ہی پسند نہ آئے تو اوروں کو کیونکر رجھائے۔"

[بہ نام زاہد ۱۳ر جون ۱۸۹۴ء]

---

[1] زاہد کی اس غزل کا مطلع یہ تھا،

وفورِ سوزشِ دل سے بدن میں آگ لگی
یہ آگ گھر کی جو پھیلی، وطن میں آگ لگی

(مشاطۂ سخن، حصۂ اول، ص ۶۱)

اکثر لغت نئے ملے اور اکثر شعر بھی کام آئے۔ دریائے لطافت بھی دفتر میں ہے، مگر اُس کے دیکھنے کی نوبت کم آتی ہے بلکہ نہیں آتی۔ اس کے محاورے جو تم نے انتخاب کیے، وہ مفید ہوئے۔ نظیر کے کلام نے ایک لفظ کا فائدہ نہیں دیا۔ ان کے ماورا جو تم نے بعض بعض الفاظ کے نوٹ لکھے ہیں، اور مثلوں کی شان لکھی ہے، اُن کا ماخذ معلوم ہونا چاہیے کہ کہاں سے اور کس کتاب سے لیے گئے ہیں۔ امیر اللغات میں تو وہی لکھنا ہوتا ہے جو کسی صورت سے نامعتبر نہیں ہوتا۔ غالب ہے کہ تم نے اس کا خیال کر لیا ہوگا۔"

[بنام ثاقب - ۱۲ر جون ۱۸۹۵ء]

(۳۵) بلعم باعور:

"تمھارے ایک شعر کے معنی نہیں سمجھا کہ "بلعم باعور کی طرح درویش دسر کی پوٹ" کیا چیز ہے؟ یہ مضمون غالباً کسی قصّے سے متعلق ہوگا، جو مجھے معلوم نہیں۔"

[بنام ثاقب - ۳ر مارچ ۱۸۹۶ء]

لے نظیر کے کلام میں ایسے لفظ بہت ہیں جو لُغت میں نہیں ملتے۔ نظیر کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ انھوں نے عام بول چال اور مقامی بول چال کے الفاظ بہ کثرت نظم کیے ہیں۔ امیر کا یہ لکھنا کہ "نظیر کے کلام نے ایک لفظ کا فائدہ نہیں دیا"، لُغت نویسی کے محدود تصوّر کا ترجمان ہے۔ ایسے کسی لغت کو مکمل نہیں کہا جا سکتا جس میں نظیر وغیرہ کے کلام میں مستعمل الفاظ شامل نہ ہوں۔

دریائے لطافت کے متعلق جو کچھ امیر نے لکھا ہے، وہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ یہ کتاب تو نہایت کارآمد ہے۔ اصل میں معیار پسندی کے محدود تصوّرات نے یہ سارے گُل کھلائے ہیں اور اُس زمانے میں حکومت اِسی کی تھی۔ امیر بھی، لغت نویس ہونے کے باوصف، اُس حصار کو توڑ نہیں پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لفظ آج لُغات میں نظر نہیں آتے، جب کہ وہ تصنیفات میں موجود ہیں۔

"کر دے گی" کی یائے اول کا گرنا، ناپسند کر کے، اُس کی جگہ "کر گئی"[سے] بنانا ٹھیک ہے۔ اب اپنے وجدانِ سلیم سے کام لیجیے اور اس مصرعے کو یوں ہی رکھیے، جیسا میں نے بنایا ہے۔

"باٹ دیکھنا" راہ دیکھنے کے معنی میں، فصحائے دہلی و لکھنؤ کی زبان نہیں۔ میر کا کہنا، اس وقت سند نہیں ہو سکتا، اُس وقت بولتے ہوں گے، اب کوئی نہیں بولتا۔

مخزن المحاورات چرنجی لال کا کیا اعتبار! اس میں ہزاروں محاورے گنواروں کے لکھے ہیں؛ من جملہ اُن کے ایک یہ بھی ہے۔ بہرکیف "باٹ دیکھنا" کسی طرح صحیح نہیں۔ میں بھی آپ سے متفق ہوں۔

تیسرا حصّہ لغت کا مدت سے تیار ہے۔ بے سرمایگی اُس کی طبع سے مانع ہے۔ دفتر، ابتر اور پریشان ہوا چاہتا ہے؛ بل کہ ہو گیا۔ کام بند ہو گیا ہے۔ بڑا افسوس ہوگا اگر یہ کتاب ناتمام رہ گئی۔ اور یہ افسوس نہ صرف مجھ کو ہی رہے گا؛ بل کہ تمام ملک کو۔"

[بہ نام زاہد: ۱۹ ستمبر ۱۸۹۵ء]

(۳۴) بہ سلسلۂ امیر اللغات:

"لغت کا تیسرا حصّہ تمام ہوا اور نظرِ ثانی بھی ہو گئی۔ اب کچھ یوں ہی سا کام اُس میں باقی رہا ہے۔ میں نے آپ کے اجزا اب نکالے اور دیکھے؛ اُن میں

سے مجموعۂ مکاتیب میں "کر گئی" کے بجائے "کر دے گی" ہے، لیکن یہ درست نہیں ہو سکتا۔ زاہد کا شعر یہ تھا:

جگر کو گرمیِ بنتِ عنب نے پھونک دیا — حلال کر دے گی زاہد کو یہ حرام کی بوند

امیر نے دوسرا مصرع یوں بنایا تھا: حلال کر گئی زاہد کو یہ حرام کی بوند (رشحاتِ سخن)

(۳۱) بہ سلسلۂ امیراللغات :

"اشعار سند میں نہ دیے جائیں، اس کو تو میں خود بھی پسند نہیں کرتا، چاہے کوئی کتنی ہی مخالفت کرے۔ اور مجھے یاد بھی نہیں آتا کہ کسی نے مخالفت کی ہے۔ ہاں، حصۂ اول میں جس کثرت سے شعر دیے گئے تھے، تو وہ ضرورت سے زیادہ نظر آتے تھے؛ اسی لیے کمی ضرور ملحوظ ہے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ فقرہ جس قدر محلِ استعمال کو ٹھیک بتاتا ہے، شعر سے اتنا واضح نہیں ہوتا؛ اس لیے شعر کم کر کے، فقرہ خوب صورت بن پڑتا ہے، تو وہی درج کیا جاتا ہے۔"

[بہ نام زاہد - ۲۰ر فروری ۱۸۹۴ء]

(۳۲) ابر کی بوند :

"مینہ کی بوند، منہ کے پانی کی بوند، یہ سب درست ہے، مگر ابر کی بوند مستعمل نہیں"۔

[بہ نام زاہد، ۲۰ر ستمبر ۱۸۹۴ء]

(۳۳) ابر کی بوند - باٹ دیکھنا - مخزن المحاورات - امیراللغات کا تیسرا حصہ :

"ابر کی بوند بے شک شعرا نے [اور شاہ نصیر اور داغؔ] نے کہا ہے؛ اس سے یہ غلط نہیں کہا جا سکتا، لیکن اپنی اپنی پسند ہے۔ زبانوں پر مستعمل نہ ہونے سے میری طبیعت اس کو پسند نہیں کرتی۔ اگر آپ اپنے کلام میں لکھنا چاہتے ہیں تو چنداں مضائقہ بھی نہیں۔

لے قوسین کی عبارت مجموعۂ مکاتیب میں موجود نہیں۔ مشاطۂ سخن میں بہ ذیلِ اصلاحاتِ امیر اس خط کا اقتباس مندرج ہے؛ اس میں یہ ٹکڑا موجود ہے۔ زاہد کا شعر یہ تھا :

"ہوا ہے سرد، مجھے سوز دل شراب پلا　　پڑے اگر کوئی ابر سیاہ فام کی بوند"

لے مجموعۂ مکاتیب میں "زبانوں" سے ہے۔ میں نے یہ جملہ مشاطۂ سخن کے مطابق لکھا ہے۔

(۳۶) بلعم باعور:

"بلعم باعور کا جو حال تم نے لکھا ہے[1]، میں نے دیکھا۔ اب وہ شعر بے تکلف رکھنے کے قابل ہے۔"

[بہ نام زاہد - ۱۹ر اپریل ۱۸۹۶ء]

(۳۷) زکریا:

"زکریا، بہ فتحتین، بکسرِ را و تشدید یا آیا ہے۔ اس میں کوئی تغیرِ اعراب تک نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ "زکریا" ذال سے بالکسر لکھتے ہیں، اور سکونِ ثانی و تخفیفِ یا کے ساتھ بولتے ہیں، محض غلط ہے، خواہ دہلی والے ہوں خواہ لکھنؤ والے۔"

[بہ نام زاہد - ۲۶ر ستمبر ۱۸۹۶ء]

(۳۸) زکریا:

"میں لکھ چکا ہوں اور پھر لکھتا ہوں کہ "زکریا" ز سے ہے۔ ذال سے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، اور اس کے اعراب میں بھی تغیر ممکن نہیں ہے[2]۔"

[بہ نام زاہد - ۳۰ر ستمبر ۱۸۹۶ء]

---

[1] مشاطۂ سخن میں اس جملے کے بعد یہ عبارت بھی ہے: "بنی اسرائیل کا ایک بڑا عالم و عابد تھا۔ جو بڑھاپے اور کثرتِ زہد و عبادت سے ایسا نحیف ہو گیا تھا کہ تلامذہ اس کو پوٹلی میں باندھ کر دوش در دوش لیے پھرا کرتے تھے۔ انشا نے بھی اپنے مقطع میں کہا ہے:

حاسد تو ہے کیا چیز جو کرے قصد حوانشا • تو توڑ دے جھٹ بلعم باعور کی گردن"

میرا خیال ہے کہ یہاں پر زاہد کے خط اور امیر کے خط کی عبارت خلط ملط ہو گئی ہے۔ زاہد نے اصلاح امیر کے ذیل میں اپنے خط کی اس عبارت کو لکھا ہوگا، جو امیر کی عبارت کے ساتھ آمیز ہو گئی۔

[2] یہ نام ہے ایک معروف پیغمبر کا، اور اس نام کے طور پر اس کی حرکات ناقابلِ تغیر ہیں، مگر یہ انقلاب

(اگلے صفحے پر)

(۳۹) سقوطِ الف۔ نشہ۔ قرار۔ اعلانِ نون:

"الفاظ چندیں میں سے آخر کا حرف گرتا ہے، بیچ کا حرف نہیں گرتا [فلہٰذا "میاں" کی تصحیح کر دی گئی]۔ "نشے" میں "ی" سے پہلے ہمزۂ مفروضہ[1] چاہیے۔

"قرار" بہ معنی اقرار، عربی و فارسی میں نہیں ملتا۔ بغیر واوِ عطف "قول قرار" کو جس طرح آپ نے اُردو کر لیا ہے، اس کا مضائقہ نہیں۔

عام لوگوں کے نام کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے: رفیق زکریا۔ بل کر گلگتے میں تو "زکریا اسٹریٹ" ایک علاقے کا نام ہے۔ ایسے عام ناموں کے طور پر اس لفظ کے اعراب میں تغیر ہو چکا ہے اور اس کو بہ فتح اول و دوم، بہ سکونِ سوم و یائے مخفف مفتوح بولتے ہیں یعنی، زَکَرْیا۔ ان اعراب کو بھی اب تسلیم کر لینا چاہیے۔

[1] یہ خیال کر اُردو میں "نشے" میں "ے" سے پہلے ہمزۂ مفروضہ لازماً ہونا چاہیے صحیح نہیں۔ اردو میں یہ لفظ بہ فتح شین یعنی "نشَہ" یا "نَشا" بھی مستعمل ہے اور یہ اُردو کا تصرف ہے۔ چند اسناد پیش کی جاتی ہیں، اثباتِ مدعا کے لیے یہ کافی ہیں:

ہشیاری کے برابر کوئی نشا نہیں ہے (میر، کلیاتِ مرتبہ آسی، ص ۳۶۰) یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں (ایضاً ص ۲۹۶) اِس غزل کی ردیف ہے "میں نشے میں ہوں"۔ کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اس کی میر (ایضاً ص ۵۰۳) نشا اور کچھ دل کو بھایا ہے شاید (میر سوز) نے نشے میں جو تجھ یوں قدحِ بنگ اڑے (انشا۔ کلامِ انشا، ص ۲۲۳) مخمور ہیں نشے میں جہاں گر پڑے، پڑے (ایضاً ص ۲۱۷) یاں وہ نشے نہیں جنھیں ترشی اتار دے (ذوق، دیوان مرتبہ آزاد، ص ۲۲۳) رات مے خانے میں ساقی جو نشے میں بہکا (ایضاً ص ۱۰۱) کیوں نشے میں توڑتے ہو رکھ کے ساغر زیرِ پا (ایضاً ص ۸۸) نشے میں عجز کے بے جور کوئی (حالی۔ مسدس۔ تاج کمپنی، ص ۹۳) نشے میں مے حق کے سرشار سارے (ایضاً ص ۲۳) نشے میں مے عشق کے چور ہیں وہ (ایضاً ص ۵۰) نشے زندگی کے سب

اضافت کی حالت میں اعلانِ نون جائز نہیں۔

آثار ے تمھارے (دتّہ لکھنوی۔ دیوان، نول کشور پریس، ص ۱۳۹)

یہاں پر ایک بات قابلِ غور ہے، امیر کا شعر ہے:

ڈورے نشئے کے دختِ رز ہے ۔۔۔ در پردہ ہیں رشتہ دل لگی کا

(صنم خانۂ عشق ص ۵۸)

بہ قولِ امیر اس میں "نشئے" لکھا جائے گا یعنی ے سے پہلے ہمزہ آئے گا، پڑھنے میں بھی اور لکھنے میں بھی یہ تو ٹھیک ہے، مگر امیر کے اس شعر میں:

"ہم کیا کریں کہ سے میں ترے جامِ جم سے ۔۔۔ جو شیشہ تھا، وہ نشۂ مستی سے چور تھا"

(صنم خانۂ عشق، ص ۴۹)

"نشہ" کو کس طرح لکھا جائے گا؟ اس میں بہ قولِ امیر ایک ہمزہ تو جزوِ لفظ ہے، اور ایک ہمزہ اضافت کی علامت کے طور پر آئے گا، یعنی اصولاً اس کو "نشۂ" لکھنا چاہیے اور یہ مسلمات میں سے ہے کہ اس لفظ کا یہ املا آج تک نہیں دیکھا گیا۔ اس کی جگہ "نشہ" ہی لکھا جاتا ہے، اور اس کا واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ اس صورت میں شین کو مشدّد پڑھنا پڑے گا، یعنی: "نشّۂ مستی سے چور تھا"۔ اس کے سوا اور کوئی صورت نظر نہیں آتی اور اس صورت میں یہ کہنا کہ "نشئے" میں "ے" سے پہلے "ہمزۂ مفروضہ" ضروری ہے، لازماً صحیح نہیں ہو سکتا۔

اربابِ لغت اس لفظ میں متفق نہیں، مختلف اقوال ملتے ہیں۔ اردو میں بول چال کی حد تک یہ لفظ صرف بہ فتحِ شین مستعمل ہے اور نظم میں بہ فتحِ شین و بہ سکونِ شین، دونوں طرح آتا ہے، مگر یہ بیش تر "نشہ" دیکھا جاتا ہے۔ اردو کی حد تک مناسب یہ ہوگا کہ اس کا املا "نشہ" مانا جائے۔ یہ بروزنِ فعَل بھی آئے گا، اور "نشّہ" بروزنِ فعلن بھی آسکتا ہے، جب یہ بروزنِ فعلن آئے، اُس صورت میں اس کو بہ تشدیدِ شین لکھا جانا چاہیے، یعنی ہوا: جو شیشہ تھا وہ نشّۂ مستی سے چور تھا۔ لفظ اس موضوع پر ایک مستقل مضمون میں بحث کی گئی ہے، جو شاملِ کتاب ہے، اُسے دیکھا جائے۔

یہ شعر مجھ کو جی سے پسند آیا۔ بارک اللہ! خوب کہا ہے:

وہ آنکھوں میں ہے پتلیوں کی طرح　　مگر دیکھنے کو نظر چاہیے"

[بہ نام زاہد۔ ۱۳ جولائی ۱۸۹۷ء]

ویا۔ باہمدگر۔ پر۔ پرے پیار:

"ویا"[1] اب بالکل متروک ہے، اس کی جگہ صرف "یا" بولتے ہیں [یا کاف سے کام لیجیے، جو "یا" کے معنی میں آتا ہے]۔

"باہمدگر" کی صحت میں کلام[2] ہے۔ "بایک دگر" ہو سکتا ہے، یا محض "ہمدگر" چاہیے

---

[1] ناسخ اور ان کے شاگرد وزیر کے یہاں یہ لفظ موجود ہے:

بعدِ مدت سو گیا ہوں چین سے　　یہ جنازہ ہے ویا گہوارہ ہے

ناسخ (کلیات طبع اول، ص ۲۳۱)

جب ذ تب کہتے ہو، صاحب صبر کر　　بندہ عاشق ہے، ویا ایوب ہے

(" " ص ۲۵۱)

جب ذ تب منہ دیکھ لیتا ہے وہ قاتل کھینچ کر　　یہ کٹاری ہے ویا اس کی کمر میں آئنہ

(" " ص ۲۲۲)

ذاق، خوش رہو جس جا رہو، مرے صاحب　　ملو ویا نہ ملو، ہم نباہ کرتے ہیں

وزیر (دفترِ فصاحت، ص ۱۳۴)

متاخرین نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔

[2] امیر کی یہ رائے صحیح نہیں۔ "باہمدگر" کی صحت میں مطلق کلام نہیں کیا جا سکتا۔ فارسی میں یہ لفظ موجود ہے، وہیں سے یہ لفظ ہمارے یہاں آیا ہے۔ سلیمان حبیم کے لغت میں یہ لفظ موجود ہے (جلد اول، ص ۲۲۱)۔ غالب نے قاطع برہان میں کئی جگہ اس کو استعمال کیا ہے، مثلاً لفظ "بر پروشان" کے

لکھیے۔

"پہ" بہ معنیِ لیکن و دیگر، واجب الترک ہے، بجائے پر، جو ہر جگہ مستعمل ہے (کذا)

تحت انھوں نے لکھا ہے: "و تبدیلِ شینِ نقطہ دار و شینِ مہملہ باہمدگر، اصطلاحیست محکم در ضوابط زبانِ ایران"۔ لفظ "برخ" کے ذیل میں لکھا ہے: "در این شش معنی موافق و نہ باہمدگر متحد و مرادف"۔

مولفِ آصف اللغات نے "باہم" کو "باہم دگر" کا مخفف لکھا ہے (جلد نہم)۔ اساتذۂ اردو نے بھی اس کو استعمال کیا ہے، مثلاً:

باہمدگر رکھے ہے میاں عالم اختلاط (قائم چاند پوری۔ دیوانِ قائم، عکسِ نسخۂ انڈیا آفس لندن، دیاان کو باہمدگر التیام (قائم) ہوتی ہے (ذوق قیس و کوہ کن باہمدگر اک جا (آشنا۔ کلام الشا، ص ۳۴) اٹھ جاتے چاہیے سب باہمدگر تکلف (ایضاً ص ۱۱) خود پرستی سے رہے باہمدگر نا آشنا (غالب، دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، ص ۱۹) باہمدگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب (ایضاً ص ۲۲) اگر اختلاف ان میں باہمدگر تھا (حالی۔ مسدس۔ تاج کمپنی، ص ۲۳) باہمدیگر ہیں خشتِ بنیاد (شفق لکھنوی۔ مثنوی تنظیم الحیات، حصۂ حمد)۔

ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبارت میں بعض لفظ چھوٹ گئے ہیں۔ آمیر کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ "پر" بہ معنیِ لیکن و دیگر مستعمل ہے، مگر اس کا مخفف "پہ" واجب الترک ہے۔ "پر" بہ معنیِ لیکن و دیگر کے مخفف "پہ" کو اساتذۂ لکھنؤ نے بالاتفاق متروک قرار دیا ہے، البتہ "پر" (بہ معنیِ لیکن) کے ترک میں اختلاف ہے۔ جلال نے اپنے تیسرے دیوان مضمونِ ہائے دلکش میں جہاں اپنے متروکات کی فہرست درج کی ہے، اس لفظ کو بھی بذیلِ متروکات لکھا ہے۔ شوق نیموی نے رسالۂ اصلاح میں اور مولفِ نور اللغات نے لکھا ہے کہ بعض فصحا نے ترک کر دیا ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے صاحبِ نور اللغات کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"لیکن میں وہ بات کہاں جو بعض موقع پر لفظ "پر" سے پیدا ہوتی ہے، مثلاً:

(باقی اگلے صفحے پر)

نہ ہوا، پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ذوقؔ، یاروں نے بہت زور غزل میں مارا"

(فرہنگِ اثر، ص ۸۸)

شوق نیموی نے وضاحت کی ہے: "فی الواقع "پر" بہ معنی لیکن، بہ کثرت مستعمل تھا۔ استادی جناب شمشاد لکھنوی، جن کو متروکات کا بہت خیال ہے، ان کے دیوانِ اول میں، جس کا نام خمخانۂ خیال ہے، یہ لفظ موجود ہے۔ اور مولف بھی پہلے اس لفظ کا تارک نہ تھا، مگر رسالۂ اصلاح کی وجہ سے جب بہت سے لوگ احتیاط کرنے لگے، حتیٰ کہ کچھ دنوں سے جناب شمشاد کو بھی احتیاط کی ہے، تو مولف نے بھی وجوباً ترک کر دیا ہے۔" (حاشیۂ رسالۂ اصلاح، ص ۱۲)

مولفِ اصلاحِ زبانِ اردو نے لکھا ہے: "لیکن کے معنوں میں "پر" کا استعمال اب فصحا نے ترک کر دیا ہے۔ آخر میں جلال و داغ نے بھی ترک کر دیا تھا۔" ــــــ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے امیر مینائی کے شاگرد حکیم برہم نے لکھا: "پر کا استعمال لیکن کے معنی پر بہ کثرت ہے۔ اگر کچھ لوگ نہیں کہتے تو اس سے متروک نہیں ہو سکتا۔ امیر نے آخر تک اس کو جائز رکھا ہے اور دیگر شعرا بھی استعمال کرتے ہیں۔" (مرقعِ ادب، جلدِ دوم ص ۶۱) برہم نے ٹھیک لکھا ہے کہ امیر نے آخر تک اس کو جائز رکھا تھا۔ صنم خانۂ عشق سے صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

بے تکلف نشے نے تو اُن کو کر دیا پر وہ شرمیلی نگاہوں کا مزا جاتا رہا

خورشید لکھنوی نے اپنے رسالے افادات میں لکھا ہے:

"اب اُن الفاظ کا ذکر کرتا ہوں جنھیں بعض اساتذہ ترک کر چکے ہیں . . . مگر چوں کہ مجھے یقین ہے کہ ان کے ترک میں ضرور دقت پڑے گی اور مزہ کلام میں باقی نہ رہے گا، لہٰذا میں نے ترک نہیں کیے ہیں، اور نہ اپنے تلامذہ و احباب کو صلاح ان کے ترک کی دیتا ہوں، کیوں کہ میں تجربہ کر چکا ہوں کہ بعض اشعار سے جو ان لفظوں کو نکال کے اور بدل کے دیکھا، تو وہ مزہ جو پہلے تھا، باقی نہ رہا" (ص ۴۲)۔

اور اس ذیل میں انھوں نے "پر" بہ معنی لیکن کو بھی لکھا ہے ــــــ مختصر یہ کہ "پر" بہ معنی لیکن

"پرے" لکھنؤ میں بالکل متروک ہو گئے۔ اور دلّی میں بھی اب فصحا کے کلام میں کو محض بعض نے ترک کر دیا، مگر بیش تر نے اس کو استعمال کیا ہے۔ امیر کی بھی یہی روش رہی اور ان کے کلام میں اس کی مثالیں بالعموم ملتی ہیں۔

لکھنؤ کے اساتذۂ متاخرین میں سے بعض نے "پر" کے مخفف "پہ" کو، خواہ وہ کسی معنی میں ہو متروک قرار دیا تھا اور اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ: "ہندی میں کوئی لفظ جس کے آخر میں ہائے مختفی ہو، نہیں پایا جاتا، اس واسطے کہ ہندی میں ہائے مختفی نہیں آتی۔ پس معلوم ہوا کہ اس لفظ کی کچھ اصل نہیں، "پر" کے مقام پر، زبانوں پر غلط مستعمل ہو گیا ہے" (دستور الفصحا)۔ جلال نے اس کو اپنے تیسرے دیوان میں شامل فہرستِ متروکات میں داخل کیا ہے، اگرچہ وہ اس کو استعمال کر چکے تھے:

دل کس کو دیا، لاکھ یہ پوچھا کیے احباب　　دل ہی میں رہا، لب پہ ترا نام نہ آیا

صفیر بلگرامی نے "پر" کے ذیل میں لکھا ہے: "اردو میں یہ حرف مخفف بھی آیا ہے یعنی (پہ)، رائے مہملہ گرا کر، بہ ضرورتِ وزن۔ لکھنؤ میں ناسخ تک نے تو جائز رکھا، مگر رشک نے اس تخفیف کو ناجائز قرار دیا اور اپنے کلام سے اس تخفیف کو تخفیف کر دیا، لیکن خواجہ وزیر، اور رجبر، تحر وغیرہ شاگردانِ ناسخ نے ناسخ کی تقلید کی" (رشحاتِ صفیر، ص ۶۱)

اس بے معنی التزام کو ان شاگردانِ ناسخ کی طرح، دوسرے بہت سے اساتذہ نے بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ مولفِ اصلاحِ زبانِ اردو نے لکھا تھا: "پہ" کا استعمال اب اکثر فصحا نے ترک کر دیا ہے۔ آخر میں داغ و جلال نے ترک کر دیا تھا"۔ حکیم برہم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: "کسی نے ترک نہیں کیا اور نہ کوئی شاعری اس سے خالی ہو سکتی ہے۔ داغ کے آخری دیوان میں صدہا جگہ بندھا ہوا ہے" (مرقعِ ادب، دوم، ص ۶۰)۔ ــــــ اصل میں اس طرح کے التزامات، محض مصنوعی حیثیت رکھتے تھے اور ان کو قبولِ عام حاصل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

میرے بعض دوست جو بات مجھ سے پوچھتے ہیں، اپنی رائے ناقص کے موافق ان کو بتا دیتا ہوں۔ اسی مشرب کی بنا پر میں تاریخ بحوث عنہ سے بحث نہیں کرتا اور آپ کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ بے فائدہ دردِ سر مول لیا کیجیے۔

جب خصوصیت مباحث متعلقہ تاریخ سے قطع نظر کی گئی، تو اب بتانے کی بات یہ رہی کہ مشتری ستارہ، مذکر ہے یا مونث؟ واضح ہو کہ یہ ستارہ، مونث ہے۔ اور جہاں کہیں سخن دانوں اور سخن وروں نے استعمال بہ تذکیر کیا ہے، وہاں ستارہ مقصود نہیں ہے، جس کو مشتری سے تشبیہ دی ہے۔[1] جیسے ناسخ کے اس مطلع پر:[2]

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا | روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

اُن کے شاگردِ رشید مرزا محمد رضا برق[3] نے جو مصرعے لگائے ہیں، اس میں قمری کو جس کی تانیث میں کسی کو اختلاف نہیں، بہ تذکیر استعمال کیا ہے، تو بات یہی ہے کہ وہاں قمری طائر مقصود[4] نہیں ہے۔ وہ تضمین یہ ہے:

---

[1] عبارت میں بعض لفظ چھوٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ امیر کی مراد یہ ہے کہ جہاں یہ لفظ مذکر استعمال ہوا ہے، وہاں اس سے دراصل وہ وجود مقصود ہے جس کو مشتری سے تشبیہ دی گئی ہے، نہ کہ ستارۂ مشتری۔

[2] کلیاتِ ناسخ مطبع مولائی ص ۲۔

[3] فتح الدولہ، بخشی الملک، مرزا محمد رضا خاں برق، تلمیذ ناسخ (تذکرۂ نادر)، واجد علی شاہ کے مصاحب اور استاد تھے۔ متوفی ۱۲۷۴ھ (کلیاتِ قتیل)۔ ان کا دیوان ان کی زندگی ہی میں بہ حکم واجد علی شاہ اور بہ تصحیح امیر علی خاں ہلال (تلمیذ برق)، مطبع سلطانی لکھنؤ میں ۱۲۶۹ھ میں چھپا تھا۔

[4] جلال اس سے بہت پہلے اس طرف توجہ مبذول کرا چکے تھے۔ انھوں نے مفید الشعرا میں

(۱۴۴) دنبل :

"دنبل" لفظ عربی ہے، "دمامیل" اس کی جمع ہے۔ "دنبل" صحیح نہیں۔ آپ کے قلم سے کسی جگہ یوں ہی نکلا، لہٰذا اغلاطاً لکھا گیا۔"

[بہ نام زاہد۔ ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۷ء]

غزل ہے جس کی ردیف "پیارے" بروزن فعولن ہے۔ مطلع: تیر ایک دم دا اس پن تو تو جیا پیارے ؛ کیا کہ کے مجھ کو رو دیں یہ کیا کیا پیارے (ص ۳۳۲) نگاہ و کہکشاں میں سورج سے ہے پیارا چاند (آتش، کلیات، نول کشور پریس، ص ۳۶۸) کیا ہوئی تو مری پیاری آج (مومن۔ دیوان مرتبہ ضیا احمد صاحب، ص ۴۷)۔

"پیارا" کی طرح "پیاسا" اور "دھیان" کو بھی بہ اظہار یا نظم کیا گیا ہے۔ غالباً میر انیس کا مصرع ہے: قوم کے ہاتھ سے ہوتے ہیں پیاسے مقتول۔ ذوق کا مصرع ہے: کہ ہے آشام پیاسے ہیں پینا بھر کے۔ کہ اس کو میرے سوا اور کا دھیان نہیں مومن (دیوان مرتبہ ضیا احمد، ص ۱۵۴)۔

اس کے برخلاف بھی ہوا ہے جیسے "پیالہ" بہ اظہار یا فصیح مانا جاتا ہے مگر اس کو بہ یائے مخلوط بھی نظم کیا گیا ہے مثلاً: دونوں جہان کی نہ رہی پھر خبر آنے ؛ وہ پیالے تیری آنکھوں نے جس کو پلا دیے (میر درد، دیوان شائع کردہ مکتبہ جامعہ، ص ۸۱) یا اس یگانہ کا شعر ہے: خواہ پیالہ ہو یا لوٹا ہو ؛ بن پڑے تو جھپٹ لے، بھیک نہ مانگ (آیات وجدانی)

بات دراصل یہ ہے کہ اس قبیل کے کئی لفظ ہیں جن میں سے بعض کو بہ اخفائے یا فصیح مانا گیا اور بعض کو بہ اظہار یا۔ ایسے لفظوں میں پیار، پیاس، پیالہ، پیاز، پیال، پیادہ، دھیان قابل ذکر ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے تلفظ میں کبھی کبھی مختلف کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میری رائے میں ایسے الفاظ کے کسی ایک تلفظ پر مہر نہیں لگانا چاہیے۔ ذوق کے مصرعے میں "پیاسے" بہ اظہار یا نظم ہوا ہے اور قطعاً خلاف فصاحت نہیں معلوم ہوتا۔ یہی صورت اور الفاظ کی بھی ہے اور ہو سکتی ہے۔

(۴۲) دنبل:

"دنبل کی صحت میں اس لیے کلام ہے کہ کہیں فارسی میں پایا نہیں جاتا۔"

[بنام آزاد، ۲۶؍ اکتوبر ۱۸۹۷ء]

(۴۳) دنبل:

"دنبل کا فارسی میں ہونا آپ کی اس تحریر سے معلوم ہوا۔ آپ نے جن لغات کا، یعنی ہفت قلزم[1] و تتمۂ برہانِ قاطع[2] کا حوالہ دیا ہے، میں بھی اُن میں ان شاء اللہ دیکھوں گا۔"

[بنام تمنا، ۵؍ دسمبر ۱۸۹۷ء]

(۴۴) بحث اور استفتا، مشتری کی تذکیر و تانیث:

"استفتے سے متعلق میں سچ کے طور پر آپ کو اپنا مشرب لکھتا ہوں کہ میں بہت سہام ملامت ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور تمام عمر تجربہ ہوا کہ اول تو مناظرہ جو احقاقِ حق سے عبارت ہے، ہوتا ہی نہیں۔ اور بالفرض ابتدا میں کہیں ہوتا بھی ہے، تو انجام کار مکابرے اور مجادلے کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ لہٰذا میں بھی اِن جھگڑوں میں نہیں پڑتا، اور کسی استفتے پر فتوا نہیں دیتا۔ البتہ

---

[1] بضمِ اول و سکونِ نون و فتح موحدۂ تحتانی و لام زدہ، معروف است۔ و آنرا در تازی "دمل" گویند، بہ ضمِ دالِ ابجد و تشدیدِ میم۔ و بفتح دالِ ابجد و سکونِ نون: مرمارے است کہ آنرا در ہندی سرمندل گویند" (ہفت قلزم، نول کشوری اڈیشن ص ۱۴۵)۔

[2] "دنبل بفتح اول و دالِ ابجد دبل ماندیست کہ بہ ہندوستان مندل گویند، و در فرہنگے بمعنی غلول نوشتہ اند۔ و بضمِ اول، ورمے کہ در اعضا بہم رسد، و بزبانِ عربی دمل گویند" (تتمۂ برہانِ قاطع، نول کشوری اڈیشن ص ۵۸۳)

سلیمان حییم کے لغت میں یہ لفظ موجود ہے، اور نور و آصفیہ میں بھی ہے۔

پایا نہیں جاتا ہے۔ آپ چاہیے، لکھیے۔

"پیار" بروزنِ فاعِلْ ہے۔" [بہ نام تراب، ۱۱ اگست ۱۸۹۷ء]

سہ ریاض خیرآبادی نے بھی ایک خط میں یہی خیال ظاہر کیا ہے: "نہیں "پرے" کے لفظ کو متروک سمجھتا ہوں۔ داغ و امیر و جلال نے بھی استعمال نہیں کیا، نہ ان کے متبعین نے۔ عام بول چال میں بھی نہیں۔ بعض دلی والے شاید بولتے ہیں۔" (مکتوبِ ریاض، نقوش مکاتیب نمبر ص ۳۴۹) دلی میں یہ لفظ ہر زمانے میں مستعمل رہا ہے۔ مولفِ فرہنگِ آصفیہ نے اس لفظ کے متروک یا غیر فصیح ہونے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ "پرے بٹھانا" کے ذیل میں انھوں نے یہ فقرہ بہ طورِ مثال لکھا ہے: "ایسا پکایا کہ باورچی کو پرے بٹھا دیا۔" اس مثالیہ فقرے سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولف کے زمانے میں بھی یہ لفظ رائج تھا۔ اس کے بعد کی کتابوں میں بھی یہ لفظ موجود ہے، مثلاً: "نابالغ لونڈے بھی اگلے زمانے کے پختہ کلاموں کو پرے بٹھاتے ہیں" (ترجمۂ دریائے لطافت، ص ۳۷۸)۔ عام بول چال میں بھی یہ لفظ آتا رہتا ہے۔ نواب عزیز جنگ ولا (تلمیذِ داغ) نے اس لفظ کے متعلق لکھا ہے: "مولف عرض کرتا ہے کہ استادانِ سخن کے کلام میں اِس کا استعمال ہے اور ہمارا ذوق اس کے استعمال کو پسند اور فصیح خیال کرتا ہے" (معیارِ فصاحت، ص ۳۳) ______ حقیقت یہ ہے کہ "سدا" اور "سیت" جیسے بہت سے الفاظ کی طرح یہ لفظ بھی غیر ضروری طور پر فہرستِ متروکات میں شامل ہو گیا۔ اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اصلاحِ زبان کا یہ سودا کس قدر بے معنی تھا۔ ہاں یہ لفظ رشک کے یہاں موجود ہے: تو عرش سے پرے ہے اگر پیشِ چشم ہے (مجموعۂ دواوینِ رشک، ص ۲۶۸)

شہ قدما و متوسطین نے "پیارا" کو بروزنِ فعولن بھی نظم کیا ہے، مثلاً:

کہ ایسے لوگ پیارے عزیز جہاں ہیں (میر۔ کلیات مرتبۂ آسی، ص ۳۰۳) میر کی ایک

پرواز ہوں ازل سے سراجِ منیر کا ‏ ‏ قمری ہوں سبز و باغِ علیِ کبیر کا
میں نغمہ سنج ہوں چمنِ بے نظیر کا ‏ ‏ بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا

جہاں تاریخ میں زہرہ کے ساتھ مشتری کا لفظ آئے گا، وہاں مشتری سے دولہا ہی مقصود ہوگا۔ جیسے قمری سے، برق کے شعر میں، عاشق یا خود متکلم و مصنف مراد ہے۔ اگر تتبع کلامِ اساتذہ سے آپ کوئی سند مشتری کو کب کی تذکیر کی پائیے تو مجھے بھی لکھیے۔"

[بنام زائر، ۳۱ مارچ ۱۸۹۹ء]

لفظ "بلبل" کے ذیل میں لکھا ہے:

"بعض سخنورِ اساتذہ تذکیرِ بلبل کی، اس شعر سے ناسخ مرحوم کے کرتے ہیں ع بلبل ہوں بوستان الخ۔ حالاں کہ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہاں سے تذکیرِ بلبل کی مستفاد ہوتی ہے یا قائلِ شعر کی؟ اور بالفرض و التسلیم اگر شعرِ مذکور سے تذکیرِ بلبل ہی کی مستفاد ہوتی ہے تو اس مصرعِ برقِ مرحوم سے ع قمری ہوں سرو باغِ علیِ کبیر کا، استفادہ تذکیرِ قمری کا بھی ہو سکتا ہے، حالاں کہ قمری کو کسی نے آج تک مذکر نہیں کہا ہے۔ فتأمل۔"

یہ عرض کر دوں کہ جلال کا یہ رسالہ پہلی بار ۱۲۹۳ھ میں چھپا تھا، مقدمۂ طبعِ چہارم یعنی امیر کے اس خط سے پانچ چھ برس پہلے۔

خواجہ وزیر کا بھی ایک شعر اسی نوعیت کا ہے:

اُس سروِ خوش خرام کا قمری ہوں اے وزیر ‏ ‏ چلتے تھے جس کے ساتھ شجر پا بہ لنگ سے

(دفترِ فصاحت ص ۱۹۵)

ﮯ دیوانِ برق، ص ۳۴۶۔
ﮯ فرہنگِ آصفیہ میں مشتری (بہ معنیِ ستارہ) کو مذکر لکھا گیا ہے۔ اور نور اللغات و

معین الشعرا میں، مذکر کی سند میں منیر کا یہ شعر درج کیا گیا ہے:

ہوا ہے مشتری محبوس گویا برج عقرب میں
نظر آتے ہیں اہل علم وفضل اس سال زندانی

کلیات منیر میں یہ شعر اسی طرح ہے (ص ۹) اگرچہ ایسے اشعار سے تذکیر یا تانیث حتمًا ثابت نہیں کی جا سکتی، کیوں کہ غلط نویسی کاتب کا احتمال باقی رہتا ہے، مگر یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ مختلف فیہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں صفیر بلگرامی کی عبارت سے مزید وضاحت ہو گی۔ نقل عبارت سے پہلے یہ لکھنا ضروری ہے کہ جلال نے "مشتری" کی تانیث کی سند میں مفید الشعرا میں ناسخ کے یہ دو شعر لکھے تھے:

نقدِ جاں لاتی ہے آئے مول نورانس ماہ سے | مشتری رکھتا ہے نام اپنے لیے برجیس کا

تیرا غلام کچھ مہ کنعاں فقط نہیں | کہتی ہے مشتری بھی میں تیری خریدہ ہوں

صفیر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"موئنث کہتا ہے کہ کار آمد شعرا کی ان مثالوں سے موئنث ہونا کچھ ضرور نہیں کہ ثابت ہو، کیوں کہ کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے یعنی "نقدِ جاں لایا ہے" اور "کہتا ہے مشتری" بھی کہہ سکتے ہیں۔ چناں چہ اکثر الفاظ میں صاحب کار آمد شعرا کو بھی شک ہو گیا ہے اور کاتب کی غلطی پر محمول کیا ہے۔ بے شک ایسی مثالوں سے تسکین نہیں ہو سکتی، مگر میں نے مشتری کے لفظ کو مذکرات میں لکھا ہے اور اس کی مثال کسی استاد کے کلام میں پائی تھی۔ افسوس اصل مسودہ ایسا گم ہو گیا کہ اب نہیں ملتا اور نہ اب اتنی مہلت اور فرصت ہے جو پھر دیوان وغیرہ دیکھ کر مثال نکالوں مجھے اس لفظ پر مذکر ہونے کا بھی یقین ہے، اس لیے اصل یائے معروف کے قاعدے سے[illegible] بنا لے

(۴۵) ساکھا، بھاشا:

"مادۂ تاریخ میں لفظِ "ایجاب" محض، اور بجائے "قران" لفظِ "وصل" لانا اور اس سے معنی ایجاب وقبول، اور قران واجتماع مراد لینا بہت ہی تکلف ہے۔ اس باب میں مجھے بھی آپ کی رائے سے اتفاق کلّی ہے۔

لفظ "ساکا" کی اصل "ساکھا" بمعنی جنگ[1] وجدل ہے۔ میر تقی مرحوم کے شعر میں بھی یہی معنی ہیں۔ قدما کے سوا متوسطین ومتاخرین کے کلام میں یہ لفظ دیکھا نہیں گیا۔

"بھاکا" اصل میں بھاشا ہے۔ ہندی میں "ش" اور "کھ" کا بدلا ہوتا ہے۔ اردو میں فصحا کی زبان پر بیش تر "بھاکا" اور کم تر "بھاشا" مستعمل ہے۔"

[بہ نام زاہد، ۳ر اپریل ۱۸۹۹ء]

(۴۶) یاں، واں:

"یاں اور واں، یا یہاں اور وہاں، بروزن فاع، فصحائے لکھنؤ

"مشتری" کو داخل کر دیا ہے۔ مقلد کو اختیار ہے، مذکر باندھے یا مونث۔" (رشحاتِ صفیر، مطبع احمدی پٹنہ، ص ۴۷)

[1] "ساکھا" بمعنی اتفاق ویک دلی بھی ہے: "ساکھا، متفق ہونا چند آدمیوں کا کسی کام پر، مثلاً حریف سے لڑنے پر اتفاق کرنا یا اور اسی طرح کے کسی امر پر متفق ہو جانا۔ ف: یک دلی۔ ع: اتفاق" (سرمایۂ زبانِ اردو)۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی یہ معنی ملتے ہیں۔ یہ بھی درست نہیں کہ متوسطین یا متاخرین کے کلام میں یہ لفظ نہیں ملتا۔ صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے: "اگرچہ راج پوت تمواروں نے بڑا ساکھا کیا مگر انجام کو شکست کھائی۔" محمد حسین آزاد (قصصِ ہند، مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور، ص ۲۷)

اب نہیں لکھتے۔ لیکن آپ چوں کہ دہلی کی زبان پسند کرتے ہیں اور اسی کا اتباع کرتے ہیں، اس لیے آپ لکھیے۔"

[بنام زاہد، ماخوذ از مشاطۂ سخن]

لے ایک زمانے میں اکثر اساتذۂ لکھنؤ کو متروکات کا مراق سا ہو کر رہ گیا تھا۔ مختلف حضرات کی فہرستیں الگ الگ تھیں، اور ایسی ایسی قیدیں عائد کرلی تھیں کہ آج ہنسی آتی ہے۔ چوں کہ یہ قطعاً غیر ضروری پابندیاں تھیں، اس لیے ایسے بہت سے قاعدوں کی پابندی پوری طرح یہ لوگ خود بھی نہیں کر پاتے تھے۔ اسی "یاں" اور "واں" کو لیجیے! آپ نے امیر کے قول کو ملاحظہ فرمایا! لیکن مرآۃ الغیب اور صنم خانۂ عشق میں بیسیوں جگہ یہ لفظ آئے ہیں۔ پہلے دیوان اول مرآۃ الغیب سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ڈھونڈھے گر عاشق، تو یاں معشوق کا پائے دواں (ص ۱۸) ہر روش سبزے پہ واں عکسِ گل و لالہ دستمار (ص ۳۳) چمن دل میں جو عارت کے چلی واں کی نسیم (ص ۳۳) یاں اور دو دستوں نے لکھا خط رسید کا (ص ۵۲) سرمۂ روشنیِ چشم ہے یاں خاکِ قدم (ص ۵) خواب میں سبزۂ خوابیدہ جو واں کا دیکھے (ص ۳۲) خواب میں دیکھے اگر ترکِ فلک یاں کی بہار (۳۳) قدم یاں پھونک کر رکھتی ہے، بجلی بھی جو آتی ہے (ص ۵۷) واں نزاکت پر تو یاں ہے ناتوانی پر گھمنڈ (ص ۱۱۸) یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں (ص ۱۸۰)۔

دوسرے دیوان صنم خانۂ عشق سے بھی کچھ مثالیں لکھی جاتی ہیں (مطبوعہ محبوب پریس حیدر آباد):

واں نگاہیں تیز تیز اور یاں تھیں آہیں درد خیز (ص ۵) کیا قدر ہے فسادِ الفت کی واں امیر (ص ۱۶۸) یاں کثرتِ سجود، وہاں جوشِ نقشِ پا (ص ۲۱) جوانی میں بھی یاں نہ آئی ہنسی (ص ۳۶) یاں ہاتھ اٹھایا ہے دعا کے لیے میں نے۔ بے تاثیر سے واں ہاتھ اٹھایا ہے دعا نے

(۳۷) رکھیں:

"رکھیں میں اب تخفیفِ کاف کو فصحا[1] خلافِ فصاحت جانتے ہیں۔"

[مشاطۂ سخن ص ۲۲]

(ص ۲۸۵)؛ یاں خامشی پسند ہے واں گفتگو پسند (ص ۵۷)؛ واں جام سے دریغ یہاں ہے سبو پسند (ص ۵۸)؛ انھی سلوک ہوتے ہیں واں داد خواہ بند (ص ۶۷)؛ کس سے شرماتے ہو تم وصل میں یاں غیر نہیں (ص ۳۰۷)۔

جلال نے اپنے تیسرے دیوان "مضمون ہائے دل کش" میں اپنے متروکات کی جو فہرست پیش کی ہے، اس میں یہ دونوں لفظ موجود ہیں۔ نیز اُن کے صاحب زادے کمال نے اپنے رسالے "دستور الفصحا" میں ان لفظوں کو متروک لکھنے ہی پر قناعت نہیں کی، یہ بھی لکھا ہے: "یہ جو یہاں وہاں کو۔۔ لوگ یاں، واں بولتے ہیں اور لکھتے ہیں، یہ نہیں معلوم کیا الفاظ ہیں۔" شوق نیموی نے رسالۂ "اصلاح" میں یہ لکھ کر کہ واں اور یاں، وہاں اور یہاں کی جگہ محض غیر فصیح ہیں، اکثر شعرا نے ان کو ترک کر دیا ہے؛ اس پر حاشیہ بھی لکھا ہے[1] اور یہ لکھتے ہیں: "خصوصاً رشک کے مقلدین نے یک قلم ترک کر دیا ہے۔ مولف نے آج تک یہ الفاظ استعمال نہیں کیے، ابتدا سے ان کا تارک ہے" (ص ۱۲)۔ اس کے برخلاف خورشید لکھنوی نے اپنے رسالے "افادات" میں یاں اور واں کو ایسے الفاظ میں شامل کیا ہے جن کا ترک کرنا ضروری نہیں؛ بل کہ یہ دونوں ایسے الفاظ میں شامل ہیں جن کے ترک میں ضرر و دقت پڑے گی اور مزہ کلام میں باقی نہ رہے گا، لہٰذا میں نے ترک نہیں کیے ہیں اور نہ اپنے احباب و تلامذہ کو صلاح ان کے ترک کی دیتا ہوں" (ص ۳۲)۔

صاحبِ "نور اللغات" نے صحیح طور پر لکھا ہے کہ "فصحائے دہلی استعمال کرتے ہیں، لکھنو کے بعض شعرا احتراز کرتے ہیں" (جلد اول، ص ۱۱)۔ "بعض" کی حد تک یہ بات درست ہے؛ جمہور نے نہ اُس زمانے میں اِس بات کو مانا تھا، نہ اب مانتے ہیں۔ ان "بعض" میں اگر اُن لوگوں کو بھی شامل کر لیا جائے جنھوں نے بہ لحاظِ قاعدہ ان کو متروک کہا ہے، مگر خود نظم کیا ہے (جیسے امیر مینائی)، تب اِس "بعض" کا دائرہ مختصر تر ہو جائے گا۔

[1] اِس کا شمار بھی ایسے متروکات میں ہے جو رواجِ عام کی سند نہ پا سکے۔ حقیقتاً یہ بھی غیر ضروری

(حاشیہ)

پابندی تھی۔ امیر کے زمانے کو چھوڑیے، اُس کے بعد بھی رکھنا کو بہ تخفیفِ کاف استعمال کیا جاتا رہا۔
آرزو لکھنوی مرحوم اس دور کے اساتذہ میں تھے، اُن کے شعر ہیں:

کلیم! برق ہے گا بجوش کے شعلۂ حسن ‍ ‍ ‍ رکھو امید رعایت نہ اشتعال کے بعد

(جہانِ آرزو طبع اول ص ۶۲)

اب آرزو، اس پھلواری میں جینے کا سہارا کوئی نہیں
دو سوکھے تنکے لا کے رکھو، تو وہ بھی جلائے جاتے ہیں

(سریلی بانسری طبع اول ص ۷۹)

داغ کے کلام سے اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، مثلاً:

خوش نوائی نے رکھا ہم کو اسیر اے صیاد
ہم سے اچھے رہے صدقے میں اُترنے والے

روزہ رکھیں، نماز پڑھیں، حج ادا کریں
اللہ، یہ ثواب بھی ہے کس عذاب کا

نشانِ شر نہ رکھا نام کو زمانے میں
خدا کے بندوں کا وہ خیر خواہ ہے مجذوب

ناسخ اور اُن کے اکثر تلامذہ کے یہاں بھی یہ صورت ملتی ہے، مثلاً:

قدم رکھا کہیں اور جا پڑا کہیں کا کہیں ‍ ‍ ناسخ (کلیات، مطبع مولائی، ص ۱۹۱)
ناتوانی نے رکھا محروم استقبال سے ‍ ‍ " (ص ۳۷۵)
علی نے رکھا اسے بر روئے زمیں ‍ ‍ " (ص ۳۷۰)
رکھو مومنو اس طرف گوشِ جاں ‍ ‍ " (ص ۳۷۸)

(۴۸) بھاتا:

"بھانا پسند آنا کے معنی میں، فصحانے لکھتو نہ بولتے ہیں نہ لکھتے ہیں۔ اگر اہلِ دہلی بولتے ہیں تو آپ شوق سے لکھیے۔ توسیعِ زبان کا بھی آپ کو بہت خیال ہے"[1]

[مشاطۂ سخن، بہ ذیلِ اصلاح بر غزلِ زاہد]

(۴۹) پیراک، تیراک:

"پیرنا اور تیرنا میں آپ کی رائے یہ ہے۔ میرے ایک شعر کا مصرع تھا، تیراک

دامن آنکھوں پہ رکھو، چاک گریباں کرو — ناسخ (ص ۲۰۸)

ہوں وہ لاغر جب رکھا ان کے کفِ رنگیں پہ ہاتھ — وزیر (دفترِ فصاحت، ص ۲۷)

جامِ خالی پر رکھا کیوں دستِ گل گوں ساقیا — " " (ص ۱۴۳)

آتش اور ان کے تلامذہ کے یہاں بھی یہی صورت ملتی ہے۔ صرف صبا کے یہاں سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

جب رکھا آنکھوں پہ دامن لال بادل ہو گیا (غنچۂ آرزو ص ۳۱) سدا خراب رکھا اپنے ساتھ اس کو بھی (ص ۵۰) طاقِ نسیاں پہ رکھا ہے ہم نے قرآں آج کل (ص ۸۰) کچھ بھی قیمت لبِ جاناں نے رکھی لعلوں کی (ص ۸۸)۔

اور لوگوں کے علاوہ نادر نے بھی تلخیصِ معلّیٰ میں "رکھا" بہ تخفیفِ کاف کو متروک لکھا ہے، مگر ہر زمانے میں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں، خواہ بعض نے مکمل احتیاط کی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پابندی بھی محض غیر ضروری تھی اور اسی لیے یہ صورت پیدا ہوئی۔

[1] اس لفظ کے لیے مکتوب ۱۳ کا حاشیہ دیکھا جائے۔ زاہد کا شعر یہ تھا:

ادائیں یہ ساقی کی زاہد کو بھائیں — کہ جھٹ توڑ بیٹھا وہ مے خوار توبہ

[مشاطۂ سخن]

پانی پھیر کے اس سے نکل گیا۔ میرے استادِ مرحوم نے "پیراک" بنا دیا تھا۔ [1]
[بہ نامِ شہیرِ مچھلی شہری]

---

[1] جلال نے سرمایۂ زبانِ اردو میں "تیراک" کے ذیل میں لکھا ہے: "بعض کے نزدیک اس لغت میں بجائے فوقانی، بائے فارسی ہے۔" گویا جلال "تیراک" کو صحیح (یا کم از کم مرجح) سمجھتے تھے، لیکن صاحبِ نور اللغات نے وضاحت کردی ہے کہ "پیراک صحیح ہے، اور تیراک غلط"۔ پھر "پیرنا" کے ذیل میں لکھا ہے: "فصحائے لکھنؤ بے جان چیز کے پانی پر چلنے کے لیے "تیرنا" بولتے ہیں، اور جان دار کے لیے "پیرنا"۔ جناب اثر لکھنوی نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے: "یہ درست نہیں۔ مرغابی جان دار ہے، لیکن اس کے لیے کہتے ہیں کہ پانی میں تیر رہی ہے، نہ کہ پیر رہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ "پیرنا" فنِ شناوری ہے۔ اس کے علاوہ، اگر کوئی شے سطحِ آب پر رہے یا بہے، اس کو تیرنا کہتے ہیں" (فرہنگِ اثر، ص ۲۵۵)۔

فرہنگِ آصفیہ میں "تیرنا" اور "پیرنا" دونوں درج ہیں اور کسی امتیازِ معنوی کا ذکر نہیں۔ ان دونوں لفظوں کا معنوی فرق مسلّم، اکثر مواقع پر اس کا لحاظ بھی ضروری ہوگا، مگر "تیراک" اور "پیراک" میں اس کی پابندی ضروری نہیں، کیوں کہ یہ دونوں لفظ عموماً انسانوں کے لیے بولے جاتے ہیں۔ غالباً اسی نکتے کے پیشِ نظر جلال نے تیراک کے ذیل میں "بعضوں" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

جیسا کہ اثر صاحب نے لکھا ہے: "اگر کوئی شے سطحِ آب پر رہے یا بہے، اس کو تیرنا کہتے ہیں"۔ اس میں اس کا اضافہ کرنا چاہیے کہ اس معنی کے ساتھ ساتھ شناوری کے معنی میں بھی "تیرنا" مستعمل ہے، البتہ "پیرنا" مطلقاً شناوری کے لیے سخن میں آیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ شناور کے لیے "تیراک" اور "پیراک" دونوں لفظ مستعمل ہیں ــــ ہاں، بحر لکھنوی نے بحر البیان میں تیرنا اور پیرنا کو مرادف بتایا ہے: "تیرنا و پیرنا بفتح، شناوری کردن"۔

(۵۰) رسالۂ رشک، میم کی تذکیر، یسن۔ مردمِ دیدہ :

"رشک مرحوم نے کس کتاب میں تانیث و تذکیرِ حروفِ تہجی کا ذکر کیا ہے؟
اُس کتاب کا نام و نشان[1] ضرور لکھیے۔ اور اگر آپ کے پاس ہو، تو چند روز
کو مستعار مجھے دیجیے۔

میرے نزدیک میم ضرور مذکر ہے، اور میں نے مذکر ہی کہا ہے[2]۔

"یسن" بہ معنیِ سال کہیں نہیں نکلا۔ فارسی میں تلاش کیا، کوئی سند قابلِ
اعتبار نہیں ملی۔ ان معنی میں "سِن" ہے۔ اردو میں بغیرِ ترکیب اگر "سن"
بہ معنیِ سال کوئی کہے تو تاویل ہو سکتی ہے۔ محققین اس کی جگہ "سال" کہتے ہیں۔

"مردمِ دیدہ" مذکر ہے۔"

[بہ نام نعیم الحق آزاد، ۳۰ر نومبر ۱۹۱۸ء]

اور اس اندراج سے قطعی طور پر اس کی تائید ہوتی ہے کہ "تیرنا" کے ایک معنی "شناوری کردن"
بھی ہیں اور یہی مستفاد ہوتا ہے صاحبِ فرہنگِ آصفیہ کے اندراج سے۔

[1] رشک کی ایسی کسی کتاب کا کسی اور نے ذکر نہیں کیا، نہ اس کے وجود کا کچھ پتا چلتا ہے۔

[2] امیر کا شعر یہ ہے :

جو آنکھیں ہوں تو نام پاک سے پیدا ہے یکتائی — کہ آغوشِ احد میں جلوہ گر ہے میم احمد کا

[محامدِ خاتم النبیین، ص ۷]

صفیر بلگرامی نے رشحاتِ صفیر میں "م" کو مذکر ہی لکھا ہے اور سنداً ناسخ کا ایک شعر لکھ کر
مزید وضاحت کی ہے کہ "مگر حیرت ہے کہ کلبِ حسین خاں نادر نے تلخیصِ معلیٰ میں میم کو مؤنث
کیوں کر لکھا ہے اور کہاں سند پائی" (ص ۱۳)

جن لوگوں نے "م" کو مؤنث کہا ہے، انھوں نے رشک کے یہاں سے سند لی ہے۔

(۵۱) بہ سلسلۂ تاریخ گوئی :

"میں نے اب یہی مشرب اختیار کرلیا ہے کہ "آئی" اور "آئے" اور "گئی" اور "گئے" سب میں دُہری ی خیال کی جائے اور ۲۰ عدد لیے جائیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ "آئے" میں ۱۰ عدد اور "آئی" میں ۲۰ عدد شمار کیے جائیں، مگر اب بعض وجوہ سے یائے معروف و مجہول، دونوں کے ۲۰ قرار دیے ہیں۔[1] مگر آپ کو یہ

ج "لکھو سکو ایسی اگر دو ایک میمیں، لطف ہے" (مجموعۂ دواوینِ رشک، ص ۵، ۳)۔ رشک کے دونوں مطبوعہ دواوین میں حرف م بصورتِ واحد کہیں اس طرح نہیں ملا کہ اس کو مذکر یا مونث کہا جاسکے۔ مندرجۂ بالا مصرعے میں "میمیں" بحالتِ جمع ہے۔ اس سے حرف م کی تانیث پر حتماً استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے لفظ کی جمع "لفظیں" اساتذۂ لکھنؤ کے یہاں ملتی ہے، مگر اس سے "لفظ" کا مونث ہونا لازم نہیں آتا۔ ناسخ کے یہاں "لفظ" مذکر ملتا ہے (ع : آ دجائے لفظ لب پہ پئے استعمال کا)، یہی صورت "میمیں" کی بھی ہو سکتی ہے۔ بہرصورت اکثریت م کی تذکیر پر متفق ہے۔

۲ہ جلال نے گلشنِ فیض میں "سن بکوسنہ" کا مرادف لکھا تھا۔ اس پر اعتراض کیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ نے اسی سلسلے میں استفسار کیا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مکتوب ۱۲ کا حاشیہ۔

لہ "آئے، جائے بروزنِ فعلن کا املا دو طرح مروج ہے: ایک یہ کہ جس طرح آؤ، جاؤ میں واؤ پر ہمزہ لکھتے ہیں، اسی طرح آئے وغیرہ میں ایک ے لکھ کر اس کے اوپر ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں صرف ایک ے کے عدد دینا چاہیے۔ مورخینِ ہند نے جا بجا ایسے الفاظ میں ایک ہی ی کے عدد لیے ہیں۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ دو یائیں لکھ کر پہلی ی پر ہمزہ لکھ دیں۔ فی الحال اکثر اس کا املا دو یاؤں سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں دو یاؤں کے بیس عدد لینا چاہیے

(باقی اگلے صفحے پر)

(حاشیہ)

کیوں کہ تاریخ کی بنا کتابت پر ہے۔" (رسالۂ اصلاح ص ۳۰)

جلالؔ نے افادۂ تاریخ میں لکھا ہے کہ "آئی" "گئی" میں بیس عدد لیے جائیں گے لیکن یائے مجہول جن الفاظ کے آخر میں ہو، خواہ اس پر ہمزہ لکھا جائے خواہ نہ لکھا جائے، جیسے جفائے، صفائے وغیرہ، اس میں دس عدد لیے جائیں گے۔ منیر نے جلالؔ کے قول کے خلاف "گئے" میں دو ی شمار کی ہیں اور اس لفظ کے ۳۰ عدد لیے ہیں۔ رشک کے دیوان کی تاریخ میں اُن کا یہ مصرع ہے: ع: چھپ گئے دیوانِ رشکِ شاعراں۔ ۱۲۶۳ (کلیاتِ منیر)۔

صفیؔ لکھنوی مرحوم نے جلالؔ کے اس قول سے اختلاف کیا ہے کہ "گئے" میں ایک ہی فرض کی جاتی ہے:

"گئے" میں دو ی ہیں، پہلی ہمزہ ہو گئی ہے، مگر عدد اس کے بھی دس ہی شمار کیے جائیں گے۔ "آئی" کے اگر جلالؔ نے گیارہ عدد لیے ہیں تو یہ ہرگز صحیح نہیں، اس لیے کہ آئی میں بھی دو ی شمار میں آنا چاہیے، پہلی ی بصورتِ ہمزہ ہے اس کے بھی دو عدد لینا چاہیے۔ اس طرح "آئی" کے ۲۱ عدد ہوتے ہیں۔ "کہلائے" بروزنِ مفعولن، اس کے بھی ۷۶ عدد لینا چاہیے، کیوں کہ اس میں "دو ی ہیں..... اگر امیر مینائی صاحب نے اس لفظ کے ۶۶ عدد لیے ہیں تو مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہیں۔ البتہ "کہلائے" بروزنِ مفعول کہیں پر نظم میں آئے تو اس حالت میں آپ ۶۶ لے سکتے ہیں۔ کیوں کہ کتابت میں صرف ایک ی ہوگی اور اس کے دس شمار کیے جائیں گے۔"

(مکتوبِ صفیؔ، نقوش، مکاتیب نمبر ص ۴۵۷)

اِس بحث سے قطعِ نظر کرتے ہوئے، موجودہ املا کے لحاظ سے عرض کروں کہ اصولاً آئے جائے وغیرہ میں ایک ہمزہ اور ایک ی لکھنا چاہیے۔ عموماً لکھا بھی اسی طرح جاتا ہے، یعنی آئے، جائے، لائے، پلائے، اور آئی، جائی، لائی، پائی وغیرہ۔ اِس بنا پر کہ تلفظ میں آخری ی سے

(باقی اگلے صفحے پر)

(حاشیہ)

پہلے ہمزہ آتا ہے۔ ورنہ پھر آؤ اور جاؤ کو، آیو اور جایو لکھنا پڑے گا۔ اور اس لحاظ سے اب "ؤ" اور "ئے" کے گیارہ عدد لیے جائیں گے۔ (ہمزہ کا ایک عدد ان لفظوں میں ضرور لیا جائے گا، یہ مکتوبی اور ملفوظی، دونوں حیثیتیں رکھتا ہے)، تاریخ کی بنا کتابت پر ہے، اور اس سے کسی کو اختلاف نہیں۔ آئے اور آئی میں صرف ایک ی لکھی جاتی ہے، اس لیے عدد بھی صرف ایک ی کے لیے جائیں گے۔ اس سے بحث نہیں کہ قدما نے کیا کہا ہے۔ ان کی بحث کا مدار اسی پر تھا کہ لفظ آیی (آ ی ی) ہے۔ مگر اس طرح نہ لکھتے ہیں اور نہ بولتے ہیں۔ رہی ہمزہ کا عدد شمار نہ کیے جانے کی بات، تو شوق نیموی نے یادگارِ وطن میں اس پر بحث کی ہے اس کو دیکھا جائے۔ ہمزہ کا ایک عدد بہت سی تاریخوں میں لیا گیا ہے۔ اردو میں ہمزہ کی حیثیت مستقل حرف کی سی ہے، اس لیے ایسے مقامات پر، اب اس کا شمار حروف میں کیا جانا چاہیے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ افادۂ عام کی خاطر، یادگارِ وطن کی مکمل عبارت کو یہاں پر نقل کر دیا جائے:

"بعض رسائل میں لکھا ہے کہ ہمزے کا کوئی عدد نہیں۔ چناں چہ ریاض العروض میں ہے کہ زبا الف ممدودہ، اس کا مورخین نے ایک لیا ہے، اس لیے کہ ہمزہ بے عدد ہے۔ اور حضرت جلال نے رسالۂ افادۂ تاریخ میں لکھا ہے کہ ہمزہ جو خطِ معنی سے عبارت ہے، اس کا کوئی عدد تاریخ میں نہیں لیا جاتا، اس لیے کہ یہ کوئی حرف، حروفِ تہجی میں سے نہیں ہے۔ پس مولفِ ہیچ مداں کے نزدیک ہمزہ کا ایک عدد لینا کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ قلط بل کہ اغلط ہے کہ مورخینِ ثقات نے کبھی ہمزہ کا کوئی عدد تاریخ میں نہیں لیا۔ انتہٰی۔"

اور مولف کی نظر سے بعض ایسی تاریخیں بھی گزری ہیں جن میں ہمزہ محسوب نہیں ہوا، جیسے رشک لکھنوی کی یہ تاریخ: اب کیا کشتی بنی ہے ماشاء اللہ (۱۲۳۹ھ)۔ المختصر لوگوں کی اس قسم کی تحریر اور تاریخوں سے، پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ ہمزے کا عدد لینا صحیح نہیں، مگر بعد تتبع و تفحص ثابت ہوتا ہے کہ اس کا ایک عدد لینا بلاشک درست ہے، یہ خیال کہ ہمزہ، حروفِ تہجی سے نہیں، قابلِ التفات نہیں، کیوں کہ جس طرح جیم

(باقی اگلے صفحے پر)

(حاشیہ)

کے عوض ہے، اسی طرح ہمزہ، الف کا قائم مقام ہے۔ دیکھو صاحب صراح وغیرہ "خباء"، وغیرہ کو، باب الالف میں لاتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمزہ، الف کا قائم مقام ہے۔ اس کے علاوہ مورخین کرام نے بھی ہمزے کا ایک عدد لیا ہے۔ چناں چہ مؤلف خزانۂ عامرہ نے یحییٰ کاشی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ:

"مخفی نماند کہ ہمزہ کہ بعد الف می آید، مورخان فرس اکثر او را بجای الف داشتہ، در تاریخ حساب می کنند۔ چناں چہ در ترجمۂ نعمت خان عالی گذشت کہ ہمزۂ "لقاء" را در تاریخ مصرع "بخوجا تو کرد ایں جا التقاء ساکنین" محسوب ساختہ۔ وگاہے حساب نمی کنند، زیرا کہ شکلے از اشکال حروف تہجی ندارد۔ چناں چہ در تاریخ میر یحییٰ، کہ مورخ ہمزۂ "احیاء" را محسوب نساختہ۔ و مورخان عرب برعکس ایں عمل کنند۔ یعنی اکثر حساب نمی کنند، وگاہے کنند وقت ضرورت۔ مثلاً تاریخے از قرآن یا حدیث یافتہ شود۔ میر عبد الجلیل بلگرامی تاریخ جلوس محمد فرخ سیر بادشاہ، مطابق ۱۱۲۴ھ اربع عشرین ومائۃ و الف "نور شاہان ایشار" یافتہ، و ہمزۂ "ایشار" را حساب کردہ۔"

اور شمس العلما مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی نور اللہ مرقدہ، کہ بہت بڑے محقق تھے، ان کے دیوان قسطاس البلاغۃ میں یہ تاریخیں موجود ہیں، ع: گو سیر شد بماء زلال وصال دوست (۱۲۸۲ھ) ع: بناء طرح کبیت عتیق (۱۲۹۶ھ) اور ان کے دیوان مقصد البلاغۃ میں یہ تاریخ ہے ع جاء عندی خزائن الاسرار۔

الغرض ہمزے کا لینا اور نہ لینا دونوں طرح ثابت ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ہم لوگوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اگر یہ قاعدہ رکھا جائے کہ جہاں چاہے لیجیے، اور جہاں چاہے چھوڑ دیجیے، تو کچھ ٹھیک نہیں۔ ایسی حالت میں ایک سال کی کمی بیشی کا کھٹکا رہے گا، اور تعیین زمانہ، جو تاریخ سے مقصود ہے، ثابت نہ ہوگی۔ اس باب میں کوئی قاعدہ منضبط ہونا چاہیے کہ یہ خرابی

(باقی اگلے صفحے پر)

مشرب پسند آئے تو آپ بھی اختیار کیجیے۔ اور جلال نے "آئی" میں ۱۱ عدد نہیں لیے ہیں بلکہ ۲۰ عدد لیے ہیں۔ البتہ "بوئی"[2] میں ی نہیں لکھی ہے، واو کو اضافت دی ہے، چناں چہ دیوان میں بھی بغیر ی کے چھپوایا ہے، اور افادۂ تاریخ میں[3] بھی اس سے بحث کی ہے؛ مگر میں اس کو پسند نہیں کرتا۔"

بنام نعیم الحق آزاد - ۱۱ اپریل ۱۹۳۰ء

(۵۲) آنچل اور دامن ـــــ ایضاً

"آنچل اور دامن کے جھگڑے میں میری کلیہ رائے ہے کہ دوپٹے اور اوڑھنی وغیرہ اوڑھنے کی چیزوں میں "آنچل" کہنا چاہیے۔ اور قبا، عبا وغیرہ پہننے کی چیزوں

دور ہو جاتے۔ میں اب اس ضابطے کا پابند ہوں کہ عربی ہو یا فارسی، جہاں ہمزہ مستقل طور پر ہو یعنی "پردۂ چشم" وغیرہ کی طرح کسی حرف پر نہ ہو، جیسے: جائز، مائل، اس کا ایک عدد لینا چاہیے۔ کیوں کہ جب کتابت میں بھی موجود ہے اور ہمزہ، الف کا قائم مقام ہے، تو اس کا خون کیوں ہو۔ ہاں اگر کسی واقعے کی چند تاریخیں ہوں، جن سے تعیینِ زمانہ ہو جاتی ہے، اگر اس کی ایک آدھ تاریخ میں ہمزے کا عدد نہ لیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں کیوں کہ آخر لوگوں نے ہمزے کو غیر محسوب بھی قرار دیا ہے، اور دوسری تاریخوں سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہاں غیر محسوب ہے۔ کمی بیشی کا کھٹکا نہیں ہو سکتا۔ مگر بہر صورت اولیٰ یہی ہے کہ ہمزۂ مستقلہ بہر رنگ محسوب ہو، کہیں نظر انداز نہ کیا جائے" (یادگارِ وطن، ص ۴۵-۴۷)۔ یہی صورت اردو میں ملحوظ رہنا چاہیے۔ "گئی" اور "آئے" جیسے لفظوں میں ہمزہ مستقل حیثیت رکھتا ہو۔

[2] اشارہ ہے جلال کی اس عبارت کی طرف: "یا مولف نے نواب مرزا خان داغ دہلوی کے طبع دیوانِ اول کی تاریخ میں لفظ "آئی" کے بیس عدد لیے ہیں ۔ع بہ گلزار داغ آئی آج" (افادۂ تاریخ، ص ۱۲)

[3] جلال کا یہ رسالہ قواعدِ تاریخ گوئی پر مشتمل ہے۔ مطبع جعفری لکھنؤ میں ۱۳۰۲ھ میں پہلی بار چھپا تھا۔

میں "دامن" کہنا چاہیے۔ مگر شعرِ مبحوث عنہ کی تصحیح یوں ہو سکتی ہے کہ شعرا نے گوشۂ دامن کو بھی آنچل کہا ہے چناں چہ اس کو میں نے امیر اللغات[1] میں کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے، اور یہ دو شعر سند کے بھی "آنچل" کے لغت میں درج کیے ہیں:

آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں　　　میرؔ دریا کا سا اس کا پھیلا ہے　(میرؔ)

دھیان دانتوں کا جو آیا تو یہ سوجھی تشبیہ　　　صبح نے موتی پہ لیا دامن شب کا آنچل[2]　(نسیمؔ)

ساعت اور گھڑی ساعت کے قافیے میں احتیاط تو مقتضی اس کی ہے کہ شاعر بلا ضرورت شدید، وہم التباس سے بھی بچے، مگر جواز ثابت کرنے کے لیے بہت سے اشعار شعرائے فارسی و اُردو کے ملیں گے، جن میں انھوں نے جائز کر لیا ہے، جیسا کہ تجرؔ نے یہ مطلع کہا ہے:

"افادۂ تاریخ" تاریخی نام ہے جس سے سالِ اختتامِ تالیف (حسبِ صراحتِ مولف) ۱۳۰۲ھ نکلتا ہے۔ آغازِ تالیف کا سال "مادۂ التاریخ" سے نکلتا ہے (۱۲۹۲ھ)۔

[1] امیر اللغات کی مکمل عبارت یہ ہے:

"آنچل (ھ۔ انچل، س۔ (مادہ "انچو" ہے) مذکر، دوپٹے وغیرہ اوڑھنے کی چیز کے دسوں رومال کے، دونوں سرے جو ایک طرف سے دوسری طرف شانے پر ڈالے جاتے ہیں۔

مومنؔ: آنچلوں سے کبھو منہ کہاں چھپتا تھا　　　کب دوپٹا یہ مری طرح گرا پڑتا تھا

گلزارِ نسیم: آنچل ہوا واں حجابِ عارض　　　سہرا ہوا یاں نقابِ عارض

اور شعرا نے دامن کے کنارے کو بھی "آنچل" کہا ہے، مگر زبانوں پر نہیں ہے۔

میرؔ: آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں　　　میرؔ دریا کا سا اس کا پھیلا ہے

(باقی اگلے صفحے پر)

بحر، درویشی طریقہ ہے رسول اللہ کا — باندھیے تسمہ کریں ورد بسم اللہ کا

[ماہنامہ قاضی محمد خلیل حیراں بریلوی]

(۵۳) برس :

"غزل دیکھی، زمین کے سست ہونے سے، اکثر شعر سست ہیں: "برس[1]" مذکر ہے"۔

[ماہنامہ جلیل آبادی۔ ۲۶ر جون ۱۸۹۳ء]

نسیم : دھیان دانتوں کا جو آیا تو یہ سوجھی تشبیہ
صبح نے منہ پہ لیا دامنِ شب کا آنچل"۔

[1] کلیاتِ میر، مرتبہ آسی ص ۳۷۳ [2] دیوانِ نسیم دہلوی موسوم بہ دفترِ فصاحت ص ۱۷۔

[3] بحر لکھنوی کا یہ شعر غالباً بہ سلسلۂ ایطا درج کیا گیا ہے۔ شوق نیموی نے رسالہ اصلاح میں بحر کا یہی شعر اور خواجہ وزیر کا ایک شعر نقل کر کے لکھا ہے کہ:

"ان اشعار میں بھی ایطا نہیں ہے، کیوں کہ بوجہ اختلافِ علمیت، معنی میں تکرار نہ رہی" (ص ۲۵) خواجہ وزیر کا وہ شعر یہ ہے:

میں سراپا مظہرِ اسمِ خدا، واللہ ہوں — ہم صفیرو اس چمن میں مرغِ بسم اللہ ہوں

[1] "برس" کے مذکر ہونے پر اتفاق ہے۔ اصولاً اس کی جمع "برسیں" نہیں آنا چاہیے۔ صفیر بلگرامی نے یہ بات لکھی بھی ہے: "بعض ناواقف "برس" کے لفظ کو جو بہ معنی سال ہے، مؤنث سمجھ کر اس کی جمع "ین" سے "برسیں" کرتے ہیں، حالاں کہ "برس" مذکر ہے اور اس کی جمع "برسوں" ہوگی" (رشحاتِ صفیر، ص ۱۱۸)۔ صفیر کا یہ لکھنا کہ جو لوگ اس کی جمع "برسیں" کرتے ہیں، وہ "برس" کو بھی مؤنث سمجھتے ہیں، درست نہیں۔ یہ عرض کر دیا جائے کہ بول چال میں اس کی جمع "برسیں" سننے میں ضرور آتی ہے۔ صاحبِ نور اللغات نے اس کو عورتوں سے مخصوص کیا ہے: "برس۔۔ برسوں جمع۔ عورتیں مؤنث بولتی ہیں۔ فقرہ: پانچ چھے برسیں ہوئی ہوں گی جب (باقی اگلے صفحے پر)

(۵۴) کسر:

"کسر، بہ فتحتین، اردو ہے۔ اور اسی طرح مستعمل ہے جس طرح داغ نے کہا ہے: "ایک آنچ کی کسر رہ گئی"۔ "تھوڑی سی کسر آتی ہے"۔ بے تکلف ہے۔ اور "کسر" بہ فتح اول و سکون ثانی، عربی ہے، جو بہ معنی شکستن ہے: جیسے: کسر شان، کسر نفس؛ وہ اس جگہ مستعمل نہیں ہے جس جگہ سے بحث کی گئی ہے اور نہ اس کے معنی یہاں چسپاں ہوتے ہیں۔ بہرکیف "کسر"[1] اپنے مقام پر صحیح اور بول چال میں داخل ہے۔"

[بہ نام بشیر ملیح آبادی۔ ۸ مارچ ۱۸۹۷ء]

(۵۵) تیروں کا گنجان ہو کر بیٹھنا:

"تیروں کا گنجان ہو کر بیٹھنا، یہ زبان نہیں ہے۔ درخت، آبادی و خط کی نسبت گنجان کہا جاتا ہے۔" [بہ نام درگا شاہ جہاں پوری]

(۵۶) چلمن۔ دامن نکلنا۔ آستین نکلنا۔ گریبان نکلنا:

"چلمن" ہندی ہے۔ دامن نکلنا، آستین نکلنا؛ ہر ایک یہ صحیح ہے۔ کسی کا شعر ہے:

لاٹ صاحب لکھنؤ آتے ہیں"؛ مگر اس میں عورتوں کی تخصیص مناسب نہیں۔ عام گفتگو میں بھی یہ اسی طرح استعمال میں آتا رہتا ہے۔ اور جو لوگ "برسیں" بولتے ہیں (عورتیں ہوں یا مرد) وہ "برس" کو مذکر ہی استعمال کرتے ہیں۔ "لفظیں" کی مثال سامنے ہے کہ "لفظ" مذکر اور اس کی جمع "لفظوں" اور "لفظیں" دونوں طرح آتی ہے۔ یہی صورت اس لفظ "برس" کی ہے۔ بہرحال "برسیں" کو بھی صحیح مان لینا چاہیے، لیکن یہ صراحت ضروری ہوگی کہ اس سے "برس" کا مونث ہونا لازم نہیں آئے گا۔

[1] داغ کا شعر ہے: آتی ہی تو بس کسر ہے تم میں ۔ کہنا نہیں مانتے کسی کا
(مہتاب داغ، مطبع مفید عام لاہور، ص ۲۳)

گریباں کو میں روکوں، یا سنبھالوں اپنے دامن کو
بڑی مشکل تو یہ ہے ساتھ ہی دونوں بہکتے ہیں"
[بنام دل شاہ جہاں پوری۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۹۵ء]

(۵۷) پسِ چلمن:
"چلمن" نہ فارسی ہے نہ عربی، اس کی طرف اضافت فارسی کی ہرگز جائز نہ ہوگی۔ "جانبِ متھرا" کی نظیر اس کے لیے سند نہیں ہے۔ "متھرا" علم ہے، شہر کا نام ہے؛ اس کا ترجمہ فارسی عربی میں کیا ہوگا؟ لہٰذا یہی لفظ ترکیبوں کے ساتھ بے تردد باندھا جائے گا۔ آپ کے مطلعے میں جس میں "پسِ چلمن" ہے[1]، یوں اصلاح ہو سکتی ہے:

دلِ صد چاک میں دیکھا رخِ روشن اُن کا ... ہم نے نظارہ کیا ڈال کے چلمن اُن کا"
[بنام دل شاہ جہاں پوری۔ ۱۴ مئی ۱۸۹۵ء]

---

[1] دل صاحب کا مطلع یہ تھا:

دلِ صد چاک میں دیکھا رخِ روشن ان کا ... ہم نے نظارہ کیا ہے پسِ چلمن اُن کا
(نشاطِ سخن)

اس لفظ کو بہ اضافت نظم کیا گیا ہے:

کیوں نہ دو پردہ نشیں پھر مجھے سمرن مالے ... میں نے ستے پھول کئی جانبِ چلون ڈالے
انشا (کلام انشا، ص ۲۳۶)

نیم جلوے کو بھی وہ کہتے ہیں اب بے پردگی ... جسم کا بھید ہر کس کا صرفِ چلمن ہوگیا
مومن (دیوان مرتبہ ضیا احمد، ص ۳۰)

یہ کاوہ رہا ہے بھی ہیں کم اے کشش دل ... نہ کو رکھے ایسا پسِ چلمن سے ہمارا
(ص ۴۳) (باقی اگلے صفحے پر)

(حاشیہ)

اضطرابِ شوق، شاید غیر اُس کے پاس ہو　　جانبِ چلمن نظارہ دم بہ دم کیوں کر کریں

مومن (دیوان مرتبہ ضیاء احمد ص ۱۳۷)

بے پردہ پسِ چلمن یک بار تم آ بیٹھے　　بے تابِ نظر کس کو، کیوں جلوہ گری آتی

(،، ص ۲۰۴)

"چلمن" درحقیقت ایسا لفظ ہے جس کے ساتھ اضافتِ فارسی مطلق مخلِ فصاحت نہیں معلوم ہوتی۔ جو مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں، اُن سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے، اور ایسے الفاظ کے ساتھ عطف و اضافت کو غلط نہیں کہنا چاہیے۔ آتش کا شعر ہے:

سرخ و سفید رنگ سے ہوتا ہے آشکار　　وہ جسمِ نازنیں ہے ابیر و گلال کا

(کلیات، نول کشوری، ص ۵۵)

یہاں "ابیر و گلال" نہایت برمحل ترکیب ہے، جب کہ قاعدے کے لحاظ سے یہ بھی درست نہیں۔ یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ ایسی ترکیبوں سے مفر نہیں۔ اوروں کا کیا ذکر خود امیر کے یہاں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ اُن کے مختلف خطوط سے بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

بر واپسی ڈاک (ص ۳۴۹)، بہ صیغۂ بیرنگ (ص ۲۲۲)، کیٹیِ انتخاب (ص ۲۳۶)، ارکانِ اسٹاف (ص ۲۳۸)، متصلِ سڑک (ص ۳۰۹)، کارڈِ اطلاعی (ص ۱۰۹)

یا مثلاً اُن کے اس مطلعے کو دیکھیے:

گھر ہے اللہ کا، گھر بے سر و سامانوں کا　　پاسبانوں کا یہاں کام نہ دربانوں کا

(صنم خانۂ عشق، ص ۔)

پہلے مصرعے میں "بے سر و سامانوں" کی بھی یہی حیثیت ہے۔ غرض یہ ہے کہ "چلمن" جیسے لفظوں کے ساتھ عطف و اضافت کو غلط نہیں کہنا چاہیے۔ اس طرح کی ترکیبیں اچھی خاصی تعداد میں اردو کی نثر و نظم میں ملتی ہیں۔

یہ خط نقوش کے مکاتیب نمبر میں بھی شائع ہوا ہے اور مرقعِ ادب میں (باقی آگے صفحے پر)

(۵۸) جامے سے باہر ہونا۔ گنجینۂ زبان:

"واقعہ یہ ہے کہ جامے سے باہر ہونا اور اس کے امثال میں، بے خودی ضروری ہے، مگر بے خودی کی علل بہ اختلافِ مواقع مختلف ہوتی ہیں۔ کہیں کمالِ غضب، کہیں کمالِ سرور، کہیں کمالِ رشک۔ وقس علیٰ ہذا۔ ناسخ کے اِس شعر میں:

تجھ کو جس گل پیرہن نے اک نظر دکھلا دی
نکہتِ گل کی طرح[1] جامے سے باہر ہو گیا

منشاے بے خودی، رشک ہے۔ اور اس شعرِ ناسخ میں:

اپنے جامے سے وہیں ہو گئے باہر لاکھوں
گھر سے پوشاک بدل کر جو وہ باہر آیا[2]

منشاے بے خودی، وفورِ سرور ہے۔ اور اس فقرے میں کہ "تم سے کوئی کیا دردِ دل کہے، تم ذرا ذرا سی بات میں جامے سے باہر ہو جاتے ہو" منشاے بے خودی، فرطِ غضب ہے۔ بہر حال، آپ کے اس شعر میں:

جامے سے باہر ہے جب سے چھو لیا تیرا لباس
عطر کی بو ہر طرف پھرتی ہے اتراتی ہوئی

منشاے بے خودی، وفورِ سرور ہے۔ اور اترانے کا ذکر، جو اُس کی طرف شعر میں ہے دکھلا، یعنی بوے عطر اس بات پر کہ میں نے اس کا لباس چھوا ہے، ناز کر رہی ہے۔ پس یہ مقام سرور اور نشاط کے جوش کا ہے۔ یہاں غضب اور رشک کی گنجایش نہیں۔

بھی موجود ہے۔ دونوں کے متن میں فرق ہے۔ تقدیم کے لحاظ سے مرقعِ ادب کے متن کو ترجیح دی گئی ہے۔

[1] کلیات میں "طرح" کی جگہ "روش" ہے۔ ع: نکہتِ گل کی روش جامے سے باہر ہو گیا۔
(کلیاتِ ناسخ، مطبعِ مولائی ص ۶)

پس یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ "جامے سے باہر ہوتا ہے" تھوڑی کے معنی میں مان لیا جائے تو میرے شعر میں بوے عطر کا اترانا لطف نہیں دیتا "مستقیم نہیں"، بل کہ خوب لطف دیتا ہے۔ اور شعرا نے ایسے موقع میں دکھا بہت کہا ہے۔ چوں کہ سردست تنقیح کلام کی فرصت نہیں، لہٰذا مثالیں نہیں لکھ سکتا۔ اور آپ کی سلامت رائے اور ذہن وقاد پر اعتماد کر کے اسی قدر توضیح کو کافی سمجھتا ہوں۔

لغت اردو کا جو آپ کے پیش نظر ہے، اس سے متعلق ایک وجہ ہے کہ اس کو میں لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ کبھی ملوں گا تو کہوں گا۔ ایک لغت میں نے زمانۂ غدر سے شروع کیا تھا، مگر وہ میری کم فرصتی سے مہذب و مکمل نہ ہو سکا۔ مسودہ غیر مہذب اُس کا اب بھی موجود ہے کہ اس لغت سے جو آپ نے دیکھا ہے، چہار چند ہے۔ اگر خدا اطمینان دے تو دو برس کی محنت میں وہ تکمیل پا سکتا ہے۔ مگر جو سامان اس کی تکمیل و اشاعت کے لیے درکار ہے، وہ خدا مہیا کرے تو ہو۔ گنجینۂ زبان[3] کو اس کا ایک ٹکڑا جانیے، اور

---

[3] گنجینۂ زبانِ اردو، جلال کے لغت کا نام ہے، جس کا تاریخی نام گلشنِ فیض ہے۔ اس کی تفصیل مکتوب ۱۲ کے حاشیے میں درج کی جا چکی ہے۔ امیر نے گویا جلال پر سرقے کا الزام لگایا ہے، جس صورت میں کہ امیر کا مذکورہ لغت چھپا ہی نہیں تھا اور اُس کا مسودہ بھی "غیر مہذب" تھا اور امیر کی کم فرصتی کی وجہ سے وہ "مہذب و مکمل نہ ہو سکا"۔ کسی خاص ثبوت کے بغیر اس بات کو کیسے مانا جا سکتا ہے۔ اصل میں ان اساتذۂ کرام میں باہم اس طرح کا "مزاج المومنین" ہوتا ہی رہتا تھا۔ اس کو یوں دیکھیے کہ امیر نے جس طرح جلال پر سرقے کا الزام لگایا ہے، مگر ذرا احتیاط کے ساتھ؛ اس کے مقابلے میں، مولوی سید احمد دہلوی مولفِ فرہنگِ آصفیہ نے

شکر ملا بھی کسی قدر تصرف کیا ہوا، اور سب تصرفات بھی بجا نہیں ہیں۔ خیر! اس قصّے کو جانے دیجیے۔ اس خط کو بھی کسی کو نہ دکھائیے کیا حاصل کہ باہم ملال بڑھے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اگر زمانہ فرصت دے گا اور وہ لغت کبھی چھپے گا تو حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ اور فرصت نہ ملی اور وہ محنت بست وہشت سالہ برباد ہو گئی، تو ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

[بنام مہدی حسن خاں شاداب رسول پوری، ۱۳ اپریل ۱۸۹۵]

نہایت وضاحت کے ساتھ آمیر پر بھی یہی الزام لگایا ہے۔ جلدِ اول کے دیباچہ میں جہاں آمیر کی وفات کا ذکر کیا ہے، وہاں لکھا ہے:

"اللہ اللہ! کیا مقام عبرت ہے کہ حضرت آمیر احمد صاحب آمیر مینائی، جنھوں نے اس اخیر عمر میں امیر اللغات کے ۲ دو باب، حرفِ الف ممدودہ و مقصورہ کے، ہو بہو ہمارے ارمغانِ دہلی کا چربا اُتار کر شائع فرمائے..." (فرہنگ آصفیہ، جلدِ اول، حاشیہ ص ۳۰)

مولوی صاحب نے کئی جگہ اس الزام کی تکرار کی ہے۔ اس طرح کے الزامات کو زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہیے۔ معاصرانہ چشمک، ایسے خیال پیدا کر ہی دیا کرتی ہے اور متعلقین کی حسن ساز طبیعتیں اس پر حاشیے چڑھاتی رہتی ہیں۔ ہر لغت میں الفاظ و محاورات کی تو تکرار ہی ہوگی؛ نئے محاورے اور لفظ کہاں سے آئیں گے۔ اور بہت سی تشریحات و امثال بھی ایک جیسی ہو سکتی ہیں۔ اس سے کسی کو مفر نہیں۔ آمیر نے اپنے جس نامکمل لغت کا اس خط میں ذکر کیا ہے، اُس کے متعلق ڈاکٹر ابو محمد سحر نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بہارِ ہند ہوگا (مطالعۂ امیر، ص ۲۱۱) اور مجھے اس رائے سے اتفاق ہے۔ بہارِ ہند کا ذکر آمیر کے ایک اور خط میں بھی آیا ہے، ملاحظہ ہو مکتوب ۲۲۵، اور اس کا حاشیہ۔

(۵۹) اخفائے نون :

"خون، جان وغیرہ سہ حرفی الفاظ میں نون کا اخفا غیر فصیح ہے[1]، الّا بحالتِ اضافت وغیرہ۔"

[بنام نامعلوم، ۲ر نومبر ۱۸۹۸ء]

(۶۰) دولت سرا، کشش و جذبہ :

"دولت سرا مونث ہے۔ دولت سرا کی جگہ، دولت کدہ مناسب ہے۔
کشش اور جذبہ، ایک ہی چیز ہے "کشش" کی جگہ "دل" مناسب ہوگا :
پیغامِ وصلِ یار نے بعدِ فنا دیا — آخر کو دل نے جذبۂ الفت دکھا دیا۔"[2]

[بنام منشی عنایت اللہ رخشاں بدایونی، ۱۹ اکتوبر ۱۸۹۰ء]

(۶۱) سدا :

"سدا کا لفظ بہت فصیح ہے۔ متوسطین نے اس کو ناحق ترک کر دیا۔

---

[1] دوسرے شعرا کا کیا ذکر، اس کی مثالیں خود امیر کے یہاں بہت ہیں، مثلاً :
پردیکھنے کی طرح مری جاں نہیں دیکھا (صنم خانۂ عشق، ص ۲۹)، حسرتیں خوں ہوگئیں دل میں تو لایا رنگ عشق (مرآۃ الغیب، ص ۸۸)، زلفِ لیلیٰ سے پیچ قیس کا دل خوں ہو کر (ایضاً ص ۳۸)، ایسا ہوا ہے اب تو زمانے کا خوں سفید (ص ۴۷)، چمن ہے بلبل کے خوں کا محضر گواہ ہیں برگ و بر سراسر (ص ۹۸)، خوں مرا کر کے بہت ہاتھ ملے قاتل نے (ص ۱۰۳)، خوں ریختہ اس قدر کہ ہوا فرشِ خواب سرخ (ص ۱۱۳)، پھوٹے گا خوں سے دشت میں پھر لالہ زار آج (ص ۱۱۰)۔
یہ پابندی بھی قطعاً غیر ضروری، غیر مناسب اور ناقابلِ عمل تھی، اور اسی لیے اس کو نباہا نہ جا سکا۔ ایک دوسرے مضمون میں اس پر مفصل گفتگو کی گئی ہے، اس سلسلے میں اس کو بھی دیکھا جائے۔

[2] یہ خط صہبائے مینائی میں ہے، مگر نامکمل، مکتوب الیہ کا نام بھی مذکور نہیں۔ اصل خط مکرمی جناب عبرت صدیقی بریلوی کے پاس محفوظ ہے، میں نے اسی خط سے یہ عبارت نقل کی ہے اور مکتوب الیہ کا نام بھی اسی سے ماخوذ ہے۔

میرا جی تو چاہتا ہے کہ اس کا استعمال کروں[1]"

[سوانح امیر مینائی مؤلفہ جلیل مانک پوری، ص ۷۱]

---

[1] امیر کے شاگرد اور جانشین جلیل مانک پوری نے امیر کا یہ قول اپنی کتاب سوانح امیر مینائی میں لکھا ہے۔ مکمل عبارت یہ ہے:

"فرماتے تھے کہ "سدا" کا لفظ بہت فصیح ہے۔ متوسطین نے اس کو ناحق ترک کر دیا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس کا استعمال کروں، مگر کبھی استعمال نہیں کیا۔ اور لطف یہ ہے کہ داغ صاحب سے جب حیدرآباد میں یک جائی ہوئی تو ان کو یہی کہتے سنا کہ "سدا" کا لفظ استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے، مگر انھوں نے بھی کبھی استعمال نہیں کیا۔ یہ ان حضرات کی احتیاط کا مقتضا تھا، ورنہ استعمال کیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔"

(سوانح امیر مینائی، ص ۷۱)۔

صاحب نور اللغات نے "سدا" کو بہ ذیلِ متروکات لکھا ہے۔ جلال نے گلشن فیض میں اس لفظ کو لکھا تھا اور سند میں ناسخ کا یہ شعر لکھا تھا:

"ہو مبارک تا صد و سی سال چترِ سلطنت　　سایہ افگن ہو سدا رایت علم بردار کا"

اور آخر میں لکھا تھا کہ "والحال ایں لفظ متروک است"۔ سرمایۂ زبانِ اردو میں ناسخ کا شعر درج کیے بغیر لکھا ہے: "اس زمانے کے فصحا اس لفظ کو نہیں بولتے۔ اب متروک الاستعمال ہو گیا ہے"۔ مگر اس زمانے کے فصحا کے یہاں یہ لفظ ملتا ہے، مثلاً:

ایک کوڑی کبھی نہ میں لایا　　تم کو اس پر بھی خوش سدا پایا

منیر شکوہ آبادی (کلیات، ص ۲۱۹)

خواجہ اسد قلق لکھنوی (متوفی ۱۲۹۶ھ) کے شہر آشوب (مطبوعہ معاصر ک) میں یہ لفظ دو جگہ آیا ہے:

(۶۲) آسیر۔ مصحفی کے استاد کا نام۔ تلامذہ کی تعداد :

"منشی مظفر علی آسیر مرحوم نے ۷۶ برس، تین مہینے، تیرہ دن کی عمر پائی۔ ۱۷ ربیع الاوّل ۱۲۹۹ھ کو رحلت فرمائی۔ مذہب اُن کا امامیہ تھا۔ تصنیفات کی تعداد تو لکھ دینا آسان ہے، مگر سب کے نام لکھنے کی فرصت کہاں۔

ع : نام فرزند پہ جس کی ہو سدا جان نثار

ع : ملک شہر اودھ کی جو سدا کہلاتے

وزیر تلمیذ ناسخ نے بھی اس کو استعمال کیا ہے، اور صبا کے یہاں بھی موجود ہے :

ع : دیکھتا ہوں اس کو پھرتے دستِ خوباں میں سدا — وزیر (دفترِ فصاحت، ص ۱۸۲)

ع : سدا خراب رکھا اپنے ساتھ اُس کو بھی — صبا (غنچۂ آرزو، ص ۵۰)

ع : گرداب سے کیوں کر نہ کرے آب سدا رقص — صبا (" " ص ۲۹)

ع : ہر حال میں خوش رہتے ہیں کرتے ہیں سدا رقص — صبا (" ")

صاحب نور اللغات نے لکھا تھا کہ "خواص نے اِس کا استعمال ترک کر دیا ہے۔" اثر لکھنوی مرحوم نے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"خواص کی دیکھیے، وہ دن دور نہیں جب یہ "سدا بہار" کو "ہمیشہ بہار"، "سدا سہاگن" کو "ہمیشہ سہاگن"، "سدا رنگیلے" کو "ہمیشہ رنگیلے" اور "معلوم کیا کیا" بہک بہک کر تغیر کریں گے اور زبان کو بازیچۂ اطفال بنا دیں گے۔ ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ چُن چُن کے ہندی الفاظ نکال باہر کیے جاتے ہیں اور اُن کی جگہ فارسی عربی کے الفاظ ٹھونسے جاتے ہیں، اپنی علمیت جتانے اور زبان کو ثقیل اور بھدا بنانے کے سوا، اور تو کام ہی کوئی نہیں۔ میرے مخاطب فصحا ہیں۔" (فرہنگِ اثر بحث متروکاتِ نور اللغات)۔

اس کے بعد اِس لفظ کے متروک ہونے کے ناقابلِ قبول قول پر مزید گفتگو کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

مصحفی مرحوم کے اُستاد کا نام خوب تحقیق کو تو نہیں پہنچا، مگر خان آباد آتی ہی کے شاگرد تھے۔

آپ میرے تلامذہ کی تعداد کیا دریافت فرماتے ہیں۔ میں نے کبھی ان کے اسما ضبط نہیں کیے۔ ایک زمانے میں میرے فرزند اکبر محمد احمد قمر نے کچھ نام لکھے تھے، یاد پڑتا ہے کہ سو سے زیادہ تھے۔ اس کے بعد سیکڑوں اور ہوتے اور ہوتے جاتے ہیں، اور زندگی باقی ہے تو ہوتے جائیں گے۔ ان سب کی فہرست تیار کرنا محال ہے۔ پہلے سے التزام کیا جاتا تو البتہ ممکن تھا۔ میرے نزدیک مناسب یہ ہے کہ چند نامور شاگرد مثل ریاض و آہ و قدا و خلیل و جلیل و عابد و سرشار مولف فسانۂ آزاد وغیرہ کے نام اور پتے لکھ دیجیے اور باعتبار تعداد کے یہ لکھیے کہ بے شمار ہیں۔ اُمرا میں اول درجے (کذا)، نواب خلد آشیاں اور موجودہ میں نواب صفدر علی خاں اور راجہ حسین خاں تعلقہ دار پرپانواں ہیں۔ آخر میں اتنا کہنا ضرور ہے کہ آپ اپنے تذکرے سے دو جزو مرتب شدہ، نقل کرا کے بھیجیے، تا کہ معلوم ہو کہ آپ نے کن کن طبقات کو لیا ہے اور کس رنگ پر لکھا ہے؟"

[بنام نعیم الحق آزاد، ۲۳ جنوری ۱۹۲۸ء، ماخوذ از نقوش خطوط نمبر حصہ اول]

(۶۳) گھائل:

" "گھائل" کو قدما میں اکثر شعرا نے بہ فتح یا موزوں کیا ہے۔ شاہ ظفر دہلوی نے اسی کی تقلید کی، مگر متوسط طبقۂ شعرا نے بہ کسر یا موزوں کیا۔ البتہ اس طبقے میں بحر مرحوم نے بہ فتح یا کہا ہے اور مجھ سے بالمشافہ یہ ذکر کیا کہ وزن سے لوگوں کو دھوکا ہو گیا ہے، در حقیقت ہندی لفظ ہے بہ فتح یا۔ اُس صحبت میں امیر مرحوم بھی موجود تھے، اُن کے نزدیک بہ کسر یا ہی رہا، اور انھوں نے فرمایا کہ

طبقۂ متوسطین میں جمہور شعرا نے بکسرِ یا[1] کہا ہے؛ تقلید انھی کی مناسب ہے اور خود وہ، اور اُن کے اتباع سے میں بھی، بکسرِ یٰ استعمال کرنا بہتر اور راجح سمجھتا ہوں۔ مگر چوں کہ "بسمل" ان معنوں میں شعرا کو مل گیا ہے، تو اس کا استعمال کم تر ہے۔ ہاں، جہاں کہیں مطلعے میں "بسمل" کا قافیہ آگیا ہے، اور ضرورت پڑی ہے کہ دوسرا قافیہ بھی انھی معنوں میں ہو، تو "گھایل" کہا ہے۔ اشعارِ سند کے اِس وقت یاد نہیں، اور میں عازمِ سفر ہوں؛ لہٰذا تفحص و تجسس نہیں کر سکتا۔" [بہ نام حافظ سید عبدالجلیل مارہروی، یکم رجب ۱۳۰۵ھ]

---

[1] جلال نے بھی یہی لکھا ہے: "جناب شیخ امداد علی بحر مغفور، کہ ارشد تلامذہ میں سے جناب شیخ ناسخ مرحوم کے تھے، وہ اس لغت کو یائے تحتانی کے فتحے سے صحیح فرماتے تھے، اور صندل، محمل وغیرہ کے قافیے میں لاتے تھے؛ لیکن اتفاق جمہور فصحائے لکھنؤ کا لغتِ مذکور میں یائے تحتانی کے کسرے ہی پر ہے، یعنی مکسور پڑھتے ہیں اور دل، بسمل کے قافیے میں لاتے ہیں" (سرمایۂ زبانِ اردو)

قاعدے کے لحاظ سے تو یہ لفظ بہ فتحِ یا صحیح ہے، مریل، اڑیل، سڑیل وغیرہ کی طرح شعرا نے اصل کی رعایت سے بہ فتحِ یا نظم بھی کیا ہے، لیکن اکثریت کسرۂ یا کو مرجح سمجھتی رہی ہے۔ شعرائے متقدمین و متوسطین و متاخرین کے دواوین کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکثر دل اور بسمل کے قافیے میں آیا ہے اور کم تر چنچل اور کل کے قافیے میں باندھا گیا ہے۔ البتہ یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ جب یہ "چنچل" وغیرہ کا ہم قافیہ ہوگا تو ی سے لکھا جائے گا (گھایل)، اور جب یہ "دل" وغیرہ کے ساتھ آئے گا تو ی کی جگہ ہمزہ لکھا جائے گا (گھائل)۔ اس کے خلاف لکھنا، غلطیِ املا کا مرتکب ہونا ہے۔ اِس قبیل کے عام ہندی الفاظ کی صورت یہی ہے کہ جب حرفِ آخر سے پہلے والا حرف مفتوح ہوگا تو ی لکھی جائے گی، جیسے: نرایَن، پایَل۔ اور جب وہ مکسور ہوگا تو ی کی جگہ ہمزہ آئے گا، یعنی نرائِن، پائِل، اجائِن، گھائِل وغیرہ ———
آمیر کا یہ خط تاریخِ نثرِ اردو، مؤلفہ مولانا احسن مارہروی سے ماخوذ ہے (ص ۵۵۳)

بحرالبیان

بحر لکھنوی (تلمیذ ناسخ) کا یہ رسالہ، جس کا نام بحرالبیان ہے، قواعد اور لغت کے موضوعات سے تعلق رکھتا ہے۔ قواعد کا حصہ مختصر اور ناتمام ہے۔ دراصل اِس کی حیثیت ضمنی ہے۔ رسالے کا موضوع، اُردو مصادر کا بیان ہے، اور اِس لحاظ سے اِس کو "لغات المصادر" کے ذیل میں رکھنا چاہیے۔ تقدمِ زمانی کے لحاظ سے غالباً اُردو میں یہ اپنے انداز کا پہلا رسالہ ہے۔ اُردو میں متعدد لغت اِس رسالے سے پہلے لکھے جا چکے تھے، مگر یہ انداز کہ اُردو کے مصدروں کو یک جا کیا جائے؛ اُس وقت تک شاید سامنے نہیں آیا تھا۔ اِس رسالے میں مرتّب نے حروفِ تہجی کی ترتیب کے بجائے، سات عروضی ارکان (فعلن، فاعلن وغیرہ) کو باب بنایا ہے اور مختلف مصدروں کو اِن اوزان کے تحت یک جا کیا ہے؛ یہ نیا انداز ہے۔ اربابِ تذکرہ نے بحر کی عروض سے واقفیت اور اِس فن میں مہارت کا خاص طور سے ذکر کیا ہے؛ اِس رسالے کی یہ عروضی ترتیب بھی اِس پر دلالت کرتی ہے۔ مصدروں کی تعداد کے لحاظ سے یہ رسالہ "جامع" کہلانے کا مستحق نہیں، مگر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اِس رسالے سے متعدد مصادر سے متعلق، اور خود مولف کے مختارات کے متعلق کچھ قیمتی معلومات حاصل ہوتی

ہے۔ نیز بعض مصادر اِس رسالے کے علاوہ شاید ہی اور کہیں مل سکیں۔ لغت کے نقطۂ نظر سے، اور اُس عہد کی زبان پر کام کرنے والوں کے لیے، یہ اہم باتیں ہیں۔ مرتّب نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ "اردوی لکھنؤ" سے تعلق رکھتا ہے، اور مرتّب کا شمار ناسخ کے اہم تلامذہ میں کیا جاتا ہے؛ اِس طرح دبستانی نقطۂ نظر سے بھی اِس کے مندرجات قابلِ ذکر حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس رسالے کے مندرجات سے متعلق مزید کچھ کہنے سے پہلے، مولّف کے کچھ حالات مختصراً لکھے جاتے ہیں۔

شیخ امداد علی بحر لکھنوی، شیخ امام بخش کے بیٹے اور ناسخ کے نامور شاگرد تھے [انتخابِ یادگار۔ مجموعۂ سخن]۔ سالِ ولادت کسی نے نہیں لکھا۔ امیر مینائی نے تذکرۂ انتخابِ یادگار میں (سالِ ترتیب: ۱۲۹۰ھ) اِن کی عمر "پینسٹھ برس" لکھی ہے؛ اِس حساب سے ۱۲۲۵ھ کے لگ بھگ زمانۂ ولادت ہوگا۔ ایک عمر کی پریشانی کے بعد، دربارِ رام پور سے متعلق ہوگئے تھے۔ انتخابِ یادگار میں نمونۂ کلام کے ذیل میں اِن کے دو قصیدوں کے چند اشعار بھی لکھے گئے ہیں، اُن دونوں قصیدوں کا تعلق دربارِ رام پور سے ہے اور اُن میں سے ایک قصیدہ نواب یوسف علی خاں ناظم کی مدح میں ہے؛ اِس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ نواب ناظم کے زمانے میں رام پور کے متوسّلین میں شامل ہوئے ہوں گے۔ تاریخ لطیف (قلمی، مخزونہ کتاب خانۂ رام پور) میں امیر کا کہا ہوا قطعۂ تاریخِ وفاتِ بحر موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں اُن کا انتقال ہوا تھا۔ قطعہ یہ ہے:

شیخ امداد علی بحر ز دارِ فانی ۔۔۔ رفت در باغِ جناں، خدمتِ حیدر برسید
ساختم فکر بتاریخِ وفاتش چو امیر ۔۔۔ گفت دل: "بحر بیک موج بکوثر برسید"

متعدد کتابوں میں بحر کا سالِ وفات ۱۳۰۰ھ لکھا ہوا ہے، مگر یہ درست

نہیں ۔ یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ خود اسیر کا انتقال ۱۲۹۹ھ میں ہوا تھا اور اس میں کچھ اختلاف نہیں ۔ انتقال لکھنؤ میں ہوا تھا اور کربلائے تال کٹورا میں دفن ہوئے تھے (آبِ بقا) ۔ رام بابو سکسینا نے لکھا ہے کہ رام پور میں انتقال ہوا تھا ، مگر صاحبِ آبِ بقا کا قول مرجح ہے ۔ محمد علی خاں اثر رام پوری (مرحوم) نے مسدسِ بے نظیر کے حاشیہ ص ۳۷ پر بحر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ : " رام پور میں تحقیق کرنے سے بھی بحر کا انتقال رام پور میں ثابت نہیں ہوا " ۔

بحر کا دیوان سید محمد خاں رند (تلمیذِ آتش) نے ۱۲۵۲ھ میں مرتب کیا تھا ، جس کا اعتراف بحر نے کیا ہے :

جامع اِس دفتر کے ہیں سید محمد خانِ رند
اُس سراپا لطف کا یہ بحر پر احسان ہے

(ریاض البحر ، ص ۲۸۳)

اِس کا نام ریاض البحر ہے ۔ یہ تاریخی نام ہے ، لیکن یہ چھپا تھا رند کے انتقال کے بعد ۱۲۸۵ھ میں ۔ امیر مینائی نے انتخابِ یادگار میں بحر کے نمونۂ کلام کے ذیل میں لکھا ہے : " یہ اُن کے کلیاتِ مطبوعہ کا انتخاب ہے " ، اور اِس ضمن میں اشعارِ غزلیات کے علاوہ ، ایک قصیدے کے پانچ شعر ، ایک قصیدے کے تین شعر ، ایک واسوخت کا ایک بند اور ایک دوسرے واسوخت کے پانچ بند بھی درج کیے ہیں ؛ مگر قصائد اور واسوخت ، دیوانِ مطبوعہ میں شامل نہیں ۔ بحر کے دو واسوخت ، واسوختوں کے مجموعے شعلۂ جوالہ (مرتبہ عیش لکھنوی) میں شامل ہیں ۔ بحر کا ایک دیوان غیر مطبوعہ بھی ہے ، " اس کا ایک نسخہ کتب خانۂ خدا بخش پٹنہ میں موجود

ہے" [قاضی عبدالودود صاحب ۔ تحریک ، غالب نمبر، اپریل ۱۹۶۹ء] ۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی مرحوم نے ، "تذکرۂ آبِ بقا" میں ، بحر کے مفصّل حالات لکھے ہیں ، اُن میں سے کچھ باتیں دوسری کتابوں میں بھی ملتی ہیں، ذیل میں خواجہ صاحب مرحوم کی عبارت کے کچھ اجزا کو اقتباس کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے :

"توپ دروازے کے رہنے والے ، شیخ ناسخ مرحوم کے شاگردِ رشید ، سیاہ فام، دُبلے پتلے ، میانہ قد تھے ۔ تحقیقِ لغت اور صحتِ الفاظِ ہندی میں مشہور، اُستاد لوگ اُن کی زبان کو سند مانتے تھے ۔ ہمیشہ محاورات کی تلاش رہتی تھی۔ نوّاب سیّد محمد خاں رند ، آتش کے شاگرد ، اُن کے بہت قدردان تھے اور کچھ خدمت بھی کیا کرتے تھے۔ چھوٹی شہزادی اشرف النّسا بیگم افسر بہو صاحبہ ، دخترِ حضرت امجد علی شاہ بادشاہ کی سرکار سے کچھ قلیل وظیفہ پاتے تھے ۔ افیون کا استعمال کیا کرتے تھے ۔ عیش باغ کے میلوں میں اکثر جاتے تھے۔ زندگی بہت عسرت سے بسر ہوتی تھی ۔ میاں بحر داڑھی کا ہمیشہ صفایا رکھتے تھے —— نوّاب مہدی علی خاں مرحوم قمر ، تلمیذِ بحر کہتے تھے کہ جس وقت ہم شاگرد ہوئے ہیں ، اُستاد ، چھوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی پر رہتے تھے۔ پھاٹک کی بغل میں ایک کمرا ہے ، اُس میں افیون گھُلا کرتی تھی اور ایک کہنہ چٹائی بچھی رہتی تھی ۔ تحقیقِ الفاظ کو لوگ دور دور سے آتے تھے ۔ دن بھر ڈیوڑھی پر رہتے تھے ، شام کو اپنے مکان پر جاتے تھے ۔ توپ دروازے پر ایک کچّا مکان تھا ، اُس میں رہتے تھے ۔ لڑکا کوئی نہ تھا ،

بیوی تھیں اور آپ تھے ـــــ حکیم میر ضامن علی جلالؔ مرحوم بعدِ رشکؔ
اُنھی سے مشورۂ سخن فرماتے تھے۔ نواب سلیمان خاں صاحب اسدؔ
فرماتے ہیں کہ بحرؔ کو ہم نے بارہا دیکھا، آواز میں سخت رعشہ تھا، غزل
خود نہیں پڑھتے تھے، میاں فہیمؔ اُن کے شاگرد پڑھتے تھے۔ عروض
اچھی طرح جانتے تھے اور اِس فن پر بہت ناز تھا۔"

ایک معاصر کا مختصر بیان بھی اِس کی تائید کرتا ہے: "علم عروض و قافیہ خوب جانتے ہیں۔ بہت لوگ اِن کے شاگرد ہیں۔ آواز میں رعشہ ہمیشہ سے تھا۔ اب بہ وجہِ ضعف رعشہ زیادہ ہوگیا، اِس سبب سے شعر پڑھنا کم کر دیا" [مجموعۂ سخن [1]، حصّۂ دوم، ص 119]۔ نساخؔ نے بھی سخنِ شعرا میں عروض و قافیے سے اُن کی اچھی واقفیت کا ذکر کیا ہے: "عروض و قوافی میں اچھا دخل رکھتے ہیں"۔

بحرؔ کے ایک لغت کا ذکر کئی حضرات نے کیا ہے، لیکن یہ لکھا ہے کہ غالباً وہ مکمل نہیں ہو سکا۔ صاحبِ گلِ رعنا نے لکھا ہے: "لوگ کہتے ہیں کہ اُردو کا ایک لغت لکھنا شروع کیا تھا، اُن کے مزاج کو دیکھتے ہوئے، اِس کی کیا توقع کہ

---

[1] یہ ایک انتخاب ہے جس کو طلبۂ مدارس کے لیے مرتب کیا گیا تھا۔ یہ مجموعہ "حسب الحکم کماں اے۔ آر۔ بروننگ.... ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ملکِ اودھ، پنڈت شیو نراین تھا ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع لکھنؤ نے، بہ اعانتِ منشی محمد حکیم الدین صاحب ہیڈ ماسٹر چوک اسکول، و منشی غلام حسنین قدر ہیڈ ماسٹر مہونا اسکول ضلع لکھنؤ، واسطے طلبۂ مدارسِ ملکِ اودھ کے ترتیب دیا"۔ منشی نول کشور کے مطبعے میں ۱۸۶۸ء میں چھپا تھا۔ مختلف عنوانات کے تحت مشہور شعرا کی غزلیں نقلیں جمع کی گئی ہیں۔ آخر میں کچھ شعرا کا حال بھی لکھا گیا ہے۔

اُسے پورا کیا ہو"۔ صاحبِ تذکرۂ آبِ بقا نے لکھا ہے : "جب دیوان چھپ چکا تو ایک لُغت کی تصنیف میں مصروف ہوئے ۔ خدا جانے اُس کو تمام کیا یا ناتمام رہ گیا"۔ —— کتاب خانۂ رام پور کی فہرستِ مخطوطات میں "بحرالبیان" نام کی ایک کتاب پر نظر پڑی۔ خیال آیا کہ ممکن ہے یہ وہی لُغت ہو جس کا ذکر کیا گیا ہے، دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہی ہے۔ یہ اصلاً ایک رسالہ ہے جو دو حصّوں پر مشتمل ہے : حصّۂ اول، قواعدِ زبان سے متعلق ہے، اور دوسرا حصّہ، اردو مصادر اور کچھ محاورات و کنایات پر مشتمل ہے۔ مولّف نے آغاز ہی میں لکھا ہے کہ : " ایں رسالہ ایست مسمّی بہ "بحرالبیان"، مصنّف امداد علی متخلّص بہ بحر، چند قوانین ہندی یعنی اردوی لکھنؤ، بطریقِ صرف و نحو بہ تحریر آوردہ"۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض رسائل میں ایسی باتیں بھی مل جاتی ہیں جو بہت کام کی ہوتی ہیں۔ بحر کا زمانہ قواعدِ زبان و قواعدِ شاعری کے بہت سے اہم مباحث کا زمانہ ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کی اکثر پابندیاں اِسی زمانے میں معرضِ وجود میں آئیں۔ اِس دور پر ابھی بہت کم کام کیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس زمانے کے لسانی مباحث پر کام کرنے والوں کے لیے یہ رسالہ مفید ثابت ہوگا۔ جو لوگ اُس عہد کی زبان اور مصادر کے معانی اور اُن کے اجزا کی ترتیب پر کام کرنا چاہیں گے، اُن کے لیے اِس رسالے کا مطالعہ ازبس ناگزیر ہوگا۔ ناسخ کے تلامذہ میں قواعد و ضوابط کے واضع کی حیثیت سے رشک کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ اکثر پابندیاں، جن کو ناسخ سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ دراصل رشک ہی کے نتائجِ افکار ہیں۔ رشک کے بعد، فہرست میں بحر کا نام آتا ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ ناسخ کے اِن دونوں اہم شاگردوں نے لُغت کے موضوع پر اپنی تحریروں کو اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا ہے۔ رشک کا لُغت نفس اللغۃ، مکمل شائع نہیں ہو سکا، مگر جس قدر بھی چھپا

ہے ، وہ اس عہد کی زبان کے لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ بحر نے گو باقاعدہ لغت نہیں لکھا، مگر اُن کا یہ رسالہ جو لغاتُ المصادر کے ذیل میں آتا ہے ؛ لغت ہی کے قبیلے کی چیز ہے اور اس لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اِس موضوع پر اس انداز سے اُس وقت تک اُردو میں شاید کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ اِس رسالے میں متعدد مصادر ، املا اور معانی کے لحاظ سے ، لسانی اہمیت رکھتے ہیں اور لغت نویسی کے ذیل میں ایسے مطالعوں کی جو اہمیت ہے ؛ اس سے متعلق افراد بہ خوبی واقف ہوں گے۔

دو چار مثالوں سے مندرجۂ بالا قول کی وضاحت کی جاتی ہے ؛ مصدر "سونگھنا" کو مع نونِ غنّہ لکھا گیا ہے ، اور اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس مصدر میں غنّہ آواز کا شمول محض عوام سے متعلق نہیں ، معتبرین بھی اِس صورت کو مانتے تھے۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لہجے کی ایسی کارفرمائی نہیں جو تحریری سطح پر کبھی قابلِ قبول ہی نہ رہی ہو۔ اِس سے اتّفاق کیا جائے گا کہ اُس عہد کے لیے بھی ، اور کلامِ بحر کی تدوین کے لیے بھی ، یہ معلومات قابلِ ذکر حیثیت رکھتی ہے ___ مصدر "ٹھیرنا" کو مع یؔ لکھا گیا ہے اور اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ٹھہرنا" اور "ٹھیرنا" دونوں صورتیں لکھنؤ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ بحر کے دیوان ریاض البحر میں ، یؔ کی ردیف میں ایک غزل ہے جس کی ردیف ہے : "ٹھیرے" (ص ۲۷۴)۔ بحر کے کلام میں تو اِس مصدر اور اِس کے مشتقات کو مع یؔ (ٹھیرنا ، ٹھیرا وغیرہ) لکھا ہی جائے گا اور تدوین کے نقطۂ نظر سے یہ اہم معلومات ہے ؛ مگر اِس کے علاوہ ، لغت کے لحاظ سے بھی اِس معلومات کی اہمیت ہے۔

"پیلنا" کے ذیل میں صراحت کی گئی ہے کہ : "بعض بایں معنی بجای لام ، حرفِ رای قرشت استعمال کنند"۔ یعنی اِس مصدر کی دو صورتیں

ہیں : پِلنا اور پیرنا - فرہنگِ آصفیہ و نوراللغات میں صرف "پیلنا" ہے ۔۔۔ "بٹنا" جس کا فارسی مرادف "بافتن" ہے ، زیادہ تر بہ ضمّ اول بولا جاتا ہے ۔ فرہنگِ آصفیہ و نوراللغات میں بھی اِس کو بہ ضمّ اول ہی لکھا گیا ہے ؛ مگر بحر نے اِس کو "بافتن" کے معنی میں صرف "بہ کسر" لکھا ہے ۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کی زبان پر جو اِس مصدر کے بعض مشتقات بہ کسرِ اول ہیں ، وہ محض بے اصل نہیں ، بل کہ یہ اختلاف بجائے خود پایا جاتا ہے ۔ لُغت نویسی کے لحاظ سے اِس کی جو اہمیت ہے ، اُس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

"جھنجھوڑنا" کو بہ کسرِ اول لکھا گیا ہے ۔ نوراللغات میں یہ صراحت نہیں ملتی ، بل کہ اِس میں حرفِ اول کی حرکت کی صراحت ہی نہیں کی گئی ہے ۔ آصفیہ میں حرفِ اول پر زبر لگا ہوا ہے ۔ تلفظ کے ایسے اہم اختلافات ، مختلف لسانی مباحث کے لیے بہت کار آمد ہوتے ہیں ، اور لُغت میں ایسی تفصیلات کا جس طرح ذکر کیا جاتا ہے ، اُس کے لحاظ سے یہ اختلاف اہمیت رکھتا ہے ۔۔۔ یہی صورت "ستانا" کی ہے ۔ نوراللغات میں اِس کو "بہ فتحِ اول" لکھا گیا ہے ، عام طور پر مستعمل بھی اِسی طرح ہے ؛ مگر بحر نے اِس کو بہ فتحِ اول و بہ ضمّ اول ، دونوں طرح لکھا ہے (سَتانا ۔ سُتانا) ۔ یہ اختلافِ حرکت بھی لُغت کے لیے اہمیت رکھتا ہے ۔

چکلانا ، "بفتح ، بمعنی چوڑانا" ؛ ڈھڈھانا ، "بہ کسرِ ہر دو دالِ ثقیل ، نواختنِ دفِ کوچک" ؛ مٹمٹانا ، "برہم زدنِ چشم بہ غنودگی" ؛ ٹھپنا ، "بتائی ثقیل و بائی فارسی ، بمعنی ارتسام و طبع ، چوں مہر بر کاغذ" ؛ یہ مصادر نوراللغات میں موجود نہیں اور میرا خیال ہے کہ اِس رسالے کے سوا یہ اور کہیں بھی شاید ہی مل سکیں ۔ آصفیہ میں "چکلانا" موجود ہے ، مگر مختلف معنی میں :

"پھلی اٹھانا، کسی پودے کو مٹی سمیت اٹھانا"۔ یہ مختلف مصدر ہوا۔

نوراللغات میں "پچھکارنا" کے معنی لکھے گئے ہیں: "کتا پیچھے دوڑانا۔ سیٹی بجانا"۔ بحرالبیان میں اِس کے معنی "دوانیدنِ اسپ باوازِ مانندن" لکھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی قابلِ ذکر اختلافِ معنی ہے۔ بحر نے "اردوی لکھنؤ" کی جو تخصیص کی ہے، اس نے اِس رسالے کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔ متعدد مصادر کے ذیل میں اس کو دیکھا جا سکتا ہے، مثلاً "تڑنا" اور "دمانا" زبانِ لکھنؤ سے متعلق مصادر ہیں۔ نور میں بھی اِس کی صراحت کر دی گئی ہے۔ آصفیہ میں یہ مصدر موجود نہیں۔ بحرالبیان میں یہ دونوں مصدر موجود ہیں اور بحرالبیان، نوراللغات سے بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ "تڑنا" کے ذیل میں نوراللغات میں بہ طورِ سند بحر ہی کا شعر لکھا گیا ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، قواعد کا حصّہ مختصر اور ناتمام ہے۔ بحر نے زیادہ توجہ مصادر پر صرف کی ہے۔ قواعد کے موضوع پر جلال کا رسالہ نسبتاً مفصّل ہے؛ مگر بحر کے اِس رسالے میں، قواعد کے ذیل میں بھی بعض اہم باتیں مل جائیں گی اور اِس اعتبار سے یہ ناتمام حصّۂ قواعد بھی قابلِ توجہ قرار پاتا ہے۔ مثلاً بحر نے حرفِ جیم کے ذیل میں لکھا ہے:

"در شش کلمہ برای رفعِ ثقالت می آید، چوں: لیجیے و دیجیے و پیجیے .... بجہت آنکہ اجماعِ سہ یای تحتانی شدہ است و خواندنِ آن دشوار، لہذا حرفِ جیم واقع شدہ، کلمہ فصیح گردید ...."۔

جلال کے رسالے میں یہ بات مذکور نہیں، اور یہ اہم بات ہے۔ ضمنی طور پر، اِس صراحت سے صحتِ املا کے اِس قاعدے کی بھی توثیق ہوتی ہے کہ ایسے تعظیمی افعال میں آخری دو حرف، یی ہیں۔ اصلاً تین یی تھیں، پہلی یی کی جگہ

جچ آگیا ؛ دو تی باقی رہیں۔ یعنی صحیح املا "دیجیے" (دی ج ی یا یے) ہے، اِس کو "دیجئے" (دی ج ء ے) نہیں لکھا جائے گا۔

بعض حضرات نے معائبِ شاعری کے ذیل میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ عربی و فارسی کے جن الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی ہوتی ہے، اُن کو اِس طرح نظم کرنا کہ ہائے مختفی، الف کی طرح آواز دے، داخلِ معائب ہے۔ تجر نے ایک جگہ بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ: "حرفِ ہا، بمنزلۂ الف است در محاورۂ ہندیاں"۔ اور اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بعض حضرات کا وہ قول "محاورۂ ہندیاں" پر توجّہ نہ دینے کا نتیجہ ہے۔

تجر نے مرکبات کے ذیل میں جھالردار، انگیٹھی بردار، چوپڑباز، جیسے متعدد مرکبات بطورِ مثال لکھے ہیں؛ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اور اہلِ نظر کی طرح وہ ایسے مرکبات کو "مہند مرکبات" کے نام پر غلط نہیں سمجھتے تھے، بل کہ وہ ایسے مرکبات کو زبان کا جز سمجھتے تھے۔ اِسی طرح سمیت، تلک جیسے الفاظ، جن کو بعد والوں نے متروک قرار دیا؛ اُن کو تجر نے مستعمل اور فصیح الفاظ کی طرح درج کیا ہے۔ تجر نے "تک" اور "تلک" دونوں کو مستعمل لکھا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ رسالہ کئی اعتبارات سے قابلِ توجّہ ہے، اور اِس قابل ہے کہ لغت نویسی کے سلسلے میں اِس کے مندرجات کو سامنے رکھا جائے۔ یہ ایک ایسے شخص کی تحریر ہے جو اپنے زمانے میں مستند حیثیت رکھتا تھا اور اُس زمانے کی تحریر ہے جب زبانِ لکھنؤ کا نقش درست ہو رہا تھا۔ اِنھی اعتبارات کے پیشِ نظر، اِس متن کو شائع کیا جا رہا ہے اور توقّع کی جاتی ہے کہ زبان و بیان کے بعض مسائل کی افہام و تفہیم میں اِس کے مندرجات سے قابلِ قدر مدد ملے گی۔

اِس کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے، جو مضبوط بادامی کاغذ

پر لکھا ہوا ہے۔ خط پختہ اور روشن ہے۔ سرخیاں شنگرفی ہیں اور عبارت میں بھی خاص خاص لفظوں کی یہی صورت ہے۔ جس طرح اِس کی کتابت کی گئی ہے اُس سے بہ ظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ کسی خاص مقصد کے تحت اہتمام سے کام لیا گیا ہے، اگرچہ مخطوطے میں ایسی کوئی صراحت موجود نہیں۔ کتابت کی اغلاط بھی کچھ نہ کچھ موجود ہیں، جیسے: "کثیف" کی جگہ "کسیف" وغیرہ۔ الفِ ممدودہ پر کہیں مد ہے اور کہیں نہیں۔ بابِ فعلن کے ذیل میں "آنا" کو "اانا" لکھا گیا ہے، مگر اور مقامات پر الفِ ممدودہ کی متعارف صورت (آ) ملتی ہے۔ پیش کے اظہار کے لیے اکثر مقامات پر، قدیم طرزِ نگارش کے مطابق، واو لکھا گیا ہے، جیسے: اوس، اوٹھنا وغیرہ۔ کتابت کا عام انداز جو اُس زمانے میں تھا، وہ اِس میں بھی موجود ہے۔ "پانو" کا املا ہر جگہ "پاوں" ہے۔ لکھنؤ والے اِس لفظ کا یہی املا مانتے تھے۔ خاص بات یہ ہے کہ واو کو ہمزہ کے بغیر لکھا گیا ہے۔ ہمزہ اور بہت سے ضروری مقامات پر بھی نظر نہیں آتا اور کہیں ملتا بھی ہے۔ اِس طرح کی کم احتیاطیاں یا انتشار، اُس زمانے میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ الفِ ممدودہ پر کہیں مد ہے اور کہیں نہیں۔ نقطوں کا بھی یہی حال ہے۔

عام طور پر املا میں صحت اور روشِ حال کو ملحوظ رکھا گیا ہے، البتہ خاص خاص مقامات پر اصل صورت کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ "پاوں" کو ہر جگہ "پاؤں" لکھا گیا ہے۔ الفِ ممدودہ پر ہر جگہ مد لگایا گیا ہے۔ گاف کے مرکزوں کی بھی یہی صورت ہے۔ البتہ "اانا" کو اِسی طرح رکھا گیا ہے۔ پیش کے اظہار کے لیے جن لفظوں میں واو کو لکھا گیا تھا، اُن کو بدونا واو کے بغیر لکھا گیا ہے۔ البتہ جن الفاظ و مصادر میں، تشریح کے ذیل میں، اِس واو کا ذکر آ گیا ہے

وہاں واو کو ضرور تا لکھا گیا ہے، مثلاً " آرشنا " کو مخطوطے میں اِس طرح لکھا گیا ہے: " اوڑنا، بضم و واوِ مشمومہ، پہ یدن ۔" ظاہر ہے کہ تشریح میں " واوِ مشمومہ " کا ذکر آگیا ہے، اِس لیے یہاں " اوڑنا " لکھنا لازم ہوا۔ املا کی روشِ حال کے مطابق رموزِ اوقاف کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

مخطوطے میں متعدد جگہ کچھ قلم زد عبارتیں بھی ہیں۔ اُن عبارتوں کو قلم زد ہی سمجھا گیا ہے۔ جن مقامات پر یہ خیال ہوا کہ لغزشِ قلم نے غلط نگاری کا ارتکاب کیا ہے، ایسے مقامات پر صحت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، مگر سختی کے ساتھ اِس کی پابندی کی گئی ہے کہ صرف نہایت صریح غلطی تک اِس کو محدود رکھا جائے اور خواہ مخواہ قیاسی تصحیح سے کام نہ لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مقامات پر " کذا " لکھنا پڑا ہے۔ بعض مقامات پر نہایت ضروری اجزا چھوٹے ہوئے معلوم ہوئے، ایسے مقامات پر ربطِ عبارت کے لحاظ سے، قوسین ( ) میں ضروری اضافے کیے گئے ہیں۔ مخطوطے میں اگر کہیں کوئی لفظ قوسین میں تھا، تو اُس کو ایسے قوسین [ ] کے درمیان لکھا گیا ہے۔ اِس کا اظہار ضروری ہے کہ فارسی عبارت نہایت معمولی درجے کی ہے، بل کہ متعدد مقامات فارسی کے لحاظ سے محلِ نظر بھی معلوم ہوتے ہیں؛ مگر مولف نے فارسی دانی کا کہیں دعوا بھی نہیں کیا۔ اِس کے علاوہ، اِس رسالے کا مطالعہ موضوع کے لحاظ سے کرنا چاہیے، زبان کے لحاظ سے نہیں۔ چوں کہ اُس زمانے میں یہ روایت عام تھی کہ ایسی تحریروں کو فارسی میں لکھا جائے، اِس لیے مولف نے بھی اُسی کی پیروی کی۔ مولف کی حیثیت اُردو کے لحاظ سے " اہلِ زبان " کی تھی، اور اِس حیثیت پر شک نہیں کیا جا سکتا، اور یہی اصل بات ہے:

رسالے کے آغاز میں حمد و نعت و منقبت پر مشتمل ۲۹ اشعار ہیں؛ اُن کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

ایں رسالہ ایست مسمّیٰ بہ بحرالبیان ۔ مصنّفِ امداد علی ، متخلص بہ بحر ، چند قوانینِ ہندی یعنی اردوی لکھنؤ ، بہ طریقِ صرف و نحو بہ تحریر آوردہ ، بہ چند موج ۔

موجِ اوّل :

بداں کہ جملہ کلام زبان زدِ خاص و عام ، سہ قسم اند : اسم و فعل و حرف ــــ
اسم ، کلمہ ایست مستقلِ معنی باشد فی نفسہٖ ، چوں : گاو و خر و سنگ و شجر ۔
فعل ، کلمہ ایست کہ در معنیش یکے زمانہ یافتہ شود : ماضی یا حال یا استقبال ۔
چوں : آمد و می آید و خواہد آمد ۔ و در ہندی : آیا و آتا ہے و آئے گا ۔
حرف ، آنست کہ معنیش بلا ضمِ ضمیمہ مفہوم نشود ۔ چوں : در و بر ۔ اوپر و تلے ۔ میں و بیچ و سے و سمیت و جو و تک و ہاں و ہوں و سوای آں ۔
مصدر ، آنست کہ مانند باشد و افعالِ متصرفہ از آں اخراج یابند یعنی صیغۂ ماضی و حال و استقبال وغیرہ ۔ و مصدر در ہند سہ اند : یکے اصلی و یکے جعلی و یکے مزیدی و حاصل بالمصدر ۔ و آں ہر سہ مصادر بہ اعتبارِ حروف چہار اند : یکے رباعی و دوم خماسی و سوم سداسی و چہارم سباعی ۔

و بہ اعتبارِ وزنِ عروضی ہفت اند ، بریں اوزان : فعلن و فاعلن و فعولن و مفاعلن و مفعولن و مستفعلن و فاعلاتن ۔

پس مصدرِ اصلی کہ بروزنِ فعلن است ، یکے حرف درو زائد نیست، چوں : آنا و جانا و کھانا و پینا و سونا و جاگنا ۔

مصدرِ جعلی آنست کہ مرکب باشد از فارسی و ہندی ، چوں : خریدنا و قبولنا و تراشنا و لرزنا و شرمانا و بخشنا و گزرنا و فرمانا ۔

مصدرِ مزیدی آنست کہ صیغۂ امر بروافزایند ، چوں : کر بیٹھنا و بول اٹھنا و تڑپ جانا و رو دینا ۔ و وزن برای آں معین نیست ۔

حاصل بالمصدر بہ حرف (کذا) مشترک است : یکے بہ تای قرشت ، چوں : گھرت و جرأت و چاہت و بادشاہت ۔ و یکے بہ تای ثقیل ، چوں : بناوٹ و سجاوٹ و رکاوٹ و گھبراہٹ ۔ و یکے بہ سینِ سعفص ، چوں : مٹھاس و کھٹاس و ہنگاس و مٹاس و پیاس ۔ و یکے بہ نون ، چوں : تڑپن و چلن و الجھن و مرن ۔

و مصادرِ فعلن بہ ہر سہ حرکت ، چوں : کہنا و رہنا و دینا و لینا و جینا و پینا و ہونا و رونا ۔

و مصادرِ فاعلن نیز بہ ہر سہ حرکت ، چوں : مارنا و گاڑنا و پھیرنا و گھیرنا و موڑنا و توڑنا ۔

و مصادرِ فعولن نیز بہ ہر سہ حرکت ، چوں : جلانا و منگانا و چھپانا و چلانا و اچھلنا و ابلنا ۔

و مصادرِ فاعلن نیز بہ ہر سہ حرکت ، چوں : پھاڑنا و سنوارنا و نکالنا و بگاڑنا و پکارنا و ابھارنا ۔

و مصادرِ مفعولن نیز بہ ہر سہ حرکت ، چوں : سہلانا ، بہلانا ، اترانا ، دکھلانا ، مرجھانا ، کمھلانا ۔

و مصادرِ مستفعلن ہم بہ ہر سہ حرکت ، چوں : پہچاننا ، پچکارنا ، مل بیٹھنا ، سرکھیلنا ، پچکارنا ، سسکانا ۔

و مصادرِ فاعلاتن نیز بہ ہر سہ حرکت ، چوں : گرگرانا ، جھلجھلانا ، بلبلانا ، ہچکچانا ، کلکلانا ، سرسرانا ۔

و چہار حرف کہ مخلوط التلفظ آیند ، مخلِّ وزن نیست ، و آں این است : ن ، و ، ہ ، ی ۔ مانند نونِ غنہ و واوِ مشمومہ ، کہ در فارسی می آیند ، چوں : خواب و خور و ناں و جاں ۔ و ہشت حروف در فارسی نمی آیند ، و آں این است : ث ، ح ، ص ، ض ، ط ، ظ ، ع ، ق ۔ و چار حرف در عربی نمی آیند ، و آں این است : پ ، چ ، ژ ، گ ۔ و نُہ حرف در ہندی نمی آیند ، و آں این است : ث ، ح ، ذ ، ص ، ض ، ط ، ظ ، ع ، ق ۔ و چہار حرف کہ از لہجۂ زبان پیدا می شوند ، و آنرا حروفِ مشمومہ گویند کہ بالا مذکور شد ۔ و مثالِ نؔ ، چوں : ڈانک و ٹانک ، ہر دو بر وزنِ پاک ۔ و مثالِ وؔ ، چوں : کواری و جواری ، ہر دو بر وزنِ یاری ۔ و مثالِ ہؔ ، چوں : گھر و دھر ، ہر دو بر وزنِ زر ۔ و مثالِ یؔ ، چوں : پیاما و پیاسا ، ہر دو بر وزنِ دابا ۔

و بنای زبانِ عربی منحصر است بر بست و ہشت [۲۸] حروف ۔ و بنای زبانِ فارسی منحصر است بر بست و چہار [۲۴] حروف ، و بنای زبانِ ہندی بر سی [۳۰] حروف ، مع حروفِ مشمومہ و حروفِ ثقیل یعنی ٹ و ڈ و ڑ ۔

موجِ دوم در تقسیمِ حرف :

بداں کہ الف در آخرِ افعال ، علامتِ ماضیِ مذکّر است ، چوں : اُٹھا و بیٹھا و دیکھا و سُنا ۔ و در آخرِ اسم ، علامتِ مذکّر است ، بشرطے کہ جمعش ممتنع بہ یائی مجہول باشد ، بہ یا و نون نباشد ، چوں : گھوڑا و گدھا و کالا و گورا ۔ و گاہے برای تحقیر می آید ، چوں : کلوا و بدھوا و ٹٹوا و مٹھوا ۔ و گاہے برای تعداد ، چوں : پہلا و دوسرا و تیسرا و چوتھا و چھٹا ۔ سوای ایں پنج مقام نمی آید ۔

و گاہے میانِ دو کلمہ برای اتصال می آید ، چوں : بھاگا بھاگ و مارا مار ۔ و گاہے در مصدر برای تعدیہ می آید ، چوں از سمجھنا ، سمجھانا ۔ و از اُٹھنا ، اُٹھانا ۔ گاہے در اولِ کلمہ برای نفی می آید ، چوں : الگ و اچھت و اٹنک و امٹ ۔ و گاہے در آخرِ اسم برای مفعولیت می آید ، چوں : گنڈیا و لتیا و ڈکھیا و منکھیا ۔

حرفِ تا : برای حاصل بالمصدر ، کہ بالا مسطور شدہ ، چوں : چنت و بنت ۔ و علامتِ تانیث است درِ الفاظِ عربی و فارسی و ہندی ، چوں : دولت و حشمت و ثروت و عظمت ۔ و خلعت و شربت ، کہ در استعمال مذکّر اند ، شاذ اند ۔

حرفِ جیم : در شش کلمہ برای رفعِ ثقالت می آید ، چوں : کیجیے و لیجیے و پیجیے و دیجیے و ہوجیے و پیجیے ۔ بہ جہت آں کہ اجماعِ سہ یائی تحتانی[1]

---

[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان افعال میں اصلاً تین ی کا اجتماع تھا ، ج کے آنے

(باقی اگلے صفحے پر)

شده است و خواندنِ آں دشوار ؛ لہذا حرفِ جیم واقع شده ، کلمه فصیح گردید ، چوں نونِ وقایه در عربی ۔ و اگر لفظ "کیجیے" را "کریے" خوانند ، خلافِ محاورۂ فصحا ست ۔

حرفِ سین : برای حاصل بالمصدر آید ، که مذکور شد ، چوں : بُھواس و مٹھاس ۔ و در اولِ کلمه برای تحسن و خوبی می آید ، چوں : سُمیل و سُڈول ، ہر دو به ضم ۔

حرفِ کاف : برای مفعولیت در آخرِ کلمه می آید ، چوں : لے پالک و ٹھنڈک و پھٹک و کالک[1] ۔ و گاہے برای تصغیر ، چوں : ڈھولک ۔ و گاہے برای مشارکت میانِ دو کلمه ، چوں : مارک مارا و نوچک ناچا ۔ و گاہے برای نفی ، چوں : کُمیل و کُڈھب و کُراه ، ہر سه به ضم ۔

ہے آخر میں دو "یے" باقی رہ گئیں ؛ اس لیے "کیجئے" یا "دیجئے" یا "لیجئے" لکھنا غلط ہوگا ۔ صحیح املا ہوگا : کیجیے (کی جائے) ، دیجیے (دی جائے) وغیرہ ۔ یہ غلط نگاری اکثر دیکھنے میں آتی ہے کہ ایسے "تعظیمی افعال" میں آخری "یے" سے پہلے ایک عدد ہمزہ کو داخل کر دیا جاتا ہے اور یہ بالکل غلط طرزِ نگارش ہے ۔ ایسے افعال کے آخر میں ہمیشہ دو "یے" آئیں گی ۔ جیسے : دیکھیے ، لکھیے ، پڑھیے ، دیجیے وغیرہ ۔

"سکالک ، قلیل سی سیاہی کو بولتے ہیں" جلال (قواعد المنتخب ، ص ۸) مگر استعمالاً تصغیر کی قید باقی نہیں رہی ، عام لفظ کے طور پر بھی اس کو استعمال کیا جاتا ہے ۔ نوراللغات میں رِند کا ایک شعر اس لفظ کے ذیل میں بہ طورِ مثال لکھا گیا ہے اور اس سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے ۔ شعر یہ ہے : شبِ فراق کی کالک سے دم نکلتا ہے ؛ الٰہی رات ہوئی یا کوئی بلا آئی ۔

حرفِ نون : در آخرِ اسم علامتِ تانیث است ، چوں : رہین و کرمین ۔ وگاہے علامتِ زوجہ ، چوں : تیلن و تنبولن و دلہن و سمدھن ۔ و گاہے در آخرِ صیغۂ امر برای حاصل بالمصدر آید ، چوں : جلن و مرن و دھڑکن و چبھن ۔ وگاہے در آخرِ صیغۂ ماضی بہ ہماں معنی آید ، چوں : اُٹان و آٹھان و چلان و لگان ۔ وگاہے برای مفعولیت آید ، چوں : کترچن و پیشکن و چھیلن ۔ و بہ افعال و اسما[1] حرفِ نفی است ، چوں : نہ دیا ، نہ لیا ، نہ جائے گا ، نہ آئے گا ۔ نڈر ، نیل ۔

حرفِ لام : در مصدر برای تعدیہ[2] می آید ، چوں : از دینا ، دلانا و

---

[1] اسموں کے قبل نونِ نفی مکسور ہوتا ہے ، جیسے : نِدھڑک ، نِکما ، نِگوڑا وغیرہ ۔ اور افعال کے اول " نہ " آتا ہے ۔ یہ صراحت ضروری تھی ۔ محرر نے آگے چل کر خود بھی " نہیں " اور " نہ " کو درج کیا ہے اور لکھا ہے : " بفتح ، ہر دو نافیہ اند " ، اور یہاں پر " نہ " کا اندراج بالکل ٹھیک ہے ۔ بہرصورت ، اسموں کے قبل آنے والا نونِ مکسور ، جو نفی کے واسطے آتا ہے ، وہ " نہ " سے یوں مختلف ہے ، جو افعال کے شروع میں آتا ہے کہ وہ مفتوح ہوتا ہے ۔

[2] جلال نے بجا طور پر اِس صورت کو " تعدیہ صرف " سے موسوم کیا ہے ، یعنی " دلانا " وغیرہ میں تعدیۂ محض ہے اور یہ لام ، " کہیں قبل الفِ تعدیہ کے آ کر ، فائدہ تعدیہ کی تاکید کا دیتا ہے ، جیسے : دکھانا سے دکھلانا ، بتانا سے بتلانا ، بٹھانا سے بٹھلانا " (قواعد المنتخب ، ص ۹) ۔ یہ حوالہ اِس لیے دیا گیا کہ لکھنؤ کے بعض اساتذۂ متاخرین نے " دکھلانا " ، " بتلانا " جیسے افعال کو متروک قرار دیا ہے ؛ حالاں کہ بہ قولِ جلال ان سے تعدیہ کی تاکید کا فائدہ حاصل ہوتا ہے ۔ جلال نے اِس سلسلے میں مزید لکھا ہے :

(باقی اگلے صفحے پر)

از کھانا، کھلانا و از پینا، پلانا۔

حرفِ میم : در دو کلمہ برای مشارکت می آید، چوں : دھکم دھکا، گتھم گتھا، کشتم کشتا۔

حرفِ واو : واوِ معروف در آخرِ کلمہ علامتِ مذکر است، چوں : پڑھو، دکلو، و بیرو۔ و گاہے گاہے برای فاعلیت آید، چوں : کھاؤ و لٹاؤ و کماؤ و ڈاکو۔ و واوِ مجہول در آخرِ امرِ حاضر برای جمع تعظیماً آید، چوں : آؤ و جاؤ و بیٹھو و اٹھو۔ و گاہے برای حاصل بالمصدر، چوں : دکھاو و بچاو و چڑھاو و گھٹاو۔[1]

"یہ جو بعض فصحائے متاخرین اِن مصادر کو اپنے نزدیک زائد و بے کار سمجھ کر، اُن کے استعمال ہی کے نظم و نثر میں مانع ہیں، اُن کی غلط فہمی ہے۔ ہرگز یہاں لام زائد و بے کار نہیں۔ ہاں خود اُن کو اپنے مقام پر اِن مصادر کے استعمال کے ترک کر دینے کا اختیار ہے، کہ ہر ایک اپنے طور پر اخذ و ترکِ الفاظ کا مختار ہے"۔ (ایضاً)

آرزو لکھنوی مرحوم کا شعر یاد آیا :

نیرنگ نہ دکھلائے اگر جلوۂ یک رنگ — وہ کون ہے، کچھ کو جو بت خانہ بنا دے

(جہانِ آرزو، ص ۱۶۰)

1. جلالؔ نے آخر میں آنے والے اِس واو کی تین قسمیں کی ہیں : معروف، مجہول، موقوف۔ یہ نہایت مناسب تقسیم ہے، کیوں کہ دکھاو، بچاو وغیرہ حاصل مصدروں کے آخر میں واو موقوف ہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کو "دکھاؤ" یا (...)

حرفِ یا : یای معروف در آخرِ اسم علامتِ تانیث است ، چوں : ٹوپی ، پگڑی ، کھڑکی [دروازۂ کوچک] - و در افعالِ ماضیِ مونّث است ، چوں : مٹھائی کھائی و کشائی دکھائی - گاہے برای فاعلیت ، چوں : تیلی و تنبولی و چھیپی - و گاہے برای نسبت ، چوں : پڑوسی و دیسی - گاہے برای اجرت ، چوں : پسائی و دُھلائی و پکوائی و رنگائی - و گاہے مصدری ، چوں : بھلائی و بُرائی و چوراچوری و قساقسی و چھینا جھپٹی و ہلاچلی -

و یای مجہول در آخرِ اسمِ مذکر برای جمع آید ، اگر آخرش الف باشد یا ہای ہوّز - زیرا کہ حرفِ ہا ، بمنزلۂ الف است در محاورۂ ہندیاں ، چوں : گھوڑے و گدھے و خیمے و بےچھپے - و گاہے در آخرِ امرِ غائب می آید ، چوں : آئے - و گاہے در آخرِ امرِ حاضر می آید مکرّر -

---

" بچاؤ " لکھنا غلط ہوگا ، کیوں کہ اِس صورت میں واو موقوف نہیں رہتا ، محض ساکن ہوتا ہے - افعال میں واو ساکن ہوتا ہے ، اور حاصل مصدروں میں موقوف ہوتا ہے - مثلاً جانا کے فعل " جاؤ " میں واو ساکن ہے (جاءُ و) اور لگانا کے فعل " لگاؤ " میں بھی واو ساکن ہے ، مگر اِس کا حاصل مصدر " لگاو " ہوگا اور اِس میں واو موقوف ہے ، اِس کو " لگاؤ " نہیں لکھا جا سکتا ــــــ اِسی طرح گھاو ، ناو ، پاو ، گاو وغیرہ اسموں میں بھی واو موقوف ہے ، اِن میں بھی واو سے پہلے ہمزہ نہیں آئے گا ، ورنہ واوِ موقوف ، واوِ ساکن میں بدل جائے گا - جلال نے واوِ موقوف کے متعلق لکھا ہے : " اور واوِ موقوف کی شناخت یہ ہے کہ آخر میں اُن اسما کے واقع ہوتا ہے جن میں اِس واو کے قبل الف واقع ہو " - یہ نہایت واضح تعریف ہے - اِس کے مطابق " بناؤ " میں واوِ ساکن ہے اور " بناو " میں واوِ موقوف ہے - اِس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے اکثر صورتوں میں املا کے لحاظ سے غلط نگاری کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور قواعد کے لحاظ سے غلط مبحث ہوتا ہے -

موجِ سوم :

ہر گاہ می خواہی کہ صیغۂ امر بسازی از مصدرِ ہفتگانہ ، پس لفظِ " نا " کہ علامتِ مصدر است ، ساقط کن ، چوں امرِ حاضر از آنا : آ و از جانا : جا ۔ و جمعش : آؤ و جاؤ ۔ و جمعِ تعظیماً : آئیے و جائیے ۔ و امرِ غائب : آئے و جائے ۔ و جمعش بہ یا و نون است ، چوں : آئیں و جائیں ۔ و در امرِ حاضر و غائب ، مذکر و مونث مساوی اند ۔

ماضیِ پنجگانہ : بداں کہ صیغۂ ماضیِ پنجگانہ و صیغۂ حال و صیغۂ استقبال از صیغۂ امر می سازند ۔ ہر امرے کہ در آخرِ آں الف است ، بہ الحاقِ یا ، ماضی شود ، چوں : آیا و کھایا ۔ و اگر آخرِ امر حرفِ دیگر ؛ بہ الحاقِ الف ، ماضی می شود ، چوں : سنا و دیکھا ۔ و " جانا " کہ مصدر است بمعنیِ رفتن ؛ ماضیِ آں بہ لفظِ " گیا " خلافِ قیاس آمدہ ۔

و بہ الحاقِ " ہے " بہ فتح ، ماضیِ قریب الحال می شود ، چوں : لکھا ہے و پڑھا ہے ۔ و در جمعِ مذکر و مونث نون زیادہ می شود ، چوں : ہیں ، بجائے " ہے " ۔ و بہ الحاقِ " تھا " ماضیِ بعید الحال می شود ، چوں : بیٹھا تھا و اٹھا تھا ۔ و بہ الحاقِ " تا تھا " ماضیِ استمرار می شود ، چنانکہ : جلتا تھا ، ملتا تھا ۔ و بہ الحاقِ " ہوگا " ماضیِ محتمل می شود ، چوں : گایا ہوگا و بجایا ہوگا ۔ و بہ الحاقِ " گا " صیغۂ امرِ غائب ، صیغۂ استقبال می شود ، چوں : آئے گا و جائے گا ۔

ماضی پنجگانہ :	مذکر واحد	جمع مذکر	واحد مونث	جمع مونث	متکلم واحد و جمع
ماضی مطلق :	آیا	آئے	آئی	آئیں	آیا میں آئے ہم
ماضی قریب الحال :	آیا ہے	آئے ہیں	آئی ہے	آئیں ہیں	آیا ہوں میں آئے ہیں ہم
ماضی بعید الحال :	آیا تھا	آئے تھے	آئی تھی	آئیں تھیں	آیا تھا میں آئے تھے ہم
ماضی استمرار :	آتا تھا	آتے تھے	آتی تھی	آتیں تھیں	آتا تھا میں آتے تھے ہم
ماضی محتمل :	آیا ہوگا	آئے ہوں گے	آئی ہوگی	آئیں ہوں گی	آیا ہوں گا میں آئیں ہوں گے ہم
استقبال :	آئے گا	آئیں گے	آئے گی	آئیں گی	آؤں گا میں آئیں گے ہم
حال :	آتا ہے	آتے ہیں	آتی ہے	آتیں ہیں	آتا ہوں میں آتے ہیں ہم

و برای متکلم سہ لفظ اند : مَیں ، بہ فتح ۔ ہم ، بہ فتح ۔ مجھ ، بہ ضم ۔ و وتن بلا شرکتِ حرفِ دیگرے خاص است (کذا) ۔

و ایں الفاظِ متکلم ، گاہے با فعل اول می آیند و گاہے در آخرِ فعل ۔ "میں" و "ہم" بہ افعالِ لازم می آیند ، چوں : میں اٹھا ، میں بیٹھا ۔ ہم اٹھے ، ہم بیٹھے ۔ اٹھا میں ، بیٹھا میں ۔ اٹھے ہم ، بیٹھے ہم ۔ "میں نے" و "ہم نے" بہ افعالِ متعدی می آیند ، چوں : میں نے کھایا ، میں نے پیا ۔ ہم نے کھایا ، ہم نے پیا ۔ "مجھ" برای اشارت بذاتِ خود ، چوں : مجھ کم بخت کو ، مجھ دیوانے کو کیوں ستاتے ہو ۔ "مجھے" نیز برای ذاتِ خود ، چوں : مجھے کیا غرض ، مجھے کیوں بلایا ۔

گاہے بہ ازدیادِ کاف و واو ، برای مفعولیتِ خویش ، چوں : مجھ کو پڑھایا لکھایا ۔ گاہے بہ ازدیادِ سین و یا ، چوں : مجھ سے فلاں شخص کو کیا مطلب ۔ و گاہے بہ الحاقِ لفظ "میں" ، چوں : مجھ میں طاقت ہے ۔ و گاہے بہ اتصالِ لفظ "سمیت" ، چوں : مجھ سمیت

آستاد مختلج ہوئے ۔ و گاہے بہ اتصالِ لفظِ "پر" ، چوں : مجھ پر احسان ہے آپ کا۔
و گاہے بہ الحاقِ لفظِ "سا" ، چوں : مجھ سا دوسرا نہیں ۔

میرا : برای ملکیت ، چوں : یہ مال میرا ہے - یہ غلام میرا ہے - و برین قیاس " ہم " ، چوں : ہمیں کیوں بلایا ۔ ہم کو کس لیے تکلیف دی - ہم سے کیا غرض ۔ ہم میں طاقت نہیں - وہ ہم سمیت نوکر ہوئے - ہم پر احسان اُن کا - ہم سا بے ہنر - یہ مقسوم ہمارا - و ایں الفاظِ روابط اند ۔

اپنا : مخففِ "آپنا" ، بمعنیِ خویش ، برای مذکر ۔ یعنی : یہ گھوڑا اپنا ہے ۔ و برای موئنث " اپنی " : یہ گھوڑی اپنی ہے ۔

الفاظِ روابط این است کہ با کلمہ و کلام می آیند :

سمیت : بفتحتین ، برای معیت است ۔

سے : بکسر ، بیای مجہول ، بمعنی " از " است ۔

میں : بکسر ، بیای مجہول و نونِ غنہ ، بمعنیِ " در" ۔

سا : بمعنیِ مانند ۔

پر : بفتح ، بمعنیِ بالا و علیٰ ۔

کو : کافِ تازیِ مضموم بہ واوِ مجہول ، چوں " را " در فارسی ۔

کے : کافِ تازیِ مکسور بیای مجہول ، بمعنیِ اضافت ، برای اشیای مذکرِ جمع ، چوں : زید کے گھوڑے ، عمرو کے ہاتھی - و بیای معروف برای اشیای موئنث ، چوں : زید کی گھوڑی ، عمرو کی ہتھنی۔

کا : برای اضافتِ شے مذکر ، چوں : امیر کا لشکر۔

اور : بفتح ، بمعنیِ واوِ عطف ۔

نہیں : بفتح و ہای مکسور بیای معروف و نونِ غنّہ ، بہ نَہ ، بفتح ، ہر دو نافیہ اند ،
چوں : فلاں مفلس نہیں نہ بے بضاعت ۔
ہے : بفتح ، بمعنیِ " است " در فارسی ۔

الفاظِ اشارہ برای سمت و طرف :

اِدھر : بکسر و دالِ مفتوح با ہای مخلوط ، بمعنیِ ایں طرف ۔
اودھر :[1] بضم و واوِ مشمومہ و دالِ مفتوح و ہای مخلوط ، بمعنیِ آں طرف ۔
کدھر : بر وزنِ اِدھر ، بمعنیِ کدام سمت ۔
جدھر : بر وزنِ کدھر ، اشارہ ایست از ہر سو ، چوں : جدھر چاہو ، جاؤ ۔ جدھر سے آئے ہو ، اُدھر جاؤ ۔
اِس : بکسر ، اشارہ ایست بہ ہر چیز ، بمعنیِ ایں ، چوں : اِس مرد کو یا اِس گھوڑے کو پہچانتے ہو ؟ یا اِس طرف جاؤ ۔
اُس : بضم ، بمعنیِ آں ، بہماں معنی ۔
کِس : بر وزنِ بس ، بمعنیِ کدام جا و کدام وقت ۔ گاہے بہ ازدیادِ حرفِ " کو " ، یعنی : کِس کو ۔ گاہے بہ ازدیادِ یا ، یعنی : کسے ۔ گاہے بزیادتِ " میں " ، یعنی : کِس میں ۔ و بریں قیاس ہر سہ : اِس و اُس و کِس ۔

---

[1] یہ پرانا اندازِ نگارش ہے ، جو اب قطعاً متروک ہے ۔ اب " اُدھر " لکھا جائے گا ۔ چوں کہ یہاں " واوِ مشمومہ " کی صراحت تھی ، اِس بنا پر مع واو لکھا گیا ہے ۔

ہیں : بفتح ، برای جمع ، چوں در فارسی " آمده اند "۔
پاس : بمعنیِ نزدیک ۔
یہ ٖ : بکسر ، بمعنی " ہذا "۔ و اشاره به شےِ قریب ۔
وہ : بضم ، اشاره به شےِ بعید ۔
یہاں : بروزنِ جہاں ، بمعنیِ ایں جا ۔
وہاں : بروزنِ شہاں ، بمعنیِ آں جا ۔
کہاں : ہماں وزن ، بمعنیِ کدام جای ۔
جہاں : بروزنِ مکاں ، جای غیر معیّن ۔
ہاں : بمعنیِ مکان و جای ، چناں چہ مرزا رفیع سوداؔ مغفور گوید :
تلوار جو گھر میں ، تو سپر (بیچے کے) ہاں ہے ۔ حرفِ یا از کثرتِ استعمال ساقط شده ، " کہاں " ملفوظ است ۔

" وہ " اور " یہ " دونوں میں ہائے ملفوظ ہے ؛ اِس لیے " یہ " میں ہ کے نیچے اُس کا شوشہ لازماً لگایا جائے گا ۔ کبھی نظم میں اور کبھی کبھی گفتگو میں بھی ہ کی آواز پوری طرح تلفّظ کا ساتھ نہیں دیتی ، یہی صورت " وہ " کی ہوتی ہے ؛ مگر اِس سے اِن لفظوں کے املا پر اثر نہیں پڑے گا ۔ عام طور پر " یہ " کو شوشے کے بغیر " یہ " لکھا جاتا ہے ، پُرانی تحریروں میں بھی یہی صورت ملتی ہے ؛ مگر اب اصل کے مطابق اِس کو " یہ " لکھنا چاہیے ۔ مخطوطے میں ، روشِ عام کے مطابق ، ہ کا شوشہ موجود نہیں ؛ اِس کا اضافہ کیا گیا ہے ۔

الفاظِ مخاطب ، حاضر و غائب : تو و تم و تیرا و تمھارا و آپ و اس و ان ـ و ایں ہمہ علیٰ قدرِ مراتب ـ

تو : برای ادنا ، یعنی : تو کیا کہتا ہے ، و تو کون ہے ـ

تیرا : یہ تیرا مال ہے ـ

تم : برای درجۂ اوسط ، چوں : تم بیٹھو ـ

تمھارا : ہمچو : یہ مال تمھارا ہے ـ

آپ : برای مردِ معزّز ، چوں : آپ تشریف لائیں ـــــ و برای مخاطبِ غائب و ادنا : اُس ـ چوں : اُس شخص کو بلاؤ ـ

اُن : بضم ، چوں : اُن صاحب کو ہمارا سلام کہنا ـ

انھیں ، انھوں : چوں : انھیں کیا غرض ـ انھوں نے نوکری کر لی ـ

ہاں : چوں در عربی "بلیٰ" ـ

کیا : بایای مخلوط ، چوں در فارسی "چہ" ـ

کیوں : بیای مخلوط ، برای چہ ـ

کیونکر : یعنی بچہ طور ـ

کچھ : بضم ، بمعنی اندک ـ

تا : در آخرِ امر برای فاعلِ حال آید ، چوں : روتا و ہنستا ، در فارسی : گریاں و خنداں ـ

اِن : برای جمعِ اشیا و انسانِ حاضر ، چوں : اِن چیزوں کو ہاتھ نہ لگاؤ ـ اِن صاحبوں سے کہ دو ـ

سارا : برای شئے مفرد ، چوں : سارا پونڈا کھا گئے ـ

سب : برای افراد ، چوں : سب گنڈیریاں کھا گئے ـ

کون : بروزنِ عون ، بمعنیِ کس و کدام ، چوں : کون آیا۔ کون گیا۔ کون کون چیزیں پسند کیں۔

کب : بفتح ، بمعنیِ کدام وقت ، چوں : کب آؤ گے۔

جب : بفتح ، بمعنیِ ہرگاہ ، چوں : جس وقت آؤ گے ، خوش ہو کر جاؤ گے۔

تب : بفتح ، یعنی ہماں وقت ، لیکن در جواب "جب" موضوع است، چوں : جب میں نے سمجھایا ، تب سمجھے۔

تو : بضم ، واوِ مجہول : تم تو یہ کہتے کہ وہ بلائیں گے تو میں جاؤں گا۔

جو : بضم ، بواوِ مجہول ، شرطیہ بمعنیِ "اگر"۔

اب : بفتح ، بمعنیِ حالا۔

تک و تلک : بفتحتین ، ہر دو برای انتہا۔

لیے : بکسرتین ، بمعنیِ واسطہ۔ و ایں مفرد نمی آید، بہ دو سہ لفظ مرکب شدہ استعمال یابد ، چوں : اس لیے ، و کس لیے ، و جس لیے ، میرے لیے ، تمھارے لیے۔

بہت : بفتح و ہاے مضمومہ : بمعنیِ بسیار۔

تھوڑا : بضم و ہاے مخلوط و رای ثقیلِ مفتوحہ ، بمعنیِ اندک و قلیل۔

موجِ چہارم :

اسم مکرر بچند معنی مستعمل است : گاہے بمعنیِ مقدار ، چوں : کم خواب کے تھان سو سو روپے بکتے ہیں اور چار چار گز کے تھان ہوتے ہیں۔ گاہے شرطیہ ، چوں : ہم سر سر بازی بدتے ہیں۔ گاہے بمقامِ شک ،

چوں : فلاں شے کچھ کالی کالی ہے یا لال لال ہے ۔ گاہے بمعنیٰ کثرت ، چوں : گھر گھر نوبتیں بجتی ہیں ۔ گاہے بمعنیٔ تاکید ، چوں : خوب خوب ، اچھا اچھا ۔

و دو صیغۂ امرِ مختلف ، حاصل بالمصدر می شود ، چوں : ناپ تول ، مار پیٹ ، تاک جھانک ، جھاڑ پھونک ، لاگ ڈانٹ ۔

والا : بمعنیٔ صاحب و فاعل آید در آخرِ اسم ، چوں : دال موٹھ والا ۔ حلوا سوہن والا ۔ برای مؤنث بجای الف ، حرفِ یا آرند کہ علامتِ تانیث است ، چوں : دہی والی ۔ دودھ والی ۔

الف امالہ : برای اسم مذکر است کہ در آخرِ آں الف باشد یا ہای مختفی ، چوں : گھوڑے سے اُترے ۔ خیمے میں داخل ہوئے ۔ خصوص با حرفِ ربط ، چوں : گھوڑے میں جان نہیں ۔ گھوڑے پر چڑھے ۔ گھوڑے سمیت ڈوبے ۔ و ہم چنیں الفِ مصادر ، چوں : آنے میں کیا دیر ہے ۔ سیکھنے کا قصد ہے ۔ پڑھنے سے پڑھنا آتا ہے ۔ و اسمے کہ در آخرِ آں الف است یا ہای مختفی ، و در استعمال[1] مؤنث ، امالہ در آں ہر دو حرف نمی شود ، چوں : دوا و دعا و قبا و قضا و حیا و ردا و ضیا و گھٹا و ہوا و صبا و توبہ و بیوہ ۔

---

[1] دیگر تفصیلات سے قطعِ نظر کرتے ہوئے ، میں صرف ایک قاعدے کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ عربی کے باب افعال سے آنے والے جو مصادر ، اردو میں

(باقی اگلے صفحے پر)

قاعدۂ جمع :

برای اسم مذکر، حرفِ یای مجہول، چوں : گھوڑے و گدھے و خیمے و بے چوبے؛ بشرطے کہ در آخرِ اسم مذکر الف باشد یا ہای مختفی۔ و اگر در آخرِ آں اسم مذکر حرفِ عین است، پس حرفِ ماقبل را کسرہ دہند[له]، چوں : مصرع و مطلع و مجمع، قس علیٰ ہذا۔

مستعمل ہیں اور جن کے آخر میں الف ہے، اُن میں بھی امالہ نہیں ہوتا، جیسے : املا، انشا، اخفا وغیرہ۔ عربی میں ان سب کے آخر میں ہمزہ بھی ہے یعنی (املاء، انشاء وغیرہ) مگر فارسی و اُردو میں یہ ہمزہ کے بغیر ہی بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے پہلا لفظ "املا" خاص طور پر یاد رکھنے کا ہے۔ لوگ "انشا" کو تو "انشے" کبھی نہیں لکھیں گے، مگر "املا" کو "املے" لکھ دیا کرتے ہیں۔ اِس لفظ میں بھی امالے کا گزر نہیں ہوگا اور ہر صورت میں "املا" لکھا جائے گا، جیسے : املا کی صحت، املا کی کاپی وغیرہ۔

له جلال نے بھی مفید الشعرا میں یہی لکھا ہے، مگر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کی رائے یہ تھی کہ ہر صورت میں ایسے الفاظ کو بھی مع "یے" لکھنا چاہیے۔ مرحوم نے میرے خط کے جواب میں لکھا تھا :

"عربی "مُرَبَّع" اُردو میں "مُرَبَّع" ہوگیا (ق کے زبر سے)۔ ہ اُردو میں قائم مقام الف کا ہے، اِسی لیے "مُطلَع" سے اردو میں "مَطلع" ہوا اور "موقَع" سے "موقَع"۔ جن لفظوں میں ہ کا ماقبل عربی

(باقی اگلے صفحے پر)

و برای اسم موٴنث الف و نون است، چوں: بکریاں و ہرنیاں؛ بشرطیکہ در آخر اسم موٴنث یای معروف باشد۔ و اگر حرفِ دیگر است، جمعش بہ یا و نون است، چوں: دعائیں[1] و قبائیں و کتابیں و ڈابیں۔ و

میں مفتوح تھا، وہ اپنے حال پر رہے: مقطع، مطلع۔ اور جو خود عربی میں دو طرح سے رائج ہیں، جیسے: موضَع؛ اُن میں اردو نے زیر کو اختیار کرلیا۔

زیر سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ سب مثالیں واحد قائم کی تھیں۔ مذکر کا واحد محرّف اپنے آخر میں بجائے الف کے، یے رکھتا ہے؛ اس لیے جمع کے بعد یے کا لانا ضروری ہوا، چناں چہ: برقعے کے، برقعے میں وغیرہ۔ اسی طرح جمع مذکر محرّف: برقعوں، ضلعوں، مطلعوں، مقطعوں وغیرہ۔

یہ مسلّم ہے کہ مطلعوں، مقطعوں، موقعوں وغیرہ میں ع تلفظ کا ساتھ نہیں دیتی، مگر اس کو لکھا جاتا ہے اور جمع کا وں اس کے ساتھ شامل ہوتا ہے؛ یہی صورت مطلعے، مقطعے وغیرہ کی ہے، کہ ع یہاں بھی شاملِ تلفظ نہیں، اور اس کے بعد اصولاً جس طرح وں کا اضافہ کیا جاتا ہے، اسی طرح یے کا اضافہ ہونا چاہیے۔ یہ آسان، سادہ اور باقاعدہ صورت ہے، یعنی: مطلع، مطلعے، مطلعوں۔ مقطع، مقطعے، مقطعوں وغیرہ۔ اور اسی کو مرجّح سمجھنا چاہیے۔

"کتابیں" اور "ڈابیں" کی مثال تو درست ہے، مگر "دعائیں" اور "قبائیں" کی صورت ذرا مختلف ہے کہ ان میں "یں" کا نہیں، بل کہ "ئیں" (ء۔ ی۔ ن) کا اضافہ ہوا ہے (دعا + ئیں)۔ یہی صورت ان الفاظ کی ہوتی ہے جن کے آخر میں ہائے مختفی ہو، جیسے "دایہ" سے "دائیں" اور "بیوہ" سے "بیوائیں"، اس فرق کے ساتھ کہ ہائے مختفی، الف میں بدل جاتی ہے اور پھر "ئیں" کا اضافہ ہوتا ہے۔

انگیاں و ڈبیاں و کُلھیاں و چڑیاں ؛ و دریں چہار اسم یائی علامتِ تانیث موجود است ، پس بسببِ اجتماعِ ساکنین ، یک الف ساقط شد۔ و جمع بہ واو نون مشترک است میانِ مذکّر و مونّث ، چوں: توتوں میں میناؤں[1] میں ، مردوں میں ، رنڈیوں میں فرق ہے۔ و گاہے ایں واو نون برای اتّصال واقع می شود میانِ اسم مکرر ، چوں : کانوں کان و ہاتھوں ہاتھ و راتوں رات و شاموں شام۔ و گاہے با اسمِ مفرد ، چوں : کوسوں و منزلوں۔

مرکّبات :

باز : بداں کہ "باز" بمعنیِ فاعل آید ، چوں : پتنگ باز و بٹیرباز و کبوترباز (و) چوپڑباز (و) لونڈے باز و رنڈی باز وغیرہ۔

بردار: چنوربردار و کنول بردار و انگیٹھی بردار و حقّےبردار وغیرہ۔

دار : جھالردار و چوکی دار و جوڑی دار و مکان دار[2] وغیرہ۔

دان : پان دان ، اُگال دان ، بمعنیِ سفل دان ، ناس دان ، سرمہ دان

---

[1] "میناؤں" کی بھی وہی صورت ہے جو "دعائیں" کی تھی ، کہ یہاں بھی صرف "ون" نہیں ، بلکہ "ؤں" (ء ، و ، ں) کا اضافہ ہوا ہے۔ البتّہ "مردوں" اور "رنڈیوں" کی مثال ٹھیک ہے ، کہ ان میں "ون" کا اضافہ ہوا ہے۔

[2] بعض ضرورت سے زیادہ محتاط حضرات "سمجھ دار" اور "چاے دانی" جیسے الفاظ کو اب بھی غیر مناسب سمجھتے ہیں۔ ایسے حضرات کو لکھنؤ کے ایک مسلّم الثبوت استاد اور زبان داں کی ان مثالوں کو ذرا توجّہ کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

ناگردان ، بہ تقلیدِ عجمیاں ، چوں : قلم دان و جزودان۔

اپا : بمعنیِ ہنگام ، چوں : بُڑھاپا و رنڈاپا۔ و بمعنیِ طرز و شیوہ ، چوں : بہناپا و سگھڑاپا و گلاپا و مٹاپا و دبلاپا۔

پن : بہ ہماں معنی : لڑکپن و دیوانہ پن و مسخرہ پن و بانکپن و بھولاپن۔

واں : بمعنیِ مثل و مانند ، چوں : سوروواں و جُڑواں و ڈھلواں و گیہونواں[1] برنگِ گندم ۔ و در فارسی نیز بہ ہمیں معنی ، چوں : پلواں ، اے مثلِ پل۔ و در شمارِ اعداد بمعنیِ میم دوم و سوم ، چوں : پانچواں و ساتواں و آٹھواں و نواں و دسواں و گیارھواں و بارھواں و مثلِ آں ۔ و گاہے بہ امالۂ الف ، چوں : پانچویں دن و ساتویں مہینے و آٹھویں برس ۔ و برای مونث بہ یای معروف ، چوں : پانچویں تاریخ و ساتویں شب و آٹھویں ساعت ۔

یل : بمعنیِ فاعل ، چوں : مریل و بجھیل و اڑیل ۔ و بمعنیِ مفعول ہم ، چوں : گھایل[2] و سڑیل و کڑیل بمعنیِ جوانِ سخت ، و پایل

---

[1] مخطوطے میں اس کا املا "گیہونواں" ہے۔

[2] یہ لفظ سائل اور مائل وغیرہ کا ہم قافیہ بھی ملتا ہے اور بادل اور چھاگل وغیرہ کے ساتھ بھی آیا ہے۔ شوق۔ نیموی نے رسالۂ اصلاح میں اس بحث کو لکھا ہے۔ اس بحث سے قطعِ نظر کرتے ہوئے ، یہاں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب ماقبلِ لام مفتوح ہوگا تو اس کو "پایَل" لکھا جائے گا اور جب ماقبلِ لام مکسور ہوگا تو یے کی جگہ ہمزہ آئے گا ، یعنی "پائِل" لکھا جائے گا۔ یہ اردو کا قاعدہ ہے کہ اس قماش کے الفاظ میں مفتوح ہونے کی صورت میں یے آتی ہے ، جیسے : نمایَش ، پایَل ، نمایَک وغیرہ ، اور اگر ان میں ماقبلِ حرفِ آخر کو مکسور مانا جائے گا تو پھر ہمزہ کے ساتھ ان کو لکھا جائے گا ، یعنی : نمائِش ، پائِل ، نمائِک وغیرہ۔

بمعنی چالاک۔ وگاہے بسکونِ یا و حرفِ ماقبلِ آں مفتوح، چوں: بڑھیل و کیھڑیل و ہیکل یعنی مہار و اکیل یعنی تنہا و ڈکیل[1] و ٹھکیل.

ہند : بفتح، در آخرِ اسم بمعنی بو باس می آید، چوں: سڑاہند و کچاہند و بساہند و ہراہند و کھراہند [بوئی بول] و گگراہند [بمعنی بوی سگ] و چراہند۔

بند : چوں: بیچ بند یعنی بازوبند و تیغ بند و نیچے بند و چہرے بند و چپڑبند و ہتھیار بند و چیرابند۔

یرا : بسکونِ اول و حرفِ ماقبلش مکسور، برای نسبت، چوں: ممیرا [ماموزاد برادر] و خلیرا [خالہ زاد برادر] و بہتیرا و سویرا و دریں واو، الف امالہ است از "سوا"، و کمیرا۔

ہرا : بسکون، ماقبل مفتوح، برای نسبت، چوں: سنہرا و کٹہرا و چتہرا و اکہرا و دُہرا (و) تہرا و چوہرا و پچوہرا۔

یلا : برای نسبت و صاحب، چوں: رسیلا و کسیلا و رنگیلا و رگیلا و پھنسیلا و گٹھیلا و ہٹیلا و نکیلا و تندیلا و نشیلا۔ وگاہے بیای مجہول، چوں: ادھیلا و سوتیلا و نویلا و اکیلا۔

اَن : بفتح، بمعنی نفی، یعنی نہیں، چوں: اَن میل و اَن گھڑ و اَن مول و ان کہی [ناگفتہ] و اَن ذات و اَن بیج و اَن پڑھ

---

[1] مخطوطے میں ان کا املا "ذوکیل" اور "ٹھوکیل" ہے۔

یا : ہر صیغۂ امر کہ آخرِ او حرفِ علت باشد، ضمیرِ ماضی واقع می شود، چوں : لایا، کھایا، رویا، سویا۔ پیا، سیا ؛ یک حرفِ یا از کثرتِ استعمال ساقط شدہ۔

و در آخرِ اسم بمعنیِ فاعل آید، چوں : باڑھیا، دُھنیا، رنگ بھریا، فریبیا، بھیڑیا، چھیندیا، چھپ جالیا۔ وگاہے برای نسبت، چوں : پہاڑیا و رام پوریا و تیلیا و بھوریا و جوگیا و مداریا و مونگیا۔

وگاہے برای تصغیرِ مونث، چوں : بڑھیا، چلمیا، کھٹیا، ڈبیا، منڈھیا۔

نی : بیای معروف، علامتِ تانیث، چوں : ڈومنی و چاندنی و متھنی و اوڑھنی (و) سقنی و ہندنی و چونٹنی و منگنی و ٹھگنی و پھنکنی[1]۔

یت : بسکون و حرفِ ماقبل مفتوح، بمعنیِ فاعل، چوں : برچھیت و بنگیت و کڑکیت و ڈکیت و بنیت و پھندیت و سپیت۔

ڑا : بمعنیِ اضافی، چوں : سینکڑا[2] و چمڑا و دُکھڑا و پھلڑا و پلڑا و لنگڑا و کبڑا و جیوڑا۔

و جملہ مصادرِ عربی کہ از بابِ تفعیل اند، در محاورۂ ہندیاں تانیث الاستعمال آمدہ اند، الّا : تعویذ ؛ چوں : تصویر، تاثیر، تحریر، تعبیر، تقریب، تہذیب، تشبیت، تثبیت، توریث، تلویث، تدریج، تزویج، توضیح، تفریح، تاریخ، توبیخ، تجدید، تبرید، تلمیذ، تشحیذ،

---

[1] مخطوطے میں اس کا املا "پھونکنی" ہے۔

[2] مخطوطے میں اسی طرح، مگر صحیح املا "سیکڑا" ہے بغیر نون۔

تجویز ، تبریز ، تاسیس ، تخمیس ، تشویش ، تفتیش، تلخیص، ترخیص ، تفویض، تحریص ، تخلیط ، تقریظ، تربیع ، توقیع ،تفریع، تبلیغ ، تعریف ، توصیف، توفیق ، تحریک ، تشکیک ، تبدیل ،تعجیل ، ترمیم ، تحلیم ، تدوین، تخمین ، توجیہ ، تنبیہ ۔

و ہر کلمہ کہ آخر تای قرشت دارد ، تانیث الاستعمال است ، چوں : مصلحت و مرحمت ۔ و اگر تای مختفہ است ، تذکیر الاستعمال ، چوں : معالجہ و معاملہ ۔ و خلعت و شربت شاذ است ۔

وٹی : ہم جای نسبت ، چوں : سنگوٹی و چنوٹی و ہتوٹی و کجلوٹی و کسوٹی و بنجوٹی و لنگوٹی و چنگوٹی ۔

مصادرِ بابِ فعلن، وزنِ عروضی، و حروفِ مخلوطی محسوب نیست ۔

فصلِ الف عینِ کلمہ

اآنا[1] : بمعنی آمدن ۔

---

[1] مخطوطے میں اسی طرح لکھا ہوا ہے اور یہ فارسی لغات کی تقلید ہے۔ متعدد پرانی مطبوعہ اور قلمی کتابوں میں الفِ ممدودہ کو دو[2] الف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ مطبوعہ لغات مثلاً بہارِ عجم اور برہانِ قاطع کے نول کشوری اڈیشنوں میں [سالِ طبع بالترتیب : ۱۸۶۹ء، ۱۸۸۸ء] الفِ ممدودہ کو "اا" لکھا گیا ہے۔ صاحبِ فرہنگِ جہانگیری نے مقدمۂ فرہنگ میں اس کی صراحت بھی کی ہے : "چوں علمای فارس الفِ ممدودہ را دو[2] الف اعتبار می کنند، در فصلِ الف، از بابِ الف، ہر لفظے کہ در اولِ او الفِ ممدودہ بود، نوشتم و دو[2] الف رقم کردم"۔ اردو میں اب اس کا رواج نہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اور مقامات[1] پر الفِ ممدودہ کو مع مد لکھا گیا ہے مثلاً آخر میں بہ ذیلِ محاورات ہر جگہ الف پر مد ملتا ہے۔ یہاں بھی اس غیر متعارف املا کو محض مطابقتِ اصل کے خیال سے محفوظ رکھا گیا ہے۔

تانا : گرم کردنِ روغنِ گاو، تا خالص شود۔
جانا : بمعنیِ رفتن۔
بھانا[1] : بمعنیِ پسند آمدن۔
پانا : بمعنیِ یافتن۔
لانا : آوردن۔
کھانا : خوردن۔
گانا : بکافِ فارسی۔ سراییدن۔
ڈھانا : با دالِ ثقیل و یا ہای مخلوط، بمعنیِ انہدام۔
چھانا : بجیمِ فارسی و ہای مخلوط، مکان را مُسقّف کردن از چوبہا یا از کاہ۔

فصلِ باہ ردو

پھبنا : ببای فارسی و ہای مخلوط، در استعمال آوردنِ چیزے کہ زیب دہد۔
دبنا : بفتح، زیرِ بارِ گراں شدن کہ باعثِ ہلاکت باشد، و مجازاً از زیرِ دست در گذر کردن۔
چھپنا : جیمِ فارسیِ مکسور و ہای مخلوط، نہاں شدن از چشمِ ناظرین۔ و بضم، رخنۂ خُرد یا کلاں بند شدن از گِل در مکان، چوں سوراخِ موش یا دیوارِ شکستہ را۔

---

[1] "بھانا" کو بعض اساتذۂ متاخرین نے، جن میں امیر مینائی کا نام قابلِ ذکر ہے، متروک قرار دیا تھا، مگر اکثریت نے اس قول کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس اندراج سے معلوم ہوگا کہ تلامذۂ ناسخ (اور کم سے کم تجر) اس کو متروک نہیں مانتے تھے۔

چپنا : بفتحِ جیم و بای فارسی ، خواندن چیزے را از قسمِ وظائف بہ کرّات ۔
لپنا : لامِ مکسور ببای فارسی ، در مکان کہگل شدن ۔
تپنا : تا مفتوح ببای فارسی ، گرم شدنِ زمین و مکان از تابشِ آفتاب ۔
ٹھپنا : بتای ثقیل و بای فارسی ، بمعنیِ ارتسام و طبع ، چون مُہر بر کاغذ ۔
چھپنا : بفتحِ جیمِ فارسی و ہای مخلوط و بای فارسی ، مطبع شدن ، چون از کتابہا و پارچہ ہا کہ طبع می شوند ۔
کھپنا : بفتحِ کاف و ہای خلط ، گم شدنِ چیزے بطورِ تحلیل ، یا چیزے را در چیزے صرف شدن ۔
نپنا : بفتحِ نون و بای فارسی : پیمایش شدن ۔

فصل التّا

کتنا : بفتحِ کاف ، پنبہ صرف شدن در رشتن ۔
جتنا : بضمِ جیم ، اسپ و گاو وغیرہ را در ارابہ گلو بند نہادن تا بکشد ، و مجازاً : در کارے مصروف شدن ۔
سنتنا : بضم و نونِ مغنونہ ، رشتہ و رسنِ باریک را از چیزے صاف شدن ، تا ریشہ و رگ ہموار شود ، و مجازاً : تغیّرے در چہرۂ کسے دیدن ۔

فصل بتای ثقیل

اٹنا : بفتح و تای ثقیل ، از گرد آلوده شدن ۔

بٹنا : بفتح ، تابیدنِ رشتہ و تقسیم شدنِ خوردنی و چیزہای دیگر ۔

پٹنا : بای فارسیِ مفتوح بتای ثقیل ، جای عمیق مثلِ چاہ و خندق وغیرہ از خاک و خاکروبہ ہموار و برابر شدن ، و ہم چنین ستقفِ مکان ۔

پھٹنا : بای فارسیِ مفتوح و ہای مخلوط ، چاک شدنِ ہر چیز از خود یا از ضرب ۔

چھٹنا : جیمِ فارسی بضم و ہای مخلوط ، چیزے از چیزے جدا شدن ، و از آدمی ۔

چھنٹنا : جیمِ فارسیِ مفتوح و نونِ مغنونہ و تای ثقیل ، شاخہای درخت قلم شدن ، و چیزے از چیزہا منتخب شدن ۔

ڈٹنا : دال و تا ہر دو ثقیل ، بمردانگی مقابل شدن ، خصوص در میدانِ جنگ ۔

رٹنا : بفتح رائے مہملہ بتای ثقیل ، یک کلمہ را علی الاتصال گفتن ۔

کٹنا : بفتح کاف بتای ثقیل ، بریدہ شدن ۔ و مجازاً : شرمسار شدن ۔

گھٹنا : بضمِ کافِ فارسی و ہا و نونِ مخلوط ، دم خفا شدن و دُخان بانبوہ شدن ۔

لٹنا : بضمِ لام بتای ثقیل ، مال و اسباب غارت شدن ۔

پٹنا : بضم ، جدا شدن ۔

بجنا : بفتح ، نواختن ۔

سجنا : بفتحِ سینِ مہملہ بجیم ، آراستہ شدن از لباس یا از سلاح یا از زیور وغیرہ ۔

بچنا : بای مفتوحہ با جیمِ فارسی ، از صدمات و از بلیّات یا از شےِ ناگزیر محفوظ ماندن ۔

پچنا : بفتحِ با و جیم ہر دو فارسی ، ہضم شدن در معدہ ۔

منجنا : بفتحِ میم و نونِ غنّہ و جیم ، ظرف وغیرہ از خاکستر بزور سحق گردیدن و شستن است ۔

جنچنا : بفتحِ جیم بجیمِ فارسی و میانِ نونِ غنّہ ، چیزے خوب قدر و قیمتِ آں ذہن نشیں شدن ۔

رچنا : بضم ، بجیمِ فارسی ، رغبت شدن بچیزے ۔ و بفتح ، خوب شدنِ رنگِ حنا در دست و پا ، و مہیّا شدنِ سرو سامانِ شادی بخانہ ۔

سینچنا : بکسرِ سینِ مہملہ و نونِ غنّہ بجیمِ فارسی ، صرف شدنِ آب در زراعت و باغ و سبزہ زار و کشیدگیِ آب از چاہ و تالاب ۔

بھنچنا : بکسرِ بای ابجد و ہا و نون ہر دو مخلوط ، تنگا تنگ آمدہ شدن ۔

کھنچنا : بکسرِ کاف و ہا و نونِ مخلوط بجیمِ فارسی ، کشیدہ شدن ۔

مچنا : بفتحِ میم بجیمِ فارسی ، شور و غوغا شدن ۔ چوں : شور و غوغا مچا ہے ۔

نچنا : بضمِ نون بجیمِ فارسی ، بمعنیِ بال و پر برکندہ شدن

کھدنا : بضمِ کاف و ہای خلط بدال ، کندیدہ شدن ۔

چڈنا : بضمِّ جیمِ فارسی ، گاییده شدن ۔
چھدنا : بکسرِ جیمِ فارسی و ہای خلط ، سوراخ رسیده شدن از آلۂ نوکدار۔
بدنا : بفتحِ موحّده ، شرط کردن ۔
لدنا : بفتحِ لام ، بار شدن بر بار بردار
ہنڈنا : بفتح و نونِ غنّہ ، رسوا شدن بکوچہ و بازار ۔

فصل الرّا

بھرنا : بفتح و ہای خلط ، پُر کردنِ ظرف از چیزہا۔ ومجازاً: گذرانیدن ایّام از مشقّت و مصیبت ۔
پھرنا : بکسرِ بای فارسی و ہای مخلوط ، گردیدن و ریدن ۔
پرنا : بکسرِ بای فارسی ۔ و بعض بجای را ، لام خوانند۔ روغنِ کنجد و شیرۂ نیشکر بکشند ۔
ترنا : بکسرِ تای قرشت ، برآب شناور شدن ۔ و ہر چیزے را گویند کہ برآب باشد و غرق نشود ۔
چرنا : بکسرِ جیمِ فارسی، شگافتہ شدنِ چوب باشد یا کرپاس۔ و بفتح، چریدنِ چوپایہ ۔
جھرنا : بضمِّ جیم و ہای مخلوط ، پژمرده شدنِ ہمچو گل و گیاه ۔
کرنا : بفتحِ کاف ، کردن ۔ و بکسر، تیغ دندانہ شدن بدم ۔
گرنا : بکسرِ کافِ فارسی ، افتادن ۔
ڈرنا : بفتحِ دالِ ثقیل ، ترسیدن ۔

گھرنا : بکسرِ کافِ فارسی ، احاطہ شدن۔ و میانِ دشمنان راہِ گریز نیافتن۔
مرنا : بفتحِ میم ، مردن۔
ہرنا : بفتح ، بازی از دست دادن۔
اڑنا : بفتحِ الف ، قائم شدن بجای استوار ، انسان یا چیزے۔
اوڑنا : بضمِ و واوِ مشمومہ ، پریدن۔
بھڑنا : بکسرِ با و ہای مخلوط ، باکس ہم پہلو نشستن۔ و باکسے مقابل شدن۔
پڑنا : بفتح ، افتادن۔
تڑنا : بفتحِ تای قرشت ، وزن شدن در ترازو یا در پلۂ چشم۔
جڑنا : بفتحِ جیم ، چیزے در چیزے نشانیدن مثلِ نگیں۔
جڑنا : بضمِ جیم ، میسر شدن۔ و چیزے بچیزے چسپیدہ شدن۔
و مجازاً : جماع۔
چھڑنا : بفتحِ جیمِ فارسی ، برنج وغیرہ را در جوغنِ کلان از کوبہ مقشر کردن
و صاف نمودن۔
جھڑنا : بفتحِ جیم ، ریختہ شدن۔ و منزل شدن بجماع۔
سڑنا : بفتح ، متعفن شدن۔
گڑنا : بفتحِ کافِ فارسی ، دفن شدن۔ بضم ، بمعنیِ شیارِ
زمینِ زراعت۔
گھڑنا : بفتحِ کافِ فارسی بہای مخلوط ، ساختنِ ظرف از مس و از سیم و زر۔
لڑنا : بفتح ، جنگیدن بزبان ، یا بزبانِ تیغ و سنان۔
مڑنا : بضمِ میم ، از یک جانب بجانبِ دیگر رو آوردن۔ و بازگشت۔

فصلِ سینِ مہملہ :

بسنا : بفتحِ بای ابجد ، بود و باش کردن بجایے ۔

پسنا : بکسرِ بای فارسی ، سابیدہ شدن ۔ و بکسے میل کردن نہایت ۔

پھنسنا : بفتحِ بای فارسی و ہا و نونِ مخلوط ، بدام گرفتار شدن ۔ و مجازاً : بدامِ محبتِ کسے گرفتار شدن ۔

ٹھنسنا : بفتحِ تای ثقیل و ہا و نونِ مخلوط ، چیزے بمنفذِ تنگ دخول شدن کہ گنجایشِ آں نداشتہ باشد ۔

دھنسنا : بفتح ، ہا و نونِ مخلوط ، پا بگل شدن در زمینِ نمناک ۔

ڈسنا : بفتحِ دالِ ثقیل ، گزیدنِ مار ۔

رِسنا : بکسرِ را ، آب چکیدن قطرہ قطرہ از ظرفِ ناقص و از جراحت ہم ۔

کسنا : بفتحِ کاف ، چیزے را محکم بستن بر سنے ۔

گھسنا : بکسرِ کافِ فارسی و ہای مخلوط ، چیزے را بہ سنگ یا بہ چیزے دگر سابیدن ۔ و بضم ، دخول شدن بجای تنگ ۔

ہنسنا : بفتح و نونِ غنّہ ، خندیدن ۔

فصلِ کاف

بکنا : بکسر ، بیع شدن ۔ و بفتح ، بسیار سخن گفتن ۔

پکنا : بفتحِ بای فارسی ، پختن ۔

پھنکنا : بضم و ہا و نونِ مخلوط ، سوختن ۔

ٹھنکنا : بضمِ تای ثقیل و ہا و نونِ مخلوط ، لفوذ شدنِ میخ در چیزے (و) سر کوفتہ شدنِ چیزے تا اندرونِ چیزے رود ۔

بھنکنا : بہاں وزن ، نوکِ کدام چیز در بدن پیوستن ۔
بکنا : بفتح ، بگریستن ۔
ٹنگنا : بفتحِ تای ثقیل و نونِ غنّہ ، آویختہ شدن ۔
جھکنا : بضم وہای مخلوط ، خمیدہ شدن ۔
چکنا : بضمِ جیمِ فارسی ، از صرف شدن چیزے نماند ۔
چھکنا : بفتحِ جیمِ فارسی و ہای مخلوط ، سیر شدن از خوردن و آشامیدن ۔
ڈھنکنا : بفتحِ دالِ ثقیل و ہا و نونِ مخلوط ، چیزے را از چیزے پوشیدن ۔
و سرپوش را نیز گویند ۔
رکنا : بضمِ را ، از روانی باز ماندن ۔ و از کسے بسببِ رنجش دم بخود ماندن ۔
سنکنا : بکسرِ سینِ مہملہ ، چیزے از آتش گرم شدن ۔
اگنا : بضم ، روییدہ شدن ۔
ٹھگنا : بفتحِ تای ثقیل و ہای مخلوط بکافِ فارسی ، چیزے از کسے بفریب گرفتن ۔
بگنا : بفتح ، ریدن ۔
تھکنا : بفتح ، سکاملہ شدن از مسافت ۔
ٹنکنا : بفتحِ تای ثقیل و نونِ غنّہ ، دوختہ مثلِ بندِ قبا وغیرہ ۔
لگنا : بفتحِ کافِ فارسی ، چیزے بچیزے وصل شدن ۔

فصلِ لام

پلنا : بفتحِ بای فارسی ، پرورش یافتن ۔ و بکسر ، حملہ آور شدن ۔
پھلنا : بفتحِ بای فارسی و ہای مخلوط ، بارور شدن ۔ و مجازاً : بشور
بر آوردن از کسے ملت ۔

تلنا : بفتح تا، چیزے بروغن بریاں کردن۔ بضم، وزن شدن بمیزان۔ وتای ثقیل مفتوحہ، چیزے را (کذا) ازجای خود دور شدن، و ازمجادلہ بہانہ دور شدن۔

جلنا : بفتح، سوختن۔

جھلنا : بفتح وہای مخلوط، بادزن جنباں شدن۔ وآب بشورہ سرد شدن۔ وظرف وزیورِ شکستہ پیوند شدن۔

چلنا : بفتح جیم فارسی، خرامیدن۔

چھلنا : بفتح جیم فارسی وہای مخلوط، رجن زدہ شدن۔ بکسر، پوست مال شدن و پوست کندن، یعنی مقشّر شدن۔

دلنا : بفتح دال، دانہا را آسیا کردن برای اسپاں۔

ڈھلنا : بفتح دالِ ثقیل وہای مخلوط، چیزے نقرہ ومسی و برنجی در قالب، ہندی: سانچا، درست شدن۔ وتنزّلِ وقت شدن۔ وبضم، چیزے مدوّر غلطیدہ شدن۔

رلنا : بضم، دانہای خوب از انبارِ غلّہ رُفتہ و برآوردہ شدن۔

گلنا : بفتح کاف فارسی، گداختہ شدنِ گوشت از آتش، وچیزے بسبب رطوبتِ خویش و بزیر ماندن گداختہ شود۔

گھلنا : بضم کاف فارسی وہای مخلوط، درآب آب شدنِ مثلِ قند وشکر وغیرہ۔

کھلنا : بکسر کاف وہای خلطہ، شگفتنِ ریاحین۔ وبضم، وا شدن۔

ملنا : بفتح میم، مالیدن۔ وبکسر، معانقہ کردن۔ وچیزے گم شدہ رادست یاب شدن۔

ہلنا : بکسر ہا، جنبیدن۔ ورام شدنِ جانور۔

فصلِ میم :

تھمنا : بفتحِ تا و ہای مخلوط ، گرفتہ شدن و از کار ساکت شدنِ چوں بارش و بادِ تند ۔

جمنا : بفتحِ جیم ، بستہ شدنِ برف و جغرات و نمش وغیرہ ۔

دمنا : بفتحِ دال ، خمیدہ شدن و راست شدنِ تیغ بوقتِ آزمایشِ اصالت ۔

فصلِ نون :

بننا : بفتحِ بای ابجد ، تیّار شدنِ چیزے از ساختن ۔ و بکسر ، بافتن ۔

بھننا : بضمِ و ہای مخلوط ، بریاں شدنِ غلہ در گلخن و کباب بر آتش ۔

تننا : بفتحِ تا ، تنیدن ، و برخود پیچیدن ۔

جننا : بفتحِ جیم ، زادن ۔

دھننا : بضمِ دال و ہای مخلوط ، ندّافی ۔

چھننا : بفتحِ جیم فارسی و ہای مخلوط ، بیختہ شدن ۔ و بکسر ، از زبردستی چیزے ربودہ شدن ۔

چننا : بضم ، چیدن ۔

سننا : بضمِ سینِ مہملہ ، شنیدن ۔ و بفتح ، آلودہ شدن ۔

گننا : بکسرِ کافِ فارسی ، شمردن ۔

گھننا : بضمِ کافِ فارسی و ہای مخلوط ، کرم خوردہ شدن بسببِ کہنگی ۔

مننا : بفتحِ میم ، بہ لجاجت ملاقی شدنِ کسے آزردہ خاطر ۔

فصلِ واو :

بونا : بضمِ بای ابجد ، درخت نشانیدن و تخم پاشی کردن ۔

چونا : بضمِ جیمِ فارسی ، ریزشِ آب از سقفِ شکستہ ۔

چھونا : بضمِ جیمِ فارسی و ہای مخلوط ، ملاقی شدنِ دست بچیزے ۔

دھونا : بضمِ دال و ہاے مخلوط و واوِ مجہول ، شستن ۔ و بدالِ ثقیل ، چیزے را بدوش و سربار کردن و بجائے رسانیدن ۔

رونا : بضمِ را بواوِ مجہول ، گریستن ۔

سونا : بضم واوِ مجہول ، خفتن ۔ و اسم زر ۔

کھونا : بر وزنِ دھونا ، گم کردنِ چیزے ۔

ہونا : بضمِ ہا بواوِ مجہول ، کارے واقع شدن ۔

فصلِ ہای ہوز :

اٹھنا : بضم و تای ثقیل و ہای مخلوط ، برخاستن ۔

بہنا : بفتح و ہای مخلوط ، جاری شدنِ آب ۔

بدھنا : بکسر و ہای مخلوط ، سوراخ شدنِ گوہر و چیزے ۔ (و) بمتلائی شدن ۔ و این معنی اہلِ تنجیم میدانند از روی علم خویش ۔

بڑھنا : بفتح و رای ثقیل و ہای مخلوط ، ترقی کردن ۔

پڑھنا : بفتح بای فارسی و رای ثقیل و ہای خلط ، خواندن ۔

چڑھنا : بفتح جیمِ فارسی و رای ثقیل و ہای خلط ، سوار شدن ۔ و بکسر ، از نامِ کسے چیز آزردہ شدن ۔

کڑھنا : بضمِ کاف و رای ثقیل و ہای مخلوط ، مغموم شدن ۔

گڑھنا : بفتحِ کاف فارسی و رای ثقیل ، چیزے ساختن .... و سنداں ۔
گندھنا : بضمِ کاف فارسی و نونِ غنّہ ، منسلک شدنِ لآلی در زیور بتارِ ریشم ۔
دوہنا : بضم و واوِ مخلوط ، دوشیدن ۔
چکھنا : بفتحِ کاف ، مزہ دریافتنِ چیزے از زبان و خوردن ہم ۔
رہنا : بفتحِ را ، بجاے استقامت نمودن ۔
سہنا : بفتح ، گوارا کردنِ چیزے ناگوار ۔
کہنا : بفتحِ کاف ، گفتن ۔
دکھنا : بضمِ دال ، درد رسیدن بہ اعضا ۔
نبھنا : بکسرِ و بای ابجد و ہای خلط ، کارے را بہ انجام رسانیدن ۔
چبھنا : بضمِ جیم فارسی و بای ابجد ، خار و مثلِ خار پیوستن بہ بدن ۔
متھنا : خمیر برآوردنِ چیزے را ۔
پتھنا : بفتحِ بای فارسی و تا و ہای مخلوط (کذا) ۔
سدھنا : بفتحِ سینِ مہملہ و دال و ہای مخلوط، تعلیم یافتنِ جانور تا حکم بردار شود ۔
بجھنا : بضمِ و جیم و ہای مخلوط ، سرد شدنِ آتش و شعلہ ۔ و دریافتنِ چیستاں ۔
پینا : بکسرِ بای فارسی و یای معروف ، آشامیدن ۔
جینا : زیستن ۔
سینا : بکسرِ سین بیای معروف ، دوختن ۔
دینا : بکسرِ یای مجہول ، دادن ۔
لینا : بکسرِ یای مجہول ، ستاندن ۔
ڈھینا : بفتح و ہای مخلوط ، از پا درآمدنِ در و دیوار وغیرہ ۔

بابِ فاعلن

مع الباي فارسی :

ڈوبنا : بضم بواوِ معروف ، در آب غرق شدن ۔
ٹاپنا : جویای مطلب جا بجا گشتن ۔
بھانپنا: بفتح و ہا و نونِ مخلوط ، گمان بردن بر کسے بحسبِ مقصودِ خویش ۔
تاپنا : گرم کردنِ دست و پا بر آتش ۔
کانپنا : لرزیدن ۔
ہانپنا : دم سوختہ شدن ۔
تھوپنا : بواوِ مجہول ، الزام بر مردِ بے قصور نہادن ۔
سونپنا : بفتح ، واو (و) نونِ مخلوط ، سپردن ۔
جھینپنا : بکسرِ ، بہای مخلوط ، بیای مجہول ، از کلام طنز آمیز خفیف شدن ۔
گھینپنا : بکسر کافِ فارسی بہا و نونِ مخلوط ، بیای مجہول ، چیزے را در ظرف از انگشت یا از کفِ دست خوب مالش دادن تا خمیر بر آورد ۔
موتنا : بوزنِ ڈوبنا ، شاشیدن ۔
سینتنا : بیا و نونِ مخلوط ، چیزے را باحتیاط نگاہداشتن تا وقتِ دیگر بکار آید ۔

فصل جیم ہر دو :

سوجنا : بواوِ معروف ، ورم شدن ۔
سونچنا : بواوِ مجہول (و) نونِ غنّہ ، خیال کردن و بیاد آوردن چیزے را ۔
گونجنا : بواوِ معروف (و) نونِ غنّہ ، مستی کردنِ کبوتر بآواز ۔ و صدای فرضیِ دشت و جبل ۔
بیچنا : بیای مجہول ، فروختن ۔
چیخنا : بیای معروف ، آواز بلند کردن ۔
ناچنا : رقصیدن ۔
کونچنا : بواوِ مجہول (و) نونِ غنّہ ، قاشِ انبہ وغیرہ را برای آچار و مربا ریش کردن بعقدِ چند سوزن ۔

فصلِ ہر دو را :

پارنا : لوہ گرفتن از شعلۂ چراغ ۔ تصدق کردن[1] ۔ (کذا) ۔
دھارنا : ہای مخلوط ، تطول کردن ۔
گھیرنا : بکسرِ کافِ فارسی (و) ہای مخلوط (و) یای مجہول ، چرخہ زنی کردن ۔
ٹھیرنا : بفتح ، ہا و یا مخلوط ، از روانی باز ماندن ۔

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "پارنا" اور "وارنا" دو مصدروں کی جگہ ، ایک مصدر رہ گیا اور دونوں کے معانی اسی ایک مصدر کے ذیل میں آگئے ۔ غالباً یہ سہوِ کتابت ہے ۔

گھورنا : بضم، ہای مخلوط بواوِ مجہول (کذا) بنظرِ تیز نگریستن۔

تیرنا و پیرنا : بفتح، شناوری کردن۔

چھیڑنا : بکسر و ہا و یای مجہول مخلوط، بنوعے رنجانیدن خواہ بمزاح خواہ بطعن و طنز۔

چھوڑنا : بواوِ مجہول، رہانیدن۔

توڑنا : بواوِ مجہول، شکستن۔

دوڑنا : بفتح دال، دویدن۔

پھوڑنا : سر را شکستن و سبو و خم را شکستن۔

پھاڑنا : چاک کردن۔

فصلِ سینِ سعفص :

تاسنا : رعب نشانیدن بر طفل۔

ہونسنا : بواوِ معروف و نونِ غنہ، بدگوئی کردن بر رشک و حسد۔

کوسنا : بواوِ مجہول، بد دعا کردن۔

ٹیسنا : بیای معروف، درد شدنِ جراحت یا بریاح۔

بخشنا : کرم و عفو کردن۔

فصلِ ہر دو کاف :

پھانکنا : بفتح، ہا و نونِ مخلوط، سفوف خوردن۔

پھونکنا : بواوِ معروف (و) ہا و نونِ مخلوط، نفخ بمنفاخ۔ و پف کردن دعا۔ و سوزانیدن۔

فصلِ تای ثقیل :

چاٹنا : از زبان چشیدن ۔

ڈانٹنا : بنونِ غنہ ، کسے را بآوازِ تند و غیظ آمیز نہیب دادن ۔

اونٹنا : بفتح ، واو (و) نون مخلوط ، روغن و شیر وغیرہ را جوشیدن ۔

ٹوٹنا : بضم ، بواوِ معروف ، شکستہ شدن ۔

پھوٹنا : نمو کردنِ دانہ ہا در کشت و کوپلہا ۔ و منفجر شدنِ دنبل ۔ و ریش شدنِ جسم از مرض ۔ و بمعنیٔ شکستہ شدن نیز ۔

گھونٹنا : ہا و واوِ مجہول و نونِ غنہ ، حل کردن ۔ و بواوِ معروف ، گلو فشردن ۔

پیٹنا : بیای معروف ، سینہ (و) سر کوفتن در غم ۔ و کسے را بتقصیر زدن ۔

بحثنا : بفتح و ثای ثخذ ، باکسے مباحثہ کردن ۔

فصلِ دال :

پادنا : گوزیدن ۔

پھاندنا : ہا و نون مخلوط ، از یک جانب بجانبِ دیگر جست کردن ۔

کوندنا : بفتح ، واو و نون مخلوط ، رخشیدنِ برق ۔

سوندنا : بفتح ، بروزنِ کوندنا ، آرد و خاک را گل کردن بدست و پا ۔

روندنا : بہماں وزن ، پایمال کردن ۔

اینڈنا : بفتح ، برخود پیچیدن ۔

چوکنا : بواوِ معروف ، سہو کردن ۔
تھوکنا : ہای مخلوط بواوِ معروف ، انداختنِ لعاب دہن ۔
ٹوکنا : بواوِ مجہول ، در کارِ کسے دخل نمودن ۔
اوکنا : بواوِ مجہول ، قے کردن ۔
ڈاکنا : بہمان معنی ۔
چونکنا : بفتح ، واو (و) نون مخلوط ، یکایک بیدار شدن ۔
بھونکنا : بفتح ہا و واو و نون مخلوط ، غریدنِ سگ ۔ و بضم ، بواوِ مجہول ، دخول کردنِ کارد در شکم ۔ و این مصدرِ متعدّی کرده است بازدیادِ واو ، و از بابِ فعلن در بابِ فاعلن آورده ۔
جھونکنا : بواوِ مجہول (و) ہا و نون مخلوط ، خس و خاشاک در گلخن سوزانیدن ۔
پھینکنا : بکسرِ ہا بیای مجہول مخلوط و نونِ غنّہ ، انداختن و رایگاں کردنِ چیزہا ۔
کوکنا : بواوِ معروف ، سوزنِ ساعت را از کلید گردش دادن ۔ و سازِ ارغن را ہم نواختن ۔
دھونکنا : بفتح ، ہا و واو و نون مخلوط ، آتش را مشتعل گردانیدن ۔
بگھارنا : تخم خربزه و تربز را بریاں کردن بروغن و شکر ۔
مانگنا : نونِ غنّہ ، سوال کردن ۔
بھاگنا : بہای مخلوط ، گریختن ۔
ٹونگنا : بواوِ معروف و نون ، چیزے خوردن اندک ۔
جاگنا : بیدار شدن ۔

فصلِ لام :

جھیلنا : یای مجهول و ہای مخلوط ، گذرانیدنِ مصیبت و سختی ۔

پیلنا : بیای مجهول ، ورزش کردن ۔ و روغنِ کنجد وغیره در جوغنِ چوبیِ کلاں بامدادِ گاوِ نر کشیدن ۔ بعض بایں معنی بجای لام ، حرفِ رای قرشت استعمال کنند ۔

سالنا : ہر چہار پایہ را سوراخ کردن موافقِ چہار چوب پلنگ ۔

کھیلنا : ہای مخلوط بیای مجهول ، مشغول شدن بلهو و لعب و بازیہا مثلِ گنجفہ و چوپڑ وغیره ۔

پھولنا : ہای مخلوط بواوِ معروف ، شگفتن و عمل آوردنِ درخت ۔ و فربہ شدن ۔ و بیای ابجد ، سہو کردن ۔

بولنا : بواوِ مجهول ، گویا شدن ۔

ڈالنا : انداختن ۔

ہولنا : بواوِ معروف ، پیل را راندن ۔

جھولنا : ہای مخلوط بواوِ معروف ، در مهد وغیره آرام گرفتنِ اطفال ۔

فصلِ میم :

چومنا : بواوِ معروف ، بوسیدن ۔

جھومنا : ہای مخلوط بواوِ معروف ، سر جنبانیدنِ فیل و [illegible] ریدن بعالمِ مستی ۔

تومنا : بواوِ معروف ، پنبہ را ریشہ ریشہ کردن بانگشتہا ۔

گھومنا : ہای مخلوط بواوِ معروف ، چرخ زدن بگردِ خویش و گشت کردن ۔

سہمنا : بفتح ہای مخلوط ، خائف شدنِ اطفال ۔
ماننا : سخن پذیرا کردن ۔
جاننا : دانستن ۔

فصلِ ہا :

دیکھنا : بیای مجہول و ہای مخلوط ، دیدن ۔
دوکھنا : بواوِ مجہول و ہای مخلوط ، ردّ و قدح کردن ۔
سونگھنا : بواوِ معروف و نونِ غنّہ ، بوییدن ۔
اونگھنا : بر وزنِ سونگھنا ، سرنگوں شدن بغنودگی ۔
سوکھنا : بواوِ معروف ، خشک شدن ۔
سیکھنا : بیای معروف ، آموختن ۔
اینٹھنا : بفتح یا و نون و تای ثقیل ہم مخلوط ، اعضاشکنی ۔
پاچھنا : از کوکنار افیون برآوردن ۔
سوجھنا : بچیزے بینا شد ۔
چھیڑنا : بیای مجہول و رای ثقیل ، اوّلاً چرمِ پاپوش را بہ اوزار تراش خراش کردن ۔
اوندھنا : بفتح ، واو و نون و دال مخلوط ، بر رو افتادن ۔
کونتھنا : بواوِ معروف ، نون و تا مخلوط ، بوقتِ ریدن قوّت کردن تا براز برآید ۔
کانکھنا : نونِ مغنونہ ، بہماں معنی ۔
بیٹھنا : بفتح ، بیا و تای ثقیل ، نشستن ۔

باب فعولن

لبھانا : بضم و ہای مخلوط ، راغب کردن بسوی خویش ۔
بلانا : بضم ، کسے را طلب کردن ۔
کھجانا : بضم ، خاریدن ۔
ستانا : بفتح ، رنجیدہ کردن ۔
بتانا : بفتح ، آموزیدن ۔
اگھانا : بکاف فارسی ، قرض دادہ شدہ را ستانیدن ۔
کھجانا : بکسر و ہای مخلوط ، ناراض کردن بکلام غیرت انگیز ۔

جھڑپنا : باکسے تند کلام کردن بعزم جنگ ۔
کلپنا : جامہ آہار کردن ۔ و دعای بد کردن ۔

اچٹنا : ضربہ از ضرب جستن و کارگر نشدن ۔
اگٹنا : کلام مخاطب را مکرر بزبان آوردن ۔ و بزرگان مخاطب را بتوہین بذکر آوردن ۔
الٹنا : بفتح از جای برگشتن ۔
جھپٹنا : بفتح ، بہای مخلوط ، بزودی دویدن ۔
رپٹنا : بفتحتین ، لغزیدن پا ۔
ڈپٹنا : بفتحتین ، تند راندن اسپ ۔
چمٹنا : بفتحتین ، چسپیدن ۔

چہکنا : بفتحتین ، آوازِ جانورانِ خوش آواز (بہنگام) خوشی ، یعنی نغمہ سرائی ۔

گنوانا : بفتح ، نونِ مخلوط ، رایگاں کردن ۔

کھوندلنا : ہا ، واو ، و نون ہر سہ مخلوط ـــــ (کذا) ۔

چکٹنا : بکسرِ جیمِ فارسی ، بفتحِ کاف ، کثیف شدنِ لباس و موی سر بسببِ روغن ۔

سمٹنا : بکسر و میمِ مفتوح ، غنچہ شدنِ چیزِ پریشاں و جمع شدن ۔

لپٹنا : بکسرِ لام و بفتحِ بای فارسی ، چسپیدن ، چون بیمار (مار؟) بدرخت ۔

گھسٹنا : بفتحِ کافِ فارسی و ہای مخلوط و سینِ مہملہ مکسور ، کشیدہ شدنِ چیزے بزور ۔

فصلِ ہر دو جیم :

گرجنا : بفتحتین ، غریدنِ سحاب ۔

اوپجنا : بضم ، واوِ مخلوط ، بای فارسی مفتوح ؛ بزبانِ بھاکا بمعنی روییدن ۔ و بزبانِ اردو بمعنی نغمۂ نو پیدا کردن در غنا ۔

کھرچنا : بضم ، بہای مخلوط ، بفتحِ را ، چیزے از چیزے برکندن بطورِ رندا ۔

الیچنا : بروزنِ آیچنا ، آب کشیدن از چاہ یا از چقر تمام ۔

خرچنا : زر صرف کردن ۔

امنڈنا :
گھمنڈنا : } ہر دو بمعنی گرد آمدنِ ابر ۔

فصلِ رائے قرشت :

اترنا : بضم ، از فوق بہ تحت آمدن ، یا بغارے یا چاہے فرو رفتن ۔ وکم شدنِ موی سر ۔ ولاغر شدنِ چہرہ وبدن ۔ و استعمالِ آں بعنوانہا ۔

ابھرنا : بضم ، برآمدنِ چیزے ہمچو پستان وحباب ۔

اپھرنا : بفتحتین ، نفخ شکم شدن ۔

بکھرنا : بکسر و ہای مخلوط ، مجموعہ پریشاں شدن ۔

دھرانا : بکسر و ہای مخلوط ، از کلام طنز آمیز یا کسے غرور کردن ۔

سنورنا : بفتح و نونِ غنہ ، آراستہ شدن ۔

گزرنا : بضم ، بجائے رفتن و از کارے درگذشتن ۔

مکرنا : بضم ، منکر شدن از کردۂ خویش ۔

نکھرنا : از کثافت نفیس شدن ۔

ٹھٹھرنا : بکسر و ہر دو ہای مخلوط ، از نمو باز ماندن ۔ وسرد شدنِ جسم از شدتِ سرما ۔

پسرنا : مسرور شدن باندک چیزے بسببِ طمع ۔

کترنا : بفتحتین ، مقراض کردن ۔

بگھرنا : بفتحتین ، آمیختہ شدنِ طعام بروغنِ داغ کردہ ۔

لرزنا : بفتحتین ، لغزیدن ۔

فصلِ سین :

آکسنا : بضم ، افزودہ شدنِ فتیلہ از لبِ چراغ ، تا روشنی زیادہ شود۔ و قدرے آمادہ شدن بر کارے ۔

بھلسنا :
بھلسنا : } ہر دو بضم ، بہای مخلوط ، کم کم سوختہ شدن ۔

ابسنا : بضم ، طعامِ شب ماندہ متعفن شدن بسببِ گرمی ۔

برسنا : بفتحتین ، باریدنِ ابر ۔

ترسنا : بفتحتین ، بسیار متمنی ماندن بچیزے ۔

فصلِ کاف :

اٹکنا : پیچیدہ شدنِ دامن از خار یا بچیزِ دیگر ۔

مٹکنا : بفتح ، حرکاتِ رقاصاں کردن بسبزگی ۔

جھٹکنا : بفتح ، بہای مخلوط ، دامن افشاندن ۔

چٹکنا : شگفتنِ غنچہ ۔ و جستنِ دانۂ اسپند وغیرہ بر آتش ۔

لٹکنا : بفتح ، آویختہ شدن ۔

بھٹکنا : بفتح ، بہای مخلوط ، راہ گم کردن ۔

ٹھٹھکنا : بکسر و ہر دو ہا مخلوط (کنا) ۔

پھٹکنا : بفتح و ہای مخلوط ، غلہ را پاک کردن بغلہ فشاں ۔ و گذر کردن بجایے ، لیکن بترکیبِ صیغۂ امر ، چوں : آنہ پھٹکنے ، و جانہ پھٹکنے ۔

کھٹکنا : بفتح ، بہای مخلوط ، خلیدنِ ذرہ بچشم ، و دغدغۂ چیزے بدل ۔

پٹکنا : بفتح ، سر کوبیدن بدر و دیوار۔
چھٹکنا : بکسرِ جیم فارسی بہای مخلوط ، روشن شدنِ شب ماہ ۔
سٹکنا : بفتح ، بے اطلاع بجایے رفتن۔
مسکنا : بفتح ، دنداں نما شکستنِ ملبوس۔
جھجھکنا : بکسرِ اول ، پس و پیش کردن از حجاب ۔ و دفعۃً خائف شدن ۔
بہکنا : بفتحتین ، بے محل سخن گفتن از روی سہو۔
مہکنا : بفتحتین ، بویا شدن ۔
لچکنا : بفتحتین ، لغزیدنِ چیز بسبب نزاکت ۔
پچکنا : بکسر ، از حریف در گذر کردن ۔ و ناہموار شدنِ ظرف بسبب صدمہ ۔
اچکنا : جستن مثلِ غوک ۔
چہکنا : بفتحتین ، نغمہ کردنِ مرغاں ۔
بلکنا : بکسر ، نالاں شدن بہ بیقراری ۔
جھلکنا۔ چمکنا۔ دمکنا : ہر سہ بفتحتین ، بمعنی رخشیدن ۔
گمکنا : بفتحتین ، گندہ تحریر سرایدن ۔
ہچکنا : بکسر ، آمادہ شدنِ بکارے باندیشہ ۔
کھسکنا : بکسر ، بہای مخلوط ، جنبش کردن از جایے ۔ و گریختن بے اطلاع ۔
دہکنا : بفتحتین ، مشتعل شدنِ آتش۔
گہکنا : بفتحتین ، کافِ فارسی ، گفتگو کردن بخروش ۔

ہمکنا : بضم، حملہ ور شدنِ طفلِ شیر خوار بآغوشِ کسے ۔

تھلکنا : بفتحتینِ تا و لام بہای مخلوط، جنبیدنِ تودۂ گل ۔

چھنکنا : بکسر، بہای مخلوط، بینی پاک کردن از خلم۔ و بفتح، آواز کردنِ روغنِ داغ در طعام ۔

جھنکنا : بفتح، بہای مخلوط، آواز کردنِ خلخال وغیرہ۔

لپکنا : بفتحتینِ لام و بای فارسی، زود دویدن ۔

بھبھکنا : بفتحتینِ ہر دو بای ابجد و مخلوط ہر دو ہای ہوّز، بدبو رسیدن بدماغ یکایک ۔

مہکنا : بفتحتین، بو دادنِ اشیای خوشبو ہمچو ریاحین و لخلخہ ۔ و معطّر شدنِ مکان و لباس از آں اشیای خوش بو ۔

لہکنا : جنبیدنِ سبزہ و گلہا بتازگی ۔

پھپھکنا : بفتح ہر دو بای فارسی و مخلوط ہر دو ہای ہوّز، بالیدہ شدنِ اشجار و فربہ شدنِ انسان ۔

تھرکنا : تای مکسور بہای مخلوط، جنبانیدنِ اعضا ۔

سسکنا : بکسرِ سینِ اول، دم سوختن از فرطِ گریہ۔ و دم شماری بعالمِ نزع ۔

سچکنا : بضمِ سین، آمادہ شدن بکارے بصد اندیشہ ۔

چرکنا : بکسرِ جیمِ فارسی، ریدنِ طفل ۔ و بضم، ریزہ کردنِ جانورِ قفسی ۔

گھرکنا : مکسور کافِ فارسی بہای مخلوط، طفل را بآوازِ مہیب منع کردن شوخی را ۔

سرکنا : بفتحتینِ سین و را، از جای حرکت کردن ۔

ڈھلکنا : دالِ ثقیل و لامِ مفتوح بہای مخلوط، اشک جاری شدن قطرہ قطرہ ۔

جھپکنا : چشم زدن ۔ و بمقابلۂ کسے در گذر کم دیدن ۔
بھڑکنا : بای مفتوح بہای مخلوط ، وحشت کردنِ جانور ۔
پھڑکنا : بہماں قیاس ، حرکت کردن بے تابانہ ، ہمچو بسمل ۔
کھڑکنا : بہماں قیاس ، آواز دادنِ اوراقِ خشکیدہ ۔
جھڑکنا : جیم مکسور بہای مخلوط ، باز داشتنِ طفل را از شوخی بآوازِ تند ۔
چھڑکنا : جیم فارسی مکسور بہای مخلوط ، افشاندن و پاشیدن ۔
دھڑکنا : اختلاجِ قلب ۔
ٹرٹرکنا : ہر دو رای ثقیل ، اول مکسور ، فغاں کردنِ طفل برای چیزے ۔
سڑکنا : بضم سین مہملہ ، از سوراخ بینی چیزے بکار بردن
مڑکنا : چیزے کج شدن از صدمہ ۔
ہڑکنا : ہای مضموم ، شیون کردنِ طفل ۔
کڑکنا : بفتح ، شورشِ برق و چوبہای سقف کہ از بارِ گراں آوازِ شکستن دہد ۔

فصلِ لام :

سلگنا : بضم ، روشن شدنِ آتش از فروزینہ ۔
ابلنا : بضم ، بیروں آمدنِ شیر و شوربہ از جوشیدنِ مرجل بر آتش ۔
اگلنا : بضم ، چیزے از دہن بیروں آوردن ۔ و بیروں آمدنِ تیغ از نیام ۔
پھسلنا : بای فارسی مکسور وہای مخلوط ، پای لغزیدن از گل یا از چیزے دیگر ۔
سنبھلنا : باز ماندن از صدمہ افتادن ، و ہم از کارِ زشت ۔
اچھلنا : بضم ، جستن ۔

کچلنا : چیزے را کوفتن ۔
مچلنا : ضد کردنِ طفل بچیزے ۔
پگھلنا : بکسرِ بای فارسی و بفتحِ کافِ فارسی و ہای مخلوط ، گداختہ شدنِ مثلِ قلعی و سرب بر آتش ۔
نکلنا : بکسر ، بیروں شدن ۔
بدلنا : بفتحتین ، چیزے را بچیزے بدل کردن ۔
کھسلنا : بکسورہای مخلوط ، افتادن از بلندی بسرین ۔ و حرکت کردنِ طفل بسرین بر زمین ۔
بہلنا : بفتحتین ، ساکت شدنِ طفلِ گریاں بشغلِ دیگر ۔
اونڈلنا : بضم ، واو و نون مخلوط ، انداختہ شدنِ چیزِ رقیق بظرفِ دیگر ۔

فصلِ ہای ہوّز :

اولجھنا : بضم ، واوِ مضموم و لامِ مفتوح و جیم و ہا مخلوط ، معقّد شدنِ تارہا و موہا کہ شانہ کشیدن دشوار شود ۔ و مباحثہ کردن باکسے از جہالت ۔ و گرفتار شدن بکار ۔
سلجھنا : بہماں قیاس ، یعنی آراستہ شدنِ آں معقّد ہای تارہا ۔
سمجھنا : بفتحتین ، فہمیدن ۔
پرکھنا : بفتحتین ، شناختنِ اشرفی و روپیہ ۔
دکھنا : بضم ، تردّدِ سخن کردن ۔
پرونا : بکسرِ بای فارسی و واوِ مجہول ، دانہ ہا بر رشتہ کشیدن ، و ہم سوزن را ۔
سمونا : بفتحِ سین ، و میم بواوِ مجہول ، گرم و سرد را معتدل گردانیدن ۔
سکرنا : بفتحتین ، پرکھنا ۔

بابِ مفاعلن

الاپنا : سرا ییدن اصولِ غنا ۔

دبوچنا : چیزے را یا کسے را بقوت گرفتن در آغوش یا در مشت ۔

کھسوٹنا : بفتح کاف، و ہای مخلوط و واوِ مجہول ، موی سر کندن بعالم غیظ و غصہ ۔

پکارنا : بضم ، آواز دادن کسے را ۔

بچارنا : پوتھی خواندن برہمناں ۔

بسورنا : بکسر، نیم گریہ ۔

بُہارنا : جاروب کشیدن ۔

بسورنا : چہرہ گریہ ناک ساختن ۔

نچوڑنا : چیزے را صاف نمودن بانگشتہا ۔

اٹیرنا : پیچیدن رشتہ ہا بر استاع ۔

مٹھارنا : بفتح میم ، تیغ آبدار را کند نمودن ۔

سدھارنا : بکسر، رخصت شدن ۔

مروڑنا : بفتح، و بضمِ رای ثقیل بواوِ مجہول ، دستِ کسے را بقوت تاب دادن ۔ یا چیزے را تاب دادہ افشردن ۔

بھنبھوڑنا : بفتح ، نون و ہا مخلوط ، و بضمِ بای ثانی و ہا مخلوط بواوِ مجہول ، گزیدنِ سگ ۔

جھنجھوڑنا : بکسر ، بقیاسِ ماقبل ، گزیدنِ سگ بشکار دادنِ شکار ۔

ٹھوکنا : بفتحِ تای ثقیل و بضمِ ہا بواوِ مجہول ، کسے را ہوشیار کردن بضربِ دست یا بضربِ انگشت ۔

فصلِ لام :

ٹٹولنا : بفتحِ تای ثقیلِ اول ، بضمِ تای ثقیلِ ثانی بواوِ مجہول ، دریافتن چیزِ بستہ را بانگشتہا ۔

گھنگھولنا : بفتحِ کافِ فارسیِ اول ، ہا و نون مخلوط ، و بضمِ کافِ فارسیِ دیگر ، ہا مخلوط بواوِ مجہول ، دست جنبیدن در آبِ ظرف ۔

گنجولنا : بکسرِ کافِ فارسی و نونِ مخلوط و بضمِ جیم بواوِ مجہول ، دستمال کردنِ طعام تا دیگری را کراہت آید ۔

کھنگالنا : بفتح ، ہا و نون ہر دو مخلوط —— (کذا) ۔

اوکیلنا : بضم ، بواوِ مجہول ، و بکسرِ کاف بیای مجہول ، راست کردن رسنِ تابیدہ را ۔

اُجالنا : جلا کردنِ زیورِ طلا و نقرہ ۔

ڈھکیلنا : بفتحِ دالِ ثقیل بہای مخلوط و کافِ مکسور بیای مجہول ، کسے را بقوّت کفِ دست زدن تا او بر زمین بررو افتد یا در چاہ یا از بلندی ۔

نباہنا : بکسر ، کارے را بانجام رسانیدن ۔

کراہنا : بفتحِ کاف ، آہستہ ہای وای کردن از شدّتِ درد ۔

بابِ مفعولن

اترانا : بکسر، نازیدن بچیزے ۔

اٹھلانا : بفتح ، بتای ثقیل و ہای مخلوط ، سخن گفتنِ طفلانہ ۔

گھبرانا : بفتحِ کافِ فارسی و ہای مخلوط ، برخاستہ خاطر شدن باندیشہا ۔

سنولانا : بفتحِ سین و نون مخلوط مع واو ، تبدیل شدنِ رنگ بِخسار بسیاہی از تابشِ آفتاب ۔

بولانا : بفتح ، حرکات کردن مجنونانہ ۔

ستانا : بضم و بفتح ہم ، باز ماندن از مسافت تا سستی و ماندگی زائل شود ۔

شرمانا : محجوب شدن ۔

دوہرانا : بضمِ دال و واو و ہا ہر دو مخلوط ، چیزے را دوتا کردن ۔ سخن مکرر گفتن ۔

چوڑانا : بفتح و رای ثقیل ، چیزے را پہن کردن بعرض ۔

مرجھانا : بضم ، پژمردہ شدنِ ریاحین و سبزہ ۔

کمھلانا : بضمِ کاف و میم و ہا مخلوط ، بمعنیِ مرجھانا ۔

چکلانا : بفتح ، بمعنیِ چوڑانا ۔

برّانا : بفتح و رای مشدّد ، شخصِ خوابیدہ را گویا شدن ۔

تھرّانا : بفتحِ تا بہای مخلوط و رای مشدّد ، لغزیدن بسببِ شدتِ سرما یا بخوف ۔

پھرّانا : بفتحِ بای فارسی و ہای مخلوط و رای مشدّد ، جست کردن و بالای بلندی رسیدن ۔

ٹرّانا : بفتحِ تای ثقیل و رای مشدّد ، گفتگو (ی) بیہودہ کردن ۔

چرّانا : بفتح و رای مشدّد ، بدرد آمدنِ جراحتِ خشک بسببِ حرکات و جنبش ۔

غرّانا : بضمّ و رای مشدّد ، غرّیدنِ سگ ۔

چکرانا : بفتحِ جیم فارسی ، گرد گشتنِ دماغ بسببِ دوا دوش ۔

تیورانا : بکسر ، یا و واو ہر دو مخلوط ، بمعنی چکرانا ۔

فرمانا : فرمودن ۔

اُکتانا : برخاستہ خاطر شدن از کارے ۔

ٹکرانا : بفتحِ تای ثقیل ، سر زدن بدر و دیوار ۔

تتلانا : بضمِ تا ، سخن گفتنِ طفل بخام زبانی ۔

سہلانا : بفتح ، کفِ دست سائیدن آہستگی بہر عضوِ بدن تا راحت رسد ۔

ٹھکرانا : بضمِ تای ثقیل و ہای مخلوط ، چیزے را پا زدن ۔

دھمکانا : بفتحِ دالِ ثقیل بہای مخلوط ، کسے را بکلام زشت مخوّف کردن ۔

ڈہکانا : بفتحِ دالِ ثقیل بہای مخلوط ، کسے را چیزے بطورِ صلاح دادن و ندادن ۔

جھنجھلانا : بضمِ جیم بہا و نونِ مخلوط و جیم دیگر و ہای دیگر ہم مخلوط ، متنفّص شدن ۔

دھکیانا : بفتحِ دال بہای مخلوط ، کسے را بازو و شانہ زدن ۔

جھلّانا : بفتحِ جیم و ہای مخلوط و لام مشدّد ، بغیظ آمدن از سخنِ طنز آمیز ۔

چندرانا : بفتح و نونِ مخلوط ، با کسے تجاہلِ عارفانہ کردن ۔

بابِ مستفعلن

للکارنا : بفتح ، کسے را بآوازِ تند و تیز ہیبت دادن ۔

چہکارنا : بفتح ، بہای مخلوط ، نغمہ سرائیدنِ جانوراں بآوازِ بلند ۔

چمکارنا : بضم جیمِ فارسی ، اسپ و گاو وغیرہ را بآوازِ بوسیدن نزدِ خود طلبیدن ۔

پچکارنا : بضم جیمِ فارسی بہا، و جیمِ فارسیِ دیگر و ہای دیگر ، ہمہ مخلوط ، دوانیدنِ اسپ بآوازِ راندن ۔

چھنکارنا : بفتح جیمِ فارسی و ہا و نون مخلوط ، نیسانیدنِ ادویہ ۔ و روغن داغ کردن ۔

ہلکارنا : بضم ہا ، سگ را سوی شکار اشارہ کردن بہ نہیب ۔

تھتکارنا : بضم تا ، و ہا و ہای دیگر ہمہ مخلوط ، تف تف کردن بچیزے منحوس ۔

دھتکارنا : بفتح دال ، ہا و تا مخلوط ، راندنِ کسے را بہ تذلیل ۔

چنگھاڑنا : بکسر جیمِ فارسی و نون و کاف و ہا و رای ثقیل ، غریدنِ فیل ۔

سسکارنا : بضم سینِ اول ، طفل را برای ریدن ترغیب دادن آہستہ ۔

پہچاننا : بفتح ، شناختن ۔

گردانا : بفتح ، دامن در کمر پیچیدن ۔

بابِ فاعلاتن

اڑاڑانا : بفتح، آوازِ افتادنِ مکان و دیوار وغیرہ۔

بڑبڑانا : بضمّ ہر دو بای ابجد با ہر دو رای ثقیل، چیزے خواندن زیرِ لب۔ و بفتح، کلام ناقبول کردن۔

گڑگڑانا : بضمّ ہر دو کافِ فارسی با ہر دو رای ثقیل (کذا)۔ و بکسرِ ہر دو کافِ فارسی ، بہ لجاجت کلام کردن۔

ہڑبڑانا : ہا و با مفتوح، بے حواس شدن۔

لڑکھڑانا : لام و کاف مفتوح، لغزیدنِ ہر دو پا بسببِ سکر و ناتوانی۔

جھرجھرانا : بفتح ہر دو جیم و ہر دو ہای مخلوط، شاخِ درختِ میوہ دار را بزور جنبانیدن تا میوہ ہا بیفتد۔

پھڑپھڑانا : بفتح ہر دو بای فارسی و ہر دو ہای مخلوط و ہر دو رای ثقیل، تپیدن مثلِ بسمل۔

چڑچڑانا : ہر دو جیم فارسی با رای ثقیل مکسور، ہر سخن رنجش آمیز گفتن۔

کڑکڑانا : بضمّ ہر دو کاف، و ہر دو را (ی) ثقیل، نالیدنِ ماکیان و خروس۔ و بفتح، شوریدنِ سحاب۔

بربرانا : بضم، چیزے خشک پاشیدن بر چیزے، مثلِ نمک و شکر۔

بھربھرانا : بفتح، بہای مخلوط، قدرے آماس شدنِ چہرہ۔

بغبغانا : بفتح ہر دو با و غین منقوطہ، مستی کردنِ کبوتر باواز۔

کھڑکھڑانا : بفتحِ ہر دو کاف، و ہر دو ہای مخلوط ، زنجیر در جنبانیدن ۔

ڈبڈبانا : ہر دو دالِ ثقیل مفتوح ، پُر آب شدنِ چشم ۔

پھرپھرانا : بضمِ ہر دو بای فارسی ، تپیدنِ سپش در موی سر و در ملبوس ۔

چرچرانا : بفتحِ جیم فارسی ، بمعنی اڑاڑانا ۔

پٹپٹانا : بکسرِ بای فارسی و ہر دو تای ثقیل ، بکارے دست و پا زدن و ازاں کار مایوس ماندن ۔

کٹکٹانا : ہر دو کاف مکسور و ہر دو تا ثقیل ، دنداں بہم سودن تا آواز برآید ۔

کھٹکھٹانا : بفتحِ ہر دو کاف و ہر دو ہا مخلوط و ہر دو تا ثقیل ، چیزے را کوفتن کہ آواز برآید ۔

مٹمٹانا : ہر دو میم مکسور و ہر دو تا ثقیل ، برہم زدنِ چشم بغنودگی ۔

بجبجانا : ہر دو با مکسور ، گندیدہ شدنِ چیزے کہ خمیر آرد و قابلِ خورش نماند ۔

مچمچانا : بفتحِ ہر دو میم و ہر دو جیم فارسی ، راغب شدن بر خوردن آنقدر کہ انزال شود ۔

پچپچانا : ہر دو بای فارسی مکسور و ہر دو جیم فارسی ، متعفن شدن و لزج شدنِ چیزے کہ از دیدنِ او کراہت آید ۔

کچکچانا : بکسرِ ہر دو کاف و بہر دو جیمِ فارسی ، بوقت قوت کردن بکسے بہ پنجہ و ساعد ، یا برداشتنِ بار گراں بجبسِ دم و دنداں ۔

فصلِ لام بجای ہر دو الفِ فاعلاتن :

بلبلانا : ہر دو بای ابجد مکسور ، بے قرار شدن و اضطراب بہای وای۔ و بفتحِ ہر دو با ، غرّیدنِ شتر۔

بوکھلانا : بفتح و ہا مخلوط بکاف ، افعالِ بے تابانہ کردن ۔

پلپلانا : بضمّ ہر دو بای فارسی ، گردانیدنِ چیزے در دہن ۔

جھلجھلانا : ہر دو جیم مفتوح ، ہر دو ہای مخلوط ، سوزش کردنِ کفِ دست بسببِ تپنچہ زدن ۔

چلچلانا : ہر دو جیمِ فارسی مضموم ، حکّہ پیدا شدن در جراحت ۔

سلسلانا : ہر دو سین ، محسوس شدنِ شے ِروان مثلِ کرم بر جسم یا در گوش یا در جراحت ۔

کلکلانا : ہر دو کاف مکسور ، بوقت گفتگو (ی) جاہلانہ کردن ۔ و بضم ، خارشتِ خفیف پیدا شدن در بنِ دنداں۔

دھلدھلانا : ہر دو دال مفتوح و ہر دو ہا مخلوط ، رواں شدنِ آب از دہانِ زخم و سبو یا از سوراخِ حوض۔

گلگلانا : ہر دو کافِ فارسی مکسور، نانِ گرم تر کردن بسیار بہ دغنِ گاو ۔

ہلہلانا : بفتحِ ہر دو ہا ، میانِ تب مضطرب شدن۔

ململانا : بفتحِ ہر دو میم ، تاسّف کنان ماندن ۔

فصلِ دال بجای ہر دو الفِ فاعلاتن :

گدگداتا : بضمِ کافِ فارسی ہر دو ، غلغلیچ کردن ۔

پھدپھداتا : ہر دو بای فارسی مفتوح و ہر دو ہا مخلوط ، گندہ شدنِ چیزے کہ مثلِ خمیر شود و حباب پیدا کند ۔

فصلِ میم بجای ہر دو الفِ فاعلاتن :

تمتماتا : بفتحِ ہر دو تا ، سرخی مائل شدنِ رخسار از تابشِ آفتاب ۔

ڈھمڈماتا : بکسرِ ہر دو دالِ ثقیل ، نواختنِ دفِ کوچک ۔

فصلِ نون بجای ہر دو الفِ فاعلاتن :

بھنبھناتا : بکسرِ ہر دو با و ہر دو ہا مخلوط ، پریدنِ مگساں بر چیزے ۔

جھنجھناتا : ہر دو جیم مفتوح و ہر دو ہا مخلوط ، در عضو صدمۂ ضرب ماندن چوں صدای ظرف از ضرب ۔

ونڈناتا : عیش بہ تبختر کردن ۔

سنسناتا : تحریکِ ریاح شدن در دست و پا و در گوش ۔

گنگناتا : ہر دو کافِ فارسی مضموم ، سرائیدن در دماغ بغیرِ کشادنِ دہن ۔

کنکناتا : بضمِ ہر دو کاف ، نیم گرم کردنِ آب ۔

ہنہناتا : غریدنِ اسپ ۔

منمناتا : ہر دو میم مکسور ، سخن گفتن بشرکتِ دماغ ۔

کنکھناتا : ہر دو کاف مکسور و ہر دو ہا مخلوط ، بدمزاج شدنِ طفل بسبب کسلمندی ۔

فصلِ لام بجای ہردو الفِ فاعلاتُن :

تملانا : بفتحِ لام و میم اضطراب کردن۔
جھلملانا : بکسرِ جیم و میم و ہای مخلوط ، قریبِ خاموش شدنِ چراغ و قریبِ غروب شدنِ نجوم۔
کسمسانا : بفتحِ کاف و میم ، ارادۂ جنبش کردن۔
ڈگمگانا : بفتحِ دالِ ثقیل و میم ، و ہردو کافِ فارسی ، جنبیدنِ سراپا۔
کنمنانا : بفتحِ کاف و میم ، سخنِ پہلودار شنیدن و ازاں متوحش شدن۔
جگمگانا : بفتحِ جیم و میم ، و ہردو کافِ فارسی ، رخشیدن۔

ایں مصادرِ ہفت بابی کہ بقلم آوردہ ام ، ہمہ اصلی اند بوضعِ واضع ؛ دراں ہیچ حرف زائد نیست ۔ و طریقِ حرفِ زائد آوردن در مصدرِ اصلی این است مثلاً مصدرِ لازم را متعدی ساخت بیک حرفِ زائد ، چوں " اٹھنا " کہ لازم است ، " اٹھانا " متعدی کرد بالفِ زائد۔ و " مڑنا " کہ لازم است ، " موڑنا " متعدی کرد بواوِ زائد۔ و " گھرنا " کہ لازم است ، " گھیرنا " متعدی کرد بیای زائد۔ و " سونا " کہ لازم است ، " سلانا " متعدی کرد بلامِ زائد۔ و واو بسببِ ثقالت ساقط شود۔

و اگر متعدی بدو مفعول کنند ، دو حرفِ زائد آرند ، چوں از " اٹھنا " ، " اٹھوانا " ، و از " سونا " ، " سلوانا " ۔ علیٰ ہذا القیاس۔

و چہار حرف مخصوص اند برای متعدی ساختن : یکے الف ، دوم واو ، سوم یا ، چہارم لام ؛ چنانچہ مجموعش " والی " رقم کردم۔

کنایات

آنکھوں پر دیوار اٹھانا ۔ آنکھوں میں گھر کرنا : ہردو، امرِ دیدہ و دانستہ را بانکار محو کردن ۔

آنکھیں نکالنا ۔ آنکھیں نیلی پیلی کرنا : ہردو، بغیظ آمدن و غصہ کردن و خشمگیں شدن ۔

آنکھ ٹیڑھی کرنا ۔ آنکھ بدلنا : ہردو، بے مروّتی کردن و برخلاف شدن ۔

آنکھ ڈالنا : برحسین نگاہِ بد کردن ۔

آنکھ چرانا : از کار پہلو تہی کردن ۔

آنکھ پھیر لینا ۔ آنکھ موڑنا : بے وفائی کردن ۔

آنکھیں بند ہونا : بخوابِ مرگ رفتن ۔

آنکھیں پھوڑنا : دیدہ ریزی کردن بکارِ باریک ۔

آنکھ کا پانی ڈھلنا : بے حیا و بے شرم شدن ۔

آنکھ نیچی کرنا : شرمگیں شدن و حجاب کردن ۔

آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا : ہوشیاری کردن ۔

آنکھیں سفید ہونا : کور شدن ۔

آنکھ دکھانا : چشم نمائی کردن ۔

آنکھیں آنا ۔ آنکھیں اٹھنا : ہردو، آشوب کردنِ چشم ۔

آنکھ لگنا : خوابیدن ۔
آنکھ لگانا : عاشقی کردن باکسے ۔
آنکھیں مانگنا : طالبِ بصارت شدن ۔
آنکھیں جانا : کور شدن ۔
آنکھیں چڑھنا : لاحق شدنِ تب یعنی بخار ۔
آنکھیں سینکنا : نگریستنِ روی محبوب ۔
آنکھیں بیٹھنا : نہایت ناتواں شدن بسببِ صدمات ۔
آنکھیں دکھنا : رمدآلودہ شدنِ چشم ۔
آنکھیں گاڑنا : نہایت غور و خوض کردن در چیزے ۔
آنکھیں پتھرانا : بیحس شدنِ مردمک ہنگامِ نزع ۔
آنکھیں ڈبڈبانا : چشم پُرآب شدن ۔
آنکھوں میں چربی چھانا ۔ آنکھوں پر پردے پڑنا : ہر دو، مغرور شدن و اغماض کردن ۔
آنکھوں پر پٹی باندھنا : ندیدنِ حالِ پریشانِ کسے ۔
آنکھوں میں پینا : بغور نظارہ کردن ۔
آنکھوں میں چبھنا : خوش آمدنِ شے ۔
آنکھوں میں کھٹکنا : ناگوار شدنِ چیزے باکسے
آنکھوں سے گرنا : نالائق شدن پیشِ مرداں ۔
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا : بغور و بصیرت دیدن ۔
آنکھیں بچھانا : نہایت خاطرداری کردن ۔
آنکھوں میں سمانا : مقبولِ خاطر شدن ۔

آنکھوں میں سرسوں پھولنا : ظاہر شدنِ نشأ۔
آنکھوں میں رکھنا : نہایت عزیز داشتن۔
آگ لگانا : آتش افروزی کردن درمیانِ دو کس۔
آگ لینے آنا : آمدن و زود رفتن۔
آگ برسنا : سخت گرمی شدن از حدت آفتاب۔
آگ بگولا ہونا : نہایت خشمناک شدن۔
آگ میں آگ لگانا : برافروختہ کردن کسے برافروختہ را۔
آگ ہونا : نہایت در غیظ آمدن۔
زبان دینا ـــ زبان ہارنا : ہر دو، اقرار کردن۔
زبان بدلنا : از قول باز گشتن۔
زبان میں کانٹے پڑنا : نہایت تشنہ شدن کہ کام و زباں خشک شود۔
زبان کھولنا ـــ زبان نکالنا : ہر دو، زبان درازی کردن۔
بغلیں بجانا : شاداں شدن۔
بیڑا اٹھانا : مستعد شدن بر کارے۔
پاؤں اٹھانا : شتاب رفتن۔
پھٹے میں پاؤں دینا : دخل نمودن در معاملۂ کسے۔
بے نقط سنانا : دشنام دادن۔
بو پھوٹنا : شائع شدنِ خبر اندک۔
بیڑا پار ہونا : آسان شدنِ کارِ دشوار۔
بیڑا پار لگانا : مشکل کشائی کردن۔

پاؤں پھیلانا : ضد کردن و بر صلاحِ مردماں راضی نشدن ۔
پاؤں توڑ کر بیٹھنا : باز ماندن از سعی و کوشش در کارِ خویش ۔
پاؤں بھاری ہونا : حاملہ شدن ۔
پاؤں نکالنا : ہرزہ گرد شدن ۔
گولی بچا جانا : رو پوش کردن بوقتِ جانبازی ۔
گلے کا ہار ہونا : اصرار کردن ۔
گلے ڈالنا ــ گلے منڈھنا ــ گلے پڑنا : ہر سہ ، لزومِ شے بہ ناگواری ۔
گلا کاٹنا : بمحبتِ کسے جانِ خود را دریغ نکردن ۔
کھویا جانا : بیحواس شدن ۔
گور میں پاؤں لٹکانا : قریبِ مرگ شدن ۔
گور جھانکنا : بہماں معنی ۔
کچے گھڑوں پانی بھرنا : اطاعتے کردن کہ غیر ممکن باشد ۔
گانڑ کے تلے گنگا بہنا : دولتمند شدن ۔
کانوں پر ہاتھ رکھنا : انکار کردن ۔
کان پکڑنا : حذر کردن ۔
کان کھڑے کرنا : ہشیار شدن بتوحش ۔ و سرِ حساب ماندن از خبر ۔
کانوں کان خبر نہ ہونا : قطعِ سماعت کردن از خبرِ نیک و بد ۔
کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھنا : غافل شدن از خبرِ نیک و بد ۔
کانٹوں پر کھینچنا : آنقدر مدارات کردن کہ مخاطب محجوب گردد ۔

کانوں پر جوں نہ رینگنا : حال شنیدن و غافل ماند (ن) و خبرگیر نشدن ۔

طرح دینا : درگذر کردن ۔

دانتوں پسینا آنا : سرانجام کار بدشواری کردن ۔

دانت رکھنا : بچیزے خواہش کردن ۔

دانت کھٹے (ہونا) : عاجز شدن ۔

دانت پیسنا : بکسے خصومت کردن ۔

ہاتھ دھونا : چیزے را از دست دادن و بر آں صبر کردن ۔

ہاتھ اٹھانا : از شے دست برداشتن ۔ و ہم بمعنیٰ زد و کوب بر غلام و کنیز، یا بر اطفال برای تادیب ۔

ہاتھ پکڑنا : دستگیری کردن ۔

ہاتھ پر ہاتھ مارنا : شرط کردن ۔

ہاتھ سر پر رکھنا : سلام کردن ۔

ہاتھ سر پر پھیرنا : شفقت نمودن ۔

ہاتھ سے کھونا : از دست دادن ۔

ہاتھ ملانا : زور آزمائی کردن بکسے ۔

ہاتھ ملنا : تاسف کردن ۔

اردو ادب پر ہماری شاندار کتب

دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی
لکھنؤ کا دبستان شاعری (دو جلد سیٹ)	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
دہلی کا دبستان شاعری	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ
شرح دیوان غالب (اردو)	ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد علیگ
انیسویں صدی کی علمی، ادبی اور تہذیبی روایت	مرتبہ: پروفیسر نذیر احمد
اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید	ڈاکٹر پروین اظہر
منٹو اور مزاح	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک
راجندر سنگھ بیدی (شخصیت اور فن)	جگدیش چندر ودھاون
گوپی چند نارنگ (حیات و خدمات)	ڈاکٹر محمد حامد علی خان
اردو نثر کی داستان	ڈاکٹر طیبہ خاتون
اردو شاعری کی داستان	ڈاکٹر محمد امین خاور
اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین خاں
زبان و ادب	پروفیسر حبیب اللہ غضنفر

an artwork by ARTWORKS INTL.
Kh. Afzal Kamal - 0320 - 4031556

بُک ٹاک
میاں چیمبرز 3۔ٹمپل روڈ لاہور
Email: book_talk@hotmail.com
www.facebook.com/booktalk.pk
Website : www.booktalk.pk
042-36370656
042-36374044
042-36303321
0300-4488470